جواہر الفتاویٰ

حضرت مولانا مفتی محمد عبد السلام چاٹگامی دامت برکاتہم العالیہ

سابق رئیس دار الافتاء
جامعۃ العلوم الاسلامیہ
علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

استاد حدیث وفقہ
جامعہ اہلیہ دار العلوم معین الاسلام
ہاٹہزاری چاٹگام بنگلہ دیش

کے علمی وتحقیقی فتاویٰ ومقالات کا منتخب مجموعہ

۳

اسلامی کتب خانہ
علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

جواہر الفتاویٰ

جواہر الفتاویٰ

جلد ۳

حضرت مولانا مفتی محمد عبد السلام چاٹگامی دامت برکاتہم العالیہ

سابق رئیس دار الافتاء
جامعۃ العلوم الاسلامیہ
علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

اُستاد حدیث وفقہ
جامعہ اہلیہ دار العلوم معین الاسلام
ہاٹہزاری چاٹگام بنگلہ دیش

کے علمی وتحقیقی فتاویٰ ومقالات کا منتخب مجموعہ

اسلامی کتب خانہ
علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

کتاب : جواہر الفتاوی

مؤلف : حضرت مولانا مفتی محمد عبد السلام چاٹگامی دامت برکاتہم العالیہ

اشاعتِ اول : اگست ۲۰۱۱

ناشر

اسلامی کتب خانہ

علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

فون: 021-34927159

فہرست جواہر الفتاویٰ جلد سوم

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
	ہماری تجارت اور حرام اشیاء کی تجارت	۱۱
	شراب اور ہماری تجارت	۱۲
	شراب کی حرمت قرآن وحدیث میں	۱۳
	شراب پینے کے نقصانات	۱۵
	قمار اور جوا اور ہماری تجارت	۲۰
	لفظ میسر کی حقیقت	۲۱
	مختلف مسابقت میں بازی لگانے پر انعام کا حکم انعامی بانڈز اور قمار بازی کے کاروبار	۲۳
	جوئے کے کاروبار میں فائدے کے شیطانی اعلانات	۲۶
	جوئے اور قمار بازی کے نقصانات	۲۷
	مردار اور خنزیر کی خرید وفروخت	۳۱
	خنزیر اور اس کے اجزاء کی حرمت	۳۲
	انسانی اعضاء کی خرید وفروخت	۳۴
	انسانی اعضاء کی خرید وفروخت کیلئے بینک کا قیام	۳۶
	مجسمہ سازی اور بتوں کی خرید وفروخت	۳۷
	تصویر اور فوٹوگرافی کا پیشہ	۳۸
	جانوروں کی تصویر اور فوٹوگرافی ناجائز ہے	۳۹
	تصاویر سے متعلق احکام	۴۲
	سرکاری محکموں میں تصاویر سازی کا حکم	۴۳
	تصاویر دیکھنا حرام ہے	۴۶
	بعض تجارتی اصول	۴۷
	سودی کاروبار کی دوسری صورتیں	۵۹

اجل اور مدت کی بنیاد پر سودی تعاملات ۵۹
بیع اور تجارت فاسدہ ۵۹
موجودہ زمانہ کے مشارکہ اور مضاربہ کی شرعی حیثیت ۶۰
شرعی مشارکہ اور اس کے اقسام ۶۱
شراکتی کاروبار کے احکام ۶۲
موجودہ زمانہ کے مضاربہ ومشارکہ اصول شرع کی روشنی میں ۶۶
حصص اور شیئرز کی خرید وفروخت ۶۶
ایک شبہ اور اس کا جواب ۶۸
دوسرا شبہ اور اس کا جواب ....
خلاصہ بحث ۷۱
بیع نجش از روئے شرع ۷۴
نجش اور دھوکہ کی مختلف صورتیں ۷۵
خرید وفروخت میں ناپ وتول کی ضرورت ۷۶
ذخیرہ اندوزی منع ہے ۷۸
بیع پر بیع کرنا منع ہے ۷۹
حقوق مجردہ کی خرید وفروخت ۸۰
حرام مال سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ ۸۱
حرام سے پاکی حاصل کرنے کی مختلف صورتیں ۸۱
ایک کمزور عذر اور اس کا جواب ۸۳
ایک اہم شبہ اور اس کا جواب ۸۵
جو مال حرام بالعوض اور تبادلہ میں حاصل ہوا اس کا حکم ۸۶
جس کی آمدنی حرام ہو اس کے ہدایا وتحائف ۸۸
حرام مال اگر وراثت میں ملے تو اس کا حکم ۹۰
تین طلاق کے بارے میں عائلی قانون اور اس کی شرعی حیثیت ۹۳

مرد اور عورت کے درمیان مساوی حقوق کی تشریح ۹۶
ضرورت کے تحت شوہر کو طلاق دینے کا اختیار ہے ۱۰۱
بعض مسائل طلاق اور اس کے احکام ۱۰۳
شرعاً طلاق کا کلی اختیار شوہر کو ہوتا ہے ۱۱۲
طلاق بائن میں جس عورت کی عدت ختم ہوگئی سابقہ شوہر سے اس کا کوئی تعلق نہیں ۱۱۹
مجلس واحدہ میں تین طلاقیں ۱۲۴
استفتاء، جواب استفتاء ۱۲۶
تین طلاقوں کے بارے میں محدثین وفقہا کرام کی رائے ۱۳۳
غیر مقلدین کے چند شبہات اور ان کے جوابات ۱۳۸
تین طلاقوں کے بارے میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ نہ ذاتی تھا نہ سیاسی ۱۴۴
غیر مقلدین کا فتح القدیر کی عبارت پر شبہ اور اسکا جواب ۱۴۶
غیر مقلدین کے بعض صحابۂ کرامؓ پر افتراء اور جھوٹ اور اس کا جواب ۱۴۸
ابن عمرؓ کا فتویٰ ۱۴۹
ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ کا فتویٰ ۱۴۹
عطا بن ابی رباح اور طاؤس بن کیسان کا فتوی ۱۵۰
زید بن علی اور جملہ اہل بیت کا فتوی ۱۵۱
عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی طرف تین طلاق کے ایک طلاق ہونے کی نسبت غلط ہے ۱۵۲
بعض احناف و مالکیہ کے طرف تین طلاقوں کی ایک طلاق ہونے کی نسبت غلط ہے ۱۵۳
احناف پر غیر مقلدین کا ایک اعتراض اور اس کا جواب ۱۵۶
خلاصۂ بحث و جواب ۱۵۶
عدالت کے غیر شرعی فیصلے پر تنقید کرنا توہین عدالت نہیں ۱۵۹
قرآن وسنت کے خلاف فیصلوں کی شرعی حیثیت ۱۶۲
غیر شرعی فیصلے کرنے والے قاضی اور ججوں کا حکم ۱۶۳
علماء محققین کی جانب سے حکام اسلام پر دینی محاسبہ اور اسکے نظائر ۱۷۰

قاضی اور حاکم کی اطاعت کب واجب ہے؟ ۱۷۶
قاضی کے فیصلے پر جائز تنقید کرنا توہین عدالت نہیں ۱۷۷
ولید بن یزید پر سعد بن ابراہیم کا محاسبہ ۱۷۸
حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا ضبہ قاضی پر اعتراض ۱۸۰
حضرت حسن بصری کا حجاج بن یوسف پر اعتراض ۱۸۱
ابن ہبیرہ پر حسن بصریؒ کی تنقید ۱۸۲
قاضی ابن ابی لیلیٰ کے فیصلہ پر ابوحنیفہؒ کی تنقید ۱۸۲
منذر بن سعید کا خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر پر محاسبہ ۱۸۴
شیخ عبدالقادر کا یحییٰ بن سعید پر محاسبہ ۱۸۵
جھینگا مچھلی حلال ہے یا حرام ۱۸۸
اصول اربعہ شرعی ۱۹۱
تصدیقات مفتیان دارالافتاء بنوری ٹاؤن ۲۰۲
تصدیقات علمائے بنگلہ دیش ۲۰۳
تصدیقات مفتیان کرام دارالعلوم دیوبند ۲۱۷
مشینی ذرائع سے ظاہری حیات کی کیفیت کو باقی رکھنا ۲۱۸
مستورات کی جماعت برائے دعوت وتبلیغ کا شرعی حکم ۲۲۹
چند شبہات اور اس کے جوابات ۲۴۱
جماعت مستورات کے بارے میں چند اہم شرعی فتاوی ۲۴۵
حضرت مفتی اعظم ہند مہتمم مدرسہ امینیہ دہلی مولانا مفتی محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ۲۴۵
حضرت مفتی سید مہدی حسن صاحب مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند کا فتوی ۲۴۶
از ہر ہند دارالعلوم دیوبند کا دوسرا فتوی از مولانا مفتی حبیب الرحمٰن صاحب: ۲۴۷
مروجہ تبلیغ میں مستورات کی جماعت کے بارے میں مفتی محمد نظام الدین صدر مفتی دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ: ۲۴۸
مفتی آگرہ یوپی انڈیا کا فتویٰ ۲۴۸

مفتی سعید احمد سابق صدر مفتی مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کا فتویٰ ۲۵۰
مفتی مظفر حسین صاحب صدر مفتی مظاہر علوم وقف سہارنپور یوپی انڈیا کا فتویٰ ۲۵۰
استاذ الاساتذہ حضرت مولانا عبدالحق مدظلہ، فاضل مظاہر علوم سہارنپور ضلع اٹک کا فتویٰ ۲۵۴
حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانویؒ سابق صدر دارالافتاء جامعہ اشرفیہ کا فتویٰ ۲۵۴
مفتی محمد عیسیٰ رئیس دارالافتاء مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کا فتویٰ ۲۵۵
مفتی محمد فرید صاحب دامت برکاتہم صدر مفتی دارالعلوم حقانیہ پشاور کا فتویٰ ۲۵۶
دارالافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی پاکستان کا فتویٰ ۲۵۶
تبلیغ کی شرعی حیثیت ۲۵۸
عاقلہ وبالغہ کے نکاح کی شرعی حیثیت ۲۶۹
الجواب باسمہ تعالیٰ وتوفیقہ ۲۷۱
اہل السنّت والجماعت کے ائمہ اربعہ کا مذہب ۲۷۴
کفو کا معنی اور اس کی تفصیل ۳۰۶
جن امور میں عورت کے ساتھ مرد کا برابر اور کفو کا ہونا شرعاً معتبر ہے ۳۰۸
ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ ۳۰۹
کفاءت کا فائدہ ۳۱۴
ایک شبہ اور اس کا ازالہ ۳۱۵
ظاہر روایت پر ہمارے برصغیر کے اکابر ۳۲۳
خلاصہ جواب ۳۲۷
اسلام کیا ہے اور وہ عالم اسلام کے مسلم حکمران اور مسلمانوں سے کیا چاہتا ہے؟ ۳۲۹
لغت میں اسلام کے معنیٰ ۳۳۱
انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ۳۳۳
علماء امت کا فرض منصبی ۳۳۷
دین اسلام کی بنیاد دو چیزوں پر ہے ۳۴۰
اسلامی حکومت کا قیام اور اس کے مقاصد ۳۴۲
اسلام کا طریق انتخاب اور مغربی جمہوریت ۳۴۴

اسلامی انتخاب کی ضرورت اوراس کی شرعی حیثیت ۳۴۵
ووٹ کی حیثیت جیسے امانت کی ہے ایسے شہادت کی بھی ہے ۳۵۱
سیاسی اور مذہبی مناصب اور عہدے امانات ہیں ۳۵۵
مسلمانوں کے تمام اجتماعی امور مشورے سے طے ہونا واجب ہیں ۳۵۷
شوریٰ کے لئے کیسے لوگ ہونے چاہئیں ۳۶۱
اسلام میں امیر کا انتخاب اوراس کے مقاصد ۳۶۳
اسلامی انتخاب کے بنیادی اصلوں کی پابندی کرنے کے فوائد ۳۶۸
کِتَابُ الْبُیُوْع ۳۷۴
ٹیلفون پر بیع وفروخت کرنے کے متعلق چند سوالات ۳۷۴
خیار رؤیت کے بارے میں چند مسائل اوران کے جوابات ۳۷۶
تالاب میں مچھلی کی خرید وفروخت کرنے کا حکم ۳۷۸
ادارہ میں طلبہ کے کھانے، قیامگاہ حقوقِ مجروہ کے تحت داخل ہیں ۳۷۹
الجواب بعون اللہ تعالیٰ وتوفیقہ ۳۷۹
موبائیل کارڈ کی خرید وفروخت درست ہے ۳۷۹
چڑھاوے کے جانور کے کھانے اور خرید وفروخت کے احکام ۳۸۰
الجواب باسمہ تعالیٰ وھوالھادی للحق والصواب ۳۸۱
شیئرز بیچنے کا حکم ۳۸۴
کِتَابُ الْاِجَارَات ۳۸۵
بَابُ بَیْعِ السَلَمْ ۳۸۷
بیع سلم اوراس کی شرائط ۳۸۷
(جنگل سے شہد لینے کے متعلق ایک اہم استفتاء) ۳۸۷
منافع کی تقسیم ۳۸۸
بیع سلم کی شرائط ۳۸۹
فصلٌ فِی الرِّبوٰ والقِمار ۳۹۰
ایک جدید کمپنی کے لین دین کا طریقہ ۳۹۰

مالی جرمانہ کرنا حرام و ناجائز ہے ۳۹۱
قرضدار کا قرض خواہ کو ہدیہ تحفہ دینا ۳۹۲
کتابُ الرَّھن ۳۹۳
چند مسائل کے بارے میں سوالات کے جوابات ۳۹۳
مروّجہ رہن سے بچنے کا شرعی حیلہ ۳۹۵
بَابُ الْمُضَارَبَةِ ۳۹۷
مضاربت کی تعریف اور اس کی شرائط ۳۹۷
مضاربت کی شرائط ۳۹۷
کِتَابُ الْأُضْحِيَّةِ وَالذَّبَائِحِ ۳۹۹
اضحیہ منذور سے کھانا صاحب نذر کے لئے جائز ہے یا نہیں ۳۹۹
خلاصۂ بحث اور جوابِ استفتاء ۴۰۶
اب صاحب احسن الفتاوی کا جواب ملاحظہ فرمائیں ۴۰۸
مفہوم کی شرعی حیثیت ۴۰۹
حضرت مفتی صاحبؒ کی پیش کردہ تیسری عبارت کا جواب ۴۱۰
حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا چوتھا دعویٰ ۴۱۲
گائے سے عقیقہ کرنے پر غیر مقلدین کا ایک اشکال اور اسکا جواب ۴۱۳
اونٹ، گائے اور بکری سے عقیقہ کرنے کے متعلق ۴۱۵
حدیثِ رسول اللہ ﷺ کے بعد اس بارے میں صحابۂ کرام ؓ کا تعامل ملاحظہ فرمائیں ۴۱۶
ائمۂ اربعہ (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) کے اقوال و مسالک ۴۱۷
اجماع امت اور جمہور علماء کے اقوال پر مزید حوالے لیجئے ۴۱۸
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کا جواب ۴۱۹
نفلی قربانی میں چند آدمی ایک بکرا یا سات گائیوں میں شریک ہو کر قربانی کریں، درست نہیں ۴۲۰
الجواب ومن اللہ تعالیٰ التوفیق والسداد ۴۲۰
شریعت کی نظر میں اراقۂ دم بھی ایک قسم کی قربت ہے ۴۲۱
ایک حصہ قربانی میں صرف ایک ہی آدمی شریک ہو سکتا ہے ۴۲۱

اگر کسی کا حصہ ساتویں حصہ سے کم ہو تو شرعاً وہ قربانی صحیح نہیں ہوگی ۴۲۲
مجوزین حضرات دو طریقوں سے استدلال کرتے ہیں ۴۲۳
حدیثِ بالا کا جواب ۴۲۳
مجوزین حضرات کا عبارتِ شامیہ سے استدلال کرنا ۴۲۴
منت کی قربانی میں عقیقہ کا حصہ لینا درست نہیں ۴۲۶
قربانی کے جانوروں کے بچے کے احکام ۴۲۷
حرام مغز کے بارے میں امام طحطاویؒ سمیت دیگر فقہائے کرام کے اقوال اور ہماری رائے ۴۲۸
طیبات اور خبائث کی تفسیر ۴۳۰
فقہ و فتاویٰ کی روشنی میں حلال جانوروں کے حرام اجزاء ۴۳۲
خلاصۂ بحث اور جوابِ استفتاء ۴۳۴
کِتَابُ التَّدَاوِی ۴۳۵
علاج و تداوی کے بارے میں چند مسائل کی تحقیق ۴۳۵
الجواب بعون اللہ تعالیٰ وتوفیقہ ۴۴۶
مرد ڈاکٹر کیلئے عورت کا اور ڈاکٹر عورت کیلئے مرد کا علاج کرنا ۴۴۸

☆☆☆

گرامی قدر

حضرت مولانا مفتی عبدالسلام صاحب

جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی۔

آپ سے گذارش ہے کہ اسلامی معیشت پر آپ نے جو مضمون لکھنا شروع کیا ہے زمانہ اور حالات کے لحاظ سے بہت ہی ضروری ہے اور اس وقت میرے نزدیک کاروباری لائن میں اس سے بہتر کوئی دینی خدمت نہیں ہوسکتی۔ خدا کرے یہ مضمون ہماری تاجر برادری کے لئے مشعل راہ ثابت ہو اور آپ کو اسے پورا کرنے کی توفیق دے۔ کچھ عرصہ سے مضمون کا تسلسل رک گیا ہے آپ سے درخواست ہے کہ دوبارہ اس کو جاری فرمائیں، اس سے عوام طبقہ کو اور بے شمار کاروباری لوگوں کو فائدہ پہنچا ہے۔

(۱) اس سلسلہ میں بندہ کی چند گذارشات یہ بھی ہیں کہ جن حرام اور ممنوع اشیاء کی تجارت شرعاً حرام ہے موٹی موٹی چند چیزوں کا ذکر فرمادیں اور دلائل کے ساتھ ہونا بہتر رہے گا۔

(۲) خاص طور پر شراب، جواء، سود، فوٹو گرافی یا تصویر سازی وغیرہ اور اخیر میں چند تجارتی اصول بھی تحریر فرمادیں تا کہ کوئی مسلمان اگر شریعت کے اصول میں رہ کر تجارت کرنا چاہے اس کے لئے مشکلات پیش نہ آئیں۔

(۳) اور ایک چیز یہ کہ جن لوگوں کے پاس حرام آمدنی جمع ہوگئی ہے حلال آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے یا نہ ہونے کے برابر ہے وہ کیا کریں آپ سے مجھے توقع ہے کہ ان مسائل پر تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔

آپ کا خادم احمد شفیع

نارتھ ناظم آباد کراچی

الجواب باسمہ تعالیٰ

ہماری تجارت اور حرام اشیاء

واضح ہو کہ اسلام نے تمام حرام اور ناپاک اشیاء کا استعمال اور اس کی خرید وفروخت کو حرام قرار دیا ہے جبکہ ایام جاہلیت یعنی اسلام سے قبل بہت سی حرام اشیاء کی خرید وفروخت اور ان کا کاروبار جائز تھا لیکن اسلام آنے کے بعد بے شمار خرابیوں اور فتنے وفساد کو ختم کرنے کی غرض سے انہیں ناجائز قرار دیا اور مسلمانوں کے لئے ایک صحت مند اور صالح معاشرہ کا انتظام کرتے ہوئے ان تمام گندی اور نجس اشیاء کو

حرام قرار دیا ہے جن سے معاشرہ میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو سکتا ہے اور ایسی اشیاء کی خرید و فروخت و تجارت کو ممنوع قرار دیا ہے تاکہ سلسلۂ فتنہ و فساد ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ مثلاً شراب، جوا، خنزیر، مردار جانور اور اس کے اجزاء، خون، تمام جاندار کی تصاویر، بت گری جیسی نجس گندی چیزیں ہیں ان اشیاء کا جب استعمال ناجائز ہے تو ان کی تجارت بھی ناجائز و حرام ہے۔

ان میں سے سب سے پہلے شراب اور اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

شراب اور ہماری معیشت

ہر مسلمان کو یہ جاننا ضروری ہے کہ ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب سے متعلق آیات حرمت اترنے کے بعد شہر شہر، گاؤں گاؤں بلکہ گلی گلی میں اس کا اعلان کروا دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب کو حرام قرار دیا ہے، اب نہ اس کا استعمال جائز و حلال ہے نہ اس کی تجارت جائز ہے۔ غرض کہ آپ نے شراب کو انسانی ضرورت اور معیشت میں سے قطعی اور کلی طور پر نکال دیا تھا۔ لیکن نہایت ہی افسوس کی بات ہے کہ دوسری برائیوں کی طرح ہماری معیشت میں شراب نوشی اور ہماری تجارت میں شراب کی خرید و فروخت پھر سے داخل ہو گئی ہے۔

صحابہ کرامؓ نے شراب بنانا، رکھنا، پینا، پلانا اور اس کی خرید و فروخت سب کچھ بند کر دیئے تھے اور زمانہ دراز تک اس پر عمل ہوتا رہا ہے۔

لیکن جب سے ہمارے ایمان میں کمزوری آ گئی اور ہمارے سروں سے اسلامی حکومت کا سایہ ختم ہو گیا اور ہمارے اندر بے ایمانی داخل ہو گئی، ہمارے دلوں میں نفاق نے جگہ لے لی۔ اس وقت سے دوسری برائیوں کی طرح شراب کا پینا، پلانا، اس کی تجارت ہمارے یہاں عام ہو گئی اور اس برائی میں مبتلا لوگوں میں سے ایک بڑا طبقہ لکھے پڑھے لوگوں کا ہے جو کہ مسلمان تو ہیں لیکن اسلام کے تقاضوں کو پورا کرنے والے نہیں ہیں بلکہ احکام اسلام سے دور بھاگنے کی وجہ سے ان لوگوں میں دینی حمیت اور غیرت باقی نہیں رہی اور ان پر شیطان مسلط ہو گیا ہے اور شیطانی اثرات غالب آنے لگے ہیں جبکہ اس میں مبتلا لوگوں میں بے شمار ایسے لوگ بھی ہیں جو کہ لکھے پڑھے نہیں ہیں، بلکہ انجان اور دینی علوم سے بالکل ناواقف ہیں۔ یہ لوگ شراب نوشی اور اس کے استعمال اور خرید و فروخت میں شیطان اور اس کی ذرّیات کے حامی و ناصر بنے ہوئے ہیں۔ اس واسطے بندہ نے ضروری سمجھا کہ شراب کے سلسلہ میں قرآن و حدیث کے کچھ احکام لکھ دوں تاکہ پڑھے لکھے طبقہ کے لئے نصیحت اور تذکیر ہو جائے اور بے پڑھے لوگوں کے سامنے شراب کے

متعلق احکام ومسائل واضح ہوجائیں اور اللہ ورسول کی جانب سے اتمام حجت ہوجائے کہ بروز قیامت کوئی شخص یہ نہ کہے کہ شراب اور اس کے احکام کے بارے میں ہمیں کسی نے بتایا نہیں تھا۔ ہم بے خبر اور بے شعور تھے اور ہم معاشرہ کے برے ماحول سے متاثر اور مجبور تھے۔

شراب کی حرمت قرآن وحدیث میں

حق جل جلالہٗ کا ارشاد ہے:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطَانُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ.

اے ایمان والو! بلاشبہ شراب، جوا، اور بت اور جوئے کے تیر یہ سب نجس ہیں، شیطانی عمل میں سے ہیں۔ سو ان چیزوں سے دور رہا کرو تا کہ تمہیں فلاح ملے۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ تمہارے آپس میں بغض اور عداوت پیدا کردے اور اللہ کی یاد سے اور نماز سے تم کو باز رکھے۔ سو کیا تو باز آؤ گے۔ (مائدہ ۹۰ و ۹۱)

آیاتِ مذکورہ میں شراب، جوئے، بت، جوئے کے تیر کو نجس اور شیطانی کام بتایا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں گندی ہیں، انسانی معیشت کے لئے مناسب اور حلال نہیں ہے اور یہ چیزیں شیطانی عمل ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہیں۔ مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ شیطان اور شیطانی عمل سے دور رہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں، اس واسطے اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا اشیاء کو حرام فرمایا ہے۔ چنانچہ آیات مذکورہ کی تشریح فرماتے ہوئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

عن ابی سعید الخدری رضی اللّٰه عنه قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ان اللّٰه تعالیٰ حرم الخمر فمن ادرکته هذهٖ الآیة وعنده منها شئ فلایشرب ولایبع قال فاستقبل الناس بما کان عندهم منها فی طریق المدینة فسفکوها.

(مسلم ص ۲۲، ج ۲)

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ شراب کو

اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے جس کے پاس شراب ہو اور اس کو حرمت کی آیت پہنچ جائے تو وہ نہ شراب پیے نہ شراب کو بیچے۔ ابو سعید خدریؓ نے کہا جن لوگوں کے پاس شراب تھی وہ ان کو مدینہ کے راستے پر لائے اور بہا دیا۔

دوسری حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد منقول ہے:

عن عائشةؓ قالت لما نزلت الأيات من آخر سورة البقرة خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم وقرأها على الناس ثم نهىٰ عن التجارة فى الخمر.

(مسلم شریف ص ۲۳، ج ۲)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب سورۂ بقرہ کی آخری آیات اتری تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور وہ آیتیں پڑھ کر لوگوں میں سنائیں اور منع کیا ان کو شراب کے کاروبار سے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور حدیث ملاحظہ فرمائیے۔

عن عائشةؓ قالت لما نزلت الأيات من آخر سورة البقرة فى الرّبا قالت خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم الى المسجد فحرّم التجارة فى الخمر.

(مسلم ص ۲۳، ج ۲)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب سورۂ بقرہ کی آیات ربا (سود) نازل ہوئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے اور قرآن کی آیات لوگوں کو پڑھ کر سنائیں۔ پھر آپ نے شراب کی تجارت کا بھی حرام ہونا بیان فرمایا۔

یہاں پر آیات ربوا اور شراب کی تجارت حرام ہونے کو بیک وقت ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ امر واضح کر دیا جائے کہ تجارت میں ربوا کا معاملہ جس طرح ناجائز و حرام ہے اس طرح شراب کی تجارت بھی ناجائز و حرام ہے۔ شراب کا حرام ہونا اور اس کی تجارت ناجائز ہونا صحابہ کرام کو تو پہلے سے معلوم تھا لیکن آیت ربا اور اس کے حکم کے ساتھ شراب کی تجارت کے بارے میں تاکیداً فرمادیا ہے کہ دیکھو! سود کے معاملہ کی طرح شراب کا معاملہ بھی ناجائز و حرام ہے لہٰذا جس طرح سود کے کاروبار سے بچنا بہت ضروری ہے اسی طرح شراب کے کاروبار سے بھی قطعی طور پر بچنا ضروری ہے۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی چوتھی حدیث ملاحظہ فرمائیے۔

عن جابر بن عبدالله انه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول عام الفتح وهو بمكة ان الله و رسوله حرّم بيع الخمر والميتة والخنزير والاصنام فقيل يا

رسول اللّٰہ أرئیت شحوم المیتة فانها یطلی بها السفن ویدهن بها الجلود ویستصبح بها الناس فقال لاهو حرام ثم قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم عند ذالک قاتل اللّٰہ الیهود، ان اللّٰہ لما حرم علیهم شحومها أجملوه فاکلوا ثمنه کذا عن ابی هریرة. (مسلم شریف ص ۲۳، ج ۲)

جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے فتح مکہ کے موقع پر بیان فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے شراب، مردے، خنزیر، بتوں کی خرید و فروخت کو حرام قرار دیا ہے۔ آپ سے پوچھا گیا یا رسول اللہ! مردار کی چربی کے بارے میں کیا حکم ہے جبکہ اسے کشتیوں میں لگایا جاتا ہے اور کھالوں میں ملی جاتی ہے اور لوگ اس سے چراغ روشن کرتے ہیں یعنی اس سے چراغ جلاتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں، وہ حرام ہے اور آپ نے مزید فرمایا کہ ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہود کو ہلاک کیا ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے چربی کو حرام قرار دیا ہے (یعنی اس کا کھانا) پھر انہوں نے اس کو پگھلایا پھر بیچ کر اس کی قیمت کھالی، یعنی انہوں نے تو چربی کو نہیں کھایا لیکن اس کی قیمت کام میں لائے جس کو اللہ تعالیٰ نے ناپسند فرمایا اور ان پر عذاب نازل فرما کر انہیں ہلاک کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ مرادر کا کھانا جس طرح جائز نہیں ہے اس کو بیچ کر پیسہ کھانا یہ بھی جائز نہیں ہے۔

غرض یہ کہ آیات قرآنی اور احادیث مذکورہ سے معلوم ہوا کہ شراب اور جوئے گندی چیزیں ہیں اور شیطانی عمل ہیں، خاص کر شراب کے استعمال اور اس کی تجارت میں بے شمار دینی و دنیوی نقصانات ہیں۔ چند ایک نقصانات یہاں پر ملاحظہ فرمائیے۔

شراب پینے کے نقصانات

☆ شراب کے استعمال پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی ہوتی ہے۔

☆ شراب پینے والے پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ناراض ہوتے ہیں اور ان پر لعنت کرتے ہیں۔

☆ حدیث میں شراب کو اُمّ الخبائث کہا گیا ہے۔

☆ حدیث میں کہا گیا ہے کہ شراب کا پینا اور ایمان دونوں امر جمع نہیں ہوسکتے

☆ حدیث میں ہے شرابی ایسا ہے جیسا بت پرست۔ (ابن ماجه، ابن حبان، بزار، حاکم)

☆ شراب اُمّ الفواحش ہے، یعنی جو شراب پیتا ہے گویا تمام فحش حرکتوں کا ارتکاب کرتا ہے۔
☆ شراب پینا سب کبیرہ گناہوں سے بڑھ کر ہے کیونکہ شرابی اسی حالت میں ماں، خالہ، بہن کے ساتھ ناجائز حرکت کرسکتا ہے۔
☆ شراب کو تمام گناہوں کی بنیاد اور جڑ قرار دیا گیا ہے۔
☆ شراب تمام گناہوں کے دروازے کی چابی ہے۔
☆ شراب ہر برائی کی چابی ہے۔
☆ شراب پینے والے کی چالیس دن کی نماز قبول نہیں ہوتی۔ پھر جب شراب پیتا ہے پھر چالیس روز تک نماز قبول نہیں ہوتی پھر شراب پیتا ہے تو چالیس روز تک نماز قبول نہیں ہوتی۔ (ترمذی)
☆ دنیا میں جس نے شراب پی اور بغیر توبہ کے مرا تو آخرت میں وہ شراب سے محروم رہے گا جنت میں نہیں جائے گا۔ (مؤطا مالک)
☆ شراب پینے کے بعد آدمی دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ دماغی خرابی کی وجہ سے لوگوں سے فساد کرتا ہے۔ بیوی بچوں بڑے اور چھوٹوں کے ساتھ وہ حرکات کرتا ہے جو کہ عام حالات میں وہ ناجائز سمجھتا ہے۔
☆ کسی کو گالی دیتا ہے۔
☆ اور کسی کو مارتا ہے۔
☆ کبھی گناہ کی باتیں کرتا ہے تو کبھی کفر بکتا ہے۔
☆ بعض دفعہ بیوی کو طلاق دے بیٹھتا ہے۔ اس طرح کی بے شمار برائیوں کا ارتکاب کرنے لگتا ہے۔
☆ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے لڑتا جھگڑتا ہے جس کی بنا پر خاندان میں ناچاقی پیدا ہو جاتی ہے۔ میاں بیوی کے درمیان تفریق ہو جاتی ہے۔
☆ اور ایسے لوگ نہ نماز کی پابندی کرتے ہیں نہ دوسری عبادات کی۔ دیکھئے شراب میں کتنی مضرتیں اور نقصانات ہیں۔ انہیں باتوں کی بنیاد پر پہلے ہی سے اللہ تعالیٰ نے مطلع کر دیا ہے کہ:
☆ شراب اور جوئے یہ چیزیں باہمی عداوت اور بغض کا سبب بنتی ہیں۔
☆ یہ سب شیطانی اعمال ہیں انہیں چیزوں کے ذریعہ سے شیطان تمہارے درمیان آپس میں دشمنی پیدا کر دیتا ہے اور تمہیں اللہ کے ذکر، نماز اور عبادات سے روکتا ہے۔
☆ دوسری جسمانی خرابیاں الگ ہیں۔

جب یہ تمام خرابیاں شراب میں موجود ہیں تو بعض معمولی فائدے کی خاطر اتنے نقصانات کو برداشت کرنا کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مذکورہ برائیوں کے علم ہو جانے کے بعد ''کیا تم شراب سے باز آؤ گے؟'' جس کے جواب میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ''انتھینا'' ''انتھینا'' یعنی ہم اس سے باز آ گئے۔ ہم اس سے باز آ گئے۔

اور حضرت صحابۂ کرامؓ نے اپنے پاس جتنی شرابیں تھیں اور جتنے مٹکے شراب کے تھے سب کے سب کو ناپاک اور گندے پانی کی طرح مدینہ کی گلیوں میں، سڑکوں میں بہا دیئے۔ یہ تھا رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی حیثیت اور اس کا نظارہ، اور پھر صحابۂ کرام کا ایمان اور اس کے اثرات۔

کیا ہمارے زمانہ کے مسلمان ایماندار نہیں ہیں۔ کیا ہم اسلام کا دعویٰ نہیں کرتے۔ جب ہمیں ایمان و اسلام کا دعویٰ ہے اور سب سے زیادہ ہے تو عمل بھی تو اس کے مطابق کرنا چاہیئے تو پھر ہم شراب کی کشید کیوں کرتے ہیں؟ شراب کی دکان کیوں لگاتے ہیں؟ علانیۃً یا خفیۃً شراب کا کاروبار کیونکہ کرتے ہیں؟ محافل و مجالس کو شراب سے مزین کیوں کرتے ہیں۔ شراب کی درآمد و برآمد کیوں کرتے ہیں۔ کیا اس سے ہمارا ایمان ضائع نہیں ہوتا اور اعمال خراب نہیں ہوتے معاشرہ میں بگاڑ پیدا نہیں ہوتا؟ بڑے غور وفکر کی بات ہے اور عبرت کا مقام ہے۔

غرض بے شمار مفاسد اور برائیوں کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب اور اس کی تجارت کو حرام قرار دیا ہے۔ قرآن وحدیث کی رو سے شراب کے متعلق مزید جو فقہی احکام جاننا ضروری ہیں وہ یہ ہیں۔

☆ شراب کو حرام جاننا ایمان ہے اور اس کا انکار کرنا کفر ہے۔

☆ اور گناہ وحرام سمجھتے ہوئے اس کا استعمال فسق ومعصیت ہے اور اس پر پوری امت کا اجماع ہے لہٰذا شراب پینا حرام ہے خواہ زیادہ ہو یا کم۔ شراب پینے پر اگر ثبوت، گواہ، اقرار یا قرائن قویہ وعلامت ظاہرہ پائی جائے تو شرابی پر حد قائم کی جاتی ہے۔

☆ شراب کی کشید یعنی تیار کرنا بھی حرام ہے جو یہ کام کرتا ہے وہ تعزیر کا مستحق ہے۔

☆ شراب کی خرید وفروخت حرام ہے، ممنوع ہے۔ اس کے فروخت کرنے اور خریدنے پر بھی تعزیر ہو سکتی ہے۔

☆ شراب پیشاب کی طرح نجس اور ناپاک ہے۔ اگر کپڑے میں یا بدن میں لگ جاوے تو کپڑا اور بدن ناپاک ہو جاتے ہیں اس کا دھونا فرض ہو جاتا ہے۔

☆ اور جس جگہ پر بھی شراب لگ جائے وہ جگہ ناپاک ہو جاتی ہے۔ نماز کے لئے اس جگہ کو دھونا فرض ہو جاتا ہے۔

☆ شراب کو حلال جاننے والا کافر ہو جاتا ہے۔ اس پر تجدید ایمان اور تجدید نکاح لازم ہو جاتی ہے۔

☆ شراب کی کوئی مالیت یا قیمت مسلمان کے حق میں نہیں ہے۔ اس لئے کسی مسلمان کے پاس اگر شراب ہے تو اس کو ضائع کرنے سے اور غصب کرنے سے ضمان نہیں آتا۔

☆ شراب فروخت کرنے کے بعد جو قیمت ملے گی وہ بھی حرام ہے۔ اس کو کسی نقد یا اجناس سے تبدیل کرنے کے بعد بھی شئی مبدل حرام ہے۔

☆ شراب سے انتفاع حاصل کرنا جبکہ وہ شراب کی حالت میں ہے حرام ہے۔

☆ شراب سے ملی ہوئی دوا کی تجارت اور اس کا استعمال بھی حرام ہے۔ مگر یہ کہ کوئی مریض مضطر اور مجبور ہو اور اس کے لئے ماہر ڈاکٹروں نے شراب والی دوا تجویز کی ہو اور اس کے علاوہ اس کی بیماری کے لئے کوئی پاک اور حلال دوا موجود نہ ہو پھر بوجہ مجبوری جب تک ضرورت ہے مباح ہے۔

☆ اسی طرح کوئی شخص فاقہ میں ہے اس کو جان کا خطرہ ہے تو اس وقت اگر شراب یا کسی حرام چیز سے جان بچانا ممکن ہے تو شراب یا کسی حرام چیز کو استعمال کر کے جان بچانا ضروری ہے یہ تو خالص شراب اور اس سے ملی ہوئی اشیاء کا حکم ہے لیکن دواؤں میں خالص شراب یعنی انگور، کشمش، منقا، کھجور کے علاوہ دوسری چیزوں سے حاصل شدہ الکحل کا حکم ایسا نہیں ہے بلکہ اس میں تفصیل یہ ہے کہ اس میں اگر مقدار مسکر ہو تو حرام ہے یعنی جس مقدار سے نشہ ہو حرام ہے اس سے کم مقدار ہو تو حرام نہیں ہے۔

☆ شراب کو اگر نمک یا دوسری چیز ڈال کر سرکہ بنالیا ہے تو پھر اس کی حرمت جاتی رہے گی۔

☆ ہر نشہ آور اشیاء ہیروئن وغیرہ حرام ہے موجب تعزیر ہے۔

☆ شراب کی دکان میں ملازمت اختیار کرنا بھی حرام ہے۔

☆ شراب کی تجارت درآمد، برآمد، مسلمانوں کے لئے حرام ہے۔

☆ شراب خود نہ پیتا ہو لیکن دوسرے کو پیش کرتا ہو یہ بھی حرام ہے۔

☆ شراب اگر کسی نے ہدیۃً دی ہے اس کا لینا اور فروخت کر کے پیسے حاصل بھی حرام ہے جیسا کہ امام محمدؒ نے "کتاب الآثار" میں نقل کیا ہے کہ کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شراب کی حرمت کے بعد شراب کو ہدیۃً بھیجا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب شراب حرام ہو گئی ہے۔ تم اپنی شراب لے

جاؤ۔ اس نے کہا آپ اسے بیچ کر ضروریات میں استعمال کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے شراب پینے کو حرام کیا ہے اس نے اس کو فروخت کر کے اس کے دام کو استعمال کرنے کو بھی حرام کیا ہے (کتاب آلآثار امام محمد)

شراب سے متعلق دس آدمیوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے۔

(۱) شراب بنانے والے پر۔

(۲) پینے والے پر۔

(۳) پلانے والے پر

(۴) نگرانی کرنے والے پر۔

(۵) اٹھا کر لے جانے اور پہنچانے والے پر۔

(۶) جس کی طرف لیجائی جارہی ہے اس پر۔

(۷) اس کو فروخت کرنے والے اور فروخت کنندہ کے وکیل پر۔

(۸) خریدنے والے اور اس کے وکیل پر۔

(۹) شراب پر۔

(۱۰) شراب کے ذریعے جو آمدنی حاصل ہوئی اس کو استعمال کرنیوالے پر۔

چنانچہ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ سے روایت ہے۔

عن ابن عمر عن ابيه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لعن الخمر وعاصرها ومعتصرها وبائعها ومبتاعها وحاملها والمحمولة اليه. وساقيها وشاربها واكل ثمنها. (شعب الايمان ص ۹، ج. ۵)

ابن عمرؓ سے روایت ہے وہ اپنے باپ عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب پر، کشید کرنے والے پر، جن کے لئے کشید کی گئی اس پر، اس کو فروخت کرنے والے پر، خریدنے والے پر، اٹھانے والے پر، جن کی طرف شراب لے جائی جارہی ہے اس پر، پلانے والے پر، پینے والے پر، شراب کی آمدنی استعمال کرنے والے پر لعنت بھیجی ہے۔

ایک اور روایت میں ہے:

عن ابی مالک الاشعریؓ صاحب رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ليشربنّ ناس من امّتى الخمر يسمونها بغير اسمها ويضرب علىٰ رئوسهم

المعازف والمغنیات یخسف اللہ بھم الارض ویجعل منھم القردۃ والخنازیر.

(شعب الایمان ص ۱۷، ج. ۵)

ابو مالک اشعری صحابی رسول نے رسول اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان فرمائی ہے کہ میری امت میں سے کچھ لوگ شراب پئیں گے اور شراب کو دوسرا نام دیں گے اور ان کے سامنے ناچنے اور گانے والی عورتیں ہوں گی ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ زمین میں دھنسا دیں گے یا ان کو بندر وخنزیر بنا دیں گے۔

مذکورہ بالا احادیث میں شراب کی جو برائیاں اور اس کے جو نتائج اور انجام بیان کیا گیا ہے بہت ہی بُرا ہے۔ اور ان وعید ودھمکی میں ہر وہ شخص آتا ہے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے لہٰذا بڑی عبرت اور سبق لینے کی بات ہے۔ بعض سرکاری اداروں میں اس کو کھلے عام فروخت کیا جاتا ہے اور لوگ خریدتے ہیں بلا تمیز اس کے کہ وہ مسلمان ہے یا غیر مسلم، مثلاً ہوائی جہاز اور پانی کے جہازوں میں سفر کے دوران، اس طرح اہم اور بڑے بڑے ہوٹلوں میں شراب کی خرید وفروخت عموماً ہوتی ہے۔ یہ بہت ہی افسوس ناک بات ہے اللہ تعالیٰ عذاب سے بچائیں اور ایسے لوگوں کو توبہ نصیب فرمائیں۔

اگر غیر مسلم مسافروں کے لئے اس کی ضرورت ہے تو غیر مسلم دکاندار کو اس کے خرید وفروخت کی اجازت دی جاسکتی ہے لیکن مسلمانوں کی حکومت کے لئے اور مسلمان کے لئے اس کی خرید وفروخت قطعاً ناجائز اور حرام ہے لیکن معلوم نہیں ہماری حکومت اس طرف کیوں توجہ نہیں دیتی۔

قمار یعنی جوا اور ہماری معیشت

یہ حقیقت تقریباً اکثر وبیشتر مسلمانوں کے سامنے واضح ہے کہ ایام جاہلیت میں دوسری برائیوں کی طرح قمار بازی کا سلسلہ بھی رہا ہے۔ اوباش اور عیار لوگوں کے ذرائع آمدنی میں سے دوسرے کا مال بلا محنت حاصل کرنے کا ایک طریقہ جوئے کا کاروبار بھی ہوتا تھا۔ پھر جب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور قانون اسلام کی بنیادی کتاب قرآن کریم کا نزول شروع ہوا تو جس طرح دوسرے معاملات اور مسائل کی اصلاحات ہوئیں، اس طرح ناجائز ذرائع آمدنی میں سے مبغوض ترین طریقہ، قمار بازی اور جوئے کے ذریعہ دوسرے کا مال لوٹنے کا رواج، اور رسم کو بھی ختم کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ حق جل شانہٗ نے سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۹۰ میں ہر قسم کے جوئے کو حرام قرار دیا ہے۔ آیت اور اس کا ترجمہ اوپر گذر چکا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے قمار بازی اور جوئے کے معاملات کو نہ صرف حرام قرار دیا ہے بلکہ اس کو

انسانی معیشت کے لئے نہایت ہی گندا اور شیطانی عمل قرار دیا ہے، اور حکم دیا گیا کہ اگر تم لوگ اپنی اور معاشرہ کی فلاح اور صلاح چاہتے ہو تو شراب، جوئے کے کاروبار کو کلیۃً چھوڑ دو۔ نیز واضح ہو کہ میسر میں ہر قسم کی قمار بازی داخل ہے چنانچہ ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ جو کہ فقہائے صحابہ میں سے ہیں فرماتے ہیں "کل القمار میسر" ہر قسم کی قمار بازی جوئے میں۔ "المیسر القمار" میسر قمار ہی ہے۔

مجاہد نے ابن عمر سے روایت کی ہے۔

المیسر القمار کله حتی الجوز الذی یلعب به الصبیان.

(درمنثور ص ۱۶۸، ج ۳)

ہر قسم کی قمار بازی میسر ہیں یہاں تک کہ بچوں کا کھیل لکڑی کے گٹکوں اور اخروٹ وغیرہ کے ساتھ بھی۔

حضرت علی بن ابی طالبؓ سے روایت ہے۔

النرد والشطرنج من المیسر. (درمنثور ص ۱۶۸، ج ۳)

نرد اور شطرنج جو کہ مختلف کھیلوں کا نام ہے جوئے میں سے ہیں۔

امام محمد صاحبؒ سے سوال کیا گیا ہے کیا نرد کا کھیل میسر میں داخل ہے؟ آپ نے فرمایا:

کل ماألھی عن ذکر اللہ وعن الصلاۃ فھو میسر. (درمنثور ص ۱۶۸، ج ۳)

ہر وہ کھیل جو کہ نماز اور اللہ کی یاد سے غافل بنا دیتی ہے وہ جوئے ہیں۔

جس سے معلوم ہوا کہ قمار بازی کی جتنی اقسام ہیں سب کے سب میسر اور جوئے میں داخل ہیں۔

لفظ میسر کی حقیقت

صاحب احکام القرآن الجصاص فرماتے ہیں:

وحقیقتهٔ تملیک المال علی المخاطرة. (ص ۴۶۵، ج ۲)

میسر کی حقیقت یہ ہے کہ ایسا معاملہ کیا جائے جو نفع ونقصان کے خطرے کی بنیاد پر کیا جائے۔

یعنی یہ بھی احتمال ہو کہ بہت سارا مال مل جائے گا اور یہ بھی احتمال ہے کہ کچھ نہ ملے گا بلکہ اصل بھی ضائع ہونے کا خطرہ ہو، یا اصل تو باقی ہو لیکن منافع کچھ نہیں جیسا کہ آج کل بیشتر لاٹریوں میں ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ جس معاملہ میں مخاطرہ ہے یعنی اس میں نفع ونقصان کے خطرے کی بنیاد پر اس کو معلق کیا گیا ہے وہ شرعاً میسر اور قمار ہے اس لئے ناجائز ہے۔

دوسرا قاعدہ: تمام اہل علم کے درمیان اس میں اتفاق ہے کہ میسر اور قمار کے جملہ اقسام حرام ہیں۔
چنانچہ احکام القرآن جصاص میں ہے:

ولا خلاف بین اهل العلم فی تحریم القمار. (ص ۳۲۹، ج ۱)

تمام اہل علم کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ قمار اور جوا حرام ہے

تیسرا قاعدہ: ہر معاملۂ مخاطرہ قمار میں داخل ہے۔
چنانچہ احکام القرآن جصاص میں ہے۔

ولاخلاف ایضاً ان المخاطرة من القمار. (ص ۳۲۹، ج ۱)

اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ نفع ونقصان کے خطرے کی بنیاد پر جو معاملہ کیا جائے وہ قمار میں سے ہے اور جوا ہے جو کہ ناجائز ہے۔

چوتھا قاعدہ: مخاطرہ کے مختلف معاملات جاہلیت میں رائج اور جائز تھے اسلام نے اس زمانہ میں رائج قمار کے ساتھ ہر قسم کی قمار بازی کو حرام قرار دیا ہے۔
چنانچہ احکام القرآن میں ہے۔

وان اهل الجاهلیة کانو ایخاطرون علی المال والزوج وقد کان ذالک مباحاً الیٰ ان ورد تحریمه. (ص ۳۲۹، ج ۱)

اور یہ کہ ایام جاہلیت کے لوگ مال اور بیوی پر قمار بازی کا معاملہ کرتے تھے اور اس زمانہ میں یہ سب معاملات جائز تھے یہاں تک کہ اس پر حرام ہونے کا حکم نازل ہوا۔

تشریح: یعنی ہار جیت کے تحت یوں معاملہ ہوتا تھا کہ فلاں کام کرتے ہیں جو بھی جیتے گا اس کا ہارنے والا اتنی رقم ادا کرے گا یا جو بھی جیتے گا جیتنے والے کو ہارنے والا اپنی بیوی حوالہ کرے گا۔

چونکہ یہ معاملات ایسی ایک شرط یعنی جیتنے یا ہارنے کی بنیاد پر دائر ہوتے تھے، نفع اور نقصان اسی شرط پر موقوف ہوتے تھے، ہر فریق کو نفع کی امید ہونے کے ساتھ ساتھ نقصان کا بھی خطرہ ہوتا تھا اور اس میں دھوکہ غرر اور دوسرے مفاسد ہوتے تھے اس لئے شریعت نے اس طرح کے تمام معاملات کو حرام قرار دیا ہے۔ اسی وجہ سے شریعت نے خرید وفروخت کے یا ہبہ، وصدقہ کے جن عقد معاملات کی اجازت دی ہے ان میں ہر اس شرط کو باطل قرار دیا جو مخاطرہ پر مبنی ہو مثلاً اس بیع کو فاسد قرار دیا ہے جس میں بائع مشتری سے یہ کہے میں نے یہ چیز تمہیں اس شرط پر فروخت کی کہ فلاں آدمی باہر ملک سے واپس آوے یا فلاں آدمی ملک سے باہر چلا جاوے۔

یا میں نے فلاں چیز تمہیں ہبہ یا صدقہ کردی اس شرط پر کہ بارش ہوجائے وغیرہ احکام القرآن جصاص میں تفصیلات موجود ہیں۔ (ص ۴۶۵، ج۲)

شریعت نے قرعہ اندازی کی ہر اس صورت کو حرام قرار دیا ہے جس میں ایک شخص کسی چیز کے مالک بننے کا استحقاق نہیں رکھتا پھر بھی وہ قرعہ اندزی کی بنا پر اس کا حق دار بن جاوے اور دوسرا جو نقصان قبول کرنے کا پابند نہیں ہے لیکن قرعہ اندازی کی بناء پر وہ نقصان پذیر ہوجائے مثلاً ایک شخص کسی کمپنی میں دس روپیہ اس لئے جمع کرتا ہے کہ اسے قرعہ اندازی میں نام آنے پر ایک لاکھ روپے مل جائیں۔ شرعاً یہ معاملہ جائز نہیں ہے کیونکہ دس روپے والا آدمی کمپنی سے دس روپیہ وصول کرنے کا حق تو رکھتا ہے مگر ایک لاکھ روپیہ وصول کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ لہٰذا اگر وہ دس روپے کے بدلہ میں اس سے زائد رقم وصول کرنے کے ارادے اور قرعہ اندازی میں نام آنے کی امید سے رقم جمع کراتا ہے تو یہ معاملہ قمار بازی ہے جب تک قرعہ اندازی نہیں ہوتی معاملہ یوں پڑا رہا تو قمار اور مخاطرہ ہے، پھر قرعہ اندازی میں اگر نام نکل آیا اور اس کو دس روپے کے بدلہ میں ایک لاکھ روپے مل گئے تو یہ زائد رقم سود ہے کیونکہ شرعاً نقد رقم کا تبادلہ اگر نقد رقم سے ہو تو برابری کے ساتھ لین دین کرنا ضروری ہوتا ہے کمی وبیشی کے ساتھ لین دین ربوا اور سود ہے اس لئے اس طرح کی قرعہ اندازی کے ذریعہ رقم حاصل کرنا ناجائز ہے تو گویا قرعہ اندازی کے تحت رقم حاصل کرنے کی بنیاد پر جو معاملہ کیا گیا ہے اس میں جوا، سود دونوں چیزیں جمع ہوگئی ہیں۔

مختلف مسابقت یعنی بازی لگانے پر انعام کا حکم

مسابقہ بلا معاوضہ وبلا انعام خواہ انسان کے درمیان ہو یا جانوروں کے درمیان سواری کے ساتھ ہو یا پیادہ دوڑ میں، بغرض اصلاح بدن ہو یا فوجی وعسکری تعلیم وتربیت ہو جائز ہے بلکہ امام نوویؒ نے مستحب لکھا ہے۔ البتہ محض تماشہ اور کھیل مقصود ہو تو جائز نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مسابقۃ بالخیل یعنی گھوڑ دوڑ کرائی ہے۔ ابن عمرؓ نے بھی مسابقت خیل میں شرکت کی۔

لیکن مسابقت اگر عوض اور انعام کی شرط کے ساتھ ہے تو اس میں تفصیل ہے۔

(الف) مسابقت اور بازی لگانے والے فریقوں کے درمیان لین دین کی کوئی شرط نہ ہو بلکہ حکومت، یا کوئی جماعت یا انجمن یا تیسرا فرد بازی میں جیتنے والے کے لئے عوض اور انعام مقرر کرتا ہے تو یہ بھی جائز ہے۔

(ج) دوفریق باہمی شرط کے ساتھ مسابقت میں اس طرح حصّہ لیں کہ مثلاً زید اور عمر شرط لگائیں کہ جو آگے بڑھے گا اس کے لئے ہارنے والے پر ایک ہزار روپیہ لازم ہوگا تو یہ جائز نہیں، یہ قمار اور جوا ہے۔

(د) البتہ اس میں جواز کی ایک صورت یہ ہے کہ زید اور عمر اپنی مسابقت میں ان کے مساوی برابر ایک تیسرے آدمی بکر کو بھی گھوڑ دوڑ میں ملالیں زید وعمر میں سے اگر کوئی بازی میں جیتے گا اس کے لئے ایک ہزار دوسرے پر لازم ہوگا لیکن بکر اگر جیتے گا اس کے لئے کچھ واجب نہ ہوگا۔ غرض یہ کہ دو فریق یا چند فریق کے درمیان مسابقہ خواہ تقریر میں ہو یا مشاعرہ میں، گاڑی چلانے میں ہو یا جانوروں کے ساتھ بازی لگانے میں اگر مسابقت میں حصّہ لینے والے دونوں فریق یا چند فریق ہر جیتنے والے کے لئے عوض (انعام) دینے کی شرط رکھیں تو یہ مسابقت ناجائز ہے۔

مختلف انعامی بانڈز اور قمار بازی کے کاروبار

واضح ہو کہ یہ حقیقت ہے کہ زمانہ کی جدّت کے ساتھ ساتھ جس طرح ہر چیز کے اندر جدّت اور تبدیلی آرہی ہے اس طرح سود کا کاروبار، جوا، اور سٹہ کے کاروبار میں بھی خاص تبدیلیاں آگئی ہیں۔ لیکن ان کاروبار کے بنیادی عناصر کو دیکھا جائے تو ان کی اصلیت اور حقیقت وہی ہے جو سودی کاروبار اور قمار بازی میں ہوتی ہے۔

حدیث میں ہے کہ شیطان انسان کے خون اور رگوں میں دوڑتا ہے اور اس کو گمراہ کرنے کے لئے ہر ایسے حربے، طریقے اور راستے بتاتا ہے جس سے انسان راہِ راست سے ہٹ جائے، صراط مستقیم سے دور ہوجائے۔ ''ان الشیطان یجری مجری الدّم''

اور یہ بھی قرآن میں ہے کہ شیطان انسان اور جنوں میں سے ہوتا ہے، اور ہر حال میں ظاہری یا خفیے طریقے سے طرح طرح کے وسوسے ڈالتا ہے۔ شیطان اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوکر اور یہ کہہ کر کہ میں شیطان ہوں، دھوکہ نہیں دیتا بلکہ دلوں کے پاس جاکر شیطانی طریقے بتلاتا ہے۔

اور یہ بھی واضح رہے کہ شیطان جیسے صحیح عقائد اور ایمان سے ہٹانے کے لئے غلط اور باطل عقیدے کا سبق پڑھاتا ہے۔ اسی طرح اعمال میں بھی صحیح اعمال سے ہٹانے اور دور کرنے کے ارادے سے بھی غلط اعمال کو مزین اور خوشنما کرکے پیش کرتا ہے۔ حلال کو حرام بناکر اور حرام کو حلال کی صورت میں پیش کرتا ہے اور لوگوں کی توجہات اپنی جانب مائل کرنے کے لئے نئے نئے ناموں اور عنوانات سے گمراہی پھیلاتا ہے۔ مثلاً زیر بحث مسئلہ قمار بازی اور جوئے کی جملہ اقسام قرآن وسنت کی رو سے حرام ہیں۔ یہ

بالکل واضح ہے اس لئے شیطان کبھی یہ کہہ کر کہ قمار بازی اور جوئے کے کاروبار جائز ہیں مسلمانوں کے سامنے تو آنہیں سکتا تو اس نے سوچا اب اس کا نام بدل دیا جاوے، عنوانات بدل دیئے جائیں تو لوگوں کو دھوکہ دیا جاسکتا ہے، اس لئے اب تک قمار بازی کے معاملات میں جو نئے نام اور نئے عنوانات سے دھوکے دیئے جارہے ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) مختلف کمپنیوں اور حکومت کے اداروں کی جانب سے مختلف ناموں سے انعامی بانڈز کے ذریعہ سرمایہ بڑھانے کی اسکیم، اور قرعہ اندازی اور لاٹری کے ذریعہ سرمایہ کو تحفظ فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ امیر بنانے والے پروگرام ہیں۔

(۲) مختلف سرٹیفکیٹ، جن کو خریدنے پر اسکیم کے تحت ماہانہ منافع کے وعدے کے ساتھ ساتھ سہ ماہی، یا ششماہی قرعہ اندازی میں نام نکلنے پر لاکھوں سے ہزاروں روپے کے انعامات دینے کے اعلانات بھی شامل ہیں۔

(۳) مختلف اشیاء کے کاروبار کرنے والے دکاندار جو اپنے کاروبار کو چمکانے اور فروغ دینے کے لئے قسطوں میں اشیاء فروخت کرتے ہیں اور اس میں بھی بعض ناجائز شرائط لگانے کے علاوہ یہ بھی کرتے ہیں کہ اپنی دکان میں قسطیں جمع کرانے والوں کے نام قرعہ اندازی کرتے ہیں اور جن لوگوں کے نام آتے ہیں انہیں مختلف مقدار کی رقوم یا بمقدار رقم مختلف اشیاء ان کی رقم کے تناسب سے دیتے ہیں مثلاً جس شخص نے لاکھ روپیہ کی گاڑی خریدنے کے واسطے قسطیں جمع کرانا شروع کردیں اگر دو ایک قسط کے بعد اس کے نام لاکھ روپے کا انعام نکل آیا ہے تو یہ شخص مجاز ہوگا چاہے لاکھ روپے کی گاڑی وصول کرے، یا ایک لاکھ روپے وصول کرے، یا دوسری چیز اس سے کم قیمت کی خریدے بقیہ پیسے وصول کرے، یا زیادہ قیمت کی گاڑی خریدے ایک لاکھ سے زائد فرق دکاندار کو ادا کرے۔ غرض آگے اس کو معاہدہ کے تحت قسطیں ادا کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور قرعہ اندازی میں جن لوگوں کا نام نہیں آتا وہ آخری قسطیں جمع کرانے کے بعد چاہے تو وہ مطلوبہ چیز وصول کریں یا اپنی رقم واپس لے لیں۔

(۴) مختلف فرضی ادارے اور کمپنیوں کے شیرز کی خرید و فروخت اور اس میں منافع دینے کے اعلان، پھر قرعہ اندازی میں نام آنے پر لاکھوں سے لے کر ہزاروں تک کے انعامات دینے کی اسکیمیں۔ یہ اور ان جیسے تمام انعامی بانڈز اور قرعہ اندازی، لاٹری، معمے کے پروگرام، سب کاروبار، قمار بازی، جوئے اور سودی لین دین ہونے کی بنا پر قرآن وسنت کی رو سے ناجائز اور حرام ہیں۔ لیکن شیطان

اور اس کی اولاد نے چونکہ ہمارے ہوشیار اور چالاک تاجروں کو اور سادہ لوح مسلمانوں کو یہ سمجھا دیا ہے کہ قمار بازی کے کاروبار میں منافع اور فائدے دوسرے کاروبار کے مقابلہ میں چونکہ زیادہ ہیں لہٰذا انہیں کو اختیار کرنا مناسب ہے، پھر وہ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو بھی پامال کر دیتے ہیں۔ فَاِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن.

جوئے کے کاروبار میں فائدے کے شیطانی اعلانات

(۱) انعامی بانڈز اس طرح ان جیسی دوسری اسکیموں کے تحت کہ جن اسامی کے نام قرعہ اندازی میں نکل آتے ہیں وہ اگر جمع شدہ پانچ روپے سے لے کر ہزار روپے کے بدلہ میں لاکھوں روپے کما سکتے ہیں اس میں کیا حرج ہے جبکہ نقصان بالکل نظر نہیں آتا۔

(۲) پھر اگر قرعہ اندازی میں نام نہیں بھی آیا تو سرمایہ تو محفوظ ہے۔ دوسری یا تیسری یا کسی بھی قرعہ اندازی میں نام آنے کا امکان تو باقی رہتا ہے۔

(۳) انعام حاصل کرنے والا بدحال آدمی بلا محنت و مشقت معمولی رقم کے بدلہ میں یکدم خوشحال بن جاتا ہے۔ یہ بہت بڑا فائدہ ہے۔

(۴) انعام حاصل کرنے والا غریب آدمی جس کو امیر بننے کی خواہش تھی اپنے دیرانہ افلاس اور غربت کو ختم کر کے منٹوں میں امیر بن جاتا ہے۔

(۵) نیز انعامی بانڈز خریدنے پر حکومت کی جانب سے عائد کردہ انکم ٹیکس سے بچت ہو جاتی ہے۔ واضح رہے کہ قمار بازی اور جوئے کے یہ وہ فوائد اور منافع ہیں جو ہمارے زمانہ کے شیطان اور ان کے پیروکار لوگوں کو بتاتے ہیں۔

اب رہا کہ شیطان اور اس کے پیروکاروں کے ان خوشنما دھوکے اور ناپاک منصوبوں میں واقعی فائدے زیادہ ہیں یا نقصان زیادہ یہ تو آپ انشاء اللہ العزیز چند سطروں کے بعد ملاحظہ فرمائیں گے لیکن جب ہمارے خالق، مالک، رب العالمین نے قمار بازی اور اس کے جملہ اقسام کے بارے میں بتا دیا ہے کہ اس میں بعض منافع تو ہیں لیکن اس میں تمہارے نقصانات زیادہ ہیں اور یہ شیطانی عمل ہے اور تمہارے لئے حرام ہے پھر مسلمانوں کو کیا اختیار رہ جاتا ہے کہ اس میں صرف فائدے کی باتوں کو اچھالتے رہیں اور اس کے جواز کے لئے راہ تلاش کرتے پھریں اور شیطان کی طرفداری کریں۔ یہ تو کسی مسلمان کو ہرگز زیب نہیں دیتا۔

جوئے اور قمار بازی کے نقصانات

قرآن کریم کی آیت اور اس کی تشریح گذر چکی ہے اللہ رب العلمین نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ:

(۱) شراب اور قمار بازی سب گندے اعمال ہیں۔

(۲) شیطان کے کاروبار ہیں۔

(۳) انہیں امور کے ذریعہ شیطان تمہیں آپس میں لڑانا چاہتا ہے باہمی دشمنی اور عداوت پیدا کرنا چاہتا ہے۔

(۴) ان کے ذریعہ سے اللہ کے احکام اور اس کے ذکر اور نماز سے دور رکھنے کی سعی کرتا ہے اور اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابۂ کرامؓ نے اور ان کے بعد آئمہ مجتہدین نے جو نقصانات بتائے ہیں۔ وہ بھی ملاحظہ فرمالیں۔

☆ جوئے کے اندر یہ خرابی بھی ہے کہ اس میں دوسرے کا مال باطل اور ناجائز طریقے سے حاصل کیا جاتا ہے جو کہ ممنوع اور حرام ہے حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے۔

ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل.

یعنی دوسرے کا مال باطل اور غلط طریقے سے مت کھاؤ۔

☆ نیز حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان رجالا يتخوضون فى مال الغير بغير حق فلهم النار.

یعنی لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہوں گے جو دوسرے کا مال ناحق ہڑپ کر جاتے ہیں پس ان کے لئے جہنم کی آگ ہے۔

☆ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من قال لصاحبه تعال: أقامرک فليتصدّق.

(الزواجر عن اقتراف الكبائر ص ۱۹۸، ج. ۲)

جس نے اپنے ساتھی سے کہا آیئے تمہارے سے جوا کھیلتے ہیں پس اس کا کفارہ یہ ہے کہ کچھ صدقہ کردے۔

یعنی قمار بازی کی دعوت دینا بھی اتنا گناہ ہے کہ اس کے کفارہ کے لئے صدقہ کرنے کا حکم ہے اب

اندازہ کیجئے جو لوگ قمار بازی، جوا کے معاملے کو اپنے معاش اور زندگی کا کاروبار بنائے ہوئے ہیں ان کے لئے کیا حکم ہوگا۔

☆ حدیث میں ہے ان کی عبادت قبول نہیں ہوتی۔

☆ جوئے کا کاروبار نص قطعی، قرآن سے حرام ہے جو بھی اس کی حرمت سے انکار کرے گا وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ اگر توبہ نہیں کرتا تو ایسا شخص واجب القتل اور گردن زنی کا مستحق ہوتا ہے اور اس کی بیوی اس پر حرام ہو جاتی ہے۔

☆ اور جو لوگ جوئے کے کاروبار کو حرام جانتے ہیں لیکن مال اور دولت کی حرص میں آ کر اسے چھوڑتے نہیں وہ حرام کی کمائی کر رہے ہیں اور وہ فاسق ہو جاتے ہیں، توبہ ان پر لازم ہے ورنہ گناہ کے بدلے جہنم میں جانا اس کی سزا ہے۔

☆ قمار بازی اور اسی قسم کے کاروبار کی وجہ سے معاشرہ میں بگاڑ اور فساد پیدا ہوتا ہے۔

☆ دل میں مال کی حرص پیدا ہوتی ہے اور بڑھتی رہتی ہے۔

☆ جوا اور قمار بازی اگر دو آدمیوں کے درمیان ہے تو ظاہر ہے ہار جیت میں ایک کا فائدہ ہے دوسرے کا نقصان ہے اور چند آدمیوں کے درمیان ہے تو اس میں بھی بعض کا فائدہ ہے اور بعض کا نقصان ہے۔ اور فائدہ بھی اس طرح ہے کہ دوسرے کو نقصان میں ڈال کر لیکن اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ دوسرے کو اس طرح ناجائز ضرر اور نقصان پہنچا کر خود فائدہ اٹھاؤ۔ دوسرے کو فقیر بنا کر خود مالدار بن جاؤ۔

☆ اور جن کمپنیوں نے انعامی بانڈز کا سلسلہ شروع کیا ہے ان میں بے شمار لوگ حصہ لیتے ہیں خواہ امیر ہوں یا غریب، امیر اور دولت مند بننے کا شوق کس کو نہیں ہوتا اس لئے جن چند افراد نے کسی کمپنی کے نام سے ادارہ کھولا ہے وہ لوگوں کی جمع شدہ رقم سے جائز و ناجائز ہر قسم کے کاروبار کرتے ہیں۔ سودی کاروبار بھی کرتے ہیں، کچھ پیسے سودی اداروں میں جمع رکھتے ہیں، اور لوگوں کو سود پر قرضے دیتے ہیں۔ غرض مختلف طریقوں سے ادارہ کے لوگ منافع کماتے ہیں۔ پھر جتنا منافع ملتا ہے اس میں سے ایک معمولی حصہ قرعہ اندازی میں نام آنے والوں پر تقسیم کرتے ہیں، باقی منافع ادارے اور کمپنیوں کے افراد تقسیم کر لیتے ہیں جن لوگوں کا نام قرعہ اندازی میں نہیں نکلتا ان کا اصل سرمایہ تو محفوظ رہتا ہے لیکن اس پر مختلف طریقوں سے جو منافع کمپنی نے حاصل کیا ہے اس میں سے لاکھوں افراد جن کے سرمائے سے منافع کمایا ہے ان کو محروم کر دیتے ہیں۔ کمپنی اور ادارہ کے افراد نے جن

لاکھوں افراد کے سرمایہ سے منافع کمایا اور منافع کا ایک حصہ قرعہ اندازی میں نام آنے والے چند افراد کے درمیان تقسیم کیا باقی منافع خود بلا کسی سرمایہ ڈالے کھا گئے۔اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ لاکھوں افراد کو نقصان پہنچا کر اگر چند افراد کو فائدہ ہوا ہے تو یہ فائدہ ہے یا نقصان۔اس سلسلہ میں ہر ذی شعور اور صاحب عقل یہی کہے گا کہ جس کاروبار سے اکثریت کو نقصان پہنچتا ہے تو یہ درحقیقت کوئی فائدہ مند کاروبار نہیں ہے بلکہ نقصان دہ کاروبار ہے۔

☆ نیز انعامی بانڈز اور قمار بازی کے معاملات میں جیسا کہ غریب اور کم سرمایہ والے حصہ لیتے ہیں اس طرح امیر طبقہ اور سرمایہ دار بھی حصہ لیتے ہیں بلکہ امیر طبقہ اور سرمایہ دار طبقہ زیادہ سے زیادہ انعامی بانڈز، اس طرح شیرز خرید لیتے ہیں تاکہ قرعہ اندازی میں نام نکلنے کا امکان زیادہ سے زیادہ یقینی ہو۔مثلاً

ایک کم سرمایہ دار ایک ایک ہزار کے اگر پانچ ہزار کے انعامی بانڈ کے پانچ ٹکٹ یا شیرز خرید لیتے ہیں۔دوسرا زیادہ سرمایہ دار ایک ایک ہزار کے لاکھ دو لاکھ روپے کے ٹکٹ یا شیرز خرید لیتے ہیں تو ایسے حالات میں جو بیوپاری زیادہ سے زیادہ سرمایہ کے حصے خریدتا ہے قرعہ اندازی میں اس کا نام نکلنے کا امکان ۸۰ سے ۹۰ فیصد ہے اور جس نے پانچ ہزار روپے کے پانچ ٹکٹ خریدے ہیں اس کے نام نکلنے کا امکان زیادہ سے زیادہ پانچ سے دس فیصد تک ہے۔لہٰذا نتیجہ یہ نکلے گا کہ انعامی بانڈز یا اس طرح قمار بازی اور سٹے کے معاملات میں زیادہ سے زیادہ فائدے اور منافع سرمایہ داروں کو پہنچتے ہیں نہ کہ کم سرمایہ والے افراد کو۔یعنی امیر تو تر بنتا جاتا ہے اور غریب طبقے کے لوگ بیچارے جو پانچ دس ہزار روپے کا کاروبار کر کے جائز منافع کما سکتے تھے اس سے بھی وہ محروم رہ جاتے ہیں، یہ ان کا زبردست نقصان ہے۔نیز سرمایہ داروں کو جو فائدے نظر آرہے ہیں حقیقت میں یہ کوئی فائدے نہیں ہیں بلکہ جوا اور سود کی وجہ سے ان کے لئے بھی نقصان کا کاروبار ہے کیونکہ ناجائز آمدنی حرام آمدنی ہے اس سے وہ تمام نقصانات ہوتے ہیں جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں ہوا ہے۔اس واسطے شریعت نے تجارت اور خرید وفروخت کے ذریعہ مال حاصل کرنے کو حلال قرار دیا ہے لیکن جوئے اور قمار بازی کے ذریعہ مال حاصل کرنے کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے۔غرض قمار بازی یا جوئے اور قمار بازی کے جتنے اقسام مختلف ناموں سے اس وقت رائج ہیں۔سب کے سب ناجائز وحرام ہیں اور اس سے ملک کی پوری دولت چند امیروں کے ہاتھ جمع ہو جاتی ہے کم سرمایہ دار اور غریب طبقہ نقصان پذیر ہوتے ہیں۔اسلام نے اس کو ناپسندیدہ عمل قرار دیا ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں جمع ہو جاوے۔

☆ جوئے اور سٹے کے کاروبار میں یہ بھی نقصان ہے کہ بعض لوگوں کو کچھ مال تو مل جاتا ہے لیکن چونکہ لوگوں کی اکثریت منافع اور فائدے بلکہ بعض دفعہ اصل سرمایہ سے بھی محروم ہو جاتے تو یہ معاملات معاشی ناہمواری اور ظلم و زیادتی کے سبب بنتے ہیں۔

☆ جوئے اور سٹے کے کاروبار کو فروغ ملنے سے یہ بھی نقصان ہے کہ اس سے لوگوں میں حلال روزی کمانے کی محنت و مشقت کی طرف توجہ کم ہو جاتی ہے۔ بلا محنت و مشقت پیسے کمانے اور دولت مند بن جانے کی خواہش میں پڑ جاتے ہیں حالانکہ قرآن و حدیث میں کسب حلال کے لئے محنت و مشقت کرنے کا حکم آیا ہوا ہے جس کی تفصیلات کتاب کی ابتداء میں گذر چکی ہیں۔

☆ مذکورہ بالا تمام خرابیوں اور نقصانات کے مقابلہ میں ان فوائد کو بھی دیکھا جائے جو کہ جوئے اور سٹے کے کاروبار میں بعض افراد کو حاصل ہوتے ہیں اور جوئے کے کاربار کو فروغ دینے والے بتاتے ہیں۔ پھر نتیجہ یہ نکلے گا کہ ایسے کاروبار نہیں کرنے چاہیئے انہیں غیر قانونی قرار دینا چاہیئے کیونکہ ایسے موقع پر شریعت کا اصل یہ ہے کہ جس کام میں منافع کے مقابلہ میں ضرر زیادہ ہو نفع سے نقصانات زیادہ ہوں یا ضرر اور منافع دونوں مساوی ہوں تو اس کام کو چھوڑ دیا جائے گا تا کہ نقصان اور ضرر سے بچا جا سکے جبکہ جوئے اور سٹے کے معاملات میں تو ننانوے فیصد نقصان ہے اور ایک فیصد نفع ہے۔

☆ پھر اس جیسے کاروبار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کا گناہ الگ ہے۔

☆ ملک اور ملک کے افراد کا زبردست مالی نقصان ہے۔

☆ اخلاقی نقصان ہے۔

☆ نیز قمار بازی کے جملہ اقسام میں جب قرعہ اندازی میں انعام مل جاتا ہے تو اس میں سود کی حقیقت اور اس کے احکام بھی آ جاتے ہیں لہٰذا جتنے دینی و دنیاوی نقصانات سود اور سود خوری میں پائے جاتے ہیں اتنے نقصانات جوئے اور سٹے کے کاروبار میں پائے جاتے ہیں۔

☆ جب آدمی جوئے اور سٹے کے کاروبار میں حصہ لیتا ہے پھر اس سے دینی حمیت و غیرت ختم ہو جاتی ہے۔ بے غیرت، بے شرم، بے حیا بن جاتا ہے۔

☆ پھر اگر اس نے توبہ نہیں کی تو آہستہ آہستہ ایمان اور اسلام کی حقیقت اس سے سلب ہو جاتی ہے جس کو جنت کے لئے بنایا گیا تھا وہ اپنے اعمال و کرتوت کے بدلہ میں جہنم میں جانے کا مستحق بن جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے ہمیں اور تمام مسلمانوں کو نجات دے اور ہمیں ہدایت نصیب فرمائے اور

جوئے وقمار بازی کے جتنے اقسام ملک میں رواج پذیر ہوگئے ہیں ان کے نقصانات اور برائیاں ہمارے دلوں میں ڈال دے۔

مردار جانور، خون، خنزیر اور اس کے اجزا کی خرید و فروخت

واضح رہے کہ ہماری تجارت میں دوسری حرام اشیاء کی خرید وفروخت کی طرح مردار جانور کے اجزاء، خون اور خنزیر اور اس کے اجزاء کی خرید وفروخت بھی عام ہو چکی ہے جبکہ حق جل شانہ ان چیزوں کو قرآن حکیم کے اندر متعدد جگہوں پر حرام قرار دے چکے ہیں چنانچہ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةَ وَالدَّمَ وَلَحۡمَ الۡخِنۡزِيۡرِ. (سورۃ بقرہ ۱۷۳، جحل ۱۱۵)

بے شک اس نے تمہارے اوپر حرام کیا ہے مردار، خون، اور خنزیر کے گوشت کو۔

اور دوسری جگہ حق جل شانہ کا ارشاد ہے:

حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةُ وَالدَّمُ وَلَحۡمُ الۡخِنۡزِيۡرِ. (مائدہ ۳)

تمہارے اوپر مردار جانور، (بہتا ہوا) خون اور سور کو حرام کیا ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

عن ابی هريرة رضی الله عنه ان رسول الله صلی الله عليه وسلم قال ان الله حرّم الخمر وثمنها وحرّم الميتة وثمنها، وحرّم الخنزير و ثمنه.

(ابوداؤد و مسلم ج ۲، ص ۲۳)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے حرام کیا شراب کو اور اس کے دام کو بھی اور مردار جانور کو حرام قرار دیا اور اس کی قیمت کو بھی اور سور کو حرام کیا اور اس کی قیمت کو بھی حرام کیا ہے۔

چنانچہ ان آیات مذکورہ اور روایات سے معلوم ہوا کہ مردار جانور کا فروخت کرنا اور اس کے اجزاء کو فروخت کرنا ناجائز ہے اس لئے کہ عام طور پر یہ نجس ہوتے ہیں۔ لہٰذا:

(۱) مردار کا گوشت کھانا اور خرید وفروخت کرنا ناجائز اور حرام ہے۔

(۲) مردار جانور کی چربی کی خرید وفروخت ناجائز ہے۔

(۳) چمڑا جبکہ اس کی دباغت اور اصلاح نہ کی گئی ہو فروخت کرنا ناجائز اور حرام ہے۔

(۴) اسی طرح خنزیر اور اس کے اجزاء اور اس کی کھال کی خرید وفروخت ناجائز ہے۔

(۵) جانور کا بہتا ہوا خون نجس وناپاک ہے اس کا استعمال وخرید وفروخت ناجائز ہے۔

البتہ مردار جانور کے بال، دانت، رطوبت سے پاک ہڈی کا ضرورت میں استعمال کرنا او اس کو فروخت کرنا سوائے خنزیر کے جائز ہے۔ کیونکہ خنزیر کے تمام اجزاء واشیاء ناپاک اور حرام ہیں ان سے انتفاع اوراس کی خرید وفروخت ناجائز ہے۔

واضح رہے کہ جھٹکے سے مرے ہوئے جانور کا گوشت، مشینی ذبیحہ کا گوشت، مشرک اور کافروں کے ہاتھ کا ذبحہ ہونے والے جانوروں کا گوشت سب ناپاک اور حرام ہیں ان کی خرید وفروخت بھی ناجائز اور حرام ہے البتہ یہود اور نصاریٰ کے ہاتھ سے ذبح ہونے والا جانور قرآن وحدیث کی رو سے جائز اور حلال ہے۔ غیر اللہ کے نام ذبح ہونے والے جانور کا گوشت حرام اور مردار کے حکم میں ہے لہٰذا مذکورہ بالا تمام اشیاء کی تجارت اور خرید وفروخت ناجائز وحرام ہے۔

خنزیر اور اس کے اجزاء کی حرمت کا بیان

قرآن حکیم کے اندر خنزیر کی حرمت کا بیان چار مقامات پر آیا ہے سورۃ البقرہ آیت نمبر ۱۷۳ میں، سورہ المائدۃ آیت نمبر ۳ میں، سورۃ الانعام آیت نمبر ۱۴۵ سورہ النحل آیت نمبر ۱۱۵ میں۔

اس سے اس کی حرمت کی شدّت اور اس کی نجاست کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ باجماعِ تمام مفسرین عظام وفقہائے کرام خنزیر اور اس کے تمام اجزاء حرام اور نجس ہیں اور نجس العین ہیں، یعنی جس طرح مردہ جانور کا گوشت اور بہتا ہوا خون اور شراب، گندگی اور غلاظت کی طرح بجمیع اجزاء نجس اور حرام ہیں۔ اسی طرح خنزیر بھی بجمیع اجزاء نجس اور حرام ہے۔ (احکام القرآن جصاص ص ۱۱۷، ج ۱)

☆ خنزیر اور اس کا گوشت اور دیگر تمام اجزاء کا کھانا استعمال کرنا حرام ہے ان کو حلال سمجھنا کفر ہے۔

''مصنف عبدالرزاق'' میں حضرت قتادہؓ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اگر کسی نے خنزیر کا گوشت کھایا تو اسے توبہ کے لئے کہا جائے گا ورنہ اسے قتل کردیا جائے گا جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کو حلال سمجھ کر کھایا تو کافر اور مرتد ہوجائے گا۔ اس کو توبہ کے لئے کہا جائے گا ورنہ اسلامی حکومت اسے قتل کرنے کا حکم دے گی۔ (روح المعانی ص ۵۷، ج ۴ کذا فی الدر المنثور)

☆ اگر کوئی خنزیر کے گوشت کو حرام سمجھتا ہے لیکن غلطی سے دانستہ یا نادانستہ کھالیتا ہے تو کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ وہ آدمی فاسق ہوجاتا ہے اس پر توبہ لازم ہے۔

☆ خنزیر کا گوشت، چمڑا اور دوسرے اجزاء دباغت کرلینے سے بھی پاک نہیں ہوتے کیونکہ وہ نجس العین

خالص گندگی ہے۔

☆ لہٰذا خنزیر کا گوشت یا اس کے اجزاء کو کھانے میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

☆ دوا میں اس کا استعمال مسلمانوں کے لئے جائز نہیں۔

☆ اشیاء خوردنی میں خنزیر اور اس کے اجزاء کو ملانا جائز نہیں ہے۔

☆ صرف حالت اضطرار یعنی جبکہ شدید بھوک ہو، جان بچانے کی کوئی صورت نہ ہو تو جان بچانے کی غرض سے بقدرِ ضرورت اس کا استعمال مباح ہے۔

☆ اور اضطراری حالت میں خنزیر کے اجزاء والی دوا کا استعمال بھی جائز ہے جبکہ مسلمان طبیب حاذق تجویز کرے کہ سوائے اس حرام دوا کے کوئی دوا مریض کے لئے مفید نہیں ہے۔

☆ خنزیر کے اجزاء، چربی، ہڈی، گوشت وغیرہ کی خرید وفروخت جائز نہیں حرام ہے۔

☆ موچی کے لئے جوتے سینے کے لئے خنزیر کے بال کو استعمال کرنے کے بارے میں ائمہ میں اختلاف ہے۔ جملہ فقہاء اس کو بھی حرام قرار دیتے ہیں جبکہ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ ایک فقہی اور اجتہادی اختلاف کی بنا پر اور بوجہ ضرورت موچی کے پیشے اختیار کرنے والوں کے لئے خنزیر کے بال کو استعمال کرنے کی اجازت دیتے ہیں لیکن اس کی خرید وفروخت کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔

(احکام القرآن ص ۱۲۴، ج ۴)

علامہ شامی نے علامہ مقدسی کا قول نقل کیا ہے کہ امام محمدؒ نے موچی کا پیشہ اختیار کرنے والوں کے لئے خنزیر کے بال کو استعمال کرنے کی اجازت ضرورت اور حاجت کی بناء پر دی ہے کیونکہ اس وقت کوئی مضبوط دھاگے کا انتظام نہیں تھا۔ اب چونکہ مضبوط دھاگے دوسری چیزوں کے جوتے کی سلائی کے لئے ملتے ہیں اس لئے اب فتویٰ اس کے جواز پر نہیں ہوگا بلکہ عدم جواز پر ہوگا۔ (شامی ص ۲۰۶، ج ۲)

☆ خنزیر کے بال کا برش بنانا اور اس کا استعمال کرنا ناجائز ہے کیونکہ اس کی ضرورت نہیں ہے اور اس کے بال نجس ہیں نیز اس کے بال والے برش بنانے اور اس کو خرید وفروخت کرنے میں اس کی تقویم اور تکریم لازم آتی ہے جبکہ خنزیر بجمیع اجزاء نہ تقویم کے لائق ہے نہ تکریم کے۔

☆ بعض غیر مسلم لوگ دانتوں کی صفائی کے لئے اس کو بناتے ہیں اور بازاروں میں فروخت کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے لئے اس کا خریدنا اور بیچنا اور استعمال کرنا ناجائز ہے۔

☆ بعض مسلمان بھائی بیرون ملک رہتے ہیں، خواہ مستقل طور پر یا عارضی طور پر ان کو خنزیر کا گوشت اور اس کے اجزاء پر مشتمل اشیاء کی دکانوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ایسے حضرات کو چاہیئے کہ جن دکانوں

میں، ہوٹلوں میں خنزیر کا گوشت پکتا ہے، یا کسی اشیاء خوردنی میں خنزیر کے اجزاء شامل ہیں ایسے ہوٹلوں اور دکانوں میں کھانے کے لئے نہ جائیں نہ ملازمت کریں۔

البتہ جن ہوٹلوں میں اس کا اہتمام ہے کہ مسلمانوں کے کھانے کے واسطے الگ پکانے کی جگہ، الگ پکانے والا، الگ برتن وغیرہ کا انتظام ہے اور حرام اشیاء سے بچنے کا اہتمام ہے ایسے ہوٹلوں میں تحقیق کر کے کھانا کھا سکتا اور اس مخصوص حلال اور جائز کھانے کے شعبہ میں ملازمت اختیار کر سکتا ہے اور اگر ان چیزوں کی تحقیق نہیں ہو سکی تو نہ ایسے ہوٹلوں میں کھائیں نہ ملازمت کریں۔

انسان اور انسانی اعضاء کی خرید وفروخت

آزاد انسان خواہ مسلمان ہو یا کافر مرد ہو یا عورت زندہ ہو یا مردہ، اس کی خرید وفروخت حرام اور ناجائز ہے۔ حدیث شریف میں ہے۔

عن أبی هريرة رضی الله عنه عن النبی صلی الله عليه وسلم قال قال الله ثلاثة أنا خصمهم يوم القيامة رجل أعطی بی ثم غدر ورجل باع حرّا فاحلّ ثمنه ورجل استاجر أجيراً فاستوفی منه ولم يعط أجره. (بخاری ص۲۹۷، ج۱)

ابو ہریرہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تین شخص ایسے ہیں کہ ان کے خلاف قیامت کے دن میں مدعی بن کر فیصلہ کروں گا ایک وہ شخص کہ میری وجہ سے اس کو دیا گیا لیکن اس نے اس میں غدر کیا دوسرا وہ شخص جس نے کسی آزاد آدمی کو فروخت کیا اور اس کی قیمت استعمال کی، تیسرا وہ شخص جس نے کسی مزدور اور ملازم سے پورا کام لیا لیکن اس کی اجرت اور تنخواہ ادا نہیں کی۔

حدیث مذکورہ میں آزاد آدمی خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم، زندہ ہو یا مردہ ہر حالت میں اس کی بیع پر سخت مواخذہ کی وعید آئی ہے لہٰذا کسی آزاد انسان کو فروخت کرنا ناجائز اور حرام ہے۔

علامہ محدث بدر الدین عینی حدیث مذکور کی شرح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

استدل بهذا الحديث أيضاً أنه لايجوز بيع الميتة الآدمی مطلقاً سواء فيه المسلم او الكافر أمّا المسلم فلشرفه وفضله حتی أنه لا يجوز الانتفاع بشئ من شعره وجلده وجميع أجزائه وأما الكافر فلان نوفل بن عبدالله بن المغيرة لما قتل و غلب المسلم علی جسده فأرادا لمشركون أن يشتر وه منهم فقال

صلى الله عليه وسلم لا حاجة لنا بجسده ولا بثمنه فخلى بينهم وبينه قال ابن هشام اعطوا رسول الله صلى الله عليه وسلم بجسده عشرة آلاف درهم.

حدیث مذکور سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ خرید وفروخت مردہ انسان کی مطلقاً ناجائز ہے برابر ہے کہ وہ مسلمان ہو یا کافر مسلمان کی خرید وفروخت تو اس لئے جائز نہیں کہ اس کا احترام اور شرافت اور فضیلت عام انسانوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے اور کافر کی میت کی بیع اس لئے جائز نہیں ہے کہ نوفل بن عبداللہ بن المغیرہ کا قتل غزوہ خندق میں ہوا وہ کافر تھا میت مسلمانوں کے قبضے میں تھی مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اس کی میت کو قیمت لے کر واپس کر دیا جائے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمیں نہ اس کی لاش کی ضرورت ہے اور نہ قیمت کی آپ نے اس کی لاش کو واپس کر دیا ابن ہشام نے کہا ہے کہ مشرکین نے جس قیمت کی پیشکش کی تھی اس کی تعداد دس ہزار درہم تھی۔
(عمدة القاری ص ۲۰۶، ج. ۵، اعلاء السنن ص ۱۱۳، ج. ۱۴)

لہٰذا حدیث پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کی شرح کی رو سے درج ذیل چیزوں کی خرید وفروخت ناجائز اور حرام ثابت ہوتی ہے۔

(۱) بعض لوگ دوسروں کے بچوں کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں اور بھاری قیمت لے کر فروخت کرتے ہیں شرعاً ان کی خرید وفروخت ناجائز وحرام ہے اور جو پیسے حاصل کرتے ہیں وہ بھی حرام ہیں۔

(۲) آزاد عورتوں کی خرید وفروخت ناجائز اور حرام ہے لہٰذا جو لوگ عورتوں کو اغواء کر کے دوسرے لوگوں کے پاس رقم لے کر فروخت کرتے ہیں یہ ناجائز اور حرام ہے۔ اس طرح فروخت کرنے والے کے لئے اس کی قیمت حرام ہے اور خریدنے والے خریدے ہوئے بچے یا عورت کے مالک نہیں ہوں گے۔ اور اس طرح لوگوں کی خرید وفروخت کرنے والوں کی سخت ترین سزا ہونی چاہیئے۔

(۳) جس طرح زندہ انسانوں کی خرید وفروخت حرام ہے اس طرح مردہ انسان کی لاش کی خرید وفروخت بھی حرام ہے خواہ مسلمان کی لاش ہو یا کافر کی، عورت کی ہو یا مرد کی، کسی کا وارث موجود ہو یا وہ لاوارث ہو۔

(۴) بعض لوگ انسانی ہمدردی کے نام پر بعض ملکوں میں اور بعض علاقوں میں طبی ضرورت کے تحت جو لاشوں کی خرید وفروخت کرتے ہیں ناجائز اور حرام کام کرتے ہیں ایسے کاروبار اور دھندا کرنے والے قرآن وسنت کی رو سے سخت مجرم اور شرعاً قابل تعزیر ہیں۔

(۵) جس طرح پورے انسان کی لاش کی خرید وفروخت ناجائز اور حرام ہے اسی طرح انسانی اعضاء دل، گردے، اور آنکھوں وغیرہ کی خرید وفروخت بھی ناجائز اور حرام ہے۔

جو لوگ انسان کی خدمت اور اس کے احترام کے نام پر ڈاکٹری تعلیم حاصل کرتے ہیں اور انسانی جسم اور اعضاء کو خرید کر اس کی بے حرمتی کرتے ہیں انہیں قیامت کے روز جواب دہی کرنی ہوگی جبکہ احکم الحاکمین خود مدعی ہوگا اور مدعی بن کر فیصلہ کریں گے۔

بعض ڈاکٹر حضرات کہتے ہیں کہ ہم طبّی تعلیم کی غرض سے کفار کی لاش اور ان کے اعضاء منگواتے ہیں اور ان پر تجربے کرتے ہیں جبکہ ان کا یہ کہنا غلط ہے کیونکہ حدیث پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی رو سے کافر کی لاش بھی اس قابل نہیں کہ اس کی خرید وفروخت کی جائے یا اس پر تجربے کئے جائیں کیونکہ انسان بہر حال قابل احترام ہے وہ دوسرے انسانوں کے ہاتھوں سے قطع برید کر کے ذلیل ہونے کے لئے نہیں ہے۔ فتاویٰ وفقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ کفار کی لاش اور اس کے اعضاء کی خرید وفروخت اور اس کا استعمال بھی کسی حال میں جائز نہیں ہے۔

فتح القدیر میں ہے:

بأن الآدمی مکرّم وان کان کافراً. (بحوالہ بحر ص ۸۱)

انسان خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم معزز ومکرم ہے اس قابل نہیں کہ اسے استعمال کیا جائے۔

ہمارے بعض نوجوان بھائی جن کا تعلق دین اور دینی جماعتوں سے بھی ہے ڈاکٹری مہارت حاصل کرنے کے لئے انسانی اعضاء خریدتے ہیں ان پر اس طرح تجربے کرتے ہیں جس طرح سلائی کا کام کرتے ہیں اور یہ لوگ اتنے نڈر ہوتے ہیں کہ درزی کا کام سیکھنے والے کو تو نئے کپڑے کی قدر ہوتی ہے اس لئے وہ قیمتی کپڑوں پر تجربہ نہیں کرتے لیکن ڈاکٹری سیکھنے والے نوجوان کے سامنے بوقت قطع وبرید انسان اور انسانی اعضاء کا اتنا احترام بھی نہیں ہوتا جتنا احترام درزی کا کام سیکھنے والے کو قیمتی کپڑے کے کاٹنے میں ہوتا ہے۔ شدید افسوس کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ان بھائیوں کو دین کی سمجھ اور فہم عطا فرمائے انسانی لاش اور ان کے اعضاء کی بے حرمتی سے بچنے کی توفیق دے کہ اس ناجائز اور گناہ عظیم سے خود بھی بچ سکیں اور دوسروں کو بھی بچا سکیں۔

انسانی اعضاء کی خرید وفروخت کے لئے بینک کا قیام

انسانی خدمت کے نام پر مختلف غیر مسلم ممالک میں آنکھوں کے بینک قائم ہوئے ہیں اور ہمارے

پاکستان میں بھی آئی آئی بینک قائم کیا گیا ہے اور ہمیشہ اس کی تشہیر اور تبلیغ پر زر کثیر خرچ کیا جاتا ہے۔ بیرون ممالک سے آنکھیں درآمد کرتے ہیں یہاں پر بھاری رقم کے بدلہ میں ضرورت مند لوگوں کو فروخت کرتے ہیں بظاہر تو یہ انسان کی خدمت ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے بینک انسان اور انسانی اعضاء کو ذلیل اور توہین کرنے کے کارخانے ہیں اور یہ کاروباری لوگ ہیں، انسانی خدمت کے نام سے کاروبار کرتے ہیں سادہ لوح انسان جن کو دین اور دینی علوم کا شعور نہیں ہوتا وہ اس میں پھنس جاتے ہیں اور بعض اہل دانش جو دینی علوم میں گہرائی نہیں رکھتے اس میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ اللّٰھم اھد قومی فانھم لایعلمون.

بہر حال بندہ کو یہ عرض کرنا ہے کہ انسانیت جیسے بہت بڑی چیز ہے اس طرح انسانی جسم، اس کے حصے اور اعضاء بھی قابل احترام میں امانت خداوندی ہے، پوری کائنات انسانیت کی خدمت کے لئے بنائی گئی انسان مخدوم ہے پوری کائنات خادم ہے۔

انسان کی غذا اور دوا اور کھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حلال اشیاء کا انتظام کیا ہے۔ انسان انسان کی غذا نہیں ہوسکتا۔ انسانی بیماریوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے حلال دوا کا انتظام کیا ہے۔ بوقت اضطراب بعض حرام اشیاء کی بھی اجازت دی ہے لیکن انسانی جسم اور اس کے اعضاء کی قطع و برید سے اس کا علاج کرنا اس کی ہرگز اجازت نہیں دی گئی۔ اس بارے میں بندہ نے اپنی کتاب ”انسانی اعضاء کا احترام اور طب جدید“ میں تفصیل سے بحث کی ہے تمام شکوک وشبہات کے جوابات دیئے ہیں علمی اعتبار سے جو لوگ تسلی کرنا چاہیں وہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیں۔

مجسمہ سازی اور بتوں کی خرید وفروخت

گذشتہ صفحات میں بخاری اور مسلم کے حوالے سے حدیث شریف کا ذکر آچکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بت سازی اور بتوں کی خرید وفروخت اور اس کے دام استعمال کرنے سے منع فرمایا ہے اس لئے مختلف شکلوں کے مجسمے اور مورتی بنانا خواہ وہ مرد کی صورت کے ہوں یا عورت کی صورت میں چھوٹے بچوں کی شکل میں ہوں یا بچیوں کی شکل میں ناجائز اور حرام ہے اس طرح مجسمے اور مورتی بنانے والے کارخانے اور فیکٹری لگانا کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس کی خرید وفروخت جائز ہے خواہ مجسمے سونے چاندی کے ہوں یا تانبے، پیتل کے، مٹی کے ہوں یا پتھر اور پلاسٹک کے، یا کسی دوسری دھات کے ان کو خریدنا اور گھروں یا دکانوں یا دفتر میں رکھنا یا زینت کا سامان بنانا ناجائز اور حرام

ہے گناہ کبیرہ ہے۔ ایسے گھروں میں رحمت کے فرشتے ہرگز داخل نہیں ہوتے جو لوگ ان چیزوں کا کاروبار کرتے ہیں ان کی کمائی حرام ہے جن کی نماز، روزہ، حج، صدقہ غرض کوئی عبادت قبول نہیں ہوتی۔

تصویر کشی، فوٹو گرافی کا پیشہ، اور اس کی تجارت

حدیث شریف میں تصاویر کی خرید و فروخت کی ممانعت آئی ہے لہٰذا جس طرح تصاویر کا کھینچنا اور بنوانا ناجائز اور گناہ کبیرہ ہے اس طرح تصاویر کا گھروں میں رکھنا، لٹکانا بھی ناجائز اور گناہ ہے۔ احادیث میں تصاویر بنانے اور بنوانے والے دونوں کے لئے وعید آئی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان الذین یصنعون ھذہ الصور یعذّبون یوم القیامۃ یقال لھم احیو ما خلقتم.

(صحیح مسلم ج ۲ کتاب اللباس ص ۲۰۱)

جو لوگ تصویر بناتے ہیں ان کو قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا جو تصاویر تم نے بنائی ہیں ان میں روح ڈالو اور زندہ کرو۔

عبداللہ ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

انّ من أشدّ الناس عذابا یوم القیامۃ المصورون.

(صحیح مسلم شریف ص ۲۰۱، ج۔ ۲)

بلاشبہ جن لوگوں کو قیامت کے دن شدید ترین عذاب ہوگا ان میں تصویر بنانے والے بھی ہوں گے۔

ابوزرعہ روایت کرتے ہیں:

دخلت مع ابی ھریرۃ فی دار مروان فرأی فیھا التصاویر فقال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول قال اللہ عزّوجل ومن أظلم ممن ذھب یخلق خلقا کخلقی فلیخلقوا ذرۃ اولیخلقوا حبّۃ اولیخلقو اشعیرۃ.

(صحیح مسلم ص ۲۰۲، ج۔ ۲)

ابوزرعہ فرماتے ہیں کہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مروان کے گھر داخل ہوا، انہوں نے وہاں کچھ تصاویر دیکھیں تو فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوسکتا ہے جو میری تخلیق کی طرح مخلوق

بنانے لگے، ذرا یہ لوگ کوئی چیونٹی تو بنائیں ذرا یہ لوگ کوئی دانہ تو بنائیں یا جو تو پیدا کریں۔

احادیث مذکورہ سے معلوم ہوا کہ جاندار کی تصویر بنانے والوں پر قیامت کے روز شدید ترین عذاب ہوگا اس میں تصویر کھینچنے والے کھنچوانے والے دونوں داخل ہیں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ گھر میں تصویر رکھنا بھی منع ہے۔ تب ہی حضرت ابو ہریرہؓ نے نکیر فرمائی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لاتدخل الملائکۃ بیتاً فیہ تماثیل ولاتصاویر. (مسلم شریف ص ۲۰۲، ج. ۲)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں مورتی یا تصاویر ہوں۔

مذکورہ بالا ان احادیث سے معلوم ہوا کہ جس گھر میں مورتی مجسمے ہوں یا تصویریں ہوں اس گھر میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس گھر والے اللہ کی خصوصی رحمت سے محروم رہتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب رحمت سے محروم ہوتے ہیں تو گناہ اور معصیت ہونے کی وجہ سے لعنت کے مستحق ہوتے ہیں اسی وجہ سے تو ہمارے گھر مصیبتوں اور پریشانیوں کے مراکز بنے ہوئے ہیں۔

جاندار کی تصویریں بنانے اور تصویروں کے لئے فوٹوگرافی کا پیشہ ناجائز ہے

چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

عن سعید بن ابی الحسن قال کنت عند ابن عباس رضی اللّٰہ عنہ اذ أتاہ رجل فقال یا ابن عباس انی رجل انما معیشتی من صنعۃ یدی وانّی أصنع ھذہ التصاویر فقال ابن عباس لا أُحدّثک الاّما سمعت من رسول اللّٰہ سلی اللّٰہ علی وسلم سمعتہٗ یقول من صوّر صورۃ فان اللّٰہ یعذبہ حتی ینفخ فیھا الروح ولیس بنافخ فیھا ابداً فربا الرجل ربوۃ شدیدۃ واصفرّ وجھہ فقال ویحک ان ابیت الا ان تصنع فعلیک بھٰذا الشجرو کل شی لیس فیہ روح.

(بخاری ص ۲۹۶، ج. ۱ کتاب البیوع مسلم ص ۲۰۲، ج. ۲)

سعید ابن ابی الحسن فرماتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا اتنے میں

ایک شخص آیا اس نے کہا اے ابن عباس میں ایک ایسا شخص ہوں کہ میرا ذریعۂ معاش میرے ہاتھوں کا ہنر ہے میں تصویریں بناتا ہوں کیا یہ ذریعۂ معاش جائز ہے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا میں وہی بات تمہیں بتاؤں گا جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص کوئی تصویر بنائے گا اللہ تعالیٰ اس کو عذاب دیں گے جب تک کہ وہ اس میں روح نہ پھونک دے اور وہ اس میں روح نہ پھونک سکے گا اس پر یہ شخص سوچ گیا اور اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ ابن عباس نے فرمایا بھلا ہو تمہارے لئے اگر تم نے تصویریں بنانی ہیں تو ان درختوں کی اور کسی ایسی چیز کی تصویر بناؤ جن میں روح نہ ہو۔

حدیث مذکورہ بالکل واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاندار کی تصویر بنانے اور اس کو گھر میں رکھنے سے منع فرمایا ہے ابن عباس نے فرمایا کہ تصویروں کا پیشہ اپنانے کی شریعت میں اجازت نہیں ہے۔

اس حدیث کے ذیل امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قال اصحابنا وغیر ھم من العلماء تصویر صورۃ الحیوان حرام شدید التحریم وھو من الکبائر لانہ متوعد علیہ بھذا الوعید الشدید المذکور فی الاحادیث وسواء صنعہ بما یمتھن او لغیرہ فصنعتہ حرام بکل حرام لان فیہ مضاھاۃ لخلق اللہ تعالیٰ وسواء کان فی ثوبٍ اوبساطٍ اودرھمٍ او دینارٍ او فلسٍ او اناءٍ او حائطٍ وغیرھا واما تصویر صورۃ الشجر ورحال الابل وغیر ذالک ممالیس فیہ صورۃ حیوان فلیس بحرام. (مسلم ص ۱۹۹، ج ۳)

ہمارے فقہا اور دوسرے علماء کرام نے کہا ہے کہ کسی جاندار کی تصویر بنانا فوٹو کھینچنا حرام بلکہ شدید ترین حرام ہے اور کبیرہ گناہ ہے کیونکہ اس بارے میں سخت وعید کے ساتھ احادیث وارد ہوئیں ہیں اور یہ حکم ہر تصویر اور فوٹو تیار کرنے والے کے لئے ہے خواہ تعظیم کی غرض سے ہو یا نہ ہو تصویر کشی کا پیشہ تو ہر حال میں حرام ہے خواہ یہ تصویر کپڑے میں ہو یا فرش میں، درہم میں ہو یا دینار میں یا دھات کے پیسوں میں، برتن میں ہو یا دیوار میں، البتہ درختوں اور اونٹ ٹھہرانے کے مکانات اور اسی طرح ان تمام چیزوں کی تصاویر جن میں جان نہیں ہوتی بنانی جائز ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ عبارت میں بہت سے مسائل بیان کئے گئے ہیں جن کی تشریح یہ ہے۔

(۱) احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رو سے کسی جاندار کی تصویر بنانا کھینچنا کھینچوانا جائز نہیں ہے حرام ہے۔

(۲) جاندار کی تصویر کشی کا پیشہ اور ذریعہ معاش اختیار کرنا ناجائز اور حرام ہے۔

(۳) جاندار کی تصویر خواہ چھوٹی ہو یا بڑی اس کی صنعت و حرفت مطلقاً ناجائز ہے۔

(۴) ہر قسم کے حیوانات درندے، پرندے، خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے کی تصویر بنانا خواہ کسی مقصد سے ہو اپنے لئے ہو یا کسی دوسرے مقصد کے لئے ناجائز اور حرام ہے۔

(۵) جاندار کی تصویر کا چھاپنا خواہ درہم و دنانیر اور سکہ رائج الوقت کے نوٹوں میں یا دوسری کتابوں اور کاپیوں میں یا اشتہاروں میں سب ناجائز اور حرام ہے۔

(۶) جاندار کی تصویر ہر قسم کے برتنوں اور پلیٹوں میں بھی ناجائز اور حرام ہے۔

(۷) جاندار کی کسی قسم کی تصویر گھر، دفتر، دکان کی دیوار یا عمارت میں لگانا ناجائز اور حرام ہے۔

(۸) صرف بے جان چیزوں کی تصویریں مثلاً مکانات اور ہر قسم کی عمارت، درختوں پتھروں کی تصویریں جائز اور حلال ہیں۔ اس کی خرید و فروخت اور اس کا پیشہ اختیار کرنا بھی جائز ہے۔

لہٰذا موجودہ زمانے میں جس طرح تصویروں کا چھاپنا چھپوانا، کھینچنا کھینچوانا عام ہو گیا ہے اور لوگ اسے کسی قسم کا گناہ اور معصیت نہیں سمجھ رہے ہیں یہ فساد عقل کی علامت ہے اور ان چیزوں کا ارتکاب کرنا بالکل حرام اور ناجائز ہے اور گناہ کبیرہ ہے۔

بعض مقامات پر تو حکومت اور اس کے وکلاء اور وزراء ضرورت کا عذر کرتے ہیں اور تصویروں کو ضروری اور لازمی قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ حقیقت حال اس طرح نہیں کی ہے، بعض حالات میں ضرورت قطعاً نہیں ہوتی مگر وہاں تصاویر مسلسل چھاپ رہے ہوتے ہیں۔ مثلاً کرنسی نوٹوں میں فوٹو کی ضرورت ذرہ برابر بھی نہیں ہے لیکن پھر بھی چھاپی جارہی ہے۔

ہر قسم کا تجارتی سامان خواہ کھانے پینے کی اشیاء ہوں یا دوسری استعمال کی اشیاء ان میں کسی جاندار کی تصویر کی ہرگز ضرورت نہیں ہوتی لیکن پھر بھی تصاویر دی جاتی ہیں۔

بعض دفعہ ننگے بدن مردوں اور ننگی اور فاحشہ قسم کی عورتوں کی تصاویر، تجارتی اشیاء میں چھاپی جاتی ہیں حالانکہ اس کی ضرورت بالکل نہیں ہوتی بس شیطانی مکر و فریب اور اس کے سبق اور تعلیم پر مسلسل عمل جاری و ساری ہے۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں اور اس کے فرشتوں اور نیک بندوں اور ساری مخلوق کی لعنت ہو اس پر

جس شخص نے دین اسلام میں اس کی تعلیم دی اور اس کی ابتداء کی اور اس کو ضروری قرار دیا، اور اس کو عام کیا ہے، انسانی تعارف کے لئے قرآنی اصول آدمی کا نام اس کے باپ، دادا کا نام، خاندان قبیلہ کا نام، قوم گاؤں اور علاقے کا نام کافی ہے، بلا تصاویر صحابہ کرام کے احوال وانساب اور حالات محفوظ ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بیان کرنے والے لاکھوں محدثین کے انساب تاریخ میں محفوظ ہیں اس میں کچھ خلل نہیں ہوا عہد رسالت کی دس سالہ حکومت اسلامیہ کے کارنامے اور عہد صحابہ، خاص کر خلفاء راشدین کے تیس سالہ ادوار اور اس کی تمام کاروائیاں جنگی حالات، تواریخ میں محفوظ ہیں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ انہیں پڑھ کر سن کر بے شمار کفار مسلمان ہوئے اور ہو رہے ہیں، حیوانی زندگی کو ترک کر کے انسانی زندگی اختیار کر رہے ہیں، حالات بالکل درست تھے، لیکن موجودہ حالات میں تصاویر پر تصاویر لگانے کے باوجود پھر بھی چوریاں، ڈاکے، دھوکہ بازوں اور تخریب کاروں کے ان گنت واقعات و حالات اخبارات میں آتے ہیں تصاویر کی وجہ سے کسی برائی کا قطعی انسداد نہیں ہوا نہ اس میں کوئی خاص کمی واقع ہوئی بلکہ تصویروں کی اشاعت عام کی وجہ سے بے شمار برائیوں نے مزید جنم لیا ہے۔ عریانی، فحاشی، بے حیائی وغیرہ میں اضافہ ہو رہا ہے، زنا، ناجائز دوستی تعلقات کا سلسلہ شروع ہوا ہے جبکہ پہلے سے ہی شریعت اور شرعی قوانین کو ہم نے بالائے طاق رکھ دیا ہے جاہلیت کی ساری چیزوں کو ہم نے اپنا لیا ہے تو اس میں تصاویر اور دوسرے دھوکے، خیانت کے تمام راستے کھول دیئے ہیں جب ہمارے یہ حالات ہوں تو اب اس طرح سے دھوکہ، خیانت، چوری، ظلم ہمارے اندر سے کیسے ختم ہوں جبکہ قانون سزا پر کہیں عمل نہیں ہے۔ ہر طرف سے چوری، خیانت، رشوت کا بازار گرم ہے تو تصاویر کے نظام سے کہیں چوری ختم نہیں ہوئی نہ دھوکہ بازی اور فریب کاری کا سلسلہ بند ہوا نہ ہی جعل سازی کا انسداد ہوا۔

بہر حال یہ تو ہمارے حالات اور ہمارے اعمال ہیں۔ پھر ہمارے قائدین کہتے ہیں کہ ہماری ترقی میں دین اور مذہب رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ افسوس ہے ایسے قائدین پر اور ایسے رہنماؤں پر اور ایسے حکمران پر۔

تصویروں سے متعلق احکام ومسائل

☆ تصویر سازی، تصویر کشی، فوٹو گرافی میں چونکہ اللہ تعالیٰ کی صفت تخلیق کے ساتھ مشابہت ہوتی ہے اسی وجہ سے اس کو حرام وممنوع قرار دیا ہے اس لئے جتنے کاموں میں تصویر سازی ہوتی ہے وہ تمام کام ناجائز وحرام ہوں گے۔

☆ لہٰذا فوٹو گرافی کا پیشہ اختیار کرنا مسلمان کے لئے ممنوع وحرام ہے۔

☆ تصویر سازی کے جتنے طریقے ہیں اگر جاندار کی ہیں تو پھر وہ ممنوع وحرام ہیں۔

☆ جن ملوں، کارخانوں میں تصویر والے کپڑے یا دوسری اشیاء بنتی ہیں اگر وہ جاندار کی تصاویر ہیں تو ایسے کپڑوں کا تیار کرنا، ایسی تصاویر کا چھاپنا ناجائز وحرام ہے۔

☆ جن کارخانوں اور پریسوں میں تصویر والی کتابیں، رسالے، جرائد اخبارات، خواہ درسی کتابیں ہوں یا تفریحی کتابیں، اشتہارات وغیرہ چھاپتے ہیں، مالکان پریس بھی اس کے ذمہ دار ہوں گے۔ وہ بھی چھپوانے والے کے ساتھ گناہ میں شریک ہوں گے۔

☆ جتنے استعمالی سامان تیار ہوتے ہیں، یا کھانے پینے کی اشیاء تیار کی جاتی ہیں اس کے باہر جاندار کی تصاویر چھاپنا بھی ناجائز وحرام ہیں۔

☆ جتنے تجارت پیشہ لوگ ہیں وہ اگر حلال کمائی کا عزم کریں اور حرام کمائی سے بچنے کا ارادہ کریں تو مذکورہ بالا تمام صورتوں میں تصویر سازی اور تصویر کشی سے بچ سکتے ہیں۔ صرف اہتمام اور پکے ارادے کی بات ہے ممکن ہے اس میں تجارت اور پیشہ میں تھوڑا بہت منافع کم ہو۔ اہتمام کرنے والے کم وبیش دنیاوی پریشانی میں مبتلا ہوں لیکن اس کی وجہ سے روزی اور کمائی انشاء اللہ کسی کی بند نہ ہوگی لیکن ایمان نصیب ہوگا۔ قلب اور دل میں ایمانی قوت پیدا ہوگی۔ اعمال میں برکت ہوگی انجام اچھا ہوگا۔ شیطانی قوتیں سرد پڑ جائیں گی۔ جہنم کی آگ سے نجات ملے گی۔ باقی جن سرکاری محکموں میں تصویر سازی ہوتی ہے اور عامۃ الناس کے لئے تصاویر کا استعمال کرنا ضروری ہوتا ہے اس کے احکام میں ذرا تفصیل ہے۔

سرکاری محکموں میں تصویر سازی کا حکم

سب سے پہلے تو یہ بات معلوم کرنی چاہیئے کہ تصویر سازی اور سرکاری دستاویزات پر تصاویر لگوانے کا قانون غیر شرعی ہے۔ شروع سے جس حکومت نے اس حرام اور ناجائز عمل کی ابتداء کی ہے اس کو اور اس کے مشیروں کو تو قیامت تک تصویر کے قانون بنانے کی وجہ سے ہر تصویر سازی کرنے والے اور تصویر بنوانے والے کے گناہ میں سے ایک ایک کا گناہ ملتا رہے گا۔ حدیث میں ہے:

من سن سنة سيئة فله وزرها ووزر من عمل بها.

جس نے بھی کسی بری بات کا طریقہ ایجاد کیا اس کے لئے اس کو برائی کرنے اور برائی کرنے والے کے برابر ایک ایک گناہ ملے گا۔

اس لئے حکومت کے با اختیار لوگوں کو چاہیئے کہ اس امر غیر شرعی کو بھی ختم کرنے کے اقدامات کریں۔

☆ لیکن حکومت یا اس کے اوپر قابض لوگ اگر دوسری برائیوں کی طرح اس کو بھی ختم نہیں کرتے تو دوسرے درجہ میں جتنے سرکاری ملازمین اور اس تصویر سازی کے کام میں وہ مبتلا ہیں، ان کو حکومت اور ارباب حکومت سے اس امر قبیح کو ختم کرنے کا مطالبہ کرنا چاہیئے اور جہاں جہاں اور جس قدر ممکن ہو تصاویر کے عمل اور اس کی اشاعت اور اضافے کو روکنے کی جدوجہد کرنی چاہیئے۔ کامیاب ہوتے ہی عنداللہ دوہرا اجر ملے گا اور اگر نا کام ہوتے ہیں تو پھر بھی اجر ہے۔

☆ اگر بامر مجبوری تصویر سازی اور تصویر کشی کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے تو حلال روزی کی غرض سے ایسے پیشے اور ملازمت کو چھوڑنا ضروری ہے۔

☆ رہا عامۃ الناس کیا کریں تو اس کی وضاحت یہ ہے۔

☆ عامۃ الناس کے لئے حکم یہ ہے کہ جو کام فرض یا واجب کے درجے میں ہے تصاویر کے بغیر وہ فرض یا واجب ادا کرنے کا کوئی جائز طریقہ موجود نہیں ہے تو بامر مجبوری اس کو ناجائز اور حرام سمجھتے ہوئے اختیار کرنے کی اجازت ہے۔

مثلاً پاسپورٹ کے بغیر حج فرض ادا نہیں ہوسکتا۔ شناختی کارڈ کے بغیر شہری اور ملکی حقوق حاصل نہیں کئے جاسکتے تو ان حالات میں مبتلیٰ بہ لوگوں کے لئے تصاویر کا استعمال مباح ہوگا۔

☆ اور جو امور فرض یا واجب کے درجہ میں نہیں ہیں ان کے لئے تصاویر بنانا یا تصاویر کا استعمال کرنا جائز نہیں ہوگا۔

☆ بلا تصاویر کپڑے ملتے ہیں، ضرورت پوری ہوسکتی ہے۔ اس لئے تصاویر والے کپڑوں کا استعمال جائز نہیں ہوگا۔ تصویر والے کپڑے استعمال کرنے کے بارے میں کوئی شرعی عذر بھی نہیں ہے؟

☆ جو اشیاء جاندار کی تصاویر کے بغیر ملتی نہیں ہیں اور ان کا خریدنا ضرورت کے درجہ میں نہیں ہیں تو ان تصاویر والی اشیاء کا خریدنا درست نہیں ہے۔

☆ البتہ اگر ان چیزوں کا خریدنا ضرورت کے درجہ میں ہو تو ان اشیاء کا خریدنا مباح ہوگا البتہ تصاویر کو ختم کرنے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔

☆ کھانے کی بعض چیزوں میں مثلاً بسکٹ وغیرہ میں جاندار کی تصاویر چھاپ دیتے ہیں۔ چھاپنے والے تو گنہگار ہوں گے لیکن ان بسکٹوں کو کھانے والے گنہگار نہ ہوں گے۔

☆ جن تصاویر والی چیزوں کو خریدنا یا گھر میں رکھنا منع ہے اس سے مراد جاندار کی تصاویر ہیں۔ غیر جاندار کی تصاویر مراد نہیں ہیں کیونکہ وہ جائز ہیں۔

☆ نیز اس سے مراد وہ تصاویر ہیں جو بڑی اور نمایاں ہوں۔ آمنے سامنے دو آدمی کھڑے ہونے پر واضح تصویر معلوم ہوتی ہو مگر جو تصاویر اتنی چھوٹی ہیں کہ بغور نظر ڈالنے سے تو نظر آتی ہیں ورنہ تصاویر معلوم نہیں ہوتیں۔ ایسی تصاویر والی اشیاء خریدنا یا رکھنا منع نہیں ہیں۔

☆ جاندار کی جو تصاویر مکمل نہیں ہیں بلکہ جسم کا آدھا حصہ یا کچھ حصہ ہے تو اس میں تفصیل یہ ہے۔

☆ اگر نامکمل تصویر نصف اسفل یعنی نچلے حصّہ کی ہے تو منع نہیں ہے اور اگر نصف اعلیٰ اوپر والے حصّہ کی ہے تو ناجائز وحرام ہے۔

☆ جاندار کی ناقص تصاویر اگر صرف کسی عضو مکمل کی تصویر ہے مثلاً ہاتھ، پاؤں، سر، سینہ، پیر وغیرہ پھر بھی منع نہیں ہے کیونکہ شرعاً یہ تصاویر ممنوعہ میں داخل ہی نہیں ہیں۔

☆ تصاویر والی فرش، قالین، بچھانے کی چادریں، دریاں تیار کرنا بھی ناجائز وحرام ہے کیونکہ احادیث میں ہر مصور کے لئے وعید آئی ہے۔

اور ایسی دریوں، قالین، چادروں کا استعمال، دنیاداری، اور تزئین کے لئے ہوتا ہے۔ زہد وتقویٰ کے بھی خلاف ہے۔ آلات لہو ولعب ہے۔ اس لئے درست نہیں ہے۔ اور تصاویر کی وجہ سے فرشتے بھی داخل نہیں ہوتے۔

☆ جتنے تصاویر والے کپڑے ہیں انہیں اگر اس طرح لباس تیار کیا جائے کہ تصاویر کٹ جائیں کامل تصاویر نظر نہ آویں تو ایسے کپڑوں کا استعمال جائز ہے چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے تصاویر والی چادر اور پردے کو کاٹ کر تکیہ، غلاف اور گدّے کی چادر بنائی تھی۔

☆ جو ناجائز تصاویر یا تصاویر والی اشیاء گھر میں موجود ہیں سب سے پہلے تو ان کو رکھنا ہی نہیں چاہیئے جلانے کے قابل ہوں تو جلا دیا کریں اور اگر قیمتی اشیاء ہیں تو تصاویر کو مٹا دینے کی سعی کرے یا کم از کم ان کو بکس میں یا الماری میں رکھ دے اس سے کراہت میں کمی آجائے گی۔

بہر حال ایسی تصویر والی چیزوں کو رہائش کے کمرے میں نہ رکھا جائے، گھر سے نکال دیں، جلا دیں یا کم از کم اسٹور یا فالتو کمرے میں چھپا کر رکھا جائے۔

☆ بعض لوگ گاڑیوں میں اپنے کمرے اور دفتروں میں اپنے نزدیک محترم شخصیت کی تصاویر لٹکائے رکھتے ہیں یہ سخت گناہ ہے۔ ایسی حالت میں رحمت کے فرشتے نہیں آئیں گے۔ زندگی اور موت کو

بھی سوچ لیں کب کیا ہوگا کچھ پتہ نہیں ہے۔

☆ بعض لوگوں کو اندرون ملک یا بیرون ملک کی بڑی شخصیتوں کی تصاویر مختلف انداز سے مختلف طریقے سے بغرض احترام بطور فیشن گھر میں، گاڑی میں، دفتر یا دکانوں میں لٹکانے کا شوق ہوتا ہے۔ بڑے شوق سے اس طرح کی تصاویر مہیا کرواتے ہیں، چھاپتے ہیں، اپنے پاس رکھتے ہیں یہ سب گناہ کی باتیں ہیں۔

☆ بعض وقت یہ تصاویر جھگڑے اور فساد کا سبب بن جاتی ہیں کہ ایک آدمی کسی بڑی شخصیت کا عقیدت مند ہوتا ہے جبکہ دوسرا ایسا نہیں ہوتا اس سے دو آدمیوں کے درمیان فکری و عملی لحاظ سے اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور ایک دوسرے کے جانی دشمن بن جاتے ہیں۔ دیکھئے تصویر رکھنا کتنے بڑے فتنے کا سبب بن گیا ہے۔

☆ کسی شخص کی عظمت و بزرگی کی بنیاد پر تصاویر رکھنا، بت پرست لوگوں کی مشابہت رکھتا ہے لہٰذا اس سے بچنا بہت ضروری ہے۔

☆ سننے میں آیا کہ بعض لوگ بڑی شخصیتوں کی تصاویر کا اتنا احترام کرتے ہیں کہ صبح گھر سے نکلتے وقت ان تصاویر کو سلام کر کے جاتے ہیں اور جب گھر واپس آتے ہیں ان تصاویر کو سلام کرتے ہیں یہ ناجائز و حرام ہے موجب کفر ہے۔

☆ اور یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ بعض نادان اور جاہل مسلمان اس طرح اپنے نزدیک بڑی شخصیت کی تصاویر کے ساتھ صبح و شام جھکتے ہیں اور جھکتے ہوئے سلام عرض کرتے ہیں۔ کسی مخلوق کے سامنے جھکنا، سجدہ یا رکوع جیسی کیفیت اختیار کرنا اگر بنیت عبادت ہے تو شرک ہے اور اگر بنیت تعظیم ہے تو سخت کبیرہ گناہ ہے۔ بعینہ یہی حکم تصاویر کے بارے میں ہے۔

تصاویر کا دیکھنا

☆ جیسا کہ تصاویر کا چھاپنا، رکھنا، ناجائز ہے اس طرح احتراماً، تلذذاً (مزہ لینے کے لئے) انہیں دیکھنا بھی ناجائز و حرام ہے یہ حکم عام جاندار کی تصاویر سے متعلق ہے۔

☆ عورتوں کی تصاویر چھاپنا، چھپوانا، اس طرح کی تصاویر رکھنا، دیکھنا خواہ محرم ہوں یا غیر محرم ہر حالت میں ناجائز ہے۔

☆ غیر محرم کی تصاویر، بالغ اور جوان عورتوں کی تصاویر کا چھاپنا چھپوانا اور ان کا رکھنا اور ان کو بلا وجہ شرعی

دیکھنا ناجائز وحرام ہے۔

☆ سرکاری محکموں میں ضرورت تفتیش کے لئے عدالت کے ججوں، قاضی اور مفتی کے لئے جب فیصلہ اور فتویٰ دیتے وقت اس کی ضرورت پڑے تصاویر کا دیکھنا خواہ مرد کی ہوں یا عورت کی بوجہ ضرورت وحاجت جائز ہے جیسا کہ غیر محرم عورتوں کا چہرہ دیکھنا بھی ایسے موقع پر جائز ہوتا ہے۔

☆ تصاویر والے اخبارات، رسائل، جرائد، کتابیں وغیرہ دیکھنا اگر دینی مقصد والے یا ضروری معلومات کے لئے ہوں تو جائز ہے البتہ ان میں موجود تصاویر دیکھنے سے بچنا ضروری ہے۔ اتفاقیہ نظر پڑ جائے نظر کو ہٹالینا چاہیئے، خاص طور پر عورتوں کی اور سینماؤں کی تصاویر سے۔

☆ تصاویر والی کتابوں، رسالوں، اخبارات، اشتہارات وغیرہ کو جلا دینا ہی مناسب ہے۔

بعض تجارتی اور خرید وفروخت کے بنیادی اصول

شریعت نے تجارت اور خرید وفروخت کے بعض اہم اور بنیادی اصولوں پر بہت زور دیا ہے۔ ان اصولوں کی پابندی کرنے سے معاشرہ کی اصلاح ہوتی ہے اور ایک عادلانہ مالیاتی نظام قائم ہوجاتا ہے اور دولت پورے ملک کے عوام میں منصفانہ طریقے پر تقسیم ہوتی ہے۔ اور ان اصولوں کی خلاف ورزی سے سرمایہ دارانہ نظام قائم ہوجاتا ہے اور دولت چند سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں جمع ہوجاتی ہے اور ملک کے عوام غربت وافلاس میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ حکومت اور ملک دیوالیہ پن کے شکار ہوجاتے ہیں۔ اس وقت بندہ اسلام کے ان زریں اصولوں کی نشاندہی کرنا چاہتا ہے، ہر تاجر اور بیوپاری کے لئے ضروری ہے کہ اگر ایمانداری سے وہ تجارت اور بیپار کرنا چاہتا ہے اور حلال طریقے پر کاروبار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور بے ایمانی، دھوکہ اور فریب سے پرہیز کرنا چاہتا ہے تو ان اصولوں کی پابندی کرے اور سختی سے ان پر عمل کرے اور انتظامی لحاظ سے ہر حکومت اور انتظامیہ کے لئے لازم ہے کہ ان اصولوں کی بنیاد پر تجارتی قوانین مرتب کرے اور قانون کے تحت تاجروں اور بیوپاری لوگوں کو ان تجارتی قوانین کے پابند بنائے۔ خلاف ورزی کی صورت میں ایسے تاجروں کا مواخذہ اور محاسبہ کرے" وہ بنیادی اصول یہ ہیں۔

اصول نمبر ا: سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ جس چیز کو فروخت کیا جائے وہ از روئے شرع مال کی تعریف میں آتی ہو۔ چنانچہ بیع کی تعریف میں یہ بات واضح طور پر موجود ہے۔

"البیع هو مبادلة المال بالمال"

بیع کا معنی یہ ہے کہ مال کے بدلے مال لیا جائے۔

اس اصول کے تحت اشیاء محرمہ مثلاً شراب، سور، خون وغیرہ چونکہ شرعاً مسلمانوں کے لئے مال کے حکم میں نہیں آتے اس لئے ان کی خرید وفروخت مسلمانوں کے لئے جائز نہیں ہے جیسے مردار جانور اور اس کے اجزاء، بت اور ہر قسم کے مجسمے، تصاویر وغیرہ (کے حوالے اوپر گذر چکے ہیں مزید حوالے آگے ملاحظہ فرمائیں گے)۔ اور جتنی اشیاء حلال ہیں اور وہ مال کی تعریف میں آتی ہیں جائز طریقے پر ان کی خرید وفروخت جائز ہے۔

اصول نمبر۲: شریعت اسلامیہ نے ان تمام خرید وفروخت اور معاملات کو ممنوع قرار دیا ہے جس میں دھوکہ دہی اور فریب کاری ہوتی ہو یا کسی قسم کی جہالت پائی جاتی ہو۔

حدیث شریف میں ہے:

ونهٰی رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الغرر. (بخاری و مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دھوکہ والی خرید وفروخت سے منع فرمایا ہے۔

(الف) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھاگے ہوئے غلام اور بھاگے ہوئے جانور کو فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم شریف)

اس کی وجہ یہ ہے کہ جو جانور مالک کے پاس نہیں ہے نہ اس کے علم میں ہے کہ کہاں پر ہے تاکہ اس پر قبضہ کر سکے اسی حالت میں اگر خرید وفروخت کرتا ہے تو اس میں دھوکہ ہو سکتا ہے کہ خریدار کو خریدنے کے بعد جانور نہ ملے اور فروخت کنندہ مفت میں پیسہ وصول کر لے۔

ہاں فروخت کنندا اگر اس شرط پر فروخت کرتا ہے کہ قبضہ بھی دلا دے گا اور اس کی ذمہ داری لیتا ہے پھر بیع جائز ہوگی۔

(ب) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جانور کے پیٹ میں جو بچہ ہے اس کو فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے۔

نهٰی رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الحبلة وحبل الحبلة. (مسلم)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جانوروں کے پیٹ کے اندر بچے اور اس سے ہونے والے بچے کو فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز فی الحال اپنے پاس موجود اور قابل تسلیم نہیں ہے اور مستقبل میں اس کا وجود اور قابل تسلیم ہو سکتی ہے اس کی خرید وفروخت ناجائز ہے۔

(ج) جانوروں کے تھن میں موجود دودھ کو جب تک اس کو نکالا نہ جائے فروخت کرنا جائز نہیں ہے

کیونکہ تھن میں موجود دودھ کی مقدار معلوم نہیں ہے اس میں اگر اندازہ بھی ہے تو اندازہ میں کمی بیشی ہوسکتی ہے تو اس میں دھوکہ ہوگا۔ اگر دودھ زیادہ نکلا تو بائع کا نقصان ہے اور اگر دودھ کم نکلا تو خریدار کا نقصان ہے۔ غرض دونوں میں سے کوئی نہ کوئی دھوکہ میں مبتلا ہوکر نقصان اٹھا سکتا ہے البتہ اگر اس طرح معاملہ کرے کہ ان جانوروں کے تھنوں میں جو دودھ ہے اس کو نکالنے کے بعد جو مقدار ہوگی اس کو اتنے روپے فی کلو فروخت کروں گا اور خریدار کہے کہ میں خریدوں گا تو یہ وعدہ بیع ہوگا۔ بائع اور خریدار دونوں وعدے کے پابند ہوں گے خلاف ورزی کرنا گناہ ہوگا۔

(د) ذاتی نہر اور تالاب میں موجود مچھلیاں جو کہ ابھی تک پانی کے اندر ہیں جن کا اندازہ معلوم نہیں کتنی ہیں ان مچھلیوں کو یوں فروخت کرنا کہ اس تالاب میں یا نہر میں جو مچھلیاں ہیں ان کو اتنے روپؤں میں فروخت کرتا ہوں۔ خریدار کہے کہ میں خریدتا ہوں جائز نہیں ہے کیونکہ تالاب میں موجود مچھلیوں کا قطعی اندازہ کسی کو معلوم نہیں ہے۔ ممکن ہے بائع کے اندازہ سے زیادہ ہوں۔ پھر اس کو دھوکہ ہوگا اور وہ نقصان میں ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ مچھلیاں خریدار کے اندازہ سے کم ہوں پھر اس کو دھوکہ ہوگا اور وہ نقصان میں مبتلا ہوگا۔ اس واسطے شریعت کے اصول کے مطابق اس طرح بیع کرنا جائز نہیں ہے جس میں بائع یا مشتری میں سے کوئی نہ کوئی دھوکہ میں مبتلا ہوسکتا ہے۔

اصول نمبر ۳: جو چیز اپنی ملک میں نہیں ہے کسی دوسرے کی ملک میں ہے اس کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔

بہز بن حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

قال یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یأتینی الرّجل فیرید منی البیع لیس عندی أفأبتاعه له من السوق فقال لاتبع مالیس عندک. (ابو داؤد)

بہز بن حکیم روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میرے پاس آدمی کوئی چیز خریدنے آتا ہے جو کہ میرے پاس نہیں ہوتی کیا میں اس کو بازار سے خرید کر فروخت کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو چیز فی الحال تمہاری ملک میں نہیں ہے اس کو مت بیچو۔

حدیث مذکور میں واضح طور پر منع کیا گیا ہے کہ جو چیز آدمی کی ملک میں موجود نہ ہو اس امید سے کہ بازار میں یہی چیز موجود ہے اس کو خرید کر قبضہ دے سکتا ہے نہ بیچی جاوے کیونکہ اس طرح بیع کرنے سے بیع ہوتی نہیں اور یہ بیع معدوم ہے۔ مثلاً

ایک شخص دکان لے کر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے پاس گاہک آتا ہے یا ٹیلیفون کرتا ہے کہ مجھے اتنے تھان فلاں مل کے فلاں کپڑا اس صفت، اور اس رنگ کا چاہیئے۔ دکاندار کے پاس وہی کپڑا اپنی ملک میں نہیں ہے۔ پھر بھی وہ خریدار سے بھاؤ متعین کر کے بیع کر لیتا ہے کہ وہی کپڑے میرے پاس ہیں۔ اس کی قیمت فی میٹر دس روپے ہوں گے خریدار معاملہ پر راضی ہو کر سودا طے کر لیتا ہے اور دکاندار وعدہ دیتا ہے کہ مال فلاں وقت میں آ کر اٹھا لینا، دکاندار وہی کپڑا اس کے کہنے کے مطابق ایسی دکان سے جس میں کم دام پر ملتا ہے خرید کر اپنی دکان سے خریدار کے حوالہ کرتا ہے یا کبھی یوں کرتا ہے کہ وہ جس دکان سے خریداری کرتا ہے اس کا حوالہ دیتا ہے کہ میرا مال فلاں دکان میں پڑا ہوا ہے وہاں سے اٹھا لینا۔ خریدار اسے قبول کر لیتا ہے پھر خریدار کے مال اٹھانے سے پہلے دکاندار تیسرے شخص کو مطلع کر دیتا ہے اور اس سے چیز خرید لیتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ فلاں آدمی بیع (مال) اٹھانے آئے گا اس کو حوالہ کر دینا۔ خریدار طے شدہ پروگرام کے مطابق تیسرے شخص کی دکان سے مال اٹھا لیتا ہے۔ شرعاً اس طرح بیع کرنا ناجائز ہے۔ اس لئے کہ فروخت کنندہ نے ایسی چیز کی بیع کی ہے جو کہ اس کی ملک میں نہ تھی۔

دوسری مثال یہ ہے کہ ایک آدمی کسی کمپنی کی ایک گاڑی، ایک لاکھ روپے قیمت پر خریدنے کی غرض سے بیس ہزار روپے پیشگی ادائیگی پر اپنے لئے بک کرا لیتا ہے۔ گاڑی کمپنی کے پاس تیار نہیں ہوتی اس لئے وہ ٹائم دیتی ہے کہ مثلاً چار ماہ چھ ماہ کے بعد گاڑی ملے گی۔ کچھ رقم کمپنی اس سے وصول کر لیتی ہے یہ سودا تو جائز ہے۔ کیونکہ یہ شرعاً استصناع کی صورت ہے کہ جو چیز بننے یا بنانے دی جاتی ہے اور اس کی تمام صفات بیان کر دی جاتی ہے اس طرح کا معاملہ کرنا جائز ہے مثلاً کپڑا بنوانے دیا یا جوتا بنوانے دیا وغیرہ وغیرہ۔

لیکن جس شخص نے گاڑی بک کرائی ہے اور اس کے پاس گاڑی بک کرانے اور کچھ رقم ادا کرنے کی رسید اور کاغذات موجود ہیں تو یہ شخص آگے کسی دوسرے شخص کو کسی زائد یا کم قیمت پر گاڑی کی رسید کو فروخت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ گاڑی فی الحال اس کی ملک میں نہیں آئی۔ اس کے پاس صرف کچھ رقم جمع کرانے کی رسید ہے۔ لہٰذا گاڑی بک کرانے والا اگر ایک لاکھ روپے پر خریدی ہوئی گاڑی کے کاغذات کو فروخت کرتا ہے اور بیس ہزار روپے کے مقابلہ میں خریدار سے چالیس ہزار روپے وصول کر لیتا ہے باقی کمپنی کے حوالے کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ گاڑی بک کرانے والا بیس ہزار روپے کی رسید کے بدلے میں چالیس ہزار روپے وصول کرتا ہے اور یہ سود ہے جو کہ حلال نہیں ہے۔ کیونکہ گاڑی تو اس کے قبضے میں نہیں ہے۔ صرف بیس ہزار روپے کی رسید ہے۔ اس واسطے زائد رقم اور منافع کی نسبت گاڑی کی

طرف نہ ہوگی بلکہ بیس ہزار روپے کی رسید کی طرف ہوگی لہٰذا اس طرح گاڑیوں کی رسیدوں کی خرید و فروخت کمی وبیشی کے ساتھ جائز نہیں ہے۔

اس طرح اگر گاڑی بک کرانے والا کسی مجبوری کی بناء پر بیس ہزار روپے پر بک کرائی ہوئی گاڑی کو جو کہ ابھی تک اس کے قبضہ میں نہیں آئی کم قیمت پر فروخت کر دیتا ہے تو یہ بھی جائز نہیں ہے۔ اس واسطے کہ گاڑی تو موجود نہیں ہے۔ صرف بیس ہزار روپے کی رسید ہے۔ لہٰذا بیس ہزار روپے کی رسید کو اس سے کم قیمت پر فروخت کرنا یہ بھی سودی معاملہ ہے۔ گویا گاڑی بک کرانے والے سے دوسرا خریدار سود لے رہا ہے لہٰذا یہ بھی ناجائز ہے۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ بیس ہزار روپے کی رسید پر بیس ہزار روپے وصول کر کے گاڑی بک کرانے کی رسید دوسرے کے نام منتقل کر دے یہ حوالہ ہو جائے گا۔

تیسری مثال

بعض پاکستانی لوگ بیرون ملک سے مال منگواتے ہیں مثلاً گندم منگوالی، چاول منگوالئے، چائے منگوائی یا دوسری چیزیں۔ ابھی تک یہ چیزیں پاکستان میں پہنچی نہیں ہوتی۔ بعض دفعہ باہر ملک کے بیوپاری مال کو جہازوں میں چڑھا دیتے ہیں۔ بعض دفعہ مال ابھی تک جہازوں میں چڑھایا بھی نہیں ہوتا۔ صرف خرید وفروخت کے کاغذات پاکستانی تاجروں کو بھیج دیتے ہیں۔ اب پاکستانی تاجر خریداری کی رسید اور قیمت کی بنیاد پر منافع لگا کر وہی مال جو اب تک بیرون ملک میں ہے ان کے قبضہ میں نہیں آیا ہے، دوسرے اور تیسرے شخص کو فروخت کر دیتے ہیں۔ اس طرح سلسلہ بسلسلہ کئی افراد تک ان کاغذات اور رسیدوں کی خرید وفروخت ہو جاتی ہے جبکہ ابھی تک مال آیا نہیں ہوتا اس طرح خرید وفروخت کرنا بھی ناجائز وحرام ہے۔

کیونکہ زائد قیمت اور منافع پر فروخت کرنے میں سود لینا ہوتا ہے اور کم قیمت پر دیتا ہے تو سود دینا ہوتا ہے۔ اس واسطے کہ اس خریدار نے بیرون ملک سے قیمت خرید مثلاً ہزار روپے فی بوری ادا کئے ہیں اب اگر اس کو بارہ سو پر فروخت کرتے ہیں۔ مال تو موجود نہیں صرف ہزار روپے ادا کرنے کی رسید ہے تو ہزار روپے کی رسید کو گویا بارہ سو روپے پر فروخت کر رہے ہیں۔ اس لئے یہ معاملہ سودی ہوا اور ناجائز ہوا، اور اگر کم قیمت پر فروخت کیا ہے تو بھی جائز نہیں ہے اس لئے کہ ہزار روپے کی رسید کو سو روپے پر فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ البتہ جتنے روپے کی رسید ہے اتنے روپے پر دوسرے یا تیسرے پر حوالہ جائز ہے۔

مذکورہ بالا تمثیلات سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ جو مال اپنی ملکیت میں نہیں ہوتا اس کو فروخت کرنا

کسی حال میں جائز نہیں ہے لہٰذا موجودہ حالات میں غیر موجود مال کی خرید وفروخت کرنے کے بے شمار طریقے جو تاجر برادری میں رائج ہیں وہ شرعاً ممنوع ہیں اور اس کی بے شمار وجوہات ہوسکتی ہیں۔

شریعت نے جو بعض وجوہات بیان کی ہیں وہ یہ ہیں کہ فروخت کنندہ جب خود مال پر قابض نہیں ہے تو دوسرے کو قبضہ نہیں دے سکتا اور اس میں دھوکہ ہوسکتا ہے کہ مال وقت پر نہ پہنچے تو خریدار کا نقصان ہوا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ مال کسی حادثہ میں ضائع ہوجائے پھر اس کا نقصان ہوجائے۔

اس کے علاوہ اگر بدون قبضہ کئے اس طرح کی خرید وفروخت اگر جائز ہو تو بہت سے سرمایہ دار اپنے سرمایہ کے زور سے سود در سود کماتے رہیں گے کیونکہ جو مال ابھی تک اس کے قبضہ میں نہیں آیا اس پر سود لے کر فروخت کرتا ہے اور دوسرا شخص اس پر مزید سود لے کر تیسرے شخص کو سود پر فروخت کرتا ہے اور تیسرا شخص چوتھے شخص کو سود پر فروخت کردیتا ہے اور مال ابھی بیرون ملک میں پڑا ہوا ہے اور کئی ہاتھوں میں فروخت ہوگیا ہے اور جو لوگ سرمایہ دار نہیں ہیں نقد رقم دے کر مال نہیں منگوا سکتے وہ سود دینے پر مجبور ہوجائیں گے۔ اس طرح پیسے والا امیر سے امیر تر ہوجائے گا اور غریبوں پر اس کا بوجھ پڑے گا اور اس میں ملکی معیشت کی تباہی ہوتی ہے کہ جو مال ہزار روپے فی بوری کے حساب سے بیرون ملک سے آرہا ہے وہ مختلف بیوپاریوں کے ہاتھوں فروخت ہونے کی وجہ سے ہزار روپے سے ڈیڑھ ہزار دو ہزار فی بوری بھی ہوسکتا ہے اس طرح دوسرے اموال اور اشیاء کو بھی قیاس کرلیا جائے۔ غرض یہ کہ جو چیز ملکیت میں نہیں آئی اسے فروخت کرنا جائز نہیں ہے جو چیز ملکیت میں آگئی ہے لیکن قبضہ میں نہیں آئی اس کو فروخت کرنا بھی منع ہے۔

اصول نمبر ۴: اس اصول کے ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری حدیث بھی ملاحظہ فرمائیے۔

عن ابن عباس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنھما قال أما الذی نھٰی عنه النّبی صلی اللّٰہ علیه وسلم فھوا لطعام حتی یقبض قال ابن عباس ولا احسب کل شئ الا مثله. (بخاری)

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ کاروبار کی وہ صورت جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ گندم، آٹا، کا فروخت کرنا کہ جب تک گندم، آٹا بائع کے قبضہ میں نہ آجاوے وہ کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کرے، ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہی حکم تمام اشیاء کے لئے ہے۔

نیز حدیث کے بعض طرق میں الفاظ اس طرح ہیں۔

من ابتاع طعاماً فلا يبعه حتى يستوفيه. (مسلم ص ۵، ج. ۲)

جس نے گندم خریدی پس جب تک اس کو وصول نہ کرے آگے کسی کے ہاتھ نہ بیچے۔

اور بعض روایت میں ہے۔

نهانا أن نبيعه حتى ننقله من مكانه. (مسلم ص ۵، ج. ۱۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں منع فرمایا کہ جب تک گندم وصول کر کے اپنے جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہ کر لیا جاوے اس وقت تک نہ بیچا جائے۔

اور بعض روایت میں ہے:

من اشترى طعاماً فلا يبعه حتى يكتاله. (مسلم ص ۵، ج. ۲)

جس نے گندم خریدی پس اس کو جب تک ناپ کر وصول نہ کر لے دوسرے کے ہاتھ مت بیچے۔

مذکورہ بالا تمام روایات کا خلاصہ یہ نکلا کہ:

(الف) جو اشیاء منقولہ معاہدۂ معاملہ کے تحت خریدی گئیں لیکن ابھی تک باقاعدہ بائع سے وصول نہیں کی گئیں دوسرے کے ہاتھوں میں ان کو فروخت کرنا درست نہیں ہے۔

(ب) کسی شۓ منقولہ کو خریدنے کے بعد قبضہ کا تحقق اس وقت ہوگا کہ خریدی ہوئی شۓ اگر وزنی ہو تو وزن کر کے اور کیلی ہو تو کیل کر کے اور عددی ہو تو شمار کر کے بائع کے قبضہ سے نکالی جاوے۔

(ج) یعنی خریدی ہوئی شے، بائع کی حفاظت سے نکال کر خریدار کی حفاظت میں آجاوے۔

حدیث کے الفاظ یوں ہیں کہ:

"بائع کی جگہ سے خریدار کی جگہ پر منتقل کر لی جاوے۔"

لہٰذا ان شرائط کے ساتھ اگر خریدی ہوئی شۓ خریدار کی تحویل میں نہیں آئی بلکہ شۓ مبیع بائع کی دکان میں اس کی دوسری اشیاء کے ساتھ پڑی ہوئی ہے یا اس کی فیکٹری یا کارخانے میں ہی پڑی ہوئی ہے، نہ مبیع پر ناپ تول کا عمل ہوا، نہ ہی بائع کی جگہ سے خریدار کی جگہ پر منتقلی کا عمل ہوا تو ایسے حالات میں خریدار کا شۓ مبیع کو کسی دوسرے کے ہاتھ میں فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

مذکورہ بالا ان دونوں اصول نمبر ۲ اور ۳ کے تحت آج کل کے بے شمار تجارتی معاملات ناجائز ہوتے ہیں۔ بندہ کے خیال میں ۸۰ تا ۹۰ فیصد معاملات اس طرح ہوتے ہوں گے۔

واضح رہے کہ مذکورہ بالا دونوں اصول سے ''بیع استصناع'' اور ''بیع سلم'' حدیث پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی رو سے مستثنیٰ ہیں۔

استصناع۔یعنی جو مال کارخانہ دار کے کارخانہ میں یا فیکٹری والے کی فیکٹری میں فی الحال تیار نہیں ہے۔شرائط اور صفات متعین کرکے اس چیز کی خریداری کا آرڈر دینا اور خریدار سے بننے والی شے کی پوری یا بعض قیمت کا وصول کرلینا جائز ہے۔اس کو بیع استصناع کہا جاتا ہے۔

بیع استصناع کے تحت فیکٹری اور کارخانہ دار کا جو مال تیار نہیں ہے اس کا اس طرح فروخت کرنا کہ بننے والی اشیاء مقررہ صفات مقررہ مقدار، متعینہ قیمت کے ساتھ وقت مقررہ پر حوالہ کرے گا جائز ہے مگر فیکٹری اور کارخانہ دار سے خریدنے والوں کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ جب تک مال فیکٹری اور کارخانہ سے وصول نہ کرلیں دوسروں کو فروخت کریں۔

اسی طرح جو شئے فی الحال بائع کے پاس موجود نہیں ہے لیکن بیع سلم کے تحت شرائط اور صفات کا تعین کرکے بائع اور مشتری یہ صورت اختیار کرسکتے ہیں کہ بائع شئے مبیع کی پوری قیمت پہلے خریدار سے وصول کرلے اور ایک مدّت معیّنہ کے بعد سے مبیع شرائط کے مطابق اگر وزنی ہو وزن کرکے کیلی ہو تو کیل کرکے، عددی ہو تو شمار کرکے، مزروعات ہو تو ناپ کرکے خریدار کے حوالہ کرے۔

واضح رہے بیع سلم ہر چیز میں جائز نہیں ہے بلکہ صرف وزنی، کیلی یا مزروعی اشیاء اور ان عددی اشیاء میں جائز ہے جن کے عدد میں باعتبار جسم، صفات، قیمت میں خاصا فرق نہیں ہے۔مثلاً انڈے ہیں اور جن عددی اشیاء میں باعتبار جسم، صفت، قیمت فرق اور تفاوت ہے ان میں بیع سلم جائز نہیں مثلاً ہر قسم کے جانور، تربوز، خربوزہ جبکہ عدداً فروخت کیا جائے۔

غرض یہ کہ سوائے استصناع اور بیع سلم کے آدمی جس شئے کا فی الحال خود مالک نہیں ہے اور وہ شئے دوسرے کی ملک میں ہے اس کی خرید وفروخت نہیں کرسکتا۔اگر کوئی شخص مالک ہونے سے قبل یا قبضہ میں آنے سے قبل کسی شئے کی خرید وفروخت کرتا ہے اس خرید وفروخت میں جو نفع آئے گا وہ ناجائز ہوگا۔

مثلاً آج کل یہ رواج ہوگیا ہے کہ ایک بیوپاری کسی فیکٹری یا کارخانہ دار سے بات طے کرلیتا ہے کہ فلاں فلاں دام پر مجھے ایک ہزار تھان فلاں کپڑے فروخت کرو فلاں آیٹم کی گندم ایک ہزار بوری دے دو، فیکٹری کا مالک یا کارخانہ دار اسے قبول کرلیتا ہے، مال ابھی کارخانہ دار کے قبضے میں ہوتا ہے اور خریدار دوسرے کے ہاتھ وہی مال زائد قیمت پر فروخت کردیتا ہے مال دوسرا خریدار اٹھاتا ہے اس طرح کی بیع ناجائز ہے علیٰ ہذا القیاس دوسری اشیاء منقولہ کا حکم ہے۔

اصول نمبر ۵: تجارت اور کاروباری معاملات میں صداقت اور سچائی بہت ضروری ہے۔

جس کاروبار میں صداقت اور سچائی پائی جاتی ہے وہ کاروبار جائز ہے برکت والا ہے حلال کمائی کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے لیکن جس کاروبار میں جھوٹ اور غلط بیانی آجاتی ہے وہ ناجائز کاروبار ہے اس میں برکت نہیں ہوتی۔ چنانچہ حدیث میں ہے (اس سے قبل حدیث کے الفاظ اور تشریح گذر چکی ہے) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سچے تاجر بروز قیامت نبیوں، صدیقوں اور شہداء کے ساتھ ہوں گے۔ (ترمذی کتاب البیوع)

دوسری حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تاجر برادری کے لوگوں کا حشر بروز قیامت فجار کی حالت میں ہوگا مگر یہ کہ جس نے اللہ سے ڈر کر تقویٰ اختیار کیا اور نیکی اور سچائی کے ساتھ کاروبار کیا۔ (ترمذی، کتاب البیوع)

اس کے برعکس جن لوگوں نے کاروبار میں جھوٹ سے کام لیا۔ اور جھوٹی قسمیں کھا کھا کر مال کو فروخت کیا ان کے بارے میں سخت وعید آئی ہیں۔

عن أبی ذرّ عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال ثلثة لاینظر اللّٰہ الیهم یوم القیامة ولایزکّیهم ولهم عذاب الیم. قلت من هم یا رسول اللّٰہ؟ فقد خابوا وخاسروا. قال المنّان، والمسبل ازاره، والمنفق سلعة بالحلف الکاذب.

(ترمذی شریف)

ابوذر رضی اللہ عنہ نبی علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین آدمی ایسے ہیں کہ بروز قیامت اللہ تعالیٰ ان کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائیں گے نہ انہیں ان کے گناہوں سے معاف کر کے پاک کریں گے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا (ابوذر نے کہا) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا یا رسول اللہ یہ لوگ جو بڑے ہی نامراد ہوئے اور خسارے میں رہے کون ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک تو وہ شخص جو کہ کسی کے ساتھ نیکی کر کے پھر احسان جتلاتا ہے، اس کا طعنہ دیتا ہے۔ دوسرا جو ٹخنوں کے نیچے تک لنگی یا پائجامہ پہنتا ہے، تیسرا وہ شخص جو جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنے مال کو فروخت کرتا ہے۔

احادیث مذکورہ سے ثابت ہوا کہ سچائی اور صداقت کی تجارت اور کاروبار بڑی فضیلت اور برکت والی چیز ہے اس پر ایمان اور یقین آنا ضروری ہے۔ ورنہ ایمان بھی ناقص ہوگا پھر عمل کیسے ممکن ہو۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ تجارت میں جھوٹ سے کام لینا اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غضب کا سبب ہے جس کا انجام کار جہنم میں جانا ہے۔ پھر ایسی تجارت میں نہ ہی برکت ہوتی ہے۔ اس واسطے کاروباری سلسلہ میں جھوٹ سے بچنا بہت ہی ضروری ہے۔

لہٰذا جھوٹ کے نتیجے میں جو کمائی بڑھی ہوگی وہ ناجائز آمدنی میں شمار ہوگی مثلاً کسی چیز کو دکاندار نے دس روپے میں خریدا ہے۔ خریدار کے سامنے ظاہر کرتا ہے کہ اس کو بارہ روپے میں مثلاً خریدا ہے۔ اب خریدار کو کہتا ہے ایک روپیہ دے کر خرید لو۔ ۱۳ روپے کر کے دے دو۔ خریدار اس پر اعتماد کر کے ۱۳ روپے پر خرید لیتا ہے۔ بعض دفعہ خریدار کو جب بائع کی بات پر اعتماد کرتے ہوئے نظر نہیں آتا تو بھی اعتماد دلانے کے لئے جھوٹی قسم کھا کر کہتا ہے کہ اس نے یہ چیز اتنے روپے پر خریدی ہے جبکہ درحقیقت اس نے اس سے کم قیمت پر خریدی ہے پھر خریدار اس کی بات پر اعتماد کر کے اس کی بتائی ہوئی قیمت خرید کے اوپر نفع دے کر وہ چیز خرید لیتا ہے۔

اب جھوٹ اور جھوٹی قسم کی بنیاد پر جو زائد پیسے بائع اور دکاندار نے کمائے ہیں وہ اس کے لئے حلال نہیں ہے۔ دوسری مثال یوں سمجھ لیں۔

ایک آدمی کسی آدمی کو کوئی چیز خریدنے کے لئے وکیل مقرر کرتا ہے کہ فلاں چیز میرے لئے بازار سے خرید کر دے دو۔ دونوں کے درمیان کوئی نفع لینے دینے کا طے نہیں ہوا۔ وکیل متعینہ چیز ایک مقررہ قیمت پر خرید کر اپنے مؤکل کے حوالے کرتے ہوئے قیمت خرید سے زائد قیمت بتاتا ہے مثلاً سو روپے اس چیز کی قیمت خدید تھی لیکن وکیل نے اس کی قیمت ایک سو دس روپے بتا کر قیمت مؤکل سے وصول کی تو قیمت خرید سے زائد قیمت وکیل کے لئے حلال نہیں ہے۔

تیسری مثال یوں سمجھ لیجئے کہ ایک گاہک دکاندار کے پاس آتا ہے وہ کہتا ہے کہ مجھے فلاں مال دے دو۔ اس پر آپ کو اتنی قیمت خرید کے اوپر دو روپے فی مال کمیشن اور منافع دوں گا۔ داندار اس کو منظور کرتا ہے۔ متعینہ مال واقعی قیمت خدید سے پانچ روپے زیادہ بتا کر پھر منافع دو روپیہ فی مال مقرر کر کے مال فروخت کرتا ہے، گاہک اعتماد کر کے مال لے جاتا ہے تو اس صورت میں دکاندار نے جو منافع لیا ہے یہ ناجائز اور غلط کیا ہے اس کے لئے فی مال پانچ روپے حلال نہیں ہیں حرام ہیں۔

چوتھی مثال ایک گاہک دکاندار سے کہتا ہے کہ مجھے فلاں ملک کے ایک نمبر کا مال چاہیئے۔ اگر تمہارے پاس موجود ہے تو قیمت متعین کر کے دے دو۔ دکاندار کہتا ہے میرے پاس موجود ہے اس کی قیمت زیادہ ہے مثلاً ایک نمبر کا مال سو روپے ڈبہ ہے جبکہ دوسرے نمبر کا مال اسی ۸۰ روپے فی ڈبہ ہے۔

خریدار کہتا ہے میں اس شرط پر خریدتا ہوں کہ مال فلاں ملک کا ہے اور ایک نمبر کا ہے۔

دکاندار نے اس کا اقرار کر کے مال فروخت کر دیا لیکن اس میں اس نے غلط بیانی سے کام لیا۔ مال دراصل گاہک کی شرط کے مطابق باہر ملک کا نہ تھا بلکہ اپنے ملک کا تھا اس نے "مارکہ" دوسرے ملک کا لگا دیا یا مال دوسرے ملک کا تھا لیکن ایک نمبر کا نہ تھا بلکہ دوسرے نمبر کا تھا تو اس غلط بیانی کی وجہ سے یہ خرید وفروخت ناجائز ہوگئی ہے کیونکہ اس نے ایک نمبر کا مال ظاہر کر کے دو نمبر کا مال فروخت کیا ہے جو کہ غلط تھا اور اس نے باہر ملک کا مال ظاہر کر کے اندرون ملک کا مال فروخت کیا ہے جو کہ جھوٹ تھا لہٰذا ایک نمبر مال اور دو نمبر مال کی قیمت میں جو فرق تھا یہ فرق کا لینا دکاندار کے لئے ناجائز اور حرام ہے۔ اس طرح اندرونِ ملک اور بیرون ملک مال کے درمیان جو فرق ہے اس میں غلط بیانی کر کے اس نے جو زیادہ پیسے وصول کئے ہیں تو یہ زیادہ پیسے اس کے لئے حلال نہیں ہیں۔

پانچویں صورت یہ کہ:

دکاندار گاہک پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ خریدار کو صرف قیمت خرید پر مال فروخت کر رہا ہے۔ اس سے کچھ منافع نہیں لے رہا ہے جبکہ اس نے اس مال پر خریدار سے منافع لیا ہے اگرچہ مارکیٹ سے کم لیا ہو۔ اس واسطے دکاندار کے لئے اصل قیمت خرید کے اوپر جو منافع خواہ ایک پیسے کر کے لیا ہو حلال نہیں ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس تمام معاملات میں جو منافع غلط بیانی اور جھوٹ کی بنیاد پر حاصل ہوا ہے وہ ناجائز وحرام ہے۔ گناہ ہے موجب عذاب الٰہی ہے۔

اصول نمبر ۶: تجارت اور کاروباری سلسلہ میں تمام معاملات کا ربوٰ یعنی سود سے پاک ہونا ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کی تجارت اور خرید وفروخت کو حلال قرار دیا ہے مگر سود اور سودی معاملات کو حرام قرار دیا ہے۔

واضح رہے کہ تجارت اور کاروبار میں سود کا باب بہت وسیع ہے۔ اس کے تمام مسائل کا احاطے میں لانا جس کے پاس قران وسنت کا بنیادی علم بھی نہیں ہے بہت ہی مشکل ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس بارے میں معلوم ہو جائے کہ کن کن وجوہ سے سود آتا ہے اور کن کن اصول کی پابندی کرنے سے معاملات سود سے پاک ہو جاتے ہیں۔

لین دین میں جب بدلین یعنی مبیع اور ثمن، زر حقیقی یعنی سونا اور چاندی یا ان دونوں کے قائم مقام سکہ رائج الوقت ہوں تو اس کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) سونے کو سونے کے عوض میں یا چاندی کو چاندی کے عوض میں، اسی طرح ایک ملک کے سکہ کو اسی

ملک کے سکہ کے عوض فروخت کیا جائے تو اس میں دو شرطوں کے ساتھ بیع حلال ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ دونوں جانب سے مقدار میں برابری ہو۔ دوسری شرط یہ کہ خرید و فروخت نقد بنقد ہو ادھار نہ ہو[1] اس طرح خرید و فروخت کرنے سے بیع حلال ہوگی ورنہ حرام ہوگی مثلاً ایک جانب سے سونا پانچ تولے ہے، دوسری جانب سوا پانچ تولے تو یہ حرام ہے۔

اسی طرح دونوں جانب سے سونے کا نقد بنقد ہونا ضروری ہے۔ اگر ایک جانب سے سونا نقد ہے دوسری جانب سے ادھار ہے تو یہ سود ہے حرام ہے۔

اگر حقیقی زر سونا چاندی یا حکمی زر، سکہ رائج الوقت کا تبادلہ اپنی مخالف جنس سے ہو مثلاً سونے کی بیع چاندی کے عوض میں یا سونے کی بیع سکہ رائج الوقت کے عوض میں یا دو مختلف ممالک کے سکوں کے درمیان بیع ہو تو اس میں بدلین یعنی مبیع اور ثمن میں برابری تو لازم نہیں ہے کمی اور زیادتی کے ساتھ بھی بیع جائز ہے البتہ بدلین کا نقد بنقد ہونا پھر بھی ضروری ہے۔[1]

☆ مثلاً پانچ تولے سونے کی خرید و فروخت کئی تولے چاندی کے ساتھ یا کئی گنا سکہ رائج الوقت کے ساتھ جائز ہے جیسا کہ مارکیٹ میں جاری ہے جبکہ سونا ایک ہاتھ سے دیا جائے چاندی دوسرے ہاتھ سے لی جائے۔ مقصد یہ کہ ایک ہی مجلس میں دونوں چیزوں کا لین دین ہو جانا ضروری ہے۔

☆ اسی طرح سونا اور چاندی کا تبادلہ سکہ رائج الوقت کے ساتھ کمی و بیشی کے ساتھ عرف کے مطابق جائز ہے لیکن مجلس واحدہ میں مبیع و ثمن پر قبضہ ضروری ہے۔ ادھار درست نہیں ہے۔ خواہ پانچ منٹ کے لئے کیوں نہ ہو۔

☆ نیز یہ بھی معلوم ہونا ضروری ہے کہ جو حکم سونا اور چاندی، سکہ رائج الوقت کا ہے وہی حکم گندم، آٹا، چاول، جو، کھجور، کشمش، نمک، چینی، غرض ہر وزنی کیلی چیزوں کا ہے۔

یعنی اگر گندم کی بیع گندم سے ہو، آٹے کا تبادلہ آٹے سے ہو۔ کھجور کا تبادلہ کھجور کے ساتھ ہو تو دو شرطوں کے ساتھ بیع حلال ہے۔ پہلی شرط برابری ہو۔ دوسری شرط نقد بنقد ہو۔ اگر ان میں ایک شرط بھی نہ ہوگی تو بیع صحیح نہ ہوگی۔ حرام اور سودی معاملہ ہوگا۔

☆ اور اگر ایک جنس کا تبادلہ دوسری جنس سے ہوگا۔ مثلاً گندم کا تبادلہ چاول سے یا کھجور کا تبادلہ کشمش سے، چینی کا تبادلہ نمک سے تو اس میں برابری شرط نہ ہوگی بلکہ کمی و بیشی کے ساتھ بیع جائز ہوگی البتہ نقد بنقد خرید و فروخت ہونے کی شرط ضروری ہے۔ ادھار کی صورت میں سود ہوگا۔ خرید و فروخت

[1] ہدایہ ص ۷۹، ج ۳۔

ناجائز ہوگی۔

☆ نیز واضح رہے کہ حقیقی زر، سونا و چاندی کی خرید و فروخت ادھار کی شکل میں کسی حال میں درست نہیں ہے۔

☆ سونا چاندی کے علاوہ تمام وزنی اور کیلی اشیاء کی خرید و فروخت سکۂ رائج الوقت کے ساتھ نقد اور ادھار ہر صورت میں جائز ہے۔

مثلاً گندم، آٹا، کھجور، کشمش غرض ہر وزنی و کیلی چیز کا سکہ رائج الوقت کے ساتھ ادھار خریدنا اور بیچنا جائز ہے۔

سودی کاروبار کی دوسری صورتیں

جس طرح مبیع و ثمن میں زیادت و کمی اور ادھار کی وجہ سے معاملات میں سودی شکل پیدا ہو جاتی ہے اس طرح کبھی شرط فاسد یا مدّت کی وجہ سے بھی معاملات میں سود داخل ہو جاتا ہے۔

اجل اور مدّت کی بنا پر سود کا معاملات میں داخل ہو جانا

اصول نمبر ۷: مثلاً کسی نے ایک چیز سو روپے قیمت پر دوسرے آدمی کے ہاتھ ایک ماہ کے ادھار پر فروخت کر دی اور یہ شرط رکھ دی کہ اگر ایک ماہ کے بعد قیمت ادا نہیں کی تو دوسرے مہینہ سے قیمت میں ۲۵ روپے کا اضافہ ہو جائے گا یا یوں کہا کہ جتنے مہینے تاخیر ہوتی جائے گی مدت کی تاخیر سے ہر ماہ پچیس پچیس روپے کا اضافہ ہوتا رہے گا۔

خرید و فروخت کی مذکورہ بالا دونوں صورتیں سودی معاملے ہیں۔ ناجائز اور حرام ہیں کیونکہ جو شرط رکھی گئی وہ شرط عقدِ بیع کے اصول کے خلاف ہے اور اس میں خالی مدت کی بنیاد پر ثمن کا اضافہ لازم آ رہا ہے اس لئے ناجائز ہے۔

بیع اور معاملۂ شرکت میں شرط فاسد کی وجہ سے شرکت فاسد ہو جاتی ہے

اصول نمبر ۸: مثلاً دو یا متعدد شرکاء مل کر کاروبار کرتے ہیں۔ اگر ایک نے یہ شرط رکھی کہ وہ محنت نہیں کرے گا۔ دوسرے شرکاء محنت کے پابند ہوں گے تو یہ شرط فاسد ہے۔ اس سے کاروبار ناجائز ہو جاتا

ہے، سود میں داخل ہوجاتا ہے۔

☆ یا یوں شرط رکھی گئی کہ ایک شریک کو ماہانہ اتنی رقم متعین کر کے مثلاً دو ہزار روپے ہر صورت میں ملتے رہیں گے۔ خواہ منافع کم ہو یا زیادہ، منافع ہو یا نہ ہو، تو یہ شرط فاسد ہے۔ اس طرح شرط رکھنے سے شرکت کا معاملہ فاسد ہوجاتا ہے، سود میں داخل ہوجاتا ہے۔ یہی حکم مضاربت کا بھی ہے کہ سرمایہ کار نے کسی مخصوص رقم کی اگر شرط رکھی یا سرمایہ کے تحفظ کی شرط رکھی یا مضارب نے کوئی شرط رکھی تو اس سے مضاربت فاسد ہوجاتی ہے۔

☆ یا ایک شریک نے یوں شرط رکھ دی کہ منافع میں سے تو نفع ونقصان کی بنیاد پر نصف نصف ہر شریک کو ملے گا لیکن اس کا اصل سرمایہ اس کو ہر حال میں واپس ملنا ضروری ہے یہ شرط بھی فاسد ہے اس سے شرکت فاسد ہوجاتی ہے۔ اس طرح مضاربت بھی فاسد ہوجاتی ہے۔

☆ کسی آدمی نے دوسرے شخص کو ایک چیز ادھار یا قسطوں میں فروخت کردی اور چیز اس کے قبضے میں دے دی۔ لیکن یہ شرط رکھ دی کہ جب تک قسطیں ختم نہیں ہوتیں اس وقت تک تمہیں شئے مبیع کا کرایہ ادا کرنا پڑے گا۔ شرعاً یہ شرط ناجائز ہے اور شئے مبیع پر خریدار سے کرایہ لینا سود ہے جو ناجائز ہے۔ نیز ایک معاملہ کے ساتھ دوسرے معاملہ کو ملانا ہے۔ حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو معاملے کو ایک ساتھ ملانے سے منع فرمایا ہے۔

موجودہ زمانے کے مشارکہ اور مضاربہ کی شرعی حیثیت

واضح رہے کہ تجارتی سلسلہ میں مختلف ذرائع آمدنی میں سے حلال ذریعہ شرعی مشارکت اور شرعی مضاربت بھی ہے۔ اگر ہماری تجارت میں ان دونوں ذرائع کی اصلاح ہوجائے اور سود سے پاک ہوجائے تو ہماری تجارت کا غالب حصہ حلال پر مشتمل ہوسکتا ہے اور حرام کا عنصر کم سے کم ہوجائے گا۔

لیکن بدقسمتی سے جتنے افراد یا ادارے مشارکہ اور مضاربہ کے معاملات میں دخیل ہیں۔ مبتلیٰ بہ ہیں۔ خواہ حکومت کی سرپرستی میں کررہے ہوں یا حکومت سے آزاد ہوکر نجی طور پر کررہے ہوں۔ ان میں اکثریت شرعی مشارکہ اور مضاربہ کے نام سے سودی کاروبار کرنے والی ہے۔ خواہ لاعلمی میں ایسا کررہی ہے یا دیدہ ودانستہ شیطانی تعلیم کے تحت کررہی ہے جبکہ مسلمانوں کی اکثریت ہمیشہ سے یہ چاہتی ہے کہ ہماری تجارت بلکہ پوری معیشت شرعی اصولوں کے تحت ہو لیکن بار بار کوششوں کے باوجود اس میں شیطانی طاقت غالب آجاتی ہے، مسلمانوں کی خواہش پوری ہونے نہیں پاتی۔ اس واسطے ان سطور میں اشارۃً

مختصر طریقے پر ہماری مشارکت اور مضاربت میں رائج سودی کاروبار کی نشاندہی کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے البتہ ان غلطیوں کی نشاندہی کے لئے چونکہ شرعی مشارکہ اور مضاربہ کا خاکہ اور نقشہ اور ان کے بنیادی قواعد کا علم سب کے سامنے ہونا اولیّت کی حیثیت رکھتا ہے۔لہٰذا یہاں پر شرعی مشارکہ اور مضاربہ کے الگ الگ اصول اور صحیح صورت لکھ دی جاتی ہے جس کے بعد ہر شخص کو موجودہ نظام کے تحت مشارکہ و مضاربہ کی خامیاں اور غلطیاں واضح ہونے لگیں گی۔

شرعی مشارکہ اور اس کے اقسام

مشارکہ کی پہلی قسم، مشارکہ فی الملک ہے یعنی جن افراد کو بطور وراثت، وصیت، ہبہ، وقف، عطیہ، بطور ملک، جائیداد، کاروبار، مکانات، دکانیں، وغیرہ ملی ہوں ان میں وہ شریک ہوں۔

دوسری قسم شرکتِ عقود، اور اس کی چار قسمیں ہوتی ہیں۔شرکت مفاوضہ، شرکتِ عنان، شرکتِ صناعۃ، شرکتِ وجوہ۔

شرکت مفاوضہ: جس میں مختلف عاقل، بالغ، مسلمان آدمی شریک ہوکر کاروبار شروع کرتے ہیں اور ہر شریک سرمایہ اور عمل، اوقاتِ کار برابر برابر لگاتے ہیں اور نفع ونقصان میں بھی ہر شریک برابر کے حصّہ دار ہوتے ہیں شرعاً یہ جائز اور حلال کاروبار ہے۔

شرکتِ عنان: جس میں مختلف آدمی اپنی اپنی حیثیت کے مطابق مختلف مقدار میں سرمایہ لگاتے ہیں اور کاروبار میں جو بھی نفع ونقصان ہوگا اس میں سب شرکاء رقم کے تناسب سے یا حسب معاہدہ کمی بیشی کے ساتھ علی سبیل الشیوع شریک ہوتے ہیں۔مثلاً تین آدمی شراکتی کاروبار کے لئے سرمایہ لگاتے ہیں۔ایک کا سرمایہ ایک ہزار روپے، دوسرے کا سرمایہ دو ہزار روپے اور تیسرے کا سرمایہ تین ہزار روپے، نفع ونقصان میں رقم کے تناسب سے ایک ہزار روپے والا چھٹا حصّہ اور دو ہزار روپے والا تہائی حصّہ اور تین ہزار روپے والا نصف حصہ طے کرلیتے ہیں یا رقم کی تفاوت کے باوجود تمام شرکاء نفع ونقصان میں برابر برابر شریک ہونے پر رضامند ہوجاتے ہیں شرعاً یہ بھی جائز اور حلال کاروبار ہے۔

شرکت صناعۃ: یعنی دو آدمی ہیں جن کے پاس سرمایہ نہیں ہے بلکہ مال تیار کرنے کے آلات یا مشینیں موجود ہیں۔وہ سب مل کر ایسے آلات حرفہ اور مشینوں کے ذریعہ شراکتی کام شروع کرنے کا معاہدہ کرتے ہیں کہ جو بھی نفع ونقصان ہوگا اس میں دونوں آدمی نصف نصف کے اعتبار سے مثلاً یا ایک تہائی دو تہائی کے اعتبار سے شریک ہوں گے شرعاً یہ کاروبار بھی جائز وحلال ہے۔

شرکت وجوہ: یعنی جن کاروباری لوگوں کے پاس نہ سرمایہ موجود ہے نہ آلاتِ حرفہ نہ کوئی اسباب کہ جن کی بنیاد پر شراکتی معاملہ کرسکیں البتہ کاروباری مہارت اور معاشرہ اور تاجر برادری میں ذاتی وجاہت کی بنیاد پر دوسرے دکانداروں اور تاجروں سے مال ادھار لے کر شراکتی کاروبار شروع کرتے ہیں اور ادھار مال پر کاروبار کے ذریعہ جو بھی نفع ونقصان ہو اس میں سب شریک برابر برابر یا پچاس فیصد منافع کے اعتبار سے شریک ہوتے ہیں۔ شرعاً یہ بھی جائز اور حلال کاروبار ہے مگر ان شراکتی کاروبار کے لئے کچھ لازمی اور ضروری احکام ہیں جن کی پابندی ضروری ہے ورنہ شراکتی کاروبار ناجائز اور سودی حرام کاروبار بن جاتا ہے۔

شراکتی کاروبار کے احکام

(الف) معاملۂ مشارکہ میں شریک افراد کے لئے ضروری ہے کہ جس سرمایہ کی بنیاد پر کاروبار شروع کرنا چاہتے ہیں۔ ان سب کا کل سرمایہ یا غالب سرمایہ حلال کا ہو۔ اگر سب شرکاء کا کل سرمایہ حلال کا ہے تو یہ کاروبار بالکل حلال ہوگا اور اگر اکثر شریک افراد کا سرمایہ حلال کا ہے لیکن بعض کا سرمایہ بالکل حرام کا ہے تو ان سے شراکت کا کاروبار ناجائز ہوگا البتہ بعض شریک کے سرمایہ میں اگر اکثریت حلال کی ہے پھر شراکتی کاروبار جائز تو ہے البتہ کچھ حرام کی ملاوٹ کی وجہ سے اس میں کراہت ہوگی۔

(ب) جو کاروبار شروع کرنے کا ارادہ ہے وہ کاروبار شرعاً جائز اور حلال ہونا ضروری ہے لہٰذا جن اشیاء کی خرید وفروخت مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے ان اشیاء کے کاروبار میں مشارکہ بھی ناجائز ہے۔ شراب کی خرید وفروخت ناجائز ہے لہٰذا شراب کے کاروبار میں شراکت بھی ناجائز ہے۔ قمار اور جوئے کا کاروبار ناجائز ہے لہٰذا اس میں مشارکہ بھی ناجائز ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

(ج) معاملۂ مشارکہ میں شریک افراد میں سے ہر فرد وکیل اور امین ہوتا ہے اور اگر سب نے کسی ایک کو کاروبار کے لئے مختار بنادیا ہے تو وہ شخص سب کی جانب سے امین اور وکیل ہوتا ہے۔ پورے کاروبار کے نفع ونقصان کو شرکاء کے سامنے ظاہر کرنا ضروری ہے چونکہ شراکت داری کے معاملہ کا دارومدار ہی اعتماد اور امانت داری پر ہوتا ہے اس واسطے کسی قسم کی خیانت اور دھوکہ معاملہ کو فاسد کردیتا ہے۔

(د) معاملۂ مشارکہ میں شریک افراد میں سے کوئی فرد مشترکہ کاروبار کے منافع میں سے ذاتی املاک

نہیں خرید سکتا، ذاتی جائیداد نہیں بنا سکتا، جو کچھ بھی خریدے گا یا بنائے گا اس میں تمام شرکاء اپنے اپنے طے شدہ حصے کے مطابق شریک ہوں گے۔

(ہ) جس نوعیت کا مشارکہ شروع کرنے کا ارادہ ہے اس میں سرمایہ کے ذریعہ کاروبار کی نیت سے مال کی خرید وفروخت شروع کرنے کے بعد معاملۂ مشارکہ شروع ہوتا ہے۔ جب تک سرمایہ نقد اور کرنسی کی شکل میں موجود ہوتا ہے اس وقت تک اس میں نفع ونقصان کا معاملہ درست نہیں ہے۔

کاروبار میں تمام افراد نفع ونقصان میں اپنے اپنے شرعی حصے کے اعتبار سے حصہ دار ہوتے ہیں جبکہ معاملۂ مشارکہ شرکت املاک کا ہو اور اگر معاملۂ مشارکہ شرکت عقود کی چاروں قسموں میں سے کوئی بھی قسم ہو تو اس میں ہر شریک نفع ونقصان میں طے شدہ اصول کے مطابق حصہ دار اور ذمہ دار ہوگا۔

(و) اگر املاک میں شریک افراد یا بعض افراد شرکت کو باقی اور جاری رکھیں تو ہر شریک کو اصل املاک میں جس قدر حصہ ملتا ہے اس کے تناسب سے منافع میں بھی حصہ ملتا ہے۔ اس میں کسی شریک کے لئے منافع میں سے اپنے حصے سے زائد و کسی مخصوص رقم کی شرط لگانا ناجائز وحرام ہے۔ یہی حکم شرکت عقود کی چاروں اقسام کے لئے ہے۔

املاک میں شریک افراد یا کوئی فرد شرکت کو ختم کر کے الگ ہونا چاہے تو اسے اپنے مقررہ حصے اصل مع منافع موجودہ وقت کی قیمت کے لحاظ سے دے دینا ضروری ہے۔ اس میں کسی قسم کی زیادت ونقصان کی شرط ناجائز ہے اور یہی حکم شرکت کی دوسری اقسام کے لئے بھی ہے۔

(ز) مشترکہ املاک میں شریک افراد میں سے ہر فرد مشترکہ کاروبار اور املاک میں شریک ہوتا ہے۔ امانت داری کے ساتھ آمد وصرف میں تصرف کرنا ہر فرد پر لازم ہوتا ہے۔ کوئی فرد آزادانہ اور من مانی تصرف کا مجاز نہیں ہوتا۔ اگر شریک افراد میں کوئی دوسرے شرکاء کا رضامندی کے خلاف آمد وصرف میں تصرف کرتا ہے تو وہ گناہگار ہوگا کیونکہ یہ امانت داری کی خلاف ورزی ہے۔ یہی حکم شرکت کی تمام اقسام کے لئے ہے۔

(ح) مشترکہ املاک اور کاروبار کے منافع کے ذریعہ اور اس کی بنیاد پر حاصل کردہ تمام نقدی، خام مال، پختہ مال، جائیداد، مکان، دکان وغیرہ وغیرہ مشترکہ سرمایہ شمار ہوگا۔ کسی شریک کی ذاتی ملکیت شمار نہ ہوگی۔ خواہ حاصل کردہ جائیداد مکان دکان وغیرہ میں بعض افراد کا نام استعمال کیا گیا ہو یا سب کا خواہ بعض شریک کی محنت اور کوشش زیادہ ہو اور بعض شریک کی کم یا نہ ہونے کے برابر ہو۔

(ط) شریک افراد میں سے ہر فرد کو اختیار رہتا ہے کہ جس مدت کے لئے شرکت کا کاروبار شروع کیا تھا اس کو پورا کرنے کے بعد چاہے آگے شرکت کو باقی رکھے یا ختم کردے اپنے حصّہ یا اس کی رقم وصول کرلے۔

(ی) مختلف شرکاء میں سے جس کو اختیار دیا گیا ہے اس نے اپنے طور پر یا سب کی رضامندی سے جو لین دین یا ادھار یا قرض کا معاملہ کیا ہے تو یہ معاملہ سب کی طرف منسوب ہوگا ہر شریک اس کا پابند ہے۔

(ک) رقم کی شرکت میں مشترکہ مال سے کوئی شخص دوسرے شرکاء کی رضامندی کے بغیر نہ حج کرسکتا ہے نہ زکوٰۃ صدقہ وخیرات دے سکتا ہے نہ کسی کو ہبہ یا وصیت کرسکتا ہے۔ اگر کسی شریک نے ایسا کیا ہے تو یہ اخراجات اس کے حصّے میں سے منہا ہوں گے۔ البتہ دوسرے شرکاء کی رضامندی سے جائز ہے۔ کاروبار میں شریک حضرات کی اجازت کے بغیر اگر کسی نے مشترکہ مال میں کچھ لیا ہے خواہ بطور قرض ہو یا بطور تبرّع تو شریک حضرات کے علم میں آنے کے بعد جس پر راضی ہوں اس پر عمل ہوگا۔ اگر وہ قرض تسلیم کرلے تو قرض کی ادائیگی ضروری ہوگی اور اگر بطور احسان چھوڑ دے تو معاف ہوجائے گا۔

(ل) مشترکہ املاک سے کسی شریک کی اپنی شادی یا اولاد کی شادی دوسرے شرکاء کی رضامندی کے بغیر درست نہیں ہے البتہ دوسرے شرکاء کی رضامندی سے جائز ہے پھر رضامندی میں جس نوعیت کی رضامندی ہوگی اس پر عمل ہوگا یعنی بطور قرض دینے پر رضامندی ہے تو قرض کی ادائیگی شریک قرضدار پر لازم ہوگی اور اگر شراکت داروں کی رضامندی ازروئے تبرع واحسان کی تھی تو پھر اس کی ادائیگی نہ اس پر لازم ہے اور نہ مشترکہ مال سے منہا ہوگا۔ ان سب قواعد کی تفصیلات کتب فقہ و فتاویٰ میں موجود ہیں۔

(م) مشارکہ میں کوئی شرط فاسد نہیں ہونی چاہیئے جن شرائط فاسدہ کی وجہ سے معاملۂ بیع فاسد ہوجاتا ہے مشارکہ بھی فاسد ہوجاتا ہے۔

(ن) مشارکہ ہو یا مضاربہ اس میں کسی فریق کے لئے مخصوص رقم کا منافع دینے یا لینے کا تعین ناجائز اور حرام ہے۔ مثلاً شریک یا مضارب اپنے سرمایہ کار سے یہ کہے کہ ماہانہ دو ہزار رقم آپ کو ہر صورت میں منافع کے طور پر ملے گی۔ باقی منافع ہمارا حصّہ ہے یا یوں کہے کہ کل منافع میں دو ہزار روپے ایک کے لئے مستثنیٰ کرکے بقیہ منافع پھر فریقین میں حسب اصول مشارکہ یا مضاربہ تقسیم ہوگا یہ سب ناجائز ہیں۔

مضاربہ

شریعت نے معاملۂ مضاربہ کے ذریعہ سے سرمایہ کاری اور کاروبار کرنے کی اجازت دی ہے۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے مضاربہ کا معاملہ کیا ہے۔ کتب حدیث وفقہ میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔

مضاربہ کی حقیقت: ایک فریق کی جانب سے سرمایہ ہوتا ہے۔ دوسرے فریق کی جانب سے عمل اور محنت ہوتی ہے اور جو کچھ منافع ملے گا اس میں ہر فریق طے شدہ اصول کے مطابق نصف نصف کے اعتبار سے یا ثلث ثلثین کے اعتبار سے شریک ہوتا ہے اور منافع کے تناسب سے نقصان کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے اس کے علاوہ کسی فریق کے لئے کسی مخصوص رقم کی شرط نہیں ہوتی۔

مضاربہ کے احکام

(۱) معاملۂ مضاربہ کے احکام بھی تقریباً وہی ہیں جو مشارکہ کے لئے ہیں فرق یہ ہے کہ مضاربہ میں ایک جانب سے محنت ہوتی ہے سرمایہ نہیں ہوتا اور دوسری جانب سے سرمایہ ہوتا ہے محنت نہیں ہوتی اور نفع ہو تو اس میں دونوں شریک ہوتے ہیں۔ نفع کم ہو یا بالکل نہ ہو تو اس میں فریقین نقصان پذیر ہوتے ہیں۔

(۲) مزید یہ کہ مضاربہ میں مضارب یعنی کاروبار کرنے والا امین کی حیثیت سے کام کرتا ہے جس نوعیت کے کاروبار کرنے کی اجازت سرمایہ کار کی جانب سے ملے گی اس طرح کا کاروبار کر سکے گا اس سے تجاوز کرنا خیانت متصور ہوگی۔ الا یہ کہ سرمایہ کار علی الاطلاق ہر قسم کی تجارت کی اجازت دے دے۔ پھر کسی خاص نوعیت کی تجارت کی پابندی نہ ہوگی بلکہ مضارب ہر جائز قسم کی تجارت کرنے کا مجاز ہوگا۔

(۳) معاملۂ مضاربہ میں اگر نقصان ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس نقصان کی تلافی نفع میں سے کی جائے گی اور اگر نقصان نفع کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے تو نفع کے بعد بقیہ نقصان اصل سرمایہ میں سے برداشت کیا جائے گا مثلاً دس ہزار سے مضارب نے کام شروع کیا۔ پہلی دفعہ خرید وفروخت میں دو ہزار روپے منافع ہوا۔ پھر مال خریدا اور بیچا اس میں ڈھائی ہزار روپے منافع ہوئے پھر مال خریدا اور فروخت کیا اس میں پانچ ہزار روپے کا نقصان ہوا تو پانچ ہزار روپے کے نقصان کو تقسیم کیا جائے گا

کہ ساڑھے چار ہزار روپے تو منافع میں سے جائیں گے اور پانچ سو روپے اصل سرمایہ سے جائیں گے اس پانچ سو میں مضارب شریک نہ ہوگا کیونکہ اس کی محنت ضائع ہونا یہ اس کا نقصان ہوا پھر وہ دہرے نقصان میں شریک نہ ہوگا۔

موجودہ زمانہ کے مشارکہ ومضاربہ "اصول شرع" کی روشنی میں

مشارکہ اور مضاربہ کے اصول اور قواعد معلوم ہونے کے بعد یہاں پر ہم بعض ناجائز اور غیر شرعی مشارکہ اور مضاربہ کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں جن میں ہمارے ملک کے سرمایہ داروں کی اکثریت ملوث ہے۔

حصص اور شیئرز کی خرید وفروخت

مشترکہ کاروبار کے حصص کی خرید وفروخت پہلے زمانہ میں بھی ہوتی رہی ہے اس واسطے کہ فقہ میں مسئلہ موجود ہے کہ کاروبار میں شریک افراد میں سے کوئی فرد دوسرے شخص کو اپنے ساتھ شریک کر سکتا ہے۔ ایک شریک اپنا حصۂ شراکت دوسرے شریک کو بلا اجازت شرکاء بیچ سکتا ہے اور غیر شریک کو باجازت شرکاء فروخت کر سکتا ہے لیکن اس کی خرید وفروخت کے جواز کے لئے انہی تمام شرائط اور احکام کی پابندی ضروری ہے جن کا ذکر ہم نے بیع مشارکہ اور مضاربہ کے تحت کیا ہے۔

☆ لہٰذا جس کاروبار کا سرمایہ کل کا کل یا غالب حصہ حلال کا ہے اس میں شراکت داری جائز ہے ورنہ ناجائز ہے۔

☆ اور جو کاروبار جائز طریقے پر کیا جاتا ہے۔ خلاف شرع کوئی بات نہیں ہے اس میں شراکت کا معاملہ جائز ہے۔ اس کا حصہ اگر کوئی شریک بیچنا چاہے بیچ سکتا ہے۔ دوسرا شخص خرید سکتا ہے لیکن جو کاروبار ازروئے شرع جائز نہیں ہے نہ تو اس کاروبار کے حصص خریدنا جائز ہے نہ اس کا منافع حلال ہے۔

☆ جو کمپنی یا ادارہ سودی یا جوا کا معاملہ کرتا ہے یا اس کا بیشتر کاروبار سودی یا جوے یا دوسرے خلاف شرع امور پر مشتمل ہے اس کے حصص اور شیئرز کی خرید وفروخت ناجائز ہے۔

☆ شیئرز کے کاغذات، درحقیقت کسی واقعی موجود کمپنی کی رسیدیں اور سرٹیفکیٹز ہوتی ہیں مثلاً ایک ہزار روپے کی شیئرز فروخت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کمپنی کی مالیت میں وہ اس قدر مالیت کے حصّے کو فروخت کر رہا ہے لہٰذا اگر کوئی واقعی کمپنی موجود ہے اور تمام اصول بیع اس میں پائے جاتے ہیں تو اس کا حصّہ خریدنا جائز ہے۔

☆ لیکن جوادارہ یا کمپنی کاروبار اور تجارتی نیت سے حصص جاری کرتی ہے تاکہ مطلوبہ رقم وصول ہونے پر کام شروع کیا جاسکے اور ابھی اس نے تجارت کی غرض سے کام شروع نہیں کیا تو کمپنی میں شرکت کی غرض سے ایسے حصص کی خریداری تو جائز ہے لیکن کام شروع ہونے سے قبل جو حصہ خریدا گیا ہے اس کو زائد یا کم قیمت پر فروخت کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ حصّہ کی اس رسید کے پس پشت سرمایہ ہے، روپے ہیں، دوسرا کوئی مال مثلاً چند افراد نے ایک کمپنی قائم کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ انہوں نے کمپنی کے واسطے زمین، تعمیر، مشینری اور دیگر اشیاء کی قیمت اور کمپنی کے ملازمین کی تنخواہ و دیگر اخراجات کا حساب لگا کر دیکھا کہ تین کروڑ روپے اس پر لاگت آئے گی۔ کام چالو ہو جانے کے بعد اس میں جو منافع آئے گا اس کا اندازہ مثلاً دس لاکھ تک ہے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں کمپنی میں شامل افراد مختلف داموں پر تین کروڑ روپے کے حصص جاری کرتے ہیں ظاہر بات ہے کہ جب تک کمپنی کے منصوبے کے تحت تین کروڑ کے حصص فروخت نہیں ہوئے تب تک کوئی کاروبار شروع کرنا ممکن نہیں ہوتا لہٰذا اس بنا پر تین کروڑ روپے کے تمام حصص کا فروخت ہونا ضروری ہے جب تین کروڑ روپے کے حصص فروخت ہو جائیں گے رقم جمع ہو جائے گی کمپنی کام شروع کر سکے گی۔ یہاں تک تو کمپنی کے افراد کے لئے حصص کو فروخت کرنا ضروری ہوتا ہے اور جو افراد کمپنی میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے حصص کا خریدنا ضروری ہے لیکن کمپنی نے جس کام کے لئے حصص کے ذریعہ لوگوں سے رقم جمع کی ہے جب تک اس کو کسی جائز کام میں نہیں لگاتی اس وقت تک اپنے حصص کے دام میں اضافہ کرنا جائز نہیں ہے اور حصص کے خریداران کے لئے اضافی قیمت پر ہاتھ در ہاتھ اس کی خرید و فروخت شروع کر دینا یہ جائز نہیں ہے کیونکہ حصص کے پس پشت کمپنی کے پاس صرف خالص تین کروڑ روپے کا سرمایہ ہے ابھی تک کمپنی نے کوئی کارخانہ قائم نہیں کیا۔ نہ ہی اندرون یا بیرون ملک میں کوئی کاروبار شروع کیا ہے۔ جس پر منافع ملتا اور اصحاب حصص کے لئے کسی منافع کا اعلان کیا جاتا ہے لہٰذا اس طرح کی فرضی اور زیر منصوبہ کمپنی کے حصص کی خرید و فروخت تو خالص سودی کاروبار ہے، پیسے کے بدلہ میں پیسے کمانا ہے۔

☆ پاکستان کا نظام بنکاری چونکہ سود پر مبنی ہے۔ اس واسطے اس کے تحت چلنے والے تمام بینکوں کے حصص کی خرید و فروخت ناجائز ہے اس میں بعض جائز پیسے بھی ہوں گے لیکن غالب و اکثریت سود کے ہوتے ہیں اور حلال و حرام میں غالب و اکثریت کا اعتبار ہوتا ہے۔

☆ اس کے علاوہ وہ تمام کمپنیاں اور ادارے جن کو حکومت پاکستان کے بینک کی سرپرستی اور نگرانی

حاصل ہے اور ان کے مشورے اور اصول وضوابط کے تحت تجارت کرتے ہیں ان کے حصص اور شیرز خریدنا اور اس پر منافع لینا بھی ناجائز ہے کیونکہ ایک تو سرمائے ناجائز اور غلط ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ مذکورہ بالا شرعی اصول کے مطابق تجارت نہیں ہوتی۔

☆ وہ تمام نجی ادارے اور کمپنیاں جو کہ دھوکہ، بے ایمانی، سود، قمار اور ناجائز طریقے سے کاروبار کرتے ہیں جن پر اعتماد نہیں ہے لہٰذا زیادت اور کمی کے ساتھ اس کی بیع جائز نہیں ہے۔ اسی طرح کمپنیوں کے حصص اور شیرز کے پیچھے چونکہ کسی قسم کا موجود مال نہیں ہوتا بلکہ صرف سرمائے ہوتے ہیں تو ہر حصّہ دار کے پاس جو حصّہ کی رسید ہوتی ہے اس رسید کو کمی وزیادتی کے ساتھ فروخت کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ دس روپے کی رسید کو ۱۱ یا ۱۲ روپے پر فروخت کررہا ہے اور یہ خالص سود ہے جو کہ حرام ہے ایسی کمپنیوں اور اداروں کے حصص کی خرید وفروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

ایک شبہ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس طرح پاکستان میں کوئی کمپنی یا ادارہ مل نہیں سکتا جس میں واقعی شرعی اصول کے مطابق کاروبار ہوتا ہو ایسے حالات میں اگر حصص کی خرید وفروخت ناجائز ہو تو تجارت اور کاروبار کیسے چلے گا، پھر تو حصص کی خرید وفروخت کو کلیۃً بند کرنا پڑے گا اور یہ ممکن نہیں ہے۔

شبہ کا جواب

فی الحال اس کے دو جوابات دیئے جاتے ہیں۔

پہلا جواب تو یہ ہے کہ حصص جاری کرنے والے سرکاری یا نیم سرکاری ادارے اور کمپنیاں ہوں یا غیر سرکاری ادارے یا کمپنیاں اگر ان کے حصص کی خرید وفروخت بند کردی جائے تو قیامت نہیں آئے گی۔ آسمان نہیں ٹوٹے گا کیونکہ اس کے علاوہ کاروبار اور تجارت کے بے شمار انواع اور ذرائع آمدنی کے بے شمار طریقے موجود ہیں۔

مروّجہ حصص کی خرید وفروخت کا جو رواج ہے اسے نصف صدی سے زیادہ مدّت نہیں ہوئی اس سے قبل دوسرے کاروبار چلتے تھے آج بھی اس طرح ممکن ہے۔ لہٰذا اگر حلال کمائی کی نیت ہو اور زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے کی حرص اور لالچ نہ ہو اور حلال کمائی پر پابندی کرنے کا ارادہ ہو تو حصص کی خرید و فروخت کو چھوڑنے میں کوئی حرج واقع نہ ہوگا بلکہ خود بخود یہ ناجائز ادارے اور کمپنیاں ختم ہوجائیں گی۔

اگر تاجر برادری مل کر کوشش کرے اور جائز طریقے اپنانے پر اتفاق کرلیں تو یہ بھی کر سکتے ہیں غرض یہ کہ ناجائز طور پر حصص کی خرید وفروخت کرنے کا مسئلہ کوئی ایسا نہیں ہے کہ اس کو چھوڑنے سے ملک تباہ ہوجائے گا، لوگ بھوکے پیاسے مرجائیں گے۔

دوسرا جواب یہ کہ اگر بالفرض ان اداروں اور کمپنیوں کو چونکہ حکومت کی سرپرستی حاصل ہے اور حکومت ان ناجائز کاروبار کو ختم کرنے پر رضامند نہیں ہوتی اور وہ کمپنی والے بھی اسلام کے اصول تجارت پر کمپنی اور کاروبار چلانے پر رضامند نہیں ہوتے تو ایسے حالات میں جو مسلمان اپنے ایمان کی حفاظت کرنا چاہتا ہے اور اپنے اعمال کی اصلاح کرنے کی سعی کرتا ہے اور اس کو آخرت کا خوف ہے اس کے لئے تو یہی راستہ متعین ہے کہ خود ناجائز ذرائع آمدنی اختیار کرنے سے پرہیز کرے اور اپنے عزیز واقارب کو اس سے بچانے کی سعی کرے اور عامۃ الناس کو اس طرح کے جرائم اور گناہوں سے آگاہ کرے تاکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری پوری ہوجائے۔ بس اس طرح حکومت اور ناجائز کاروبار چلانے والوں اور اس کو فروغ دینے والوں پر جو گناہ ہوگا اس سے پرہیز کرنے والے گناہ سے بچ جائیں گے۔

☆ جن کمپنیوں پر سو فیصد یقین ہے اور تحقیق سے معلوم ہے کہ ان کے حصص کے پس پشت واقعی جائز سرمائے کا جائز کاروبار ہے، سودی، جوے اور دھوکہ کے کاروبار نہیں ہیں اور اگر کاغذات میں کارخانہ کا ذکر ہے تو واقعی کارخانہ قائم ہے اور چالو ہے۔ مال بنتا ہے، دیانتداری سے سالانہ یا ششماہی حسب وعدہ نفع ونقصان کا اعلان کرتا ہے اور ادا کرتا ہے تو اس میں شرکت جائز ہے۔ اس کے حصص کی خرید وفروخت جائز ہے اور جن جن کمپنیوں کے بارے میں اس طرح واضح حال معلوم ہے اور جن جن لوگوں کو معلوم ہے ان کے لئے شیرز خریدنا جائز ہے لیکن جن کمپنیوں کا حال معلوم نہیں یا جن افراد کو کمپنیوں کا واضح حال معلوم نہیں ہے ان کمپنیوں میں اس وجہ سے شرکت کرنا کہ کمپنی کے حصص مارکٹ میں چالو ہیں اور یقینی طور پر شیرز میں نفع ملتا ہے جائز نہیں ہے کیونکہ جب کمپنی کے بارے میں تفصیلی علم ہی نہیں ہے کہ اس کے پس پشت کیا کیا چیزیں ہیں تو اس کے حصص کی رسیدوں کی مالیت میں جہالت ہے اور اس میں دھوکہ اور خیانت کا سو فیصد احتمال ہے جبکہ حصص خریدنے والے کے قبضہ میں کوئی مال نہیں ہوتا نہ ہی مالیت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ صرف کمپنی کے کاغذات اور اعلانات پر اعتماد ہوتا ہے۔ لہٰذا اس قدر اعتماد اور یقین پر حصص کی خرید وفروخت جائز نہ ہوگی۔

کیونکہ موجودہ زمانہ میں حصص کی خرید وفروخت میں شرعی بیع کے اصول نہیں پائے جاتے۔

(۱) مثلاً فروخت ہونے والی چیز موجود ہونا ضروری ہے اس کی رسید کی خرید وفروخت جبکہ حقیقی مبیع

موجود نہیں جائز نہیں ہے۔

(۲) فروخت کنندہ کے قبضہ میں مال کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ پھر فروخت کرنے والا اور خریدار کے لئے مبیع کی مالیت کی صحیح مقدار اور اندازہ کا علم ہونا ضروری ہے تاکہ دھوکہ نہ ہو جو کہ موجودہ شیرز میں مفقود ہیں۔

(۳) کسی قسم کے دھوکہ اور خیانت کا احتمال نہیں ہونا چاہیئے وغیرہ وغیرہ جبکہ موجودہ شیرز کی خرید وفروخت میں دھوکہ کا نہ صرف احتمال ہے بلکہ ظن غالب ہے۔

نیز جن واقعی کمپنیوں کے حصص بازار میں خرید وفروخت ہوتے ہیں اگر ان میں مذکورہ شرائط اور اصول پائے جاتے ہیں تو اس کے لئے یہ بھی ایک شرط ہے کہ دونوں طرف سے ادھار پر حصص کی خرید وفروخت نہ ہو بلکہ نقد بنقد ہو۔ خریدار ادھر سے پیسے دے اور بصیرت کے ساتھ تمام شرائط مذکورہ کے تحت شیرز کے کاغذات وصول کرے، یا کم از کم مبیع یعنی شیرز وصول کر لے قیمت حسب وعدہ چند روز میں ادا کر دے۔

لیکن موجودہ حالات میں مارکیٹ میں جس طرح شیرز کی خرید وفروخت کا سلسلہ ہے۔ دوسری خرابیوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ شیرز خریدنے والا آج کی قیمت کے لحاظ سے زبانی خرید لیتا ہے اور اس کی قیمت ہفتہ کے بعد ادا کرتا ہے۔ شیرز بھی قیمت ادا کرنے کے روز وصول کرتا ہے۔ یہ خرید و فروخت دونوں طرف سے ادھار ہے۔ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الكالى بالكالى.

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادھار کی بیع ادھار سے منع فرمایا ہے۔

اس واسطے مذکورہ طریقے پر شیرز کی خرید وفروخت ناجائز ہے۔

واضح رہے کہ جن کمپنیوں کے حصص کی خریداری میں قطعی طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ حصص کے پس پشت کمپنی واقعۃً موجود ہے یا نہیں اور اس کا جائز سرمائے سے جائز طریقے پر کاروبار ہوتا ہے یا نہیں، اور اس کی جانب سے نفع ونقصان، اعلانات، امانت داری اور دیانت داری سے ہوتے ہیں یا نہیں بلکہ صرف یہ معلوم ہے کہ اس کے حصص کی خرید وفروخت بازار میں سب سے زیادہ ہوتی ہے اس پر اکثریت اعتماد کرتی ہے اور اس میں شریک ہونے سے زیادہ سے زیادہ نفع ملتا ہے، نقصان ہوتا ہی نہیں اور اگر ہوتا بھی ہے تو بہت ہی معمولی تو صرف اس بنیاد پر حصص کی خرید وفروخت جائز نہیں ہوگی۔ کیونکہ ہمارے ہاں کاروبار میں زیادہ تر ناجائز اور حرام کاروبار کا رواج ہے۔ شبہ حرام موجود ہے اور شبہ حرام سے بچنا بھی ضروری ہے۔

لہٰذا جب تک اس کے پس پشت مال کا ہونا یقینی طور پر معلوم نہ ہو صرف کاغذات پر تحریر شدہ رقم سے زائد رقم پر حصص کا خرید وفروخت کرنا خالص سودی کاروبار کرنا ہے لہٰذا جو حضرات اس طرح کے حصص اور کاربار کو ذرائع آمدنی بنائے ہوئے ہیں وہ اپنے کاروبار کے بارے میں نظر ثانی کریں۔ غور وفکر کر کے دیکھیں کہ جس کاروبار میں وہ سرمایہ لگارہے ہیں وہ کاروبار شرعی اصول کے مطابق ہے یا نہیں۔

یہ تو اصل حصص کی خرید وفروخت کے بارے میں بحث ہوئی لیکن جن ادارے اور کمپنیوں کے حصص اور سرٹیفکیٹز میں سٹے اور جوئے کا کاروبار ہوتا ہو اور ان میں لاٹری اور قرعہ اندازی کے ذریعہ انعام بھی دیا جاتا ہو، ان میں شرکت کرنا اور ان کے حصص کی خرید وفروخت کرنا بھی شرعاً جائز نہیں ہے۔ کیونکہ شریعت کا اصول یہ ہے کہ:

اصول نمبر ۹: جس کاروبار میں قمار یعنی جوا آجاتا ہے تو وہ کاروبار حرام ہوجاتا ہے۔

خلاصہ بحث

شیرز کی خرید وفروخت جائز ہونے کے لئے مندرجہ ذیل شرائط ضروری ہے۔

(۱) جس کمپنی یا ادارہ کے حصص خرید وفروخت کئے جارہے ہیں واقعۃً وہ کمپنی یا ادارہ موجود ہو یعنی کمپنی یا ادارہ کے ماتحت کوئی جائیداد، کارخانہ، مل، فیکٹری یا چالو اشیاء کا کارخانہ موجود ہو، مثلاً حکومت نے دس کروڑ روپئے کی ایک کمپنی کی منظوری دی، دس افراد نے رقم جمع کر کے زمین خریدی، کارخانہ لگایا اور اس میں اشیاء تیار ہونا شروع ہوگئیں، یا دس کروڑ روپئے سے اندرونِ ملک یا بیرونِ ملک تجارت شروع ہوگئیں اندرون ملک سے اشیاء باہر فروخت کی جارہی ہیں یا بیرون ملک سے اشیاء اندرون ملک فروخت کے لئے لائی جارہی ہیں، تو ایسی کمپنی کے حصص شرائط کے ساتھ جائز ہیں۔ اس کے برعکس اگر دس کروڑ روپے جمع کر لئے گئے لیکن ابھی تک نہ کارخانہ قائم ہوا نہ تجارت شروع کی گئی بلکہ صرف دس کروڑ روپے کے حصص بازار میں اس لئے چھوڑے گئے کہ دس کروڑ پر پہلے سے مزید رقم حاصل کی جائے، منافع حاصل کرنا شروع کردیا جائے تو ایسی کمپنیوں کے حصص کی خرید وفروخت جائز نہیں ہوگی کیونکہ ہر شیئرز کے مقابلہ میں جمع شدہ روپے کی رسید ہے کوئی جائیداد یا مال ایسا نہیں ہے جس پر منافع لے کر فروخت کیا جاسکے۔

(۲) کمپنی کا سرمایہ جائز وحلال ہو۔

(الف) یعنی جس موجود کمپنی اور چالو کاروبار یا کارخانہ کے حصص خرید وفروخت کئے جارہے ہوں اس کا

سرمایہ جائز اور حلال ہو۔ سود، رشوت، غصب، چوری، خیانت، جوئے، سٹہ پر حاصل شدہ رقم نہ ہو لہٰذا سودی ادارہ جیسے بینک یا انشورنس کمپنی یا ہر وہ کمپنی جس میں سود یا جوئے کا کاروبار ہوتا ہو اس کے شیئرز کی خرید وفروخت جائز نہیں ہوگی کیونکہ ان کے ذرائع آمدنی ناجائز ہیں اور کاروبار ناجائز ہے۔ لہٰذا جو شخص ان کمپنیوں کے حصص خرید وفروخت کرے گا وہ ناجائز اور حرام کاروبار میں شامل ہو جائے گا جو کہ گناہ اور معصیت ہے۔

(ب) کمپنی کے شرکاء میں سودی کاروبار کرنے والے ادارہ یا افراد کی رقم شامل نہ ہو مثلاً انشورنش کمپنی یا بینک یا کسی سودی ادارہ کی اس میں شرکت نہ ہو جس کمپنی کے حصص خرید وفروخت کیے جا رہے ہیں اس میں اگر ایسی کمپنیاں شریک ہوں گی پھر اس کے حصص کو خرید وفروخت کرنا اور منافع لینا ناجائز ہوگا۔

(۳) کمپنی یا ادارہ کا کاروبار جائز اور حلال ہو۔

(الف) یعنی جس کمپنی کے حصص بازار میں خرید وفروخت ہو رہے ہیں اس کے لئے پہلی دونوں شرطوں کے بعد یہ بھی شرط ہے کہ کمپنی کا کاروبار جائز ہو مثلاً شرعی شراکت وشرعی مضاربت کی بنیاد پر کاروبار اور شرائط فاسدہ کے تحت ناجائز اور فاسد کاروبار نہ ہو، نہ ہی کمپنی کے کاروبار میں سود، جوئے اور ناجائز خرید وفروخت پائی جاتی ہو لہٰذا اگر کاروبار ناجائز ہوگا تو اس کمپنی کے شیئرز کی بیع وفروخت جائز نہیں ہوگی۔

(ب) اور کمپنی کا کاروبار حلال اور جائز اشیاء کا کاروبار ہو، حرام اور ناجائز اشیاء کا کاروبار نہ ہو مثلاً شراب، تصویر (جاندار کی) ٹی وی، وی سی آر اور ویڈیو فلم سینما وغیرہ کے کاروبار والی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت جائز نہیں ہوگی کیونکہ حرام اشیاء کی خرید وفروخت بھی حرام ہے۔

(۴) شیئرز کی خرید وفروخت میں شرائط بیع کی پابندی کرنا۔

یعنی مذکورہ بالا تمام شرائط کے موجود ہونے کے بعد اس قسم کی کمپنی یا ادارہ کے شیئرز خرید وفروخت جائز ہونے کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ شرعی بیع وتجارت کے اصول کے مطابق ہو مثلاً آدمی جس حصص کو خرید کر بیچنا چاہتا ہے اس پر شرعی طریقہ پر قابض ہو اور دوسرے کو تسلیم اور حوالہ کرنے پر قادر ہو۔ واضح رہے کہ شیئرز میں قبضہ کا حکم ثابت ہونے کے لئے شیئرز کا خریدنے والے کے نام رجسٹر یا الاٹ ہونا ضروری ہے۔ رجسٹر یا الاٹ ہونے سے پہلے زبانی وعدہ یا غیر رجسٹرڈ شدہ حصص کی خرید وفروخت کمی و بیشی کے ساتھ جائز نہ ہوگی کیونکہ ایسے حصص درحقیقت رسیدیں ہیں۔ کمپنی کے واقعی حصے نہیں اس واسطے

نفع ونقصان کا مالک صرف رجسٹر شدہ اسامی سمجھے جاتے ہیں مثلاً ایک شخص نے فی شیئرز دس روپے کر کے سو شیئرز خریدنے کے لئے کسی سے کہہ دیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ ہفتہ کے بعد پیسے دے کر شیئرز وصول کرے گا تو ایسے حالات میں یہ خرید وفروخت صحیح نہیں ہوئی کیونکہ نہ پیسے دیئے نہ شیئرز وصول کئے نہ ہی اس طرح غیر شرعی طریقے پر حصص خریدنے سے وہ کمپنی کے حصّے کے حصے دار ٹھہرے لہٰذا ایسے شیئرز کو کمی وبیشی کے ساتھ خرید وفروخت کرنا جائز نہیں ہے حرام ہے، البتہ یہ صحیح ہے کہ پہلے شیئرز رجسٹر ہو جائے اور قیمت بھی ادا کر دی جائے یا قیمت اب تک ادا کرنا باقی ہے شیئرز وصول کر لئے ہیں تو اس صورت میں حصص کو بیچ کر منافع لینا جائز ہے۔ کیونکہ شیئرز پر قبضہ ثابت ہے ایسے حصص کا معنی یہ ہوتا ہے کہ خریدار باقاعدہ کمپنی کا حصہ دار ہے اور یہ اصول ہے کہ کوئی بھی حصّہ دار اپنے حصّے کو اپنے شریک کی اجازت سے دوسرے کو فروخت کر سکتا ہے۔

(۵) منافع کی کل رقم کو تمام حصہ داروں کے درمیان شیئرز کے مطابق تقسیم کرنا۔

مثلاً کمپنی میں جو منافع ہوا ہے تمام حصہ داروں میں اپنے اپنے حصّے کے مناسب سے تقسیم کر دینا لیکن کوئی کمپنی اگر منافع میں سے ۲۰٪ فیصد کمپنی مل، کاروبار اور کارخانہ کے مستقبل کے ممکنہ خطرہ کے لئے مخصوص کر کے باقی ۸۰٪ فیصد منافع کو تمام حصّہ داروں میں تقسیم کرتی ہے تو اس کمپنی کا شیئرز خریدنا بھی جائز نہیں ہوگا کیونکہ یہ کمپنی بھی شرعی شرکت کے خلاف ناجائز کاروبار کرتی ہے۔

اس سلسلہ میں جہاں تک بندہ کے علم میں ہے دو قسم کے ادارے ہیں۔ ایک تو خالص کاروباری اور تجارتی ہیں ان کا حکم وہی ہے جو اوپر لکھا گیا ہے۔

اور دوسری قسم کے وہ جو امدادی اور رفاہی ادارے ہیں جو کہ نادار اور مستحق لوگوں کی امداد اور تعاون یا ان کے علاج ومعالجہ کی غرض سے قائم کئے گئے ہیں اور لوگوں سے زکوٰۃ، صدقات، خیرات، عطیات مختلف ناموں سے بذریعہ سرٹیفیکٹ مختلف مقدار میں پیسے جمع کرتے ہیں پھر امداد جمع کرنے والوں میں سے بعض کو بذریعہ قرعہ اندازی مختلف مالیت کی مقدار کے مختلف انعامات بھی دیئے جاتے ہیں۔ اس قسم کے امدادی اداروں میں آمد وصرف کے اعتبار سے بھی بے شمار خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ قرعہ اندازی کے ذریعہ انعامات تقسیم کرنے کی شرط پر امداد جمع کرنا بجائے خود غلط ہے۔ پھر اس قسم کے امدادی اداروں میں زکوٰۃ ودیگر صدقات واجبہ، چرم قربانی کی جو رقوم جمع ہوتی ہیں اس سلسلہ میں بہت سے اداروں کے بارے میں یہ بات علم میں آئی ہے کہ وہ زکوٰۃ وصدقات واجبہ کی رقم کو غیر شرعی طریقے پر خرچ کرتے ہیں۔ رفاہی اداروں کے ملازمین کی تنخواہیں، ہسپتال کی تعمیر اور ہسپتال کے دیگر ضروری سامان،

ڈاکٹری آلات میں خرچ کرتے ہیں اور بلاتمیز شرعی مستحق وغیر مستحق کے علاج میں بھاری رقم خرچ کرتے ہیں۔ اس بارے میں زکوٰۃ وصدقات دہندگان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ایسے امدادی ادارے میں خالص عطیات وخیرات، صدقۂ نافلہ کی رقم تو جتنا ممکن ہو زیادہ سے زیادہ دیں اللہ تعالیٰ کا حکم ''وانفقوا ممّا رزقنکم'' پر دل کھول کر عمل کریں۔ لیکن اپنی زکوٰۃ فرض اور صدقات واجبہ کے بارے میں احتیاط کریں۔ اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے مصارف کے علاوہ کسی اور جگہ نہ دیا کریں اور یہ سمجھ کر کہ ہسپتال قائم کرنا مخلوق کی بڑی خدمت ہے اور بلاتمیز مستحق وغیر مستحق مسلمان وکافر ہر قسم کے لوگوں کی امداد، زکوٰۃ وصدقات واجبہ سے کرنا سب سے زیادہ اہم عبادت ہے اس بنیاد پر ہر قسم کی امدادی اداروں کو زکوٰۃ وصدقات واجبہ کی رقم دینا بہت بڑی شرعی غلطی ہے۔

جن امدادی اداروں کے پاس لوگوں کی زکوٰۃ وصدقات واجبہ کی رقوم جمع ہوتی ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ سوائے شرعی مستحق لوگوں کے کسی اور شخص کی امداد یا علاج، زکوٰۃ وصدقات واجبہ کی رقم سے نہ کریں بلکہ خالص عطیات اور صدقات نافلہ کے فنڈ سے ان کی امداد کرنا چاہیں تو کریں۔

اسی طرح زکوٰۃ ودیگر صدقات واجبہ کی رقم کو ہسپتال کی تعمیر اور اس کی آرائش اور اس کے ضروری سامان کی خریداری اور طبی آلات اور بستروں اور فرنیچروں میں خرچ نہ کریں۔ نہ ہی اس سے ملازمین کی تنخواہیں ادا کریں بلکہ ایسے اخراجات کے لئے دوسرے عطیات وخیرات کی رقم صرف کریں تاکہ زکوٰۃ و صدقات اور دوسرے عطیات اپنی اپنی جگہ پر صرف ہوسکیں، ہر چیز اپنے اپنے مقام پر رہے۔ اس کے علاوہ ان امدادی اداروں میں دوسری غلطی یہ پائی جاتی ہے کہ کسی قسم کے صدقہ یا عطیہ کی رقم کو قرعہ اندازی میں نام آنے پر انعام دینے پر مشروط کیا جاتا ہے جو کہ غلط اور غیر شرعی ہے۔

اس سے صدقہ وخیرات اور عطیات کا ثواب اور اجر تو کجا بلکہ الٹا قمار اور جوئے کے ذریعہ پیسے کمانے کی نیت سے پیسے جمع کرانے پر شدید گناہ ہوگا۔ اس واسطے ایسے امدادی اداروں کے لئے یہ جائز ہی نہیں ہے کہ اس طریقے پر امدادی رقم جمع کریں نہ ہی قرعہ اندازی میں نام آنے پر امدادی رقم کا انعام میں تقسیم کرنا جائز ہے بلکہ قمار اور جوا ہے جو کہ حرام ہے۔

اصول نمبر ۱۰:

بیع نجش از روئے شرع ممنوع ہے

عن ابن عمر رضی اللہ عنهما قال نهى النبی صلی اللہ علیه وسلم عن النجش.

(بخاری، مسلم، کتاب البیوع)

ابن عمر سے روایت ہے آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید و فروخت نجش سے منع فرمایا۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نجش کا معنی خرید و فروخت میں خریدار کو دھوکہ دینا خواہ کسی بھی نوعیت سے ہو اور یوں لکھا ہے:

الخداع باطل لایحلّ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم الخدیعة فی النار.

(بخاری و مسلم کتاب البیوع)

خداع یعنی خریدار کو دھوکہ دینا باطل اور ناجائز ہے حلال نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دھوکہ دینے والا جہنم میں جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ سے روایت ہے:

الناجش آکل ربا، خائن، (بخاری و مسلم)

ناجش یعنی خریدار کو دھوکہ دینے والا، سود کھانے والا ہے دھوکہ باز اور خائن ہے۔

نجش اور دھوکہ کی مختلف صورتیں

(۱) اپنے سامان اور مال کی اس طرح تعریف کرنا ایسی صفات بیان کرنا جو واقعۃً اس میں موجود نہیں ہیں۔

(۲) اپنے مال میں سے جو خراب اور ناقص ہے اس کو چھپا کر رکھنا اور جو اچھا اور عمدہ ہے اس کو اوپر رکھنا اور خریدار کے سامنے ظاہر کرنا کہ سارا مال ایسا ہی ہے حالانکہ اندر یا نیچے خراب اور ناقص مال چھپا ہوا ہے۔

(۳) فروخت کنندہ کا گاہک کے سامنے یہ ظاہر کرنا کہ اس مال کو اتنی قیمت پر خریدنے والے موجود ہیں مثلاً دس روپے کا مال ہے لیکن فروخت کرنے والا گاہک کو بتاتا ہے کہ اس کے ۱۵ روپے کا گاہک موجود ہے آپ کو ۱۶ روپے پر دوں گا، خریدار اس پر اعتماد کر کے ۱۶ روپے پر خرید لیتا ہے جبکہ یہی مال دس روپے پر عام بازار میں مل سکتا ہے اور واقعۃً کوئی گاہک ۱۵ روپے کا نہیں تھا، اس نے صرف خریدار کو دھوکہ دینے اور اپنے مال کو چلانے کے لئے غلط بیانی سے کام لیا ہے یہ حلال نہیں بلکہ اس طرح کا کاروبار اور منافع سب حرام ہیں۔

(۴) خریدار کے سامنے بروکار اور دلال کا کسی چیز کا خریدار بن کر مارکیٹ سے زائد قیمت کا سودا طے کرنے کی کوشش کرنا اس ارادے سے کہ چیز بک جائے گی تو اس کو کمیشن ملے گا۔ دلال کا مبیع کے

خریدنے کا ارادہ نہیں ہے صرف دلالی کا کمیشن حاصل کرنا ہے اور اس خریدار کو دھوکہ دے کر چیز کو زائد قیمت پر بکوانا ہے۔

(۵) فروخت کنندہ کے سامنے کسی چیز کی اتنی برائی بیان کرنا، عیب بیان کرنا کہ وہ کم قیمت پر اپنی چیز کو فروخت کرنے پر راضی ہو جائے۔

(۶) دلال کا اپنے آپ کو خریدار ظاہر کر کے فروخت کنندہ کے سامنے یہ بتانا کہ تمہاری اس چیز کی قیمت مثلاً سو روپے سے زیادہ کہیں نہیں مل سکتی مجھے ساری مارکیٹوں کا پتہ ہے لہٰذا مجھے سو روپے پر دے دو جبکہ دلال سے کسی اور نے خفیہ طے کیا ہے کہ یہ چیز اگر تو اتنی کم قیمت پر دے گا تو تجھے اتنی کمیشن ادا کروں گا، اور اس چیز کی قیمت مارکیٹ میں سو روپے سے زیادہ ہے فروخت کنندہ اگر تحقیق کر کے فروخت کرے تو زیادہ پر فروخت کر سکتا ہے لیکن وہ دلال کی بات پر اعتماد کر کے سو روپے پر مال دیتا ہے تو یہ دھوکہ اور خیانت ہوئی یہ نجش ہے جو کہ حرام ہے۔ غرض یہ کہ دھوکہ دینا خواہ دلال کی جانب سے ہو یا خریدار اور فروخت کنندہ کی طرف سے سب ناجائز اور حرام ہیں۔

ہاں اگر کسی چیز کی واقعی قیمت پر فروخت کرنے کے لئے اور نقصان سے بچانے کے لئے اگر کوئی شخص کسی چیز کی صحیح قیمت کا اندازہ بائع یا مشتری کے سامنے ظاہر کر دیتا ہے تو یہ نجش اور دھوکہ میں نہیں آئے گا۔

اصول نمبر ۱۱:

خرید و فروخت کے دوران ناپ تول میں عدل و انصاف قائم رکھنا ضروری ہے

واضح رہے کہ خرید و فروخت کے دوران بعض لوگوں میں ناپ تول میں دیتے وقت کمی کرنے اور لیتے وقت زیادہ لینے کا رجحان پایا جاتا ہے جو کہ شرعاً ممنوع اور حرام ہے۔ قرآن مجید کے اندر سورہ مطففین میں اس پر سخت وعید کا ذکر آیا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

ویل ہے ان لوگوں کے واسطے جو ناپ تول میں کمی وزیادتی کرتے ہیں۔ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا بھر کر لیتے ہیں اور جب دینے لگتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ یقین نہیں کرتے کہ یہ لوگ اٹھائے جائیں گے جس روز تمام آدمی رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ خرید وفروخت اور دوسرے معاملات میں جب دوسروں سے لینے کا موقع آتا ہے تو اپنے حق سے زیادہ لیتے ہیں اور جب دوسرے کو دینے کا موقع آتا ہے تو اس میں کمی کرتے ہیں، ناپ کر دینے کی چیز ہے تو اس میں چوری اور خیانت کرتے ہیں اور جب لینے کا وقت آتا ہے اس میں بھی کوئی ایسا طریقہ استعمال کرتے ہیں کہ مال حق سے زیادہ مل جاوے۔ خواہ دوسرے کا نقصان ہو۔

حق تعالیٰ نے اس رجحان کے لوگوں کے واسطے سخت وعید کا ذکر فرمایا ہے کہ یہ بات ان کے واسطے بڑی خرابی اور ہلاکت کی طرف لے جانے والی ہے۔ قیامت کے روز رب العالمین کے سامنے جواب دہی کرنی ہوگی۔

واضح رہے کہ لین دین میں کمی وبیشی کا یہ رجحان خواہ وزن کرنے میں ہو، یا تولنے میں ہو، یا گننے میں ہو یا پیمائش میں، غرض یہ کہ ہر قسم کے معاملات میں زیادہ وصول کرنے کا رجحان اور کم دینے کی خواہش بہت ہی بری عادت ہے ہلاکت کا سبب ہے۔ اس سے آمدنی ناجائز اور حرام ہو جاتی ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سورۂ مطففین کے نزول سے قبل مدینہ کے بعض لوگوں میں کم ناپ تول کرنے کی عادت تھی لیکن اس سورت کے اترنے کے بعد کم دینے کی عادت بالکل ختم ہوگئی بلکہ زیادہ دینے کی عادت ہوگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی مدینہ کے لوگوں میں ناپ وتول میں پورا پورا دینے کی بات مشہور ومعروف ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ناپ تول میں کمی کرتا ہے یہ شخص خائن اور چور ہے اور عادی مجرم ہے۔

☆ اس واسطے تمام کاروباری لوگوں کو چاہئے کہ جب سامان کا ناپ اور تول کریں تو پورا پورا دیں۔ کمی ہرگز نہ کریں۔

☆ گندم، آٹا، چاول، چینی وغیرہ ٹنوں اور منوں کے حساب فروخت کرتے وقت بڑی احتیاط سے مال دیں، بے احتیاطی ہرگز نہ کریں۔ اس طرح لوہا، سیمینٹ، سونا، چاندی وغیرہ کی خرید وفروخت میں کمی، چوری، خیانت کا رجحان کثرت سے پایا جاتا ہے۔ اس سے بچنا ضروری ہے۔

☆ کپڑے، تھانوں کی گنتی اور گزوں اور میٹروں کے حساب سے فروخت کرتے وقت صحیح گنتی اور پیمائش کر کے خریدار کے حوالہ کریں۔ کمی وزیادتی سے بچنے کی سعی کریں۔

اور ٹیکسی، رکشہ، اور دوسری گاڑیاں چلانے والے غلط میٹر لگا کر سفر کرنے والے سے زائد پیسے وصول کرتے ہیں یہ سب باتیں تطفیف میں داخل ہیں۔ ہلاکت کے باعث ہیں۔ گناہ ہے ایسی آمدنی حرام ہے۔

حدیث میں ہے کہ جس علاقے یا ملک میں کم تولنے، کم ناپنے کم پیمائش کرنے اور چوری اور خیانت سے زیادہ پیسے اور مال وصول کرنے کی عادت پائی جائے گی وہاں پر مہنگائی زیادہ ہوگی۔ قحط سالی شروع ہوگی۔

اس واسطے بڑے اہتمام کی ضرورت ہے۔ گذشتہ امتوں میں ناپ تول میں کمی کرنے کی بنا پر عذاب نازل ہوا تھا ان کو بندر اور سور بنادیا گیا تھا لہٰذا جو لوگ اس میں مبتلا ہیں ان کے لئے تمام باتوں کو سوچنا ضروری ہے اور خدا کا خوف پیدا کرنا لازم ہے۔

اصول نمبر ۱۲:

ذخیرہ اندوزی ممنوع ہے

اسلام کے مالیاتی اور کاروباری اصول میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ ذخیرہ اندوزی ممنوع ہے اور اس کے بے شمار انواع اور اقسام ہیں لیکن یہاں پر صرف کاروبار کے سلسلہ میں جو ذخیرہ اندوزی کی جاتی ہے اس کو بیان کرنا مقصود ہے۔

حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں فرمایا کہ ”ذخیرہ اندوزی وہی شخص کرتا ہے جو خطاکار اور عادی مجرم ہوتا ہے۔“

اس سے مراد عدی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ بازار سے اشیاء خوردنی و دیگر ضروری اشیاء کو اس نیت سے خرید کر جمع کر لینا کہ بازار میں اس کی قلت پیدا کی جائے اور دام بڑھ جائے تا کہ زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کیا جائے یا اس نیت سے زیادہ سے زیادہ اشیاء خوردنی یا دوسری ضروریات زندگی سے متعلق اشیاء کا خرید لینا کہ جب بازار میں ان اشیاء کی قلت ہو جائے گی دام بڑھ جائے گا پھر اسے فروخت کیا جائے گا۔ ان صورتوں میں سے پہلی صورت یعنی بازار میں اشیاء خوردنی یا دیگر ضروریات زندگی میں مصنوعی قلت پیدا کرنا یا تاجر برادری کا اکٹھا ہو کر بازار سے گندم، جو، چاول، دال، گھی، چینی،

کپڑے یعنی جن چیزوں کی ضرورت عامۃ الناس کو زیادہ پڑتی ہے ان کو گودام میں جمع کرلینا، روک لینا تاکہ مصنوعی قلت پیدا کردی جائے یہ صورت بالکل ناجائز وحرام ہے۔ دوسری صورت میں مکروہ یعنی ضروریات زندگی میں قلت واقع ہونے کی خواہش اور دام بڑھ جانے کی حرص سے زیادہ سے زیادہ مال خرید کررکھنا، البتہ یہ دونوں باتیں اگر نہ ہوں بلکہ بازار کے اتار چڑھاؤ کے اعتبار سے منافع حاصل کرنے کی غرض سے اشیاء خریدتا ہے تاکہ دام بڑھنے پر فروخت کرسکے نہ قلت پیدا کرنے کا ارادہ ہے نہ ہی زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی خواہش، تو اس صورت میں مال خرید کر بعد میں فروخت کرنا ممنوع نہیں ہے۔

بیع پر بیع کرنا یعنی ایک معاملہ پر دوسرے معاملہ کو جمع کرنا

اصول نمبر ۱۴: بیک وقت دو قسم کی بیع، دو طرح کے معاملے کو شریعت نے منع کیا ہے حدیث میں ہے۔

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيعتين في بيعة وفي رواية صفقة على صفقة.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بیع میں دوسری بیع کو اور ایک معاملہ کو دوسرے معاملہ میں جمع کرنے سے منع فرمایا ہے۔

حدیث کی محدثین کرام نے مختلف تشریح کی ہے۔ یہاں ہم صرف چند مثالیں دے کر اکتفاء کرتے ہیں۔

(۱) ایک صورت تو یہ ہے کہ مثلاً دوکاندار ایک چیز کو خریدار پر اس طرح فروخت کرے کہ نقد میں ہو تو اس کی سو روپے قیمت ہے اور ادھار میں ہو تو ایک سو پچیس روپے۔ خریدار کسی ایک قیمت متعین کیے بغیر یوں کہتا ہے کہ منظور ہے پھر شئے مبیع اٹھالیتا ہے تو یہ بیع فاسد ہے کیونکہ بائع کو معلوم نہیں ہے۔

خریدار نے کس بیع کو اختیار کیا ہے نقد کی بیع کو یا ادھار کی بیع کو، لہٰذا جہالت عقدِ بیع کے ساتھ ساتھ جہالت ثمن بھی ہے البتہ اس میں اگر خریدار نے اسی مجلس میں کسی ایک قیمت پر بیع کو قبول کرلیا ہے کہ سو روپے نقد پر مبیع کو خریدتا ہوں یا یوں کہتا ہو کہ ایک سو پچیس روپے ادھار پر خریدتا ہوں تو بیع کی ایک صورت متعین ہوجانے کی وجہ سے اب فساد رفع ہوگیا ہے لہٰذا اس صورت میں بیع جائز ہوگی۔

(۲) بیع کے اندر بیع کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ فروخت کنندہ ایک قیمت پر کوئی چیز خریدار کو فروخت

کرتا ہے جبکہ خریدار اس پر راضی نہیں ہے لیکن کہتا ہے کہ آپ اس کو اسی شرط پر خرید لیں۔ اگر آپ سے فروخت نہ ہوئی تو مجھے ایک روپے منافع پر فروخت کر دیں میں لے لوں گا یہ بیع بھی جائز نہیں ہے۔ کیونکہ ایک بیع کو دوسری بیع کے ساتھ شرط کر دی گئی۔

(۳) یا زید عمر سے کہتا ہے کہ مجھے ایک گاڑی کے لئے لاکھ روپے کی ضرورت ہے تم مجھے خرید کر قسطوں میں دے دو۔ عمر کہتا ہے کہ اس طرح کرتا ہوں کہ گاڑی اس شرط پر بیچتا ہوں کہ تم ماہانہ دو ہزار روپے قسط بطور کرایہ اور ایک ہزار بطور قسط خرید کے کل تین ہزار ادا کرو۔ ڈیڑھ لاکھ جب وصول ہو جائیں گے، پھر گاڑی تمہیں فروخت کر دیں گے یعنی ملکیت دے دیں گے یہ معاملہ بھی ناجائز ہے کہ بیع اور اجارہ دونوں کو جمع کیا گیا ہے۔

(۴) یا مثلاً ہاؤس بلڈنگ کارپوریشن نے زید کو قرض دیا کہ تم مکان بناؤ۔ مکان میں دونوں شریک ہوں گے۔ اس کے کرایہ میں آدھا آدھا دونوں شریک ہوں گے۔ پھر ہماری قسطیں کرایہ کے ساتھ ادا کرو۔ یہ معاملہ بھی جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ معاملہ قرض اور شرکت کے ساتھ جمع کرنا ناجائز ہے۔ قرض رہے تو شرکت نہیں آسکتی شرکت آئے گی تو قرض نہیں رہے گا۔ پھر کاروبار کا سرمایہ بن جائے گا جس کی قسطیں ادا کرنا شریک پر لازم نہیں ہے۔

(۵) بعض لوگ رہن کا معاملہ کرتے ہیں پھر مرتہن کو شئ مرہون اجارہ پر دیتے ہیں تو بیک وقت ایک آدمی مرتہن اور مستاجر دونوں بنا جو کہ جائز نہیں ہے۔

اصول نمبر ۱۴:

حقوق مجّردہ کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے

یعنی ایسے حقوق جس میں کسی ملک کے باشندے اور شہری مساوی حقوق رکھتے ہیں اور شرعاً وہ مال تعریف میں نہیں آتے ہوں، ان کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔

☆ مثلاً قدرتی نہر کا پانی اور سمندر کے پانی کی خرید وفروخت کرنا۔

☆ راستہ اور شارع میں گذرنے اور گاڑی چلانے کا حق فروخت کرنا۔

☆ سرکاری، غیر سرکاری سندات اور ڈگریوں کی خرید وفروخت کرنا۔

☆ لائسنس اور اجازت ناموں کی خرید وفروخت کرنا۔

☆ پاسپورٹ، شناختی کارڈ کی خرید وفروخت کرنا۔

☆ غیر مملوکہ اور افتادہ زمین، راستے کے کنارے میں، بازار میں، میدان میں چلنے کا حق، بیٹھنے کا حق، یا اس میں خرید وفروخت کرنے کا حق، جس کو قابض نے شرعی اور قانونی طریقے پر نہ خریدا ہو فروخت کرنا۔

☆ طلبہ کے رہائش، قیام وطعام اور دوسری سہولتوں کے حقوق جو دینی مدارس اور جامعات، دنیاوی تعلیمی اداروں، اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کی جانب سے حاصل ہیں ان کی خرید وفروخت کرنا، یہ سب بیوع ناجائز ہیں۔

☆ اساتذہ کرام کے استادی کے جملہ حقوق اور اداروں کی جانب سے ملنے والی سہولتوں کی خرید و فروخت مثلاً سرکاری غیر سرکاری گاڑیوں میں کم پیسے پر سفر کرنے کے حقوق، عہدے اور مناصب کی بنیاد پر مکان یا پلاٹ لینے کے حقوق اور ان کی خرید وفروخت کرنا۔

☆ مزدوروں اور ملازمین کی مزدوری اور ملازمت کرنے کے حقوق کی خرید وفروخت، تجارت کرنے کے حقوق کی خرید وفروخت وغیرہ وغیرہ، غرض ہر قسم کے حقوق جو کہ مال کی تعریف میں نہیں آتے ان کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے۔ اس پر حاصل شدہ آمدنی اور منافع ناجائز وحرام ہے صاحب حق کو واپس کرنا ضروری ہے۔

اصول نمبر ۱۵:

حرام مال سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ

حرام اور ناجائز ذرائع آمدنی سے جو مال حاصل کیا گیا ہے یا جائیداد بنائی گئی یا کاروبار چل رہا ہے اس کو کیا کیا جائے جس سے آدمی گناہ اور حرام سے پاک ہو جائے۔ یہ ایک اہم سوال ہے اور مشکل مسئلہ ہے جس کا حل بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے تا کہ کوئی خدا کا خوف کھانے والا رجوع الی اللہ کرنا چاہے تو اس کو راستہ معلوم ہو، تو اب اس کا حل ملاحظہ فرمائیے۔

حرام مال سے اپنے آپ کو پاک اور بری کرنے کی مختلف صورتیں

(۱) اس کا سب سے پہلا حل اور شرط تو یہ ہے کہ آدمی خالص دل سے حرام کمائی کے گناہ سے توبہ کرے۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے آئندہ کے بارے میں اس طرح نہ کرنے کا اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرے اور صاحب مال کا مال واپس کرنے کی فکر کرے۔

(۲) حرام مال اگر غصب، چوری، لوٹ، رشوت، سود، جوا، خیانت دھوکہ یا ناجائز وحرام کاروبار کے ذریعہ سے حاصل کیا گیا ہے تو سب سے پہلے اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس سے مال حاصل کیا گیا ہے اگر وہ زندہ ہے تو اس کو ورنہ اس کے ورثاء کو خواہ کہیں بھی ہوں کسی ملک میں ہو پہنچایا جائے جب تک اصل مالک اور حقدار یا اس کے ورثاء موجود ہیں اور ان تک ان کا حق پہنچانا ممکن ہے دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔

شرح السیر الکبیر میں امام محمدؒ نے لکھا ہے۔

وما حصل بسبب خبيث فالسّبيل ردّه. (ص ۱۱۶، ج ۴)

یعنی جو مال کسی خبیث اور ناجائز طریقہ سے حاصل کیا گیا ہے اس کا راستہ یہ ہے کہ اسے واپس کردیا جائے۔

ردالمختار میں علامہ ابن عابدین شامی نے لکھا ہے۔

والحاصل أنه ان علم أرباب الأموال وجب ردّه عليهم والا فان علم عين الحرام لايحلّ له ويتصدّق به بنية صاحبه. (ص ۹۸)

خلاصہ یہ کہ مال حرام کے بارے میں اگر اصل مالکان کا علم اور پتہ ہے تو ان تک مال کا پہنچانا واجب ہے اور اگر اصل مالکان کا علم اور پتہ نہ ہو اور مال بھی عین حرام ہے تو پھر جس کے ہاتھ میں ہے اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ خود استعمال کرے بلکہ اسی حرام اور ناجائز مال کو اصل مالکان کی جانب سے صدقہ کردے کہ ثواب انہیں کو پہنچے۔

مذکورہ بالا شامی کی عبارت سے دوسری بات بھی معلوم ہوگئی کہ اگر مال حرام کو اصل مالک تک پہنچانا اس کا علم اور پتہ نہ ہونے کی وجہ سے کسی طرح ممکن نہ ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ اصل مالک کی جانب سے اس کے لئے صدقہ کی نیت کرکے صدقہ کردے، ایسے لوگوں کو دے دے جو کہ مستحق زکوٰۃ وصدقہ ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں رسول اللہ صلیٰ اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت ہے آپ نے ایسے موقع پر ناجائز کھانے سے متعلق فرمایا ہے کہ محتاج قیدیوں کو کھلا دیا جائے۔ امام محمدؒ نے فرمایا ہم اسی رائے اور حکم کو پسند فرماتے ہیں اور امام ابوحنیفہؒ کا مذہب بھی یہی ہے۔ (کتاب الآثار ص ۱۹۴)

محدث العصر علامہ السید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ نے بھی اپنی مایہ ناز ترمذی کی شرح ''معارف السنن'' میں اپنے شیخ علامہ سیّد مولانا محمد انور شاہ صاحب رحمہ اللہ سے یہی بات نقل فرمائی ہے۔

قال شيخنا ويستفاد من كتب فقهائنا كالهداية وغيرها من ملك بملك

خبیث ولم یمکنه الردّ الی المالک فسبیله التصدّق علی الفقراء.

(ص ۳۴، ج۱)

ہمارے شیخ نے فرمایا ہے کہ ہمارے فقہاءکرام کی کتب مثلاً ہدایہ وغیرہ سے یہ مسئلہ مستفاد ہوتا ہے کہ جوکوئی شخص مال خبیث (حرام مال) کا مالک بنااوراس کا پہنچانا مالک تک ممکن نہ ہوتواس سے خلاصی کی صورت یہ ہے کہ اس مال کوفقراء پرصدقہ کردیا جائے۔

(الف) جس کا مطلب یہ نکلا کہ قطعی مال حرام کے بارے میں دوہی حکم ہیں کہ مال اگر موجود ہے تو اصل مالک کی طرف لوٹا دیا جائے اوراگر مال ہلاک یا ضائع ہوگیا ہے تواس کا ضمان اور قیمت ادا کرے جبکہ وہ صاحبِ استطاعت ہے۔

(ب) لیکن بعض دفعہ اصل مالک یااس کے کسی وارث کا پتہ نہیں ہوتانہ ہی کسی طرح پتہ لگاناممکن ہوتا ہے تو ایسے موقع پراسی مال حرام کواصل مالک کی نیت سے اوراس کی جانب سے صدقہ کردیناواجب ہے۔

(ج) اورصدقہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ مستحق لوگوں کودیاجائے غیر مستحق لوگوں کونہ دیاجائے۔

(د) نیز مال حرام کوفقراءاور مستحق پرصدقہ کرنے کے حکم سے یہ بھی معلوم ہواہے کہ اس کوکسی ایسے مصرف میں دینا جائزنہیں جس میں تصدّق الی الفقراء کا تحقق نہ ہو۔لہٰذا ایسے مال حرام سے مسجد، مدرسہ، اور مسجدومدرسہ کے وضوءخانہ، بیت الخلاء، شفاخانہ، خانقاہ، مسافرخانہ وغیرہ کی تعمیر جائزنہیں ہے۔

ایک عذرکمزوراوراس کاحل

بعض لوگ عزت دار ہوتے ہیں، لاعلمی یا جہالت، ونادانی کی بنا پر بے شمار مال حرام اور سرمایہ ناجائز ذرائع سے حاصل کیا گیا ہوتا ہے۔اب ان کوخدا کا خوف آگیا ہے۔مال حرام سے پاک اور بری ہونا چاہتے ہیں۔اصل مالک یا مالکان کا مال پہنچانا تو چاہتے ہیں لیکن یہ بھی چاہتے ہیں کہ مال حاصل کرنے کے سبب اورطریقہ کوظاہر نہ کرے مثلاً کسی کا مال چرایا، یاغصب کیا، یاخیانت، رشوت اوردھوکہ سے حاصل کیااب اس کوبتائے بغیرواپس کرےتواس کاحل بھی کوئی مشکل نہیں ہے۔

اولاً جس جرم کے بدلے میں روزِ قیامت میں سب کے سامنے رسوائی ہوسکتی ہے جہنم میں جانے کا اندیشہ غالب ہے۔ایسے جرم کا اگر صاحبِ حق کے پاس اقرار کرلے اوراس سے معافی بھی مانگ لی جائے تویہ بہت بڑی رسوائی نہیں ہےاس سے وقار گرے گانہیں بلکہ بلند ہوگا۔اس سے حقیقۃً عزت نہیں

جائے گی بلکہ عزت ملے گی، خوفِ خدا کی وجہ سے جو کام کیا جاتا ہے اس سے عزت جاتی نہیں بلکہ عزت میں اضافہ ہوتا ہے، پھر بھی اگر کسی کو شیطانی وسوسے غالب ہوں اور اصل بات کو ظاہر نہیں کر سکتا تو اس کے لئے یہ طریقہ اختیار کرنا بھی جائز ہے کہ صاحب حق کا حق ہدیہ اور تحفہ کے نام سے واپس کر دے۔ یا وصیت کر کے جائے کہ اس کو اتنا مال ہدیہ میں دے دیا جائے یا مالک کو کوئی چیز واجب الاداحق کے برابر قیمت والی فروخت کر کے بعد میں اس کو کہہ دے آپ کو ہدیۃً دیا ہے۔ آپ سے قیمت نہیں لینا ہے، غرض یہ کہ نیت تو حق واجب کی ادائیگی کی ہو، لیکن دینے کا عنوان کچھ بھی ہو تو جائز ہے۔ اصل مقصد حقدار کو حق پہنچانا ہے۔ باقی ان کے ساتھ اگر زیادتی بھی ہوگئی تھی تو دنیا میں اس کی معافی تلافی ہو جانی چاہیئے۔ یہ سب سے بہتر طریقہ ہے اور معافی کی کوئی صورت نہ ہو سکی تو صاحب حق کے لئے دعائے مغفرت، استغفار اور ایصال ثواب کر کے بھی معافی کی صورت بن سکتی ہے جبکہ حقدار مسلمان ہو۔ لیکن حقدار اگر کوئی غیر مسلم ہے تو اس کا مالی حق پہنچانا یہ بھی ضروری ہے۔ اگر حق پہنچانے کا کوئی امکان نہیں ہے تو اس صورت میں اس کا مال مالِ فئی کے حکم میں ہے لہٰذا حکومت کے کسی ادارے میں دے دے یا کسی فقیر غریب کو دے دے یا کسی رفاہ عام کے ادارے میں دے دے کافروں کے حقوق میں اتنی گنجائش ہے کہ مستحق زکوٰۃ کو دینا ضروری نہیں ہے کسی بھی کار خیر میں دے سکتا ہے۔

نیز واضح رہے کہ اصحاب حق کے حقوق پہنچانے کی یہ تفصیل تو اس وقت ہے کہ صاحب مال کا مال موجود ہو اور اس کو پہنچانا ممکن ہو۔ یا بعینہٖ اس کا مال یا حق تو موجود نہ ہو لیکن اس کے بدلہ میں قیمت اور ضمان ادا کرنے کی استطاعت موجود ہو ہر دونوں صورت میں ایصالِ حق اربابِ حق کی طرف لازم ہے لیکن اگر ارباب حق کا حق ضائع ہو گیا ہے نہ اصل حق موجود ہے نہ اتنی استطاعت ہے کہ ارباب حق کا حق ادا کر سکے بلکہ اب ناجائز مال لینے والا یا کھانے والا خود فقیر ہو گیا ہے حق ادا کرنے کے لئے اس کے پاس کچھ بھی نہیں تو اس صورت میں اس کو چاہیئے کہ پہلے تو خود اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کرے اور روئے پھر صاحب حق اگر زندہ ہے تو اس کی طرف رجوع کرے اور اس سے حق کو معاف کرالے۔ اگر وہ خود نہیں تو اس کے ورثاء سے معافی مانگے۔ جبکہ حقدار یا اس کے ورثاء سے ملاقات ممکن ہو۔

اور اگر حقدار سے ملاقات کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے تو اس کے لئے دعائے مغفرت اور استغفار کرے۔ صاحب عذر کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور ہر آدمی کے دل کے حال کو بھی خوب دیکھ رہا ہے۔ اگر خدا چاہے گا تو اس کی نافرمانی کا گناہ معاف کر دے گا اور جس بندہ کا قصور کیا ہے اس سے معافی کا بندوبست بھی روز قیامت میں کر دے گا۔

ایک اہم شبہ

بعض علماء حرام اور ناجائز ذرائع سے مال اور جائیداد حاصل کرنے والوں کو اپنے مال اور جائیداد کو پاک کرنے کے واسطے یہ حیلے بتاتے ہیں۔

(ا) کہ کسی حلال آمدنی والے سے پورے ماہ کے اخراجات کے واسطے قرض لے کر کام چلاوے اور قرض دار کا قرض اپنے حرام مال سے ادا کرے اس طرح حرام کھانے سے بچ جائے گا اور مال کی تطہیر بھی ہو جائے گی اس میں بعض محتاط قسم کے بزرگ حضرات یہ بھی بتاتے ہیں کہ اپنی ضروریات کے لئے کسی غیر مسلم سے قرض لے اور حرام مال میں سے غیر مسلم کے قرض کی ادائیگی کر دے، اس طرح حرام کھانے سے بچ جائے گا اپنا کام چلتا رہے گا اور اس طرح کا تبادلہ اپنے تمام مالِ حرام کا اگر کرلے گا تو اس سے تمام مال پاک ہو جائے گا اور اس سلسلہ میں بعض کتابوں کے حوالے بھی پیش کرتے ہیں لہٰذا اگر حرام خوری سے بچنے کے لئے یہ دونوں حیلے استعمال کئے جائیں تو کیا حرج ہے؟

شبہ کا جواب

اس کا تحقیقی جواب تو آپ آگے ملاحظہ فرمائیں گے لیکن الزاماً ان حضرات سے یہ دریافت کیا جا سکتا ہے کہ اس طرح تبدیل ملک سے اگر چوری، ڈکیتی، رشوت، غصب، ظلم، سود، جوا، خیانت، دھوکہ سے حاصل کردہ مال حلال کیا جا سکتا ہے تو اس بارے میں کوئی قرآن کی آیت یا حدیث یا ائمہ مجتہدین امام ابو حنیفہؒ، شافعیؒ، احمدؒ سے کوئی روایت ضرور ملتی لیکن ایسی کوئی آیت یا حدیث یا روایت فقہیہ قطعاً نہیں ہے بلکہ قرآن کا حکم تو یہ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا. (النساء. ۵۸)

بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ حقدار کا حق پہنچا دو۔

غصب کی زمین کے بارے میں حدیث گذر چکی ہے کہ مالک زمین کو واپس نہیں کرے گا تو قیامت کے روز زمین کے ساتوں طبقے تک اسے دھنسایا جائے گا۔ (بحواله بخاری و مسلم)

یہاں پر یہ نہیں بتایا کہ اپنی زمین کو دوسرے کی زمین سے بدلنے پر جائز اور حلال ہو جائے گی۔ دوسری بات یہ کہ اگر رقم اور نقد کی تبدیلی سے حرمت وحلت میں فرق پڑتا ہے۔ حرام حلال ہو سکتا ہے تو جو آدمی حرام اور ناجائز ذرائع سے نقد اور روپے چراتا ہے، غصب کرتا ہے، رشوت لیتا ہے تو وہ ان پیسوں کو اشیاء خوردنی سے تبدیلی کر لیتا ہے، آٹا خریدتا ہے، گوشت خریدتا ہے پھر حرام پیسے اس کے پاس نہیں رہے

بلکہ آٹا فروخت کرنے والے، گوشت بیچنے والے کے پاس چلے گئے۔ چور کے پاس حلال دکاندار کی دکان کا آٹا آ گیا ہے۔ حلال گوشت فروخت کرنے والے کا گوشت آ گیا ہے۔ حلال فروٹ بیچنے والے کا فروٹ آ گیا ہے۔ کیا اس قسم کی تبدیلی کے بعد بھی شرعاً، قانوناً اور عرفاً چور کو یہ نہیں کہا جاتا کہ یہ شخص چوری کا مال کھاتا ہے۔ راشی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ رشوت کا مال کھاتا ہے غاصب کو کہا جاتا ہے کہ یہ غصب کا مال کھاتا ہے غرض جو بھی شخص کسی قسم کا ناحق مال کھاتا ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ناحق مال کھاتا ہے جبکہ اس نے اپنے مال کو بدل دیا ہوتا ہے۔ دکاندار جس نے مثلاً چور کو، راشی کو، سود خور کو آٹا بیچا ہے یا گوشت بیچا ہے، یا فروٹ بیچا ہے، یا کپڑا فروخت کیا ہے اس کے متعلق شرعاً و عرفاً یہ نہیں کہا جاتا کہ یہ چوری کا مال کھاتا ہے، رشوت یا غصب، یا سود کا مال کھاتا ہے تو معلوم ہوا اس قسم کے تبادلہ سے چوری، غصب، رشوت، سود وغیرہ کا مال حلال نہیں ہوتا بلکہ ان ناجائز اموال کے بدلے میں جو بھی اشیاء حاصل کی گئی ہیں ان اشیاء میں حرمت اور ناجائز ہونے کا حکم آ جائے گا۔ اگر ناجائز آمدنی سے آٹا خریدا ہے تو یہ ناجائز کا حکم آٹے میں آ جائے گا۔ اگر گوشت خریدا ہے تو گوشت میں آ جائے گا۔ اگر کپڑا خریدا ہے تو کپڑے میں آ جائے گا، زمین خریدی ہے تو زمین میں آ جائے گا۔ مکان بنایا ہے تو مکان میں آ جائے گا کیونکہ ان تمام اشیاء کو اس نے ناجائز آمدنی اور حرام مال کے بدلے میں حاصل کیا ہے۔

اسی بنیاد پر حدیث شریف میں آیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس آدمی کا کھانا اور پینا حرام ہو، لباس حرام ہو پھر وہ یارب، یارب کر کے دعا کرے گا تو اس کی دعا ہرگز قبول نہ ہوگی۔ یہ حدیث مسلم اور ترمذی میں موجود ہے۔ غرض یہ کہ حرام اور ناجائز مال کو کسی دوسرے کے مال سے تبدیل بھی کر لیا جائے خواہ کسی مسلمان سے تبدیل کیا یا غیر مسلم سے پھر بھی حرام کمانے والے کا تبدیل کردہ مال حرام ہی رہے گا۔ اس تبدیلی کی وجہ سے حرام مال کی حرمت میں حلت نہیں آئے گی لہٰذا اس کی صفائی کی شرعاً دو ہی صورتیں ہیں۔

(۱) کہ اگر حقدار معلوم ہے اور حقدار تک مال کا پہنچانا ممکن ہے تو حقدار تک اس کا حق پہنچانا فرض ہے اور اگر ممکن نہیں تو اس کی جانب سے مستحق لوگوں پر مال حرام کا صدقہ کر دینا واجب ہے اپنے لئے ثواب کی نیت ناجائز ہے۔

اصول نمبر ۱۶:

جو مالِ حرام بالعوض اور تبادلہ میں حاصل ہو اس کا حکم

اب تک جو احکام مال حرام کے بارے میں لکھے گئے ہیں وہ تو ان اموال کے بارے میں ہیں جن کو

بلاعوض حاصل کیا گیا تھا مثلاً ظلم، رشوت، سود، خیانت، دھوکہ، قمار بازی وغیرہ کے ذریعہ سے۔

البتہ وہ مال حرام جو بالعوض حاصل کیا گیا ہے اور فریق ثانی کی رضامندی سے حاصل کیا گیا ہے اس کے احکام کچھ مختلف ہیں۔

مثلاً کسی نے شراب، ہیروئن، یا خنزیر کے بدلہ میں ناجائز سرمایہ کمایا، یا فاحشہ عورت نے زنا کے بدلہ میں، گانے والی عورت یا مرد نے گانے کے عوض میں پیسے حاصل کئے، تصویر بنانے والے نے تصویر بنا کر یا تصاویر فروخت کر کے مال کمایا۔ فوٹو گرافر نے فوٹو گرافی کے پیشے سے مال کمایا، سینما کے مالکان نے سینما کے ذریعہ مال کمایا، بنک ملازمین نے بنک کی خدمت کر کے تنخواہیں وصول کیں۔ بیمہ انشورنس کمپنی کے ملازمین نے یا دوسرے سودی ادارے کے ملازمین نے ملازمت کے عوض پیسے حاصل کئے وغیرہ وغیرہ ان تمام صورتوں میں سب کی آمدنی بھی ناجائز اور حرام ہے لیکن ان کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ حاصل شدہ مال جن جن سے حاصل کیا ہے انہیں واپس کریں بلکہ ان کے لئے تو جائز ہی نہیں ہے کہ اپنی ملک اور اپنے قبضے میں آئے ہوئے سرمائے کو جن سے حاصل کیا ہے ان کی طرف لوٹائے۔

مثلاً بنک کے ملازمین کے ذمے بنک کی ملازمت سے حاصل شدہ رقم ناجائز اور حرام ہونے کے باوجود بنک کی طرف لوٹانا لازم نہیں ہے کیونکہ اس میں بنک نے تو ایک طرف ملازم کی خدمت حاصل کی ہے اگر رقم بھی اسے واپس ملے تو بدل اور مبدل منہ دونوں میں معاوضے اس کے پاس جمع ہو جائیں گے جو کہ عقد بیع، عقد اجارہ کے اصول کے خلاف ہے۔

نیز یہ کہ بنک نے خدمت کے بدلہ میں جب اجرت دی ہے تو اب اس کی طرف سے کسی قسم کا مطالبہ بھی نہیں ہے۔ بخلاف چوری غصب وغیرہ کے۔

اس واسطے جو مال حرام کسی خدمت یا کسی چیز کے بدلہ میں حاصل کیا گیا ہے اس کا حکم یہ ہے کہ اس قسم کے مال حرام، حرام کمائی کمانے والے کے لئے حلال نہیں ہے بلکہ یہ ملک خبیث ناجائز آمدنی ہونے کی بناء پر واجب التصدّق ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی آمدنی کو جو حرام قرار دیا ہے ایسے مال کا خبث کسب خبیث اور ناجائز ذرائع آمدنی کی وجہ سے ہے دوسرے آدمی کے حق کے متعلق ہونے کی بنا پر نہیں ہے۔ لہٰذا ایسے مال کے خبث اور حرمت سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی سب سے پہلا کام یہ کرے کہ ان ناجائز ذرائع آمدنی کو ترک کر دے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے، توبہ و استغفار کرے۔

دوسرا کام یہ کرے کہ ناجائز اور حرام مال کو بلانیت ثواب فقراء میں صدقہ کر کے اپنے آپ کو

فارغ کرے، حلال اور جائز آمدنی کا انتظام کرے اور حلال روزی اور کمائی پر اکتفا کرے۔ خواہ اس کی مقدار کم ہو۔

مگر یہ کہ جس کے پاس حلال آمدنی کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ آدمی اس عمر میں پہنچ گیا ہے کہ کسب وکمائی کے لائق نہیں رہا۔ یا بیماری کی وجہ سے معذور ہو گیا ہے اور تمام حرام مال کو صدقہ کرنے سے اس کے لئے فاقہ کشی کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے تو اس کے لئے اضطراری کیفیت کی بناء پر اتنی بات کی گنجائش ہوگی کہ ناجائز آمدنی میں سے اتنا مال اپنے پاس رکھے کہ فاقہ سے بچ جائے۔ احتیاجی سے بچ جائے مثلاً کسی کے پاس ناجائز اور حرام آمدنی سے بنائے ہوئے دو مکان ہیں۔ ایک میں رہائش پذیر ہے۔ دوسرا مکان کرایہ پر دیا ہوا ہے۔ اور کچھ پیسے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ کاروبار کی آمدنی سے اس کے اخراجات پورے ہو جاتے ہیں۔ زائد مکان کا کرایہ فاضل بچ جاتا ہے تو اس آدمی کے لئے ضروری ہے کہ رہائش سے زائد مکان بلانیت ثواب مستحق آدمی کو صدقہ کردے پھر ناجائز آمدنی سے جو کاروبار شروع کیا ہے اس سے جو منافع آتا ہے اگر وہ ضرورت سے زائد ہے تو کاروبار کو کم کردے۔

مثلاً دو لاکھ کا کاروبار ہے آمدنی ماہانہ پانچ ہزار ہے ضروری اخراجات ڈھائی ہزار روپے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ناجائز آمدنی سے لگایا ہوا کاروبار کا کچھ حصّہ ضرورت سے زائد ہے لہٰذا ایک لاکھ روپے کا کاروبار یا اس کی رقم صدقہ کردے۔ صرف ضرورت کی مقدار بوجہ مجبوری اپنے پاس رکھے۔ بہر حال ہر آدمی کو یہ فکر ہونی چاہیئے کہ آہستہ آہستہ ناجائز جائیداد ناجائز مکان، ناجائز کاروبار سے اپنے آپ کو جہاں تک ممکن ہو فارغ کرے اس طرح کرنے سے اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ وہ مواخذہ نہ کرے معاف کردے۔ ان تمام باتوں کی تفصیلات کتب فقہ وشروح حدیث میں موجود ہیں۔

(من شاء فليراجع اعلاء السنن ص ۱۸۸، ج ۱۶)

اصول نمبر ۱۷:

جس شخص کا ذریعہ آمدنی حرام ہے اس کے ہدایا اور تحفے

☆ واضح رہے کہ جس شخص کا ذریعہ آمدنی حرام ہے خواہ بلا معاوضہ مال حاصل کیا ہو۔ مثلاً چوری، ڈکیتی، غصب، رشوت، سود، دھوکہ اور خیانت سے یا معاوضہ کے طور پر حاصل کیا ہو مثلاً بنک کی ملازمت، انشورنس کی ملازمت، سینماؤں کی آمدنی، گانے والوں کی آمدنی، فوٹو

گرافروں کی آمدنی، اگر اس کا کوئی حلال ذریعہ آمدنی نہیں ہے تو اس کے یہاں کھانا پینا، اس کا ہدیہ تحفہ، وصول کرنا اور استعمال کرنا ناجائز و حرام ہے۔ الّا یہ کہ وصول کرنے والا خود مستحق زکوٰۃ و صدقہ ہو تو پھر گنجائش ہوگی۔

☆ البتہ جس شخص کے ذرائع آمدنی حلال و حرام دونوں طرح کے ہیں تو اس میں تفصیل ہے۔ اگر حلال آمدنی اور حرام آمدنی اس کے پاس الگ الگ ہیں، اپنے اخراجات کھانے، پینے، لباس وغیرہ میں حلال آمدنی استعمال کرتا ہے اور اس کی بات پر اعتماد ہے تو اس کے یہاں کھانا، پینا جائز ہے اور حلال مال سے کہہ کر اگر ہدیہ تحفہ دیتا ہے تو اس کا لینا بھی جائز ہے۔

☆ لیکن اس کے ناجائز اور حرام آمدنی سے کھانا پینا ہدیہ لینا جائز نہیں ہے۔

☆ اور اگر کسی کے پاس جائز اور ناجائز دونوں قسم کے ذرائع آمدنی موجود ہیں اور مخلوط ہیں تو اس صورت میں یہ دیکھا جائے گا کہ اس کی آمدنی میں کون سی آمدنی زیادہ اور غالب ہے اگر حلال آمدنی زیادہ و غالب ہے تو اس کے یہاں کھانا، پینا، اور اس کا ہدیہ تحفہ لینا مباح اور جائز ہے اور اس سے بچنا ممکن ہو تو اولیٰ اور بہتر ہے۔

☆ لیکن اگر اس کی آمدنی میں حرام اور ناجائز آمدنی غالب ہے تو اس کے یہاں کھانا، پینا، اس کا ہدیہ، تحفہ، وصول کرنا، استعمال کرنا سب ناجائز ہیں۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

أهدى الى رجل شيئاً او اضافه ان كان غالب ماله من الحلال فلا بأس الا ان يعلم بانه حرام فان الغالب هو الحرام ينبغي ان لايقبل الهدية ولايأكل الطعام الا ان يخبره بانه من الحلال او ورثه او استقرضه من غيره كذا في الينا بيع.

(ص ۳۴۲، ج ۵)

اگر کسی آدمی کو کچھ ہدیہ دیا گیا ہے یا اس کی مہمانی کی گئی ہے تو دیکھا جائے کہ اس کے مال میں اگر حلال غالب ہے تو پھر حرج نہیں مگر یہ کہ معلوم ہو کہ اس نے حرام مال سے خرچ کیا ہے۔ (پھر تو جائز نہیں) اور اگر اس کے مال میں زیادہ حرام کا مال ہے تو ضروری ہے کہ ہدیہ قبول نہ کرے اور اس کی دعوت نہ کھائے مگر یہ کہ وہ بتادے کہ اس کا ہدیہ اور دعوت حلال مال سے ہے یا اس کو وراثت میں جائز مال ملا ہے یا اس نے کسی سے قرض لیا ہے (جس کو حلال مال سے ادا کرے گا)۔

اسی طرح ''الاشباہ والنظائر'' میں علامہ ابن نجیم تحریر فرماتے ہیں:

وان کان غالب ماله الحرام لایقبلها ولا یاکل الا اذا قال انه حلال ورثه او استقرضه. (ص ۳۴۳، ج ۱)

اگر ہدیہ دینے والے کا غالب مال حرام کا ہے تو نہ ہدیہ قبول کرے نہ اس کے یہاں دعوت کھائے مگر یہ کہ وہ یہ بتادے کہ اس کا یہ ہدیہ اور دعوت حلال مال سے ہے۔ جو کہ وراثت میں ملا یا اس نے کسی سے قرض لیا ہے (جو کہ حلال مال سے ادا کرے گا)

چنانچہ مبسوط سرخسی میں ہے:

ان الحکم للغالب واذا کان الغالب هو الحرام کان الکل حراما فی وجوب الاجتناب عنها... وکذالک ان کانا متساویین لان عند المساواة یغلب الحرام شرعاً قال صلی الله علیه وسلم ما اجتمع الحلال والحرام فی شیئ الا غلب الحرام الحلال ولان التحرز عن الحرام فرض. (ص ۱۹۷، ج ۱۰)

حکم غالب کے اعتبار سے ہوتا ہے اگر مال حرام غالب ہے تو گویا سارا مال حرام ہے اس سے اجتناب ضروری ہے...... اسی طرح حلال اور حرام دونوں جب برابر ہوں پھر بھی یہی حکم ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حلال وحرام جب جمع ہو جائیں تو غلبہ حرام کا ہوگا۔ اس لئے کہ حرام سے بچنا فرض ہے۔

مذکورہ بالا حوالوں سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں کی غالب آمدنی حرام ہے یا حلال وحرام دونوں قسم کی آمدنی مساوی ہے ایسے لوگوں کی آمدنی اور کھانا پینا بھی حرام ہے ایسے لوگوں کے یہاں دعوت قبول کرنا درست نہیں ہے مگر یہ کہ یہ لوگ دعوت دیتے وقت یقین دلائیں کہ دعوت کا اہتمام صرف ان کے حلال مال سے کیا گیا ہے پھر کھانے کی اجازت ہے۔

حرام مال اگر وراثت میں ملے تو اس کے احکام

وراثت میں اگر حرام مال ملے تو اس کی مختلف صورتیں ہیں۔

(۱) سارا مال حرام ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر حرام مال کا مالک یا مالکان کا علم ہے یا ان کے ورثاء موجود ہیں اور ان کا حق ان تک پہنچایا جا سکتا ہے تو ان کا حق پہنچا دینا میت کے ورثاء کے ذمہ لازم ہے اگر ورثاء اصحاب حقوق کے حقوق ان تک نہیں پہنچاتے تو ورثاء گنہگار رہوں گے، اگر

ورثاء نے مرحوم کی جانب سے اصحابِ حقوق کے حقوق پہنچا دیئے ہیں تو خود بھی گناہ سے بچ جائیں گے اور امید ہے کہ مرحوم جنہوں نے دوسروں سے ناجائز مال لیا تھا وہ بھی لوگوں کے حقوق سے بری ہو جائیں گے۔

(۲) ورثاء کو جو مال ملا ہے اگر اس میں حلال وحرام دونوں قسم کے مال مخلوط ہیں کوئی امتیاز نہیں ہے کہ کون سا مال حلال ہے اور کون سے حرام، یا کتنا حصہ حلال کا ہے اور کتنا حرام کا، تو اس صورت میں دیکھا جائے کہ ان کے خیال میں حرام آمدنی کا مال زیادہ ہے یا حلال آمدنی کا مال زیادہ ہے جو بھی صورت ہو اس کے مطابق ورثاء سمجھ لیں کہ جتنا مال حرام کا ہے وہ میت کے ذمہ میں قرض ہے جس کی ادائیگی تقسیم ترکہ سے قبل ورثا کے ذمہ ضروری ہے لہٰذا اگر اصحاب حقوق کا علم ہے تو ان تک ان کے حقوق پہنچا دینا ضروری ہے مگر یہ کہ اصحاب حقوق اپنے حقوق کو میت یا ورثاء کے حق میں معاف کردیں اگر ان کی جانب سے حقوق کا مطالبہ موجود ہے ورثاء نے اپنے ذمہ میں عائد ذمہ داری کو پورا کرتے ہوئے ان کے حقوق کو ادا نہ کیا نہ اصحاب حقوق نے معاف کیا تو اس صورت میں میت کے ساتھ ساتھ ورثاء بھی گنہگار ہوں گے۔

(۳) اور اگر اصحاب حقوق کا علم نہیں نہ ان کے ورثاء کا علم ہے غرض کسی طرح ان تک ان کے حقوق پہنچانا ممکن ہی نہیں ہے تو وراثت کا کل مال حرام یا بعض مال حرام جو بھی مقدار ہو ہر صورت میں لوگوں میں صدقہ کر دینا ورثاء پر لازم ہے۔

پھر ورثاء کے پاس اگر حلال مال کا انتظام ہے تو حرام مال کا کوئی حصّہ رکھنا ان کے لئے حلال نہیں ہے۔ مثلاً ورثاء کو وراثت میں پانچ لاکھ روپے ملے ہیں اور سب کے سب حرام کا مال ہے اور ورثا کے پاس اپنی ذاتی املاک حلال مال کی موجود ہے تاکہ وہ حلال مال سے زندگی گذار سکیں تو ان کے لئے پانچ لاکھ روپے جو حرام ملے ہیں ان کا رکھنا اور استعمال کرنا جائز نہیں ہے صدقہ کر دینا واجب ہے اسی طرح مثلاً وراثت میں پانچ لاکھ روپے کی مالیت کی جائیداد یا کاروبار ملا ہے۔ ورثاء کے اندازے کے مطابق اس میں تین لاکھ روپے کی جائیداد یا کاروبار حلال ہے، دو لاکھ روپے کی جائیداد کا کاروبار حرام کا ہے تو ورثاء کے لئے ضروری ہے کہ تین لاکھ روپے کی جائیداد اور کاروبار کو وراثت میں تقسیم کریں باقی دو لاکھ روپے کی جائیداد اور کاروبار یا اس کی قیمت مستحق لوگوں میں بنیت اصحاب حقوق صدقہ کردیں جبکہ اصحاب حقوق کا علم نہ ہو۔

☆ وراثت میں ملا ہوا سارا مال اگر حرام کا ہے اور ورثاء کے پاس ذاتی املاک کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر تمام

حرام مال کو صدقہ کر دیتے ہیں تو ورثاء کے کھانے پینے اور رہنے کے لئے کچھ بھی نہیں رہتا تو ایسے حالات میں ضرورت مند ورثاء اپنے گذر اوقات کے لئے بقدرِ ضرورت مال حرام میں سے بوجہ اضطرار و مجبوری رکھ سکتے ہیں، باقی مال کو مستحق لوگوں میں صدقہ کر دینا ضروری ہے۔ان باتوں کی تفصیلات کتب فقہ وفتاویٰ میں موجود ہیں۔

فمن شاء فليرا جع ردالمحتار، والبحر الرائق وفتح القدير.

تین طلاق کے بارے میں عائلی قانون کی شرعی حیثیت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ان مسائل میں کہ

(۱) ایک شخص نے اپنی بیوی کو غلط عادات وآثار کی بناء پر اور مسلسل نافرمانیوں کی بناء پر تین طلاق دی ہیں۔عورت کے رشتہ دار بیچ میں مصالحت کرانے کے ارادہ سے کوشش کررہے ہیں۔شوہر کو بیوی کے حالات پر اطمینان نہیں ہے پھر اس نے تین طلاق دے کر اس کو میکے بھیج دیا ہے۔وہ دوبارہ اس کو کسی حال میں لانے کے واسطے تیار نہیں ہے۔

شوہر کے انکار پر عورت کے رشتہ داروں نے چیئرمین صاحب کا سہارا لیا ہے۔چیئرمین صاحب فرماتے ہیں کہ قانوناً ان کی تصدیق کے بغیر طلاق مؤثر نہیں ہوتی اس لئے شوہر رجوع کرسکتا ہے اور فرماتے ہیں کہ بیوی کی مرضی کے بغیر یکطرفہ طلاق نہیں ہوتی کیونکہ اس میں اس کی حق تلفی ہوتی ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ تین طلاقوں کے بعد ۹۰ (نوے) دن کے اندر اندر قانوناً رجوع کرسکتا ہے،اور مصالحت کی گنجائش ہے۔ہم نے چیئرمین صاحب سے قرآن وحدیث کے حوالے سے فتویٰ کا ذکر کیا ہے کہ تین طلاقوں کے بعد کوئی رجوع نہیں ہوسکتا۔

اس کے جواب میں چیئرمین صاحب فرماتے ہیں قرآن وسنت کا قانون کہاں چلتا ہے؟ ہم پاکستان میں رہتے ہیں لہٰذا پاکستان کے قانون کے مطابق چلنا ضروری ہے ورنہ قانوناً سزا ہوسکتی ہے۔کیا اس کی روشنی میں:

(۱) شوہر کی جانب سے دی ہوئی طلاق ثلاثہ مؤثر نہیں ہوئیں؟

(۲) کیا شوہر کو شرعاً یک طرفہ طلاق دینے کا اختیار نہیں ہے؟ یا اس میں بیوی کی رضامندی بھی ضروری ہے؟ کیا اس کی رضامندی نہ ہونے کی صورت میں حق تلفی ہوتی ہے؟

(۳) جس خاتون کا واقعہ ہے۔ستر ۷۰ دنوں میں اس کی عدت ختم ہوچکی ہے۔دس روز اوپر ہوچکے ہیں۔ چیئرمین صاحب فرماتے ہیں نوے دن کے اندر مصالحت ہوسکتی ہے خواہ عدت گذر جائے۔

(۴) شوہر رجوع یا مصالحت کے لئے تیار نہیں۔پھر وہ قانون ملکی کے مقابلہ میں قرآن وسنت کے حکم کو

مقدم سمجھتا ہے اس لئے بھی راضی نہیں جبکہ چیئرمین صاحب اور عورت کے رشتہ داروں کی جانب سے دباؤ ہے۔ قانونی سزا دی جانے کی بھی دھمکی ہے۔

ان حالات میں قرآن وسنت کے حوالے سے مفصّل جواب کی ضرورت ہے تا کہ بوقت ضرورت شرعی عدالت سے رجوع کیا جا سکے۔

عبداللہ۔اورنگی ٹاؤن کراچی

الجواب باسمہ تعالیٰ

بعد الحمد والصّلوٰۃ! یہ کہ آپ کے سوالنامہ کی طرح اور بھی سوالنامے ہمارے پاس آتے رہے جس سوالنامہ میں جتنا حصّہ مطلب کا ہوتا ہے اتنے حصّے کا جواب دیا جاتا ہے لیکن آپ کا سوالنامہ کئی وجوہ سے اہمیت کا حامل ہے۔ ایک تو اس میں تفصیلی جوابات پوچھے گئے ہیں پھر وہ بھی مدلّل۔ اس کے علاوہ آپ نے حکومت کے عائلی قانون کی دفعہ نمبر ۷ کے حوالے سے سوالات پوچھے ہیں۔ پھر آپ ان سوالات کے جوابات کو شریعت کورٹ میں بھی پیش کرنا چاہتے ہیں جو کہ ایک بہت بڑا اہم دینی کام ہے اس واسطے بندہ نے ضروری سمجھا کہ اس سوالنامہ کا جواب اگر قرآن وحدیث کی رو سے......اور باحوالہ دیا جائے تو زیادہ مناسب رہے گا تا کہ شرعی عدالت کے منصب جلیلہ پر جو بھی فائز ہیں ان کی بصیرت وعبرت کے لئے کچھ مواد فراہم ہو جائے اور سائل جس نے دینی جذبے سے امر بالمعروف، نہی عن المنکر کا ارادہ کیا ہوا ہے ان میں بندہ بھی شامل ہو جائے اور فللہ الحجۃ البالغہ، اللہ کی حجت پوری دنیا پر غالب اور بھاری رہے۔ زائغین اور منکرین کے سامنے مسائل کا تکرار ہو جائے تو شاید وہ اپنے زیغ اور انکار سے باز آ جائیں۔ ورنہ اس موضوع پر ہمارے پیشتر محقق علمائے کرام اور مفتیان عظام نے اتنا لکھا ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔

کراچی کی مجلس حاضرہ کے معزز اراکین میں سے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم پاکستان نے مبسوط مقالہ تحریر فرمایا ہے جو چھپ چکا ہے۔ ہمارے استاد خاص حضرت مولانا مفتی ولی حسن خان ٹونکی دامت برکاتہم نے تو اس پر ''عائلی قوانین شریعت کی روشنی میں'' کے نام سے ایک ضخیم اور مفصل کتاب تحریر فرمائی ہے جو کہ ''مجلس دعوت وتحقیق اسلامی علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی نمبر ۵'' کی جانب سے شائع ہوگئی ہے جو چاہے اس کو پڑھ کر اپنی اصلاح کر سکتا ہے اور اپنے علم میں اضافہ کر سکتا ہے۔ بندہ سمجھتا ہے کہ یہ کتاب اس موضوع پر مکمل اور آخری کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت کی حیات میں برکت عطا فرمائے اور صحت وعافیت سے رکھے۔

تاہم سائل کے تقاضے پر دارالافتاء کی جانب سے بندہ کو جامع اور مختصر مدلّل جواب لکھنے کا حکم ہوا ہے اس لئے یہ جواب لکھا جا رہا ہے۔ رب العالمین کی ذات سے دعا ہے کہ اس جواب کو سب کے لئے نافع بنائے۔

اب بالترتیب ہر سوال کا جواب ملاحظہ کیا جائے۔

جواب نمبر ۱،۲: قرآن وسنت کی روشنی میں حق جلّ مجدہٗ نے جب سے دنیا میں آدم علیٰ نبیّنا وعلیہ الصلوٰۃ و السلام اور حوا علیہا السّلام کو پیدا فرمایا ہے اس وقت سے خالقِ انسان نے انسانیت اور انسانی حقوق میں مرد اور عورت دونوں کو عادلانہ اور منصفانہ حقوق دیئے ہیں۔ مرد اور عورت میں سے ہر ایک کو اس کا جائز مقام دیا ہے۔ انسان کے بنیادی حقوق میں مرد اور عورت دونوں کو برابر برابر حقوق دیئے ہیں۔ بحیثیت انسان کے مرد کو جیسے اپنے وجود کی حفاظت اور سہولت کے لئے مکان اور رہائش کا حق ہے عورت کو بھی اس طرح کے مکان اور رہائش کا حق ہے۔ مرد کو جیسے اور جس معیار کے لباس پہننے کا حق ہے عورت کو بھی اس معیار کا لباس پہننے کا حق ہے، جیسے مرد کو کھانے پینے کا حق ہے عورت کو بھی حق ہے۔ جیسے مرد کو انسانی تقاضے کے تحت افزائش نسل کے لئے اور اپنی عزت وعفّت کو محفوظ کرنے کے لئے کسی حلال اور غیر محرم عورت سے نکاح کرنے کا حق ہے اس طرح عورت کو بھی وجوہات مذکورہ کے تحت کسی حلال اور غیر محرم مرد سے نکاح کرنے کا حق ہے۔

البتہ مرد اور عورت کے درمیان تخلیقی و پیدائشی فرق کی بنیاد پر اور بے شمار عوامل ومصالح کی بناء پر خالق انسان نے مرد کو عورت کے اوپر حاکم اور سربراہ بنادیا، اور عورت کو مرد کے ماتحت اور تابع بنادیا ہے۔ اس واسطے مرد کو ناکح اور زوج اور عورت کو منکوحہ اور زوجہ کہا جاتا ہے۔

عورت کے اوپر مرد کی اس سربراہی اور عورت کے مرد کے ماتحت ہونے کی بناء پر خالق انسان نے مرد کے ذمّہ میں عورت کے لئے مکان اور رہائش، لباس، نان ونفقہ کو واجب قرار دیا ہے اور مرد کو عورت کی ہر قسم کی انسانی حاجات وضروریات میں مددگار اور معاون اور خبر لینے کا حکم دیا ہے اور مرد کو تاکید کی ہے کہ ہمیشہ عورت کے ساتھ حسن معاشرت اور حسن اخلاق سے پیش آئے اور عورت کو حکم دیا کہ وہ اپنے سربراہ مرد اور زوج کی تعظیم وتکریم کرے اور اس کے ساتھ کسی قسم کی بے ادبی نہ کرے اور ممکن حد تک حقوق اللہ کے بعد مرد کی اطاعت وفرماں برداری کرے۔ اس کی ہرگز نافرمانی نہ کرے۔

نکاح سے قبل اپنے سربراہ، ولی، والدین یا بھائی وغیرہ کے ساتھ یہی معاملہ کرے اور نکاح کے بعد اپنے مرد کے ساتھ مذکورہ امور کو سامنے رکھ کر زندگی گذارے۔

مرد اور عورت کے درمیان مساوی حقوق کی تشریح

یعنی مرد کے لئے بحیثیت سربراہ اور حاکم ہونے کے ضروری ہے کہ جن امور میں خالقِ انسان نے مرد اور عورت کے لئے مساوی حقوق رکھے ہیں مرد ان میں مساوی حقوق کی رعایت رکھے جیسے بنیادی حقوق ہیں۔ مثلاً جس معیار کا کھانا مرد کھائے اسی معیار کا کھانا بیوی کو کھلائے، جس معیار کی رہائش میں خود رہتا ہے اس معیار کی رہائش میں بیوی کو رکھے اور جس معیار کا لباس خود پہنتا ہے اسی معیار کا لباس عورت کو پہنائے۔ البتہ مذکورہ بنیادی حقوق میں بھی زنانہ اور مردانہ خواص کا شرعی فرق اور شرعی قیود وشرائط کی پابندی ضروری ہے۔

مثلاً عورت کے لئے رہائش کا انتظام کرنا مرد کے ذمہ ضروری ہے۔ یہ عورت کا شرعی و بنیادی حق ہے مگر عورت کی رہائش کا زنانہ نوعیت کا ہونا، باپردہ ہونا ضروری ہے جبکہ مرد کے لئے باپردہ رہائش کی ضرورت نہیں ہے۔ عورت کا اس میں مساوات کا دعویٰ درست نہیں ہے کہ جس طرح مرد بے پردہ رہائش میں رہتا ہے وہ بھی بے پردہ رہائش میں رہے گی چونکہ قرآن وحدیث کے ذریعہ خالق انسان نے عورت کے لئے پردہ کی پابندی لگائی ہے جسے کوئی مخلوق ختم نہیں کرسکتی۔

اسی طرح عورت کو اس معیار کے لباس کا حق ہے جس معیار کا مرد پہنے۔ مرد اگر بیس روپے فی میٹر کا کپڑا استعمال کرتا ہے تو عورت کو بھی اسی معیار کا لباس دینا ضروری ہے۔ مرد اگر سو روپیہ فی میٹر کا استعمال کرتا ہے تو عورت کو بھی اس معیار کا لباس دینا ضروری ہے لیکن اس میں بھی مردانہ اور زنانہ فرق کا برقرار رکھنا ضروری ہے۔ مرد کے لئے جائز نہیں کہ زنانہ نوعیت کے لباس استعمال کرے، نہ عورت کے لئے جائز ہے کہ مردانہ نوعیت کے لباس استعمال کرے۔ علیٰ ھٰذا القیاس۔ اسی طرح کھانے کا مسئلہ بھی یعنی کھانے کا معیار برابر ہوگا مگر نوعیت میں برابر ہونا ضروری نہیں۔ پھر کھانے میں بھی اپنی نسوانی حیثیت کو باقی رکھتے ہوئے کھانا کھائے گی۔ مرد اپنے یا غیر ہر مرد کے ساتھ اکٹھا بیٹھ کر کھانا کھاسکتے ہیں اور محرم عورتوں کے ساتھ بھی، لیکن غیر محرم عورتوں کے ساتھ اکٹھا کھانا نہیں کھاسکتے یہ ممنوع ہے۔ اسی طرح عورت اپنے رشتہ دار یا غیر رشتہ دار عورتوں کے ساتھ مل کر کھانا کھاسکتی ہے اور محرم مردوں کے ساتھ بھی لیکن غیر محرم مردوں کے ساتھ بیٹھ کر نہیں کھاسکتی۔ کیونکہ بنیادی حقوق میں اتنا حصہ مرد اور عورت دونوں کے لئے مستثنیٰ ہے۔

انسانی ضرورت کے تحت نکاح میں جس طرح مرد کی رضامندی ضروری ہوتی ہے اسی طرح عاقل،

بالغ، عورت کی رضامندی بھی ضروری ہے۔ جس طرح مرد کے لئے انعقادِ نکاح کے موقع پر اظہارِ رضاء کا حق ہے عورت کو بھی ہے بلکہ دونوں کی رضاء اور اظہار رضاء کے بغیر نکاح منعقد ہی نہیں ہوگا۔

نیز مرد اور عورت دونوں کی رضامندی سے نکاح منعقد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عورت نے شرعی اصول کے مطابق مرد کی سربراہی قبول کرلی اور عورت کے اوپر مرد کی انسانی حاکمیت کو تسلیم کرلیا اور اپنے اختیار اور رائے کو مرد کے اختیار اور رائے کے تابع بنانے کا عہد کیا اور ممکن حد تک جائز امور میں مرد کی اطاعت وفرمانبرداری کی ذمہ داری اپنے اوپر لازم کرلی۔ لہٰذا عورت کے لئے ضروری ہے کہ اپنے اقرار، عہد پر قائم رہے۔ اس میں حکم عدولی نہ کرے۔ اگر وہ خلافِ عہد اور خلافِ اقرار کام کرے گی پھر وہ مرد سے ان حقوق کا مطالبہ نہیں کرسکے گی جو شریعت نے اقرار نکاح کے بعد اس کے لئے شوہر پر لازم قرار دیئے ہیں۔ اسی طرح شوہر اگر اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرتا اور بیوی کے حقوق واجبہ ادا نہیں کرتا تو وہ اپنی عورت سے ان حقوق کا مطالبہ نہیں کرسکتا جو عورت کے اوپر شوہر کے لئے شریعت نے واجب قرار دیئے ہیں یہاں تک تو مرد اور عورت دونوں کے بنیادی حقوق مساوی اور برابر برابر ہیں البتہ بعض امور میں خالق انسان نے مرد اور عورت میں فرق کیا ہے۔ اس کی تفصیل قرآنی آیات کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیں۔

قرآن حکیم کے اندر حق تعالیٰ نے ان حقائق کو دو آیتوں میں بیان فرمایا ہے:

چنانچہ حق جل مجدہ نے فرمایا:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ.

(سورۃ بقرہ۔ آیت ۲۸۸)

عورتوں کے واسطے بھی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ہیں دستور کے موافق اور مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے اور اللہ زبردست حکیم ومدبر ہے۔

تشریح: مرد اور عورت کے مساوی حقوق کا بیان اور اس کی تفصیلات تو آپ پڑھ چکے ہیں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔ باقی رہا وہ امور جن میں مرد کو عورت پر فضیلت اور برتری حاصل ہے۔ آیت مذکورہ میں جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں جامع ترین آیت کے ذریعہ بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ حق جل مجدہٗ کا ارشاد ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ الخ. (سورہ نساء آیت ۳۵)

مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو (یعنی مردوں کو) بعضوں

(یعنی عورتوں پر پیدائشی اور قدرتی طور) پر فضیلت دی ہے اور دوسرے اس سبب سے کہ مردوں نے عورتوں پر اپنے مال (حق مہر میں نان ونفقہ میں) خرچ کئے ہیں۔

تشریح: آیت کے مذکورہ حصّہ میں حق تعالیٰ نے عورت کے اوپر مرد کی برتری حاصل ہونے کا فیصلہ جاری فرمایا ہے اور اس کی بنیادی طور پر دو وجہ بیان فرمائی ہیں۔

اوّل جنس مرد کو اپنی پیدائش، علمی، عملی اعتبار سے جنس عورت پر فضیلت اور فوقیت حاصل ہے۔ جس کا حصول اور مقابلہ جنس عورت کے لئے تکوینی اور قدرتی طور پر ناممکن ہے کیونکہ یہ چیزیں وہبی ہوتی ہیں کسبی نہیں ہوتیں۔ مقابلہ کسبی چیزوں میں ہوسکتا ہے وہبی چیزوں میں نہیں لیکن بعض عورتوں کو علمی و عملی کمالات کی وجہ سے اگر کبھی بعض مردوں پر فوقیت مل جاتی ہے تو یہ چند افراد اور آحاد کی بات ہے اور یہ شاذ و نادر ہیں۔ یہ قانون کے دائرے میں نہیں آتیں جبکہ ان میں دوسری نسوانی کمزوریاں دائمی و ابدی ہوتی ہیں۔ اس واسطے جنس مرد کا مقابلہ جنس عورت کبھی نہیں کرسکتی۔

دوسری وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ مرد عورتوں کی تمام ضروریات زندگی کی کفالت کرتا ہے۔ نکاح کے موقع پر حق مہر، زیورات، کپڑے و دیگر سامان میں پیسے خرچ کرتے ہیں، پھر اس کی رہائش، نان ونفقہ کی بار برداری اٹھاتا ہے۔

لہٰذا جب عورت نے مرد کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اور اس کی خداداد فضیلت و برتری کو مانتے ہوئے مرد کے ساتھ نکاح پر رضامندی ظاہر کی اور نکاح ہوگیا تو اب عورت اپنے عہد و اقرار کے اعتبار سے مرد کے ماتحت اور اس کے تابع اور مرد کی محکومیت میں آگئی ہے۔ لہٰذا عورت کے لئے ضروری ہے کہ اپنے عہد و قرار کے تحت شرعی حدود میں رہتے ہوئے مرد کی اطاعت کرے، اس کی نافرمانی نہ کرے اور مرد کی خیر خواہ اور غمخوار بن کر زندگی گذارے۔ خدائی حفاظت کے تحت مرد کی غیر موجودگی میں اپنی عزت و آبرو کو غیر مرد سے بچائے اور اس کے گھر اور گھر کی اشیاء اور جملہ مال و متاع کی حفاظت کرے۔ خرچ کرے تو امانت داری سے کرے۔ کسی قسم کے نشوز و نافرمانی، خیانت کا ارتکاب نہ کرے۔ چنانچہ حق تعالیٰ شانہٗ آیت مذکورہ میں فرماتے ہیں نیک عورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ مرد کے خداداد فضائل و برتری اور جو کچھ ان پر خرچ کرتے ہیں ان کو دیکھ کر مرد کی اطاعت کرتی ہیں۔ کبھی بھی نافرمانی نہیں کرتیں اور مرد کی غیر موجودگی میں اپنی عفّت و عصمت کی حفاظت کرتی ہیں اور مرد کے مال و متاع کی حفاظت کرتی ہیں۔

لیکن جو عورتیں نافرمان اور ناشزہ ہوتی ہیں وہ مرد کے ان فضائل کو دیکھتے ہوئے اس کے احسانات

کوفراموش کرتی ہیں اور مال خرچ کرتے ہوئے بھی مرد کی فضیلت اور برتری کو دل سے قبول نہیں کرتیں تو
س کے نتیجے میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں اور اختلاف وافتراق کی نوبت آجاتی ہے جس کے لئے حق
بل شانہ نے مردوں کو مختلف حالات میں مختلف ہدایات دی ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

وَاللّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًاؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیًّا كَبِیْرًا۔

(بقرہ آیت ۲۲۴)

اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم کو ان کی بد دماغی اور نافرمانی کا زیادہ اندیشہ ہو تو ان کو اوّل زبانی نصیحت کرو، پھر بھی نہ مانیں تو ان کو لیٹنے کی جگہ میں تنہا چھوڑ دو۔ اس سے بھی ٹھیک نہ ہوں تو ان کو اعتدال میں رہ کر مارو۔ پھر اگر وہ اطاعت کرنے لگتی ہیں تو ان پر زیادتی کرنے کے لئے بہانہ مت ڈھونڈو۔ کیونکہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت بلند اور عظمت والا تمہارے اوپر ہے۔

آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے مردوں کو مزید جن باتوں کی فضیلت اور برتری دی ہے وہ یہ ہیں کہ:

(۱) عورت اگر بد دماغی اور نافرنی کرنے لگے تو اسے ممکن طریقے سے نصیحت کرے مرد ناصح اور خیر خواہانہ انداز سے عورت کو نصیحت کرے۔ عورت کو چاہیئے کہ مرد کی نصیحت اور سمجھانے کے بعد اپنے احوال کو درست کرلے۔ نافرمانی سے باز آجائے عورت کے لئے یہ اختیار نہیں کہ وہ شوہر کو نصیحت کرنے لگے یا شوہر کی نصیحت کو قبول نہ کرے بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ شوہر کی نصیحت اور سمجھانے کے مطابق عمل کرے اور چلے، لیکن عورت اگر ایسا نہیں کرتی تو شوہر کے لئے دوسری ہدایت یہ ہے۔

(۲) کہ عورت کو بستر ے میں اکیلے چھوڑ دے یعنی اس کے ساتھ نہ رہے اس طرح کرنا مرد کے لئے عورت کو ٹھیک کرنے کے لئے نہ صرف جائز ہے بلکہ شرعی حکم ہے لیکن عورت کو اس بات کا قطعاً اختیار نہیں ہے کہ سوائے مجبوری اور عذر کے کسی بھی وقت شوہر کو بستر ے میں الگ چھوڑ دے۔ خود کسی اور جگہ سوئے۔ اگر ایسا کرے گی تو وہ نافرمان اور ناشزہ ہوگی اور حدیث کے مطابق اس پر اللہ اور اس کے رسول اور فرشتوں کی لعنت ہوگی۔ جب تک وہ شوہر کے پاس واپس نہیں آتی اور اسے راضی نہیں کرلیتی۔ یہ بھی شوہر کی برتری اور فضیلت ہے۔ اور اگر عورت کے بستر الگ کرلینے کے باوجود وہ ٹھیک نہیں ہوتی، شوہر کی اطاعت نہیں کرتی اس وقت شوہر کے لئے تیسری ہدایت یہ ہے۔

(۳) کہ اعتدال میں رہ کر عورت کو مارے اور بعض صحابۂ کرام سے بھی یہ ثابت ہے کہ وہ اپنی بیوی کو

تربیت اور ادب دینے کے واسطے مارتے بھی تھے۔ لیکن عورت کے لئے کسی بھی وقت اس بات کا اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنے شوہر کو تربیت اور ادب دینے کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ اگر کوئی عورت ایسا کرتی ہے تو وہ اللہ و رسول کے نزدیک مجرم ہے۔ گنہگار ہے اور اس پر اللہ و رسول اور فرشتوں کی لعنت ہے۔

تو معلوم ہوا کہ مذکورہ باتوں میں مردوں کو عورتوں کے اوپر فضیلت و برتری حاصل ہے اور یہ انہیں اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے جن کا ماننا ایمان اور ایمان کی علامت ہے اور نہ ماننا کفر اور بے ایمانی ہے۔

اور اگر مذکورہ تینوں ہدایت پر عمل کرنے کے باوجود عورت ٹھیک نہیں ہوتی اور شوہر بھی اسے درگذر نہیں کرتا یا بیوی کو اپنے شوہر سے شکایت ہے اور باہمی اتفاق سے اختلافات کو ختم نہیں کر سکتے بلکہ دونوں اپنی ضد اور انا پر مُصر ہیں تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے چوتھی ہدایت یہ ہے۔

(۴) چنانچہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کا ارشاد ہے:

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَماً مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَماً مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَا اِصْلَاحاً يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْماً خَبِيْراً ۝ (نساء. آیت ۳۵)

اور اگر تم کو میاں بیوی کے درمیان ضد اور اختلاف پڑنے کا ڈر ہو تو تم لوگ شوہر کے خاندان میں سے ایک منصف اور عورت کے خاندان میں سے ایک منصف فیصلہ کے لئے مقرر کرو۔ اگر میاں بیوی دونوں صلح کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ دونوں میں موافقت پیدا فرما دے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے اور خبر رکھنے والا ہے۔

تشریح: یعنی جب شوہر کو عورت کا تمرّد اور نافرمانی کی شکایت اس حد تک ہو کہ نہ اس کی نصیحت کام آتی ہے نہ بستر ے کو الگ کرنے سے کوئی فائدہ ہوتا ہے نہ ہی مار اور پٹائی سے مسئلہ حل ہوتا ہے یا اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ عورت کی نافرمانی و تمرّد شوہر کی ناروا ظلم و زیادتی یا حقوق کی عدم ادائیگی کی بناء پر پیدا ہوئی ہو جس کی وجہ سے میاں بیوی میں سے ہر ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہراتے ہو اور باہمی بیٹھ کر جھگڑے کو ختم کرنے کا کوئی راستہ باقی نہ ہو تو ایسے حالات میں مرد اور عورت کے اولیاء رشتہ دار، یا حمایتی افراد کے لئے یہ ہدایت ہے کہ اگر مرد و عورت دونوں عدل اور انصاف کے ساتھ مصالحت چاہتے ہیں اور ازدواجی زندگی کو باقی رکھنا چاہتے ہیں تو فریقین کے رشتہ داروں یا حمایتی لوگوں میں سے ایک ایک باشرع اور شرعی اصول و ضوابط سے واقف حکم مقرر کیا جاوے جو میاں بیوی کے شرعی شکایات اور حالات کو سن کر عدل و انصاف کے ساتھ دونوں کے درمیان مصالحت کرا سکے۔ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کے حالات سے

واقف ہیں کہ اگر واقعی یہ دونوں مصالحت کا ارادہ رکھتے ہیں اور فریقین کے دونوں منصف عدل وانصاف سے فیصلہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ضرور دونوں کے درمیان موافقت پیدا فرمادیں گے اور اگر ارداہ مصالحت کا نہیں ہے۔ محض مصالحت کی زبانی گفتگو کا جمع خرچ ہے کوئی فریق اپنے مؤقف سے ہٹنے والا نہیں تو مصالحت کبھی نہیں ہوگی بلکہ منافرت میں زندگی گذرے گی۔

اس واسطے اللہ تعالیٰ نے دونوں کے درمیان موافقت پیدا کردینے اور مصالحت ہوجانے کے واسطے دونوں کی جانب سے مصالحت کے ارادے اور نیت کو شرط قرار دیا ہے لہٰذا اگر دونوں کے درمیان مصالحت ہوجاتی ہے تو پھر جھگڑے بھی ختم ہوجاتے ہیں اور علیحدگی کا کوئی مسئلہ پیش نہیں آتا۔

ضرورت کے تحت شوہر کو اختیار ہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے

لیکن بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ فریقین کے درمیان فساد اور جھگڑے اس حد تک بڑھ گئے ہوتے ہیں کہ فریقین کے درمیان صلح کرانے کی کوئی صورت نہیں رہتی یا فریقین مصالحت نہیں چاہتے تو شوہر کے لئے یہ ہدایت ہے کہ قاعدے کے مطابق اسے رکھ سکتا ہے تو رکھے ورنہ اس کو قاعدے کے مطابق چھوڑ دے۔

چنانچہ حق جل شانہ کا ارشاد ہے:

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاکٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ. وَلَایَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا اٰتَیْتُمُوْھُنَّ شَیْئًا اِلَّآ اَنْ یَّخَافَآ اَنْ لَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّایُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِہٖ تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلَا تَعْتَدُوْھَا وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ○ (بقرہ. آیت ۲۲۹)

طلاق رجعی دو مرتبہ تک ہے اس کے بعد قاعدے کے مطابق رکھ لینا ہے یا قاعدے کے مطابق چھوڑ دینا ہے۔ تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ عورت کو دیا ہوا مال لے لو مگر جبکہ مرد اور عورت دونوں ڈریں کہ باہمی رہنے میں حدود الٰہی قائم نہیں رکھ سکیں گے تو دونوں پر کچھ گناہ نہیں ہے کہ عورت بدلہ دے کر چھوٹ جاوے یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود ہیں سو ان کے آگے مت بڑھو اور جو لوگ ان حدوں سے آگے بڑھیں گے وہ لوگ ظالم ہوں گے۔

تشریح: آیت مذکورہ میں ضرورت اور مجبوری کے تحت مرد کو طلاق کا اختیار دیا گیا ہے کہ اگر وہ کسی

ضرورت کے تحت عورت کو طلاق دینا چاہے تو بہتر ہے کہ طلاق رجعی دے اور زیادہ سے زیادہ دو طلاق رجعی دے دے۔ پھر عورت اگر نرم ہو جاتی ہے اور شوہر چاہتا ہے کہ اس کو دوبارہ رکھ لے تو پھر قاعدے کے مطابق عدت کے اندر بیوی کی طرف رجوع کر لے۔ زبانی الفاظ سے یوں کہہ دے کہ میں آپ سے رجوع کرتا ہوں یا رجوع کی نیت سے عملاً بیوی سے زن و شوہر کے تعلقات قائم کر لے اس سے بھی رجوع ہو جاتا ہے اور الگ شہر میں یا الگ ملک میں میاں بیوی کے ہونے کی وجہ سے زبانی یا عملاً رجوع ممکن نہیں ہے تو بذریعہ خط یا تحریری رجوع بھی کر سکتا ہے۔ البتہ شوہر رجوع کی جو صورت اختیار کرے اس پر کم از کم دو آدمی گواہ بنا لے یہ سنت ہے اور اس میں یہ فائدہ بھی ہے کہ بیوی کبھی یہ انکار نہ کرے کہ رجوع نہیں کیا تھا یا مدّت گذرنے کے بعد دعویٰ نہ کرنے لگے کہ اس نے تین طلاق دے کر رجوع کیا تھا یا شوہر کبھی بھول نہ جاوے کہ کتنی طلاق دی تھی اور کیا ہوا تھا اس لئے کہ شوہر نے اگر طلاق رجعی ایک دی تھی تو عدّت میں رجوع کر لینے کے بعد شوہر کو آئندہ مزید دو طلاقوں کا حق رہتا ہے اور شوہر نے اگر دو طلاق رجعی دی تھی تو رجوع کے بعد اس کو آئندہ کے لئے صرف ایک طلاق کا حق رہتا ہے۔ گواہ بنانے کی صورت میں صحیح صورت حال میں غلطی نہ ہوگی اور میاں بیوی کے درمیان عددِ طلاق اور حق رجوع کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ یہ رجوع کے احکام ہوئے۔

لیکن شوہر کی جانب سے طلاق رجعی دیئے جانے کے بعد اگر عورت اور مرد کے درمیان مصالحت کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی بلکہ دونوں فریق علیحدگی پر بضد ہیں یا شوہر رجوع کرنا نہیں چاہتا تو شوہر کو چاہیئے کہ قاعدے کے مطابق عورت کو چھوڑ دے یعنی اس کو تنگ کرنے کے لئے اور لٹکائے رکھنے کے لئے رجوع نہ کرے بلکہ بغیر رجوع کے ایسے ہی رہنے دے اور اس کا جملہ سامان حق مہر اور وہ زیورات جو اس کو میکے اور اپنے رشتہ داروں نے دیئے تھے اور جو زیورات اور سامان شوہر نے اور اس کے عزیزوں نے بطور تحفہ دیئے تھے بیوی کے حوالہ کر دے۔ اس کی ملکیت میں سے کوئی سامان نہ روکے۔ کیونکہ شوہر اگر مختلف حیلے بہانے سے عورت کا کل سامان یا کچھ سامان روک لیتا ہے۔ عورت کے مطالبہ کے باوجود اسے نہیں دیتا تو یہ شوہر کی جانب سے ظلم اور زیادتی ہے۔ ایسے سامان اور زیورات کا روک لینا شوہر کے لئے حلال نہیں ہے۔ خاص طور پر جب شوہر نے اپنی مرضی سے طلاق دی ہو عورت نے طلاق کا مطالبہ نہ کیا ہو۔

ہاں میاں بیوی کے درمیان شدّت اختلافات کی بناء پر صلح کی کوئی صورت پیدا نہ ہونے کی وجہ سے عورت نے اگر از خود شوہر سے طلاق یا خلع کا مطالبہ کیا ہو اور شوہر بلا معاوضہ طلاق یا خلع پر رضامند نہ ہو تو

اس صورت میں میاں بیوی دونوں میں سے کسی پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ شوہر کے کہنے پر بیوی اپنے حق مہر سے دستِ بردار ہو جاوے اور وہ تمام سامان اور زیورات جو کہ شوہر نے یا اس کے والدین نے نکاح کے وقت یا بعد میں دیئے تھے شوہر کو واپس کر کے اس سے طلاق یا خلع کا مطالبہ کرے اور شوہر ان چیزوں کے بدلہ میں طلاق یا خلع دے دے اس طرح مشروط طلاق اور خلع بھی شرعاً جائز ہے۔

بعض مسائل طلاق اور اس کے احکام

خلاصہ: مذکورہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ نے جن بنیادی احکام کا ذکر کیا ہے اس سے جو مسائل معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) میاں بیوی کے درمیان اگر شدید اختلاف ہو جائے یہ دونوں باہمی صلح نہیں کر سکتے تو ان کے بڑوں کے لئے لازم ہے کہ طلاق سے قبل زوجین کے درمیان مفاہمت اور مصالحت کی کوشش کریں۔ اگر زوجین کے بڑے اس کی کوشش نہیں کرتے بلکہ طلاق پر آمادہ ہو جاتے ہیں تو طلاق تو لی جا سکتی ہے لیکن یہ لوگ گنہگار ہوں گے کیونکہ انہوں نے ایک شرعی حکم یعنی طلاق سے قبل مصالحت کی کوشش کرنے کے حکم پر عمل نہیں کیا۔

(۲) مصالحت کے سلسلہ میں ہر طرف کی کوشش کی ناکامی کے بعد اگر طلاق دینا ہے تو شوہر طلاق دے سکتا ہے بیوی طلاق نہیں دے سکتی۔

(۳) طلاق دینے کی صورت میں شوہر کو چاہیئے کہ طلاق رجعی دے خواہ ایک طلاق دے یا دو طلاق۔ اکھٹا دے دے یا الگ الگ۔ اس طرح طلاق دینا سنت کے مطابق ہے اور اس میں بے شمار فائدے ہیں۔

(۴) شوہر کو چاہیئے کہ طلاق بائن یا طلاق ثلاثہ نہ دے کیونکہ اس طرح طلاق دینا خلاف سنت ہے اور گناہ ہے۔ پھر طلاق واقع ہو جانے کی وجہ سے بے شمار پریشانیاں ہوتی ہیں جس کا تدارک ممکن نہیں ہوتا کیونکہ تین طلاقوں سے کم ''طلاق بائن'' دینے کی صورت میں شوہر کو رجوع کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ اور تجدید نکاح کرنا چاہے تو بیوی کی رضامندی ضروری ہوتی ہے اس کے بغیر نکاح نہیں ہو سکتا اور طلاق ثلاثہ دینے کی صورت میں رجوع کا حق چلا جاتا ہے اور تجدید نکاح بھی بدوں تحلیل شرعی ممکن نہیں ہوتی۔ ان سب باتوں کا لحاظ کر کے حق تعالیٰ نے طلاق رجعی دینے کا حکم دیا ہے۔

(۵) طلاق شوہر دے سکتا ہے عورت نہیں۔

(۶) شوہر اگر مناسب سمجھے تو رجوع کر سکتا ہے۔ بیوی کو نہ رجوع کرنے کا اختیار ہے نہ مرد کے رجوع پر انکار کا حق ہے۔

(۷) شوہر طلاق رجعی کے بعد اگر مناسب نہ سمجھے رجوع نہ کرے کیونکہ رجوع کرنا اس پر لازم نہیں۔

(۸) بدنیتی سے عورت کو تنگ کرنے یا اس کو ایذاء دینے کی غرض سے یا اس کا مال دبانے کی غرض سے رجوع کرنا جائز نہیں گناہ ہے۔

(۹) رجوع کے بعد قاعدے کے مطابق اس سے ازدواجی زندگی گذارنا اور اس کے تمام حقوق زوجیت ادا کرنا ضروری ہے اس کو ماضی کی تلخیاں یاد کرا کر ستانا گناہ ہے۔

(۱۰) اگر شوہر کا رجوع کرنے کا ارادہ نہیں ہے تو قاعدے کے مطابق اس کو چھوڑ دینا چاہیئے۔

(۱۱) اس کے مالی حقوق، حق مہر، زیورات اور دوسری املاک وسامان دینا چاہیئے۔

(۱۲) زبردستی یا حیلے بہانے سے مطلقہ عورت کے زیورات اور سامان کا روکنا ناجائز ہے زیادتی اور ظلم ہے۔

(۱۳) شوہر کے ذمہ عدّت کا خرچہ ہے جبکہ عورت اس کے گھر پر رہے اور اگر عورت کا بچہ ہو اس کا خرچ دینا بھی ضروری ہے۔

(۱۴) شوہر اگر از خود طلاق دے دے تو بیوی کو تحفہ میں دیئے ہوئے زیورات اور سامان واپس نہ لے۔

(۱۵) بیوی نے اگر طلاق یا خلع کا مطالبہ کیا اور شوہر نے دیئے ہوئے زیورات اور سامان کی واپسی کی شرط پر طلاق یا خلع دیا تو یہ جائز ہے البتہ دیئے ہوئے زیورات اور سامان سے زائد مالیت کی چیز یا رقم کا مطالبہ کرنا شوہر کے لئے ناجائز اور گناہ ہے۔

(۱۶) عورت شوہر کے خلع دینے پر خلع لے سکتی ہے۔ شوہر کی جانب سے خلع دیئے بغیر خلع نہیں ہوتا۔

(۱۷) شوہر کی بے خبری میں یا اس پر مختلف الزامات عائد کر کے بعض عورتیں مروّجہ قانون کے سہارے عدالت سے یک طرفہ خلع لے لیتی ہیں از روئے قرآن وسنت اس سے خلع نہیں ہوتا۔ عورت شوہر کے نکاح سے نہیں نکلتی شوہر کے عقدِ نکاح سے نکلنے کے لئے اس کا طلاق دینا یا اس سے خلع لینا ضروری ہے۔

(۱۸) ہاں شوہر کا ظلم وزیادتی اگر عدالت میں شرعی گواہوں سے ثابت ہو جائے اور شوہر شرعی طریقے سے اسے آباد کرنے پر رضامند نہیں ہوتا نہ اسے طلاق دیتا ہے اور نہ ہی خلع پر رضامند ہوتا ہے تو ان مجبوریوں کے بعد عدالت گواہوں کی گواہی کی بنیاد پر یک طرفہ فسخ نکاح کا اختیار رکھتی ہے۔

(۱۹) فسخ نکاح کی صورت میں عورت حق مہر اور اپنے سامان سے محروم نہیں ہوتی۔ شوہر کے ذمہ حق مہر واجب الاداء رہتا ہے۔ ہاں عدّت کا خرچ اس کو نہیں ملے گا جیسا کہ عورت کا خلع لینے کی صورت میں بھی عدّت کا خرچ اس کو نہیں ملتا۔

(۲۰) نیز مذکورہ بالا آیات میں حق تادیب یعنی عورت کو نصیحت کرنا، بستر سے الگ کرنا، ضرورت ہو تو مارنے کا حق مرد کو دیا گیا ہے۔

(۲۱) پھر حق طلاق،

(۲۲) حق رجوع اور

(۲۳) خلع کی منظوری دینا شوہر کی رضامندی پر رکھا گیا ہے۔

یہ سب احکام مرد کی عورت پر فضیلت اور برتری ثابت کرتے ہیں اس سے قبل آیت ''اَلرِّجَالُ قَوَّا مُوْنَ عَلَى النِّسَاء'' میں بھی مرد کی عورت پر برتری اور فضیلت تخلیقی طور پر اور بوجہ اس کو نان ونفقہ دینے، اس کو رہائش دینے کے ثابت کی گئی ہے۔

علاوہ ازیں طلاق کے بارے میں قرآن وحدیث کی جتنی نصوص ہیں سب میں طلاق دینے کا اختیار مرد اور شوہر ہی کو دیا گیا ہے نہ عورت کو، نہ حاکم وقت، نہ مقامی چیئرمین یونین کونسل کو۔

اوپر کی تحریر سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ نکاح کا اصل مقصد مرد وزن کی عفّت وعصمت کو محفوظ کرنا اور ہر دونوں کو سکون وراحت پہنچانا اور ازدواجی زندگی اور مرد وزن کے تعلقات کے ضمن میں قانون الٰہی کے تحت افزائش نسل کے ذریعہ دنیا کو آباد کرنا ہے۔ قرآن وحدیث کی نصوص سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی زندگی کے نظام کو دیگر حیوانات کے مقابلہ میں جداگانہ رکھا ہے دوسرے حیوانات کی طرح حیوانی تقاضے کو پورے کرنے کے لئے ہر روز نیا جوڑا رکھنے کی اجازت نہیں دی۔ اسی وجہ سے شریعت نے نکاح مؤقت کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ نکاح کو مرد وزن کی تادم حیات راحت وسکون اور دوسرے مقاصد حسنہ کے تحت مشروع کیا گیا ہے اور شریعت نے طلاق کی اجازت بعض ناگفتہ بہ حالات اور مرد وزن کی سنگین مجبوریوں کے تحت اور ان کے مستقبل کے خطرات کے پیش نظر دی ہے۔

چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

أبغض الحلال الى الله تعالىٰ الطلاق. (ابو داؤد)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ مبغوض ترین چیز طلاق ہے۔

تشریح: حدیث پاک میں طلاق کو حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ بتلانے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے مرد وزن کی آدھی زندگی برباد ہوجاتی ہے اور دونوں کے گھرانوں کا نظام درہم برہم ہوجاتا ہے اور دو خاندانوں میں جو رشتۂ نکاح کی بنا پر نئی رشتہ داری قائم ہوئی تھی جو کہ ایک نعمت خداوندی تھی وہ بھی ختم ہوجاتی ہے لیکن ان سب چیزوں کے باوجود اس کو حلال اس لئے بتایا گیا ہے کہ بعض دفعہ طلاق نہ دینے سے دونوں کی زندگیاں اجیرن بن جاتی ہیں بلکہ ان دونوں کی وجہ سے مرد وزن کے خاندان دونوں طرف سے شدید متاثر ہوتے ہیں۔ مرد وزن کے اختلافات کی شدت کی بنا پر دونوں خاندانوں کا چین وسکون ختم ہوجاتا ہے۔ نہ خاندان کے بڑے صلح کرانے کی استطاعت رکھتے ہیں نہ عدالت اس میں کچھ کرسکتی ہے۔

ایسے حالات میں مرد وزن میں علیحدگی کو دونوں کے درمیان بلکہ دونوں خاندان کے درمیان پائی جانے والی پریشانیوں کو دور کرنے اور اس کے بدلے میں چین وسکون حاصل کرنے کا واحد ذریعہ خیال کیا جاتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ پریشانی اور بے چینی کے یہ حالات عورت کی جانب سے پیش آتے ہیں یا مرد کی جانب سے پیش آتے ہیں۔

اللہ رب العالمین جو کہ خالق کائنات اور خالق مرد وزن ہے ان سب باتوں کو یوم ازل سے جانتا ہے اس نے اپنی صفت علم اور صفت خبیری کی بنیاد پر ضرورت کے تحت طلاق کو مشروع فرمایا ہے تاکہ بوقت ضرورت طلاق کے ذریعہ دونوں کے درمیان علیحدگی ممکن ہوسکے۔

باقی رہا طلاق کا اختیار مرد کو کیوں دیا عورت کو یا کسی تیسری جماعت کو کیوں نہیں دیا؟ اس کی وجوہ و اسباب تو ہر ذی شعور، اہل علم اور اہل فہم کو بخوبی معلوم ہیں لیکن علوم شریعت سے ناواقف، دنیاوی علوم کے ماہرین اور عوام کو ان چیزوں کے حقائق معلوم نہیں ہیں اس لئے یہ لوگ دانستہ طور پر یا جہالت کی بنیاد پر اعتراض کرتے ہیں۔ راقم الحروف سب سے پہلے وہ آیات تحریر کرتا ہے جن میں مرد کو طلاق کا اختیار دیئے جانے کا ذکر ہے۔

حق جل مجدہٗ ارشاد فرماتے ہیں:

وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ. (بقرہ. آیت ۲۲۷)

اور اگر انہوں نے طلاق دینا ٹھہرالیا ہے تو بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

تشریح: جو مرد چار مہینہ یا اس سے زیادہ مدت تک بیوی سے مقاربت اور نہ ملنے کی قسم کھاتا ہے پھر وہ اگر بیوی سے اسی مدت میں ملتا ہے اور قسم کو توڑ دیتا ہے تو اس پر قسم کا کفارہ آتا ہے۔ طلاق نہیں ہوتی لیکن مرد اگر قسم پر قائم رہتا ہے اور چار ماہ کی مدت میں رجوع نہیں کرتا گویا اس نے بیوی کو چھوڑنے کا

ارادہ کرلیا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اقوال کو سنتے ہیں اور ظاہر و باطن کے افعال جانتے ہیں اس سے اس کی عورت پر طلاق بائن پڑ جائے گی۔ پھر رجوع نہ ہو سکے گا البتہ تجدید نکاح ہو سکے گی۔

دیکھئے آیت مذکورہ میں طلاق کے عزم وارادے کی نسبت مردوں کی طرف کی گئی ہے۔ عورتوں کی طرف اس کی نسبت نہیں کی گئی نہ کسی جماعت یا فریق کی طرف بلکہ اس کا ذکر تک نہیں ہے کہ شوہر کے طلاق کے بعد عورت یا پنچائیت کیا ارادہ رکھتی ہے۔ چیئر مین صاحب کا کیا ارادہ ہے جس سے واضح ہوا کہ طلاق کا اختیار مرد کو ہوتا ہے عورت کو نہیں نہ کسی تیسری پارٹی کو اور اس میں عورت کی رضامندی شرط ہے نہ عدم رضاء سے اس کی حق تلفی ہوتی ہے کیونکہ شرعاً جب اس کو طلاق کا حق ہی نہیں ہے تو حق تلفی کیسے ہوگی۔

(۲) آیت نمبر ۲۲۸ کا ترجمہ اور اس کی تشریح گذر چکی ہے اس میں بھی طلاق رجعی پھر عدّت میں بیوی کو امساک یعنی رکھنے کا اختیار یا تسریح یعنی چھوڑنے کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے اس میں کسی تیسری پارٹی کا دباؤ غیر شرعی ہے۔

(۳) پھر دو طلاق رجعی کے بعد تیسری طلاق کا ذکر کرتے ہوئے حق جلّ مجدہٗ ارشاد فرماتے ہیں:

فَاِنْ طَلَّقَهَا.

پھر اگر اسی عورت کو مرد نے۔

فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ. (سورہ بقرہ آیت ۲۳۰)

تیسری طلاق دے دی تو اب وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں ہے جب تک کہ وہ کسی دوسرے خاوند سے نکاح نہ کرے۔

تشریح: آیت مذکورہ میں عورت کو طلاق دینے کی نسبت مرد یعنی شوہر کی جانب کی گئی ہے عورت یا کسی تیسری پارٹی کی طرف نہیں کی گئی جس سے واضح ہوا کہ طلاق کا اختیار نہ عورت کو ہے نہ کسی پنچایت کو، نہ کسی چیئر مین کو۔

نیز آیت میں حق تعالیٰ نے شوہر کی جانب سے دی جانے والی طلاق ثلاثہ کو مؤثر قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ طلاق ثلاثہ کے بعد نہ رجوع جائز ہے نہ ہی زوج ثانی سے قاعدے کے مطابق تحلیل شرعی کے بغیر عورت زوج اوّل کے لئے حلال ہو سکتی ہے نکاح ختم ہو جائے گا اور عورت حرمت مغلظہ کے ساتھ حرام ہو جائے گی۔ پھر اس کے بعد کسی چیئر مین کا یہ کہنا کہ طلاق اس کی تصدیق کے بغیر مؤثر نہیں ہوگی احکامِ خداوندی میں ناجائز مداخلت اور کفر ہے۔

(۴) پھر اسی آیت کے اندر حق تعالیٰ شانہٗ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يَّتَرَاجَعَا اِنْ ظَنَّا اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا

پس اگر دوسرے شوہر نے طلاق دے دی ہو تو کچھ گناہ نہیں ان دونوں پر کہ وہ پھر باہم مل جائیں جبکہ ان کو گمان غالب ہو کہ وہ باہم حدود اللہ کو قائم رکھ سکیں گے۔

فَلَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ. (سورہ بقرہ آیت. ۲۳)

اور یہ اللہ کی حدیں ہیں جنہیں بیان فرماتے ہیں ان لوگوں کے واسطے جو فہم رکھتے ہیں۔

تشریح: یعنی شوہر کی جانب سے تیسری طلاق کے بعد عورت نے اگر عدّت گذار کر دوسرے خاوند سے نکاح کرلیا ہے پھر کسی وجہ سے دوسرے خاوند نے بھی عورت کو طلاق دے دی ہے تو دوسرے خاوند کی طلاق اور عدّت کے بعد عورت اور پہلا خاوند اگر پھر سے نکاح کے لئے رجوع کریں تو ان کے لئے کوئی گناہ نہیں ہے۔ کیونکہ طلاق ثلاثہ کے بعد جب تحلیل شرعی ہوگئی ہے تو عورت اور زوج دونوں چاہیں تو دوبارہ نکاح کر کے ازدواجی تعلق قائم کرسکتے ہیں۔

دیکھئے آیت مذکورہ میں جب حق تعالیٰ نے طلاق کا ذکر فرمایا تو طلاق دینے کی نسبت مرد اور شوہر کی طرف فرمائی۔ پھر جب شوہر ثانی کی طلاق اور عدّت کے بعد زوج اوّل سے دوبارہ نکاح کا ذکر فرمایا تو اس میں عورت اور مرد دونوں کے ارادے اور خواہش کو ملحوظ رکھا جس سے صاف واضح ہوا کہ نکاح باندھنے میں تو مرد اور عورت دونوں کی جانب سے رضامندی اور ایجاب وقبول کا ہونا ضروری ہے لیکن طلاق دینے میں صرف مرد کو اختیار ہوتا ہے نہ کہ عورت یا کسی ثالث کو۔ اسی طرح قرآن حکیم کے اندر جہاں جہاں طلاق دینے کا اختیار اور طلاق دینے کی نسبت کا ذکر ہے۔ ہر جگہ پر مرد اور شوہر کی جانب طلاق دینے کی نسبت کی گئی ہے۔ دیکھئے پانچویں جگہ میں حق تعالیٰ شانہٗ کا ارشاد ہے۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْسَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ.

(بقرہ. آیت ۲۳۰)

جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر وہ عدت ختم ہونے کے قریب ہوں تو رکھ لو ان کو قاعدے کے موافق یا چھوڑ دو ان کو قاعدے کے موافق۔

تشریح: آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے مردوں سے خطاب فرمایا کہ عورتوں کو طلاق رجعی دینے کے بعد اگر عدت باقی ہے اور قریب الختم ہے تو رجوع کرنا چاہو تو قاعدے کے موافق رجوع کرلو۔ زبانی طور

پر یہ کہہ دو کہ میں رجوع کر لیتا ہوں اور اس پر دو گواہ بنالو تو بہتر ہے پھر اس کے ساتھ وہی سلوک کرو جو واقعی بیوی کے ساتھ کیا جاتا ہے اور اس کو رجوع کر لینے کے بعد رفتار و گفتار سے تنگ نہ کیا کرو، نہ ہی اس ارادہ سے رجوع کیا کرو۔

اور اگر تمہارا رجوع کرنے کا ارادہ ہی نہیں ہے تو ان کو قاعدے اور دستور کے مطابق چھوڑ دو۔ عدّت گذرنے تک ان کا نان ونفقہ دیا کرو۔ پھر جب وہ اپنے میکے جانے لگے اس کے تمام واجبات ادا کر دو اور تمہارے اندر وسعت ہے تو ایک نیا جوڑا بھی بنوا کر دو یہ نیکو کاروں کا شعار ہے اور متقیوں کے کردار سے یہ سنت بھی ہے۔ دورانِ عدت ان کو رفتار و گفتار سے ایذاء مت دو، ان کے حقوق کا خیال رکھو۔ بعد عدت ان کے زیورات اور دوسرے سامان کو یا اس کے کسی حصّہ کو دبانے کی سعی مت کرو۔

حق تعالیٰ نے "فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْسَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ" میں نے انہیں باتوں کا ذکر فرمایا ہے۔

نیز آیت میں طلاق دینے کے اختیار میں جیسا کہ مردوں کا ذکر فرمایا ہے پھر رجوع کے حق دینے میں بھی مردوں کا ذکر کیا ہے یعنی مرد جب ضرورت کے تحت طلاق دے سکتا ہے اور ضرورت سمجھے تو عدت ختم ہونے سے قبل رجوع بھی کر سکتا ہے اور اگر رجوع نہ کرنا چاہے تو اسے کوئی جبر نہیں کر سکتا۔

جس سے واضح ہوا کہ شریعت میں طلاق دینے کا حق صرف شوہر کو ہوتا ہے عورت کو نہیں ہوتا نہ کسی ثالث کو طلاق دینے میں کچھ عمل و دخل کا حق ہے۔ شوہر چاہے گا رجوع کرے گا اور اگر وہ نہیں چاہے گا تو عورت یا ثالث کے رجوع کرنے سے شرعاً رجوع نہ ہوگا اور نہ ہی دباؤ ڈالنے سے کچھ فائدہ ہوگا۔

اور ایک آیت میں حق جلّ مجدہٗ فرماتے ہیں:

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ. (بقرہ ۲۳۱)

اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر وہ پورا کر چکیں اپنی عدّت کو تو اب نہ روکو ان کو اس سے کہ نکاح کر لیں اپنے تجویز کردہ خاوندوں سے جبکہ راضی ہو جائیں وہ آپس میں دستور کے مطابق۔

تشریح: حق جل مجدہٗ نے مردوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: کہ تم نے اگر اپنی عورتوں کو طلاق دی پھر ان کی عدّت بھی گذر گئی۔ پھر وہ اگر اپنی مرضی سے اپنے تجویز کردہ خاوند سے نکاح کرنا چاہیں تو تم ان کو مت روکو! اس حکم الٰہی کی چند صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(الف) مثلاً شوہر نے اپنی عورت کو طلاق رجعی دی اس نے عدّت میں رجوع نہیں کیا بعد عدّت عورت کسی اور مرد سے مناسب خاندان، مذہب، صاحبِ حیثیت سے اپنی مرضی سے نکاح کرنا چاہے تو نہ تو پہلا خاوند رکاوٹ ڈالے، نہ ہی عورت کے ولی ماں باپ وغیرہ رکاوٹ ڈالیں۔

(ب) یا طلاق رجعی میں عدّت گذرنے کے بعد عورت سابق شوہر کے ساتھ خود تجدید نکاح کرنا چاہے تو عورت کے سرپرست یا رشتہ دار لوگ اس سے منع نہ کریں۔

(ج) شوہر نے عورت کو تین طلاقیں دی تھیں اس نے بعد عدت زوج ثانی سے نکاح کرلیا اس سے زن و شوہر کے تعلقات قائم ہوئے پھر اسی دوسرے شوہر نے اپنی مرضی سے عورت کو طلاق دی اور عورت کی دوسری عدّت ختم ہونے کے بعد وہ اگر سابق شوہر سے نکاح کرنا چاہے تو اس کو دوسرے شوہر یا کسی اور رشتہ دار کا روکنا منع ہے۔

(د) شوہر نے عورت کو تین طلاق دے دی ہیں۔ عدّت کے بعد وہ اپنی مرضی سے دوسرے شوہر سے نکاح کرنا چاہے تو شوہر اوّل یا اس کے خاندان یا کوئی تیسری پارٹی اس کو نہ روکے۔ کیونکہ اس کو اپنے تجویز کردہ خاوند کے ساتھ نکاح کرنے سے روکنا منع ہے اور پہلے خاوند کی طلاق مؤثر ہوچکی ہے اور بلا وجہ اس طرح عورت کی مرضی کے خلاف زبردستی کرنے سے فتنے پیدا ہوتے ہیں۔ پھر عورت اور مرد کے درمیان خفیہ اور ناجائز تعلقات قائم ہوجاتے ہیں۔ یہ دونوں نکاح کرکے پاکیزہ زندگی گذار سکتے تھے لیکن انہیں نکاح سے روکنے کی وجہ سے یہ ناجائز تعلقات پر مجبور ہوئے یہ سب سے بڑا فتنہ ہے۔

پھر آیت میں نکاح منعقد کرنے کے لئے تو دونوں کی رضامندی کو ضروری اور شرط قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ "اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ" یعنی مرد اور عورت دونوں باہمی قاعدے کے مطابق نکاح پر رضامند ہوجائیں تو انہیں نکاح کرنے دو۔ رکاوٹ مت پیدا کرو۔

لیکن طلاق کا جب ذکر ہوا تو اس میں عورت کو شامل نہیں کیا گیا بلکہ صرف مرد سے خطاب کیا گیا، "اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ" یعنی تم (مرد) لوگ جب عورت کو طلاق دے دو۔

آیت کا مفہوم یہ نکلا کہ مرد فاعل طلاق، طلاق دینے والا اور واقع کرنے والا ہوتا ہے جبکہ عورت مفعول طلاق یعنی مطلقہ اور اس پر طلاق واقع ہوتی ہے جس سے واضح ہوا کہ طلاق کا اختیار صرف مرد ہی کو ہوتا ہے عورت یا کسی تیسرے شخص کو نہیں ہوتا اور شوہر کی طلاق مؤثر ہوتی ہے، بیوی کی رضامندی یا کسی تیسری پارٹی کی تصدیق یا توثیق پر موقوف نہیں رہتی۔

چھٹی جگہ میں حق جل شانہٗ کا ارشاد ہے:

لَاجُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ اِنۡ طَلَّقۡتُمُ النِّسَاءَ مَالَمۡ تَمَسُّوۡ هُنَّ اَوۡتَفۡرِضُوۡا لَهُنَّ فَرِيۡضَةً.

(بقرہ. ۲۳۲)

کچھ گناہ نہیں تم پر اگر تم طلاق دو عورتوں کو اس وقت کہ ان کو ہاتھ بھی نہ لگایا ہو اور نہ مقرر کیا ہو ان کے لئے کچھ مہر۔

تشریح: اللہ تعالیٰ نے مردوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: کہ اگر کسی شدید ضرورت اور مجبوری کی بناء پر تم منکوحہ عورتوں کو قبل اس کے کہ ابھی تم لوگوں نے ان کو ہاتھ بھی نہ لگایا ہو نہ مہر مقرر کیا ہو طلاق دینا چاہو تو دے سکتے ہو۔ طلاق دینے کا اختیار ہے۔ کسی عذر اور مجبوری کی وجہ سے جب طلاق دی جائے تو کچھ گناہ تم پر نہیں ہوگا۔

البتہ ایسی عورتوں کو خاندانی عورتوں کے برابر مہر میں سے نصف حصّہ ملے گا اور ایک نیا جوڑا کپڑے کا ملے گا اور اگر مہر کا تقرر ہوا تھا تو طے شدہ مہر کا نصف یعنی آدھا مہر ملے گا اور ایک جوڑا نئے کپڑے کا دینا سُنت ہے واجب نہیں ہے۔

جن عورتوں کی ابھی رخصتی نہیں ہوئی، اگر طلاق دینا ضروری ہو جاوے تو مردوں کو چاہیئے کہ سنت کے مطابق ایک طلاق یا دو طلاق دے دیں۔ اس سے زیادہ طلاق دینا ممنوع ہے۔ پھر کسی وجہ سے دونوں فریق اگر نکاح پر راضی ہو جائیں تو تجدید نکاح کرنے کی گنجائش رہتی ہے اور نکاح نہ کرنا چاہیں تو کچھ حرج بھی نہیں ہے اور ایسی عورت پر عدّت لازم نہیں ہوتی۔

چنانچہ سورۂ احزاب رکوع ۳ اور پارہ ۲۲ میں اس کی تفصیل ہے۔

اور شوہر نے اگر تین طلاقیں بیک جنبش دے دیں تو اس میں گناہ ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کی نافرمانی بھی۔ پھر اگر فریقین نکاح ثانی پر رضا مند ہو جاتے ہیں تو نکاح ثانی بدون تحلیل شرعی ممکن نہیں رہتا۔ اس سے بڑی پریشانی پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ایسے موقع پر تین طلاقیں دینے سے احتراز کرنا شوہر کے لئے ضروری ہے اور جو لوگ طلاق کے بارے میں شوہر کو مشورہ دینے والے ہیں۔ انہیں بھی ایک یا دو طلاقوں کا مشورہ دینا چاہیئے تین طلاقوں کا مشورہ دینا بھی گناہ اور معصیت ہے اگرچہ طلاق ہو جاتی ہے۔

آیت مذکورہ میں رخصتی سے قبل طلاق دینے کا اختیار شوہر کو دیا گیا ہے عورت، یا کسی تیسری پارٹی کو طلاق دینے کا اختیار نہیں اس میں تیسرا فریق خواہ وہ پنچائت ہو یا عدالت، یا حاکم وقت، طلاق نہیں دے سکتا۔

غرض تمام آیات بابت طلاق سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ طلاق کا حق مرد اور شوہر کو ہے۔عورت کو یا کسی تیسرے شخص کو اس کا حق نہیں ہے۔لہٰذا کوئی تیسرا فریق اگر طلاق کی رسمی کاروائی کر بھی لے شرعی قانون کی رو سے اس کی کوئی حیثیت نہ ہوگی بلکہ اسے باطل اور کالعدم اور فعل عبث قرار دیا جائے گا۔

مزید یہ کہ آیت میں حق تعالیٰ شانہ نے ارشاد فرمایا: کہ عورت کو صرف ضرورت کے تحت طلاق دینے سے طلاق واقع ہوجاتی ہے احکام طلاق جاری ہوجاتے ہیں اور طلاق دینے میں شوہر پر کسی قسم کا گناہ یا جرم عائد نہیں ہوتا نہ وہ کسی سزا کا مستحق ہے خواہ طلاق دیتے وقت بیوی کی رضامندی شامل تھی یا نہیں۔ خواہ کسی تیسری پارٹی یا چیئرمین صاحب نے تصدیق کی یا نہیں۔

یہ تو آیات قرآنی کی روشنی میں لکھا گیا کہ طلاق کا حق شوہر کو ہے اور اس کے طلاق دینے سے طلاق مؤثر ہوتی ہے۔اس میں بیوی کی رضامندی یا کسی تیسری پارٹی کی تصدیق یا توثیق قطعاً لازم نہیں۔اب یہ چند احادیث رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم بھی ملاحظہ فرمائیں:

شرعاً طلاق کا کلی اختیار شوہر کو ہوتا ہے ہر حال میں اس کی طلاق مؤثر ہوتی ہے۔

عن ابی هريرة رضی الله تعالیٰ عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ثلاثة جدّهُنّ جدٌّ وهزلُهُنّ جدّ النكاح، والطلاق والرجعة وفی رواية والعتاق.

(مجمع الزوائد ص ۳۴۳، ج. ۴، و الترمذی)

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ حقیقت کی نیت سے حقیقت پر محمول ہوتی ہیں۔مذاق اور کھیل کی نیت سے بھی حقیقت پر محمول ہوتی ہیں۔نکاح، طلاق، رجعت، بعض روایت میں ہے اعتاق یعنی آزاد کرنا بھی۔

وقال الترمذی هذا حديث حسن والعمل علیٰ هٰذا عند اهل العلم من اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم. (ترمذی ص ۲۲۵، ج. ۱)

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث درجۂ حسن کی ہے اور صحابۂ کرام میں سے تمام اہل علم کا عمل اس پر رہا ہے۔

تشریح: حدیث پاک کیت و بہت لمبی تشریح ہے خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق:

(۱) شوہر طلاق خواہ طلاق کے ارادے سے دے یا مذاق اور بغیر ارادہ کے دے ہر صورت میں طلاق ہوجاتی ہے طلاق مؤثر ہے۔ بیوی کی رضامندی یا کسی فریق ثانی کی تصدیق یا توثیق پر طلاق موقوف نہیں رہتی۔

(۲) شوہر کی جانب سے طلاق دنے پر طلاق مؤثر ہوتی ہے اس پر تمام اہل علم صحابہ کرامؓ کا متفقہ عمل ہے اور اس کے بعد تابعینؒ وتبع تابعینؒ اور آئمہ مجتہدینؒ کی رائے بھی یہی ہے۔

یہی حکم نکاح کا بھی ہے کہ زوجین عاقل بالغ نے اگر گواہان کی موجودگی میں نکاح کرلیا ہے تو نکاح منعقد ہوجاتا ہے کسی دوسرے فریق کی اجازت پر موقوف نہیں رہتا اور یہی حکم رجعت کا ہے یعنی طلاق رجعی دینے کے بعد شوہر نے اگر بیوی کے ساتھ مصالحت کرلی اور رجوع کرلیا ہے تو رجوع صحیح ہوجاتا ہے اس میں کسی دوسرے کی رضامندی یا توثیق وتصدیق کی ضرورت ہرگز نہیں ہوتی۔

اگر کوئی شخص اس میں کسی تصدیق وتوثیق کو ضروری سمجھتا ہے تو یہ اس کی گمراہی ہے اور شریعت کا انکار ہے۔

(۲) عن عائشة رضی اللّٰه تعالٰی عنها أن رجلاً طلّق امرأتهٗ ثلاثًا فتزوّجت زوجاً آخر فطلّق فسئل النبی صلی اللّٰه علیه وسلم أتحل للاوّل قال لا! حتّٰی یذوق عسیلتها وتذوق عسیلته. وقال أهل العلم اذا طلّق ثلاثاً فقد حرمت علیه امرأته. (بخاری کتاب الطلاق مجمع الزوائد ص ۳۴۴، ج۔ ۴)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو طلاق ثلاثہ دے دی۔ پس اس عورت نے عدّت کے بعد دوسرے شخص سے نکاح کرلیا۔ پھر دوسرے شخص نے زن وشوہر کے تعلق قائم ہونے سے قبل طلاق دے دی۔ پھر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اس بارے میں سوال کیا گیا کہ آیا عورت زوج اوّل کے لئے حلال ہوگی یا نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں! جب تک کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کا مزہ نہ چکھ لیں یعنی مجامعت نہ کرلیں عورت پہلے شوہر کے لئے حلال نہ ہوگی۔

تشریح: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں کئی احکام بیان کئے گئے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں۔

(۱) جب کبھی شوہر عورت کو طلاق ثلاثہ دے دے گا اور وہ عاقل و بالغ ہے تو طلاق مؤثر ہوگی۔ بیوی اس پر حرمت مغلظہ کے ساتھ حرام ہوجائے گی اور حرمت مغلّظہ کا مطلب یہ ہے کہ رجوع جائز نہیں ہے اور تجدید نکاح بھی بدوں تحلیل شرعی کے حلال نہیں ہے جبکہ طلاق رجعی میں عدّت میں رجوع کر لینے سے بیوی حلال ہوجاتی ہے اور تین طلاقوں سے کم طلاق بائنہ میں رجوع تو جائز نہیں ہوتا لیکن حلالہ کے بغیر تجدید نکاح سے عورت حلال ہوجاتی ہے۔ مگر طلاق ثلاثہ میں حلالہ شرعی کی شرط ہے اس کے بغیر عورت زوج اوّل کے لئے حلال نہیں ہوتی۔

حلالہ شرعی کا مطلب یہ ہے کہ مطلّقہ ثلاثہ بعد عدّت شرعی (ماہواری کے ایام گزار کر) شرعی طریقہ پر کسی دوسرے آدمی سے نکاح کر لے پھر زوج ثانی سے تعلقات قائم ہونے (مجامعت) کے بعد اس نے اپنی مرضی سے عورت کو اگر طلاق دے دی تو یہ عورت پھر عدّت گزارے گی۔ اس کے بعد زوج اوّل اگر راضی ہوجائے اور عورت بھی دوبارہ اس سے نکاح کرنا چاہے تو نکاح کرسکتی ہے۔ دیکھئے طلاق ثلاثہ کی حرمت کتنی شدید حرمت ہے۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعۂ مذکورہ میں شوہر کی جانب سے دی جانے والی طلاق کو مؤثر قرار دیا۔ آپ سے جب زوج ثانی کی طلاق کے بعد مسئلہ دریافت کیا گیا کہ عورت زوجِ اوّل کی طرف نکاح کے لئے رجوع کرسکتی ہے یا نہیں تو آپ نے نفی میں جواب دیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ پہلے خاوند اور دوسرے خاوند کسی کی طلاق مؤثر نہیں ہے بلکہ دونوں شوہروں کی طلاقوں کو مؤثر مانا ہے۔ آپ صاحب شریعت رسول ہیں۔ اگر اس میں معمولی لچک اور گنجائش ہوتی تو آپ ضرور فرماتے کہ عورت پہلے خاوند سے رجوع کرسکتی ہے لیکن آپ نے طلاق ثلاثہ کو ایسا مؤثر قرار دیا ہے اور ایسے حرام قرار دیا ہے کہ عورت کا زوج اوّل کے واسطے حلال ہونے کے لئے صرف زوج ثانی کے ساتھ نکاح کر لینا کافی نہیں ہوگا بلکہ اس کے ساتھ مجامعت بھی شرط ہے۔ لہٰذا زوج ثانی نے اگر بدون مجامعت کرنے کے عورت کو طلاق دی ہے عذر کی بناء پر ایسا کیا گیا ہے یا مصلحۃً کیا گیا کسی صورت میں یہ عورت زوج اوّل کے لئے حلال نہ ہوگی۔

ہاں زوج ثانی نے اگر مجامعت کے بعد عورت کو طلاق دی ہے خواہ ایک مرتبہ مجامعت کی ہو پھر یہ عورت عدّت گزارنے کے بعد اگر پہلے خاوند سے نکاح کرنا چاہے تو نکاح کرسکتی ہے۔ یہ تو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے۔ قرآن وسنت کا فیصلہ ہے۔ تمام صحابہ کرامؓ اور ائمہ مجتہدین کا فیصلہ ہے جبکہ موجودہ دور کے نام نہاد اہل حدیث، شیعہ امامیہ کا فیصلہ یہ ہے کہ شوہر کی جانب سے طلاق ثلاثہ کے بعد

طلاق ثلاثہ مؤثر نہیں ہوتیں اور عدت کے اندر اندر مرد اور عورت اگر مصالحت کرنا چاہیں مصالحت اور رجوع کر کے وہ دوبارہ ازدواجی تعلق قائم کر سکتے ہیں اور سوئے اتفاق سے موجودہ عائلی قانون کی تائید بھی ان فرق ضالہ و باطلہ کو حاصل ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ شیعہ امامیہ اور اہل حدیث علماء کے پیروکار ہیں یا خدا اور رسول کے خلاف قانون حکومت کی پابندی کرنے والے ہیں۔ وہ طلاق ثلاثہ کے بعد بھی رجوع کرنا چاہیں تو کر لیں۔

لیکن جن لوگوں نے ''لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ'' کا کلمہ پڑھا ہے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں ان کے لئے تو قانونِ الٰہی اور قانون رسول کے بعد کوئی چیز ہی لائق اعتبار نہیں ہے وہ لوگ طلاق ثلاثہ کے بعد کیسے بیوی سے رجوع کر سکیں گے؟ کیونکہ اس میں تو خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی ہوتی ہے اور قانونِ خداوندی اور اس کے رسول کی شریعت سے بغاوت لازم آتی ہے بلکہ اس سے انکار کر دیتے ہیں پھر تو ایمان بھی چلا جاتا ہے۔

اس لئے جو حضرات بیوی کو تین طلاق دیتے ہیں پھر اپنے مسلکِ حقہ کو چھوڑ کر گمراہ لوگوں سے ایک طلاق کا فتویٰ لے کر حرام کو حلال بنانے کی سعی کرتے ہیں وہ راہِ راست پر نہیں رہتے بلکہ گمراہی کا راستہ اختیار کرتے ہیں جس کا انجام بہت ہی بُرا ہے نیز سوءِ خاتمہ کا اندیشہ ہے۔

فتاویٰ شامی میں ہے:

حکی أن رجلاً من أصحاب أبی حنیفة خطب الی رجل من أصحاب الحدیث ابنتهٗ فی عهد ابی بکر الجوز جانیؒ فأبٰی الاّ أن یترک مذهبه فیقرأ خلف الامام ویرفع یدیه عند الا نحطاط ونحو ذلک فأجا به فزوّجه. فقال الشیخ بعد ماسئل عن هٰذه و أطرق رأسه. النکاح جائز ولکن أخاف علیه أن یذهب ایمانه وقت النزع لأنه استخف بمذهبه الذی هو حق عنده وترکه لاجل جیفة منتنة. (ص ۸۰، ج ۴)

ایک حنفی المسلک نے اہل حدیث (محدث) کی لڑکی سے پیغام نکاح بھیجا۔ اس نے کہا کہ اگر تو اپنا مذہب چھوڑ دے یعنی امام کے پیچھے قرأت اور رکوع میں جاتے وقت رفع یدین کرے تو پیغام منظور ہے۔ اس حنفی نے یہ شرط منظور کر لی اور نکاح ہو گیا شیخ وقت امام ابوبکر جوز جانیؒ نے یہ سنا تو افسوس کیا اور فرمایا: نکاح تو ہو گیا لیکن مجھے اس شخص کے سوءِ خاتمہ کا اندیشہ ہے کہ اس نے عورت کی خاطر اس مذہب کی توہین کی جس کو وہ آج تک حق سمجھتا تھا محض عورت کی خاطر

اس کے خلاف کیا۔

تیسری حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

(۳) عن ابن عمر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ أنہ اذا سئل عمن طلّق ثلاثاً قال لو طلّقت مرۃً او مرّتین فلک الرجوع فان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم أمرنی بھذا فان طلّقھا ثلاثاً حرمت حتی تنکح زوجاً غیرہ۔ (مجمع الزوائد س ۳۳۹، ج۔ ۴)

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ان سے جب تین طلاقوں کے حکم کے بارے میں سوال کیا جاتا تو فرماتے کہ اگر ایک یا دو طلاق دی ہوتی تو تیرے لئے رجوع ہوسکتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہی حکم دیا ہے لیکن اگر تین طلاق دی ہے تو پھر بیوی حرمت غلیظہ کے ساتھ حرام ہوجائے گی۔ زوج ثانی سے نکاح کر کے تحلیل کے بغیر حلال نہ ہوگی۔

(۴) ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک سوال کے جواب میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قلت یا رسول اللّٰہ لو طلّقتُھا ثلاثاً کان لی أن أراجعھا قال اذاً بانت و کانت معصیۃ۔ (مجمع الزوائد س ۳۳۹، ج۔ ۴)

یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر میں اپنی بیوی کو ایک طلاق کی جگہ پر تین طلاقیں دے دیتا تو کیا مجھے رجوع کرنے کا حق ہوتا۔ آپ نے جواب دیا نہیں بلکہ تمہاری بیوی حرام ہوجاتی اور تم گنہگار ہوتے۔

تشریح: مذکورہ دونوں روایات سے واضح ہوا کہ طلاق ثلاثہ کے بعد طلاق نہ صرف مؤثر ہوتی ہے بلکہ عورت ایسی حرام ہوجاتی ہے کہ نہ رجوع جائز ہوتا ہے نہ ہی حلالۂ شرعی کے بغیر زوج اوّل کے لئے نکاح ثانی حلال ہوتا ہے جس سے شوہر کے لئے طلاق کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔ پھر اس میں طلاق کو بیوی کی رضامندی یا کسی فرد کی توثیق یا تصدیق پر موقوف نہیں رکھا گیا ہے۔ لہٰذا جو لوگ شوہر کی طلاق کو غیر مؤثر سمجھتے ہیں یا اس میں کسی فریق کی توثیق یا تصدیق کو ضروری خیال کرتے ہیں وہ سخت غلطی اور گمراہی میں ہیں۔

عن ابن مسعود رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ أنہ سئل فی اللتی تطلّق ثلاثاً قال لاتحل لہ حتی تنکح زوجاً غیرہ۔ (مجمع الزوائد س ۳۴۴، ج۔ ۴)

ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ان سے ایسی عورت کے بارے میں سوال کیا

گیا جس کو تین طلاق دی گئی ہے آپ نے جواب دیا کہ زوج اوّل کے لئے حلال نہیں ہے جب تک کہ زوج ثانی سے نکاح نہ کرے یعنی حلالہ شرعی نہ ہو۔

واضح رہے کہ ابن عمر اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فقہائے صحابہ میں سے ہیں۔ قرآن وحدیث کی رو سے سب حضرات فرماتے ہیں کہ شوہر نے اگر بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں تو اس سے بیوی حرام ہوجاتی ہے رجوع جائز نہیں ہے اور تحلیل شرعی کے بغیر عقد ثانی بھی درست نہیں ہے کیونکہ زوج کی طلاق مؤثر ہوگئی ہے۔ طلاق مؤثر ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں ہے نہ عورت کی رضامندی اس میں حائل ہوتی ہے نہ ہی کسی حاکم یا عدالت کا اختیار مانع بن سکتا ہے۔

بعینہٖ یہی روایت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی موجود ہے اور آپ بھی فقہائے صحابہ میں سے ہیں۔

(۵) عن عبادة بن الصامت رضی اللّٰہ تعالیٰ عنه قال طلّق جدّی امرأة له الف تطليقة فانطلقتُ الى النبی صلى الله عليه وسلم فسألته قال أمايتقی الله جدّک أماثلاثة فله وأما تسع مئة وسبعة وتسعون فيه عدوان وظلم ان شاء الله عذبه وان شاء غفرله. (مجمع الزوائد ص ۳۴۱، ج ۴)

عبادہ بن الصامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میرے دادا نے اپنی بیوی کو ایک ہزار مرتبہ طلاق دی میں اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارا دادا خدا سے نہیں ڈرتا اس کو تو تین طلاقوں کا حق تھا وہ واقع ہوگئی ہیں باقی نوسوستانوے طلاق دے کر اس نے زیادتی اور ظلم کیا ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو عذاب دے گا اور چاہے گا تو معاف کردے گا۔

حدیث پاک میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کے دادا کی ہزار طلاقوں میں سے تین طلاقوں کو مؤثر قرار دیا ہے باقی نوسوستانوے طلاق کو لغو اور باطل قرار دے کر حکم خداوندی کے ساتھ زیادتی اور ظلم ہونے کا حکم صادر فرمایا ہے اور عذاب الٰہی کی وعید بھی ذکر فرمادی۔

معلوم ہوا کہ شوہر عاقل وبالغ نے اگر طلاق ثلاثہ یا اس سے زائد مرتبہ طلاق دی ہے تو اس سے طلاق ثلاثہ مؤثر ہوجاتی ہیں، بیوی حرام ہوجاتی ہے رجوع جائز نہیں ہوتا۔ اگر طلاق ثلاثہ کے بعد ذرا بھی رجوع کی گنجائش ہوتی تو آپ رجوع کے لئے ضرور فرماتے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طلاق ثلاثہ کو مؤثر قرار دیا ہے اور تحلیل شرعی کے عام قانون سے ہٹ کر گنجائش کی کوئی صورت یا حل نہیں بتایا ہے۔

(٦) عن عصمة قال جاء المالک الی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال ان مولای زوجنی وھو یرید أن یفرق بینی وبین امرأتی قال فصعد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم المنبر قال: یا ایھا الناس اِنما الطلاق لمن أخذ بالساق.

(مجمع الزوائد ص۳۳۷، ج۴، ابن ماجہ ص ۱۰۲)

عصمہؓ سے روایت ہے کہ مالک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا یا رسول اللہ میرے مولیٰ نے میری شادی کرادی اب وہ میرے اور میری بیوی کے درمیان تفریق کردینا چاہتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر منبر پر تشریف لے گئے اور تقریر کرتے ہوئے فرمایا اے لوگو۔ تمہیں معلوم ہو کہ طلاق دینے کا اختیار اس کو ہے جس نے عورت کی پنڈلی پکڑلی یعنی شوہر کو۔

تشریح: حدیث مذکور میں رسول اللہ صل اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مولیٰ نے اگر اپنے غلام کو نکاح کرنے کی اجازت دی ہے اور اس نے نکاح کرلیا ہے تو نکاح کے بعد پھر بیوی کو طلاق دینے کا حق غلام شوہر کو ہوگا۔ مولیٰ کو اپنے غلام کے مالک ہوتے ہوئے طلاق دینے اور زوجین کے درمیان تفریق کرنے کا اختیار نہیں ہوگا۔

قیاساً علیٰ ذالک جب ایک غلام کی بیوی کو طلاق دینے کا اختیار صرف غلام ہی کو ہوتا ہے مولیٰ کو نہیں ہوتا تو ایک آزاد آدمی کی بیوی کو طلاق دینے کا اختیار بطریق اولیٰ شوہر کو ہوگا۔ کسی دوسرے کو نہیں لہٰذا کسی کا باپ بھی اس کے بیٹے کی بیوی کو طلاق نہیں دے سکتا نہ حاکم، یا عدالت کا جج یا پنچایت طلاق دے سکتی ہے طلاق کا کُلّی اختیار شوہر کو ہے۔ دوسرا کوئی اس کے ساتھ طلاق میں شریک نہیں ہے۔

(۷) قال عطاء لا طلاق لمن لا یملک عقدتہ ولا عتق لمن لایملک رقبتہ.

(رواہ البطرانی، مجمع الزوائد ص ۳۳۸، ج۔ ۱)

عطاء بن ابی رباح سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ جو شخص نکاح کا مالک نہیں وہ طلاق کا مالک نہیں اور جو غلام کی گردن کا مالک نہیں وہ آزاد کرنے کا حقدار نہیں ہے۔

نیز حدیث میں صاف تصریح ہے:

قال علیہ الصلاۃ والسلام الطلاق بالرّجال والعدۃ بالنساء.

(نصب الرایہ س ۲۲۵، ج۔ ۳)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا طلاق کا اعتبار مردوں سے ہے اور عدت کا اعتبار عورتوں سے۔

یعنی طلاق میں عورتوں کے شوہر کا اعتبار ہوگا۔اس کی طلاق مؤثر ہوگی کسی دوسرے کی طلاق مؤثر نہ ہوگی اور عدّت کا اعتبار عورتوں سے ہوگا یعنی عورت جس کیفیت اور حالت میں ہوگی۔عدت اسی کیفیت اور حالت کے اعتبار سے ہوگی۔

نیز واضح رہے کہ احادیث کے علاوہ تمام فقہائے کرام نے اس کی تصریح کی ہے کہ طلاق کا حق شوہر کو ہوتا ہے۔اس میں کسی فریق کا عمل دخل مشروع نہیں ہے۔

چنانچہ علامہ فقیہ ابن رشد مالکی ''بدایۃ المجتہد'' میں تحریر فرماتے ہیں۔

(۸) **الاصل أن الطلاق ليس بيدا حدسوى الزوج اومن يُو كلّه الزوج.**

(ص ۱۸۱، ج۔ ۲)

اصل یہی ہے کہ طلاق کا حق سوائے شوہر یا اس کے وکیل کے کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔

یعنی تمام امت مسلمہ کا یہ متفقہ اصول ہے کہ بیوی کو طلاق دینے کا اختیار سوائے شوہر کے کسی اور کے ہاتھ میں نہیں ہے نہ اس میں بیوی کی رضاء وعدم رضاء کا دخل ہے نہ ہی حکومت یا حاکم وقت کا کچھ اختیار ہے۔چیئر مین تو چیئر مین ہے اس کی کیا حیثیت؟

لہٰذا کسی کا یہ کہنا شوہر کے طلاق دینے کے بعد بیوی کی رضامندی کے بغیر طلاق ثلاثہ مؤثر نہیں ہوگی یا یہ تصور کہ حاکم وقت یا عدالت کے جج، یا مقامی چیئر مین کی توثیق وتصدیق کے بغیر طلاق ثلاثہ مؤثر نہ ہوگی غیر اسلامی تصور ونظریہ ہے۔قرآن وسنت سے ان باتوں کا کچھ تعلق نہیں۔

جس عورت کی عدّت ختم ہوگئی سابقہ شوہر سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے

واضح ہو کہ شوہر کے طلاق دینے کے روز سے ۷۰ دن میں جس عورت کو تین مرتبہ ماہواری کے ایام آچکے ہوں (اور یہ ممکن بھی ہے) تو اب شوہر کے ساتھ اس کا ذرہ برابر بھی تعلق نہیں رہا۔نکاح تو طلاق ثلاثہ کے روز سے ختم ہوگیا ہے اور عدّت تک بعض احکامِ نکاح یعنی شوہر پر نان ونفقہ کا واجب ہونا، عدّت کے ایّام میں بلا زیب وزینت رہنا، غیر محرم سے پردہ کرتے ہوئے بلا ضرورت عدّت کے دنوں میں گھر سے باہر نہ جانا، عدّت کے اندر دوسرے نکاح کی بات چیت کا حرام ہونا وغیرہ اثرات باقی تھے جو کہ اختتام عدّت پر ختم ہوگئے۔اب عورت آزاد ہے جہاں چاہے، جس مرد سے چاہے علاوہ زوجِ اوّل کے نکاح کرسکتی ہے۔زوج اوّل کے لئے نہ رجوع جائز ہے نہ بدون تحلیل شرعی کے تجدید نکاح۔

باقی رہا نوے دن (تین مہینہ) تک عدّت کے ایّام تو یہ شرعاً ان عورتوں کے لئے ہے جن کو ماہواری نہیں آتی خواہ نابالغ ہونے کی وجہ سے، یا زیادہ عمر ہونے کی وجہ سے خون آنا بند ہوگیا ہو۔

مثلاً کسی نے اپنی نابالغ منکوحہ (جس کے ساتھ خلوت کی ہے) کو رخصتی کے بعد طلاق ثلاثہ دے دی اور اس کو ابھی حیض شروع نہیں ہوا تو اس نابالغ مطلقہ کی عدت یہ ہے کہ تین ماہ عدت گزارے۔ پھر اس کی شادی دوسری جگہ ہو سکتی ہے اور اگر شوہر نے طلاق رجعی دی ہے تو تین ماہ کے اندر اندر رجوع کر سکتا ہے۔ اگر تین ماہ تک رجوع نہ کیا تو پھر تین ماہ گزرنے کے بعد اس کی عدت ختم ہو جائے گی اور رجوع نہ ہو سکے گا۔

اسی طرح وہ عورت جس کو زیادہ عمر ہو جانے کی وجہ سے حیض آنا بالکل بند ہو گیا ہے اس کے شوہر نے اگر اسے طلاق دے دی تو اس کی عدّت تین ماہ گزرنے تک ہے لہٰذا شوہر نے اگر طلاق رجعی دی ہے تو تین ماہ کے اندر اندر رجوع کرنا جائز ہے۔ شوہر رجوع کر کے مطلقہ رجعیہ کو رکھ سکتا ہے۔ آئندہ اس کو بقیہ طلاق کا حق رہتا ہے لیکن شوہر نے اگر طلاق ثلاثہ دے دی ہے تو رجوع کا حق ختم ہو جاتا ہے اور بلا تحلیل شرعی عورت سے تجدید نکاح بھی نہیں ہو سکتا۔

غرض یہ کہ تین ماہ کی عدّت صرف ان عورتوں کیلئے ہے جن کو بسبب کم عمری کے یا بسبب زیادت عمر کے حیض نہ آتا ہو۔ چنانچہ قرآن حکیم کے اندر حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ. (سورہ طلاق آیت ۴)

تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے ناامید ہو گئی ہیں اگر تمہیں ان کی عدت کے بارے میں شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہیں۔ اسی طرح جن عورتوں کو بوجہ کم عمری کے حیض نہیں آتا ان کی عدّت بھی تین مہینے ہیں۔

آیت مذکورہ اپنے معنی و مفہوم کے لحاظ سے بالکل واضح ہے کہ جن عورتوں کو حیض آنا بند ہو گیا ہے یا کم عمری کی بناء پر جن کو ابھی حیض آنا شروع نہیں ہوا ان کی عدّت تین مہینے ہیں۔ یعنی طلاق یا خلع کے بعد تین مہینے تک یہ عورتیں عدت میں رہیں گی۔ تین مہینے کے بعد ان کی عدّت ختم ہو جائے گی۔ اس سے ایک دن کم میں بھی عدّت ختم نہ ہوگی اور ایک دن اضافہ بھی نہ ہوگا۔

لیکن جن عورتوں کو ماہواری کا خون آتا ہے ان کی عدّت تین مہینے یا نوے دن قطعاً نہیں بلکہ تین مرتبہ ماہواری کا خون آجانے تک ہے۔

حیض والی مطلقہ عورتوں کی عدّت جن کو حمل نہیں ہے نوے دن نہیں ہے بلکہ تین مرتبہ ماہواری کے ایام آنے تک ہے۔

چنانچہ حق جل مجدہٗ قرآن حکیم کے اندر ارشاد فرماتے ہیں:

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوْءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْ أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ. (بقرہ. ۲۲۸)

اور طلاق والی عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو تین حیض تک اور ان کو حلال نہیں ہے کہ چھپا رکھیں جو پیدا کیا اللہ نے ان کے پیٹ میں اگر وہ ایمان رکھتی ہیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر۔

تشریح: جن عورتوں کو ان کے مردوں نے طلاق دے دی ہے اگر وہ حاملہ نہیں ہیں تو وہ اپنے آپ کو تین حیض (تین مرتبہ ماہواری کے ایام آنے) تک گھر میں روکے رکھیں نہ بلا ضرورت گھر سے باہر جائیں۔ نہ ہی بے پردگی اور زیب و زینت کا مظاہرہ کریں اگر ان کے پیٹ میں حمل یعنی بچہ، بچی کی علامت موجود ہے تو اس کو چھپا رکھنا جائز نہیں ہے کیونکہ حاملہ عورتوں کی عدّت وضع حمل یعنی بچہ پیدا ہونے تک ہے لہٰذا غیر حاملہ اور حاملہ عورت کی مدّت میں فرق ہے۔

☆ کیونکہ اگر عورت حاملہ ہے اور شوہر نے طلاق رجعی دی ہے تو اس کے لئے وضع حمل تک رجوع کرنے کا حق ہوتا ہے۔ اور اگر شوہر رجوع نہیں کرتا تو وضع حمل کے بعد اس عورت کی عدّت ختم ہو جائے گی۔ پھر شوہر کو رجوع کا حق نہ ہوگا۔ البتہ دوسری جگہ نکاح کر سکے گی۔ البتہ یہ بھی جائز ہوگا کہ شوہر سے تجدید نکاح کے ساتھ دوبارہ ازدواجی تعلق قائم کرے جس کے بعد شوہر کو مابقیہ طلاقوں کا حق رہے گا اور اس سے قبل دی ہوئی طلاق برقرار رہے گی۔

☆ اگر حاملہ عورت کو شوہر نے تین طلاقیں دے دی ہیں تو اس صورت میں رجوع نہ ہوگا اور بدون حلالہ شرعی شوہر کے لئے تجدید نکاح کی اجازت بھی نہ ہوگی بلکہ عدّت (وضع حمل) کے بعد جب تک زوج ثانی سے باقاعدہ تحلیل شرعی نہ ہوگی زوج اوّل کے لئے عورت حلال نہ ہوگی۔

☆ اور حیض والی عورت جو حاملہ نہیں ہے اس کو شوہر نے اگر طلاق دی ہے تو اس کی عدّت طلاق کے روز سے شروع ہوگی۔ اور تین مرتبہ ماہواری آنے تک ہوگی۔

☆ پھر شوہر نے اگر طلاق رجعی ایک یا دو طلاق دی ہیں تو عدّت گزرنے سے قبل شوہر رجوع کرنا چاہے تو رجوع کر سکے گا۔

☆ عدّت (تین مرتبہ حیض آجانے) کے بعد رجوع کرنا چاہے تو رجوع جائز نہ ہوگا۔

☆ البتہ طلاق رجعی دینے کی صورت میں بعد عدّت بیوی اگر راضی ہو جائے تو تجدید نکاح کے ساتھ بیوی کو رکھ سکے گا۔ لیکن شوہر نے اگر حیض آنے والی عورت غیر حاملہ کو طلاق ثلاثہ دی ہے تو اس کی

عدّت تین مرتبہ ماہواری کے ایام آنے تک ہے۔ خواہ ماہواری دو ماہ میں آجائے یا تین مہینہ میں یا اس سے کم وبیش مدّت میں غرض حسب عادت جتنے دنوں میں تین مرتبہ حیض آتا ہوا تنے دن اس کی عدّت ہے۔ جیسا کہ آیت مذکورہ میں اس کا حکم بیان کیا گیا ہے اور حدیث شریف میں ہے کہ کم از کم ایام حیض تین دن ہوتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ دس روز تک ہوتے ہیں جس عورت کی جیسی عادت ہو اسی کا اعتبار ہوگا اور پاکی کا زمانہ کم از کم پندرہ دن ہوتا ہے زیادہ کی کوئی حد نہیں ہے۔

لہٰذا جس عورت کو ہر ماہ تین روز حیض آتا ہے اور بیس دن اس کے پاکی کے ایام ہوتے ہیں پھر حیض آتا ہے تو اس عورت کو شوہر نے اگر پاکی کے زمانہ میں حیض شروع ہونے سے تین روز قبل مثلاً طلاق دی اور تین روز گزرنے کے بعد اس کو ایام حیض شروع ہوگئے۔ پھر تین روز تک حیض رہا۔ پھر بیس روز تک پاک رہی پھر تین دن حیض آیا پھر بیس دن پاک رہی۔ پھر تین دن حیض آیا تو اس تیسرے حیض کے بعد اس کی عدّت ختم ہوجائے گی جبکہ اس میں تین ماہ کی مدّت نہیں لگی بلکہ تقریباً ۵۳ (ترپن) دن میں عدّت ختم ہوگی۔

دوسری مثال اگر عورت کی عادت مثلاً ہر ماہ پانچ دن حیض آنے کی ہے اور ہر ماہ دو حیض کے درمیان ۲۰ روز کا فاصلہ رہتا ہے تو اس کو شوہر نے اگر پاکی کا زمانہ ختم ہونے پر حیض کے ایک روز قبل طلاق دی ہے تو پانچ روز میں ایک حیض گزرے گا۔ پھر بیس روز پاکی کے ایام ہوں گے۔ پھر پانچ روز حیض کے ایام پھر بیس روز پاکی کے ایام پھر پانچ روز حیض کے ایام ہوں گے۔ اس طرح کل ۵۶ روز میں عورت کی عدت ختم ہوجائے گی اس کے بعد (طلاق ثلاثہ میں) ۵۶ روز عدّت گزرنے کے بعد مطلقہ عورت دوسرے شخص سے نکاح کرسکے گی۔

استفتاء میں جس عورت کے بارے میں سوال ہے کہ ۷۰ (ستر) روز میں اس کی عدّت گزرگئی ہے اور اتنے میں تین مرتبہ ماہواری کے ایام آجانا ممکن بھی ہے اسی اعتبار سے اس کی عدّت ختم ہوگئی ہے عورت دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے چونکہ شوہر نے طلاق ثلاثہ مغلظہ دی ہے اس لئے اس کے لئے نہ رجوع کا حق ہوگا نہ ہی بدون حلالہ شرعی تجدید نکاح کی اجازت ہے۔

غرض یہ کہ جس عورت کو حیض آتا ہے اور وہ حاملہ نہیں اس کی عدّت ایام ماہواری کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ نہ کہ گنتی کے ایام نوے دن یا تین مہینے کے اعتبار سے اِس سلسلہ میں حکومت وقت کا قانون قرآن و سنت کے خلاف ہے اس پر عمل کرنا ناجائز ہے اس پر یقین کرنا کفر اور گمراہی ہے۔

مرد اور عورت یا چیئرمین صاحب کی جانب سے مصالحت کی کوشش غیر شرعی ہے۔ یہ لوگ "من یشفع شفاعة سیئة فله وزرها" (یعنی جس نے کسی کی ناجائز سفارش یا اس کی سعی کی تو گویا اس نے

گناہ کا کام کیا ہے اس میں سے اسے گناہ ملے گا) کے مصداق ہیں۔

اس لئے شوہر کو چاہیئے کہ ان لوگوں کا غیر شرعی دباؤ نہ قبول کرے بیوی کو کسی حال میں جگہ نہ دے۔ متعلقہ شریعت کورٹ سے اگر مدد لے کر مسئلہ کو حل کر سکتے ہیں تو بہتر ہے اس کے لئے کوشش کریں۔

(نوٹ): بندہ ان تمام متعلقہ بااختیار اور ذمہ دار افراد، اور عہدیداروں سے بھی گزارش کرتا ہے کہ وہ خدا کے واسطے اس غیر شرعی اقدام سے باز آجائیں۔ اللہ تعالیٰ کے پاس قیامت کے روز جوابدہی کے وقت کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے باطل ارادے سے باز رہیں۔ حرام کو حلال بنانے کی سعی نہ کریں خواہ حکومت کا قانون کچھ بھی ہو۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو ناراض نہ کریں۔ ایمان کو چھوڑ کر بے ایمانی اور کفر کا سودا نہ کریں۔

ہماری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت دے، ایمان دے، بے ایمانی اور گمراہی سے ہمیں اور سب مسلمانوں کو محفوظ رکھے۔ آمین۔

وصلی اللّٰہ علی النّبی الکریم واٰلہٖ واصحابہ اجمعین
الٰی یوم الدّین

اسلام کا قانون شہادت اور خواتین کا مقام

مصنف: حضرت مفتی محمد عبدالسّلام صاحب مدظلہٗ

بعض مغرب زدہ عناصر اور مغربی تعلیم سے متاثر افراد نے اسلام کے قانون شہادت میں خواتین کے مقام کے بارے میں بے جا اعتراضات کئے ہیں اور بعض نے تو اس مقام کا انکار یا غلط تاویلات، یا بے محل تمثیلات پیش کرنیکی کوشش کی ہے۔

حضرت مفتی محمد عبدالسلام صاحب مدظلہٗ نے اس کتاب میں اسلام کے قانون شہادت میں خواتین کے مقام کے بارے میں سیر حاصل بحث کی ہے اور معترضین کے مسکت جوابات دیئے ہیں۔ یہ تحریر ۱۴۰۳ھ میں روزنامہ جنگ اور روزنامہ جسارت میں قسط وار شائع ہوکر لوگوں کے لئے ہدایت کا ذریعہ بنی۔ اسکے شائع ہونے کے بعد اکثر جدید تعلیم یافتہ طبقہ نے مفتی صاحب کو مبارک باد دی اور اس بات کا اقرار کیا ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے موضوع کا حق ادا کردیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ کتاب اپنے موضوع پر ایک منفرد اور بینظیر کتاب ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ اسلامی کتب خانہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی نمبر ۵ پاکستان

مجلس واحدہ میں تین طلاقیں

☆ اس مضمون میں مجلس واحدہ میں تین طلاقوں کی شرعی حیثیت کو قرآن وسنّت سے بیان کیا گیا ہے۔
☆ مجلس واحدہ میں تین طلاقوں کی شرعی حیثیت کو جمہور صحابہؓ اور ائمہ اربعہ کے فقہ کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔
☆ اس میں لامذہبی گروہ اور غیر مقلدین کے ان تمام اعتراضات وشبہات جو حدیث یا تاریخی روایات سے پیش کرتے ہیں کے جوابات دیئے گئے ہیں۔
☆ اور یہ کہ مجلس واحدہ میں تین طلاقیں ایک ہونے کا نظریہ شیعہ اور غیر مقلدوں کا ہے اہل سنت و الجماعت چاروں ائمہ میں سے کسی کا مذہب نہیں

مجلس واحدہ میں تین طلاقیں

فہرست:

۱: بیک وقت تین طلاقیں حدیث کی روشنی میں
۲: بیک وقت تین طلاقیں کتبِ حدیث وفقہ کی روشنی میں
۳: غیر مقلدین کا ایک شبہ اور اس کا جواب
۴: غیر مقلدین کا دوسرا شبہ اور اس کا جواب
۵: غیر مقلدین کا تیسرا شبہ اور اس کا جواب
۶: غیر مقلدین کا چوتھا شبہ اور اس کا جواب
۷: محمود بن لبید کی روایت کی تحقیق
۸: مجلس واحدہ میں تین طلاقیں اور حضرت عمرؓ کا فیصلہ
۹: تین طلاقیں بیک وقت اور صحابہؓ کا اجماع
۱۰: حضرت عمرؓ کی ندامت کا قصہ اور اس کا جواب
۱۱: فتح القدیر کی عبارت پر شبہ
۱۲: ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ کا فتویٰ
۱۳: غیر مقلدین کا بعض صحابہ کرامؓ پر افتراء
۱۴: عبداللہ بن عمرؓ کا فتویٰ
۱۵: عطاء بن ابی رباحؒ اور طاؤسؒ کا فتویٰ
۱۶: غیر مقلدین کا حضرت علیؓ پر افتراء
۱۷: زید بن علیؓ اور جملہ اہل بیت کا فتویٰ
۱۸: بعض حنفیہ اور مالکیہ پر افتراء
۱۹: عمدۃ الرعایۃ کی عبارت کا حل
۲۰: غیر مقلدین کا احناف پر حلالہ کا الزام
۲۱: خلاصۂ بحث

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مجلس واحدہ میں ایک بارگی تین طلاقوں کے بارے میں اہم استفتاء اور اس کا جواب

استفتاء

بخدمت جناب مفتی صاحب دارالافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی نمبر ۵۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ.

امّا بعد:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہمارے غیر مقلدین مجلس واحدہ میں تین طلاقوں کو ایک قرار دیتے ہیں دلیل میں عبداللہ ابن عباس کی حدیث پیش کرتے ہیں اس کے علاوہ بعض دوسرے صحابہ کرام کی طرف سے تین طلاقیں ایک شمار کرنے کی نسبت کرتے ہیں۔

اور ابن القیم، اور ابن تیمیہ کے فیصلے کو حرف آخر مانتے ہیں۔ اہل سنت والجماعت کے علمائے کرام اور مفتیان کرام کے فتاویٰ کو رد کر دیتے ہیں، بعض سادہ لوح مسلمان یا مفاد پرست ان کے حربے میں آجاتے ہیں۔

پھر مطلقہ ثلاثہ کو رکھ لیتے ہیں اور حرام کاری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس مسئلہ کو بھی دوسرے اختلافی مسئلے کی طرح سمجھتے ہیں لہٰذا براہ کرم ایک مفصل اور مدلّل فتویٰ تحریر فرما کر دیں گے۔ شاید اس سے بہت سے لوگ گمراہی سے بچ جائیں گے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بے علم غیر مقلدین اپنی رائے کو قرآن وحدیث کے مقابلے میں چھوڑ دیں۔ اور ہماری عدالتوں کے فیصلے کے لئے ایک بہترین حل نکل آئے۔

ہماری توقع ہے کہ آپ اس پر خاص توجہ دیں گے۔ فقط والسلام

آپ کا خادم۔ عبدالطاہر

ملیر سٹی کراچی، ۱۵؍ شوال ۱۳۹۷ھ

الجواب باسمہ تعالیٰ

بعد حمد وصلوٰۃ، واضح رہے کہ تین طلاقیں ایک مجلس میں دینے سے تین ہی طلاقیں واقع ہونے کا مسئلہ عہد صحابہ کرام سے لیکر تابعین آئمہ سے مجتہدین تک اتفاقی رہا ہے۔

خصوصاً ائمہ اربعہ کے مذاہب حقہ کے علاوہ امام اوزاعی، امام سفیان ثوری، امام لیث بن سعد وغیرہم کے نزدیک بھی تین طلاقیں ایک مجلس میں تین ہی شمار ہوتی ہیں۔

سوائے شیعہ امامیہ کے تمام متقدمین ومتأخرین فقہاء ومحدثین کے نزدیک تین طلاقیں بیک وقت تین ہی شمار ہونے پر اتفاق ہے۔

لیکن سوئے اتفاق سے ان شیعوں کے ساتھ بعض غیر مقلدین (جو کہ صحابہ کرام کی تجہیل اور ان کو بدعت کی طرف منسوب کرنے سے نہیں ڈرتے) بھی شامل ہوگئے ہیں۔

سب سے افسوس کی بات یہ ہے کہ ان غیر مقلدین کو پورے ذخیرۂ حدیث میں سوائے حدیث ابن عباس کے اور کوئی حدیث نہیں ملی، اور پورے ذخیرۂ تفاسیر میں تفسیر کبیر کی عبارت کے علاوہ کوئی عبارت ہاتھ نہیں آئی جسے وہ قطع وبرید کر کے پیش کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ پورے ذخیرۂ حدیث سے آنکھیں بند کر کے ایک حدیث مضطرب کو لیکر پوری امت کو گمراہی کی طرف دھکیلنے پر تلے ہوئے ہیں۔

ان سطور ذیل کے دلائل کے ذریعہ ہم قارئین کرام کے سامنے حقائق کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔

(تین طلاقیں مجلس واحدہ میں تین ہوتی ہیں حدیث کی روشنی میں)

(۱) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اصح الکتب بعد کتاب اللہ میں حدیث عویمر عجلانی نقل کی ہے جس میں انہوں نے حدیث مذکور سے تین طلاقیں بیک وقت شمار ہونے کو ثابت کیا ہے۔ حدیث کی عبارت یہ ہے۔

فطلقها ثلاثا قبل أن يأمره رسول الله صلى الله عليه وسلم. (ص ۷۹۱، ج ۲)

ترجمہ: صحابی مذکورہ یعنی عویمر عجلانی نے قبل اس کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو کچھ حکم دیتے ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے ڈالیں۔

امام بخاری نے اپنے موقف کی تائید میں عویمر عجلانی کا قصہ نقل کیا ہے ان کا واقعہ یہ تھا کہ انہوں نے اپنی بیوی کو غیر آدمی کے ساتھ ناجائز حرکت میں مصروف دیکھا ان کے پاس کوئی شرعی گواہ نہ تھا اپنی

آنکھوں سے بیوی کو فعل زنا میں مصروف دیکھ کر غصّہ کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ جو شخص اپنی بیوی کو اپنی آنکھوں سے غیر مرد کے ساتھ فعل زنا میں مصروف دیکھے تو اس کو قتل کر دے یا کیا کرے، آپؐ نے فرمایا تم اپنی بیوی کو لے کر آؤ کتاب اللہ میں تمہارا فیصلہ موجود ہے اسکے مطابق فیصلہ کرتے ہیں۔ وہ بیوی کو لیکر آیا آپؐ نے لعان کرنے کیلئے فرمایا۔ شوہر عویمر عجلانی نے شرعی طریقہ سے لعان اور قسم کھا کر جو کچھ دیکھا بیان کیا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا پھر عورت نے بھی قسم اور لعان کے ساتھ اپنا بیان (جس مین اس نے زنا سے انکار کیا ہے) دیا۔ اس پر عویمر کو غصّہ آیا اس نے قبل اس کے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لعان کا حکم تفریق کا فیصلہ فرماتے۔ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر کہا کہ یا رسول اللہ اگر میں اس کو رکھوں تو میں جھوٹا ہوں یہ کہکر اس نے مجلس میں تین طلاقیں دیدیں۔ آپؐ نے اسے کچھ نہیں کہا۔ تین طلاقیں نافذ ہونے دیں۔

(بخاری ص ۷۹۱، ج۔ ۲)

امام ہمام (بخاری) نے اہلِ علم کی رائے کو حدیث کے تحت نقل فرما کر اس بات پر استدلال کیا ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں دینے سے تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں پھر اس میں آپ نے کسی صحابی یا کسی اہل علم کا اختلاف نقل نہیں فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ جملہ اہل علم کے نزدیک اتفاقی ہے۔

(۲) اس کے بعد امام بخاری حدیث مذکور کے شواہد پیش کرتے ہیں

قال فی الطلاق الثلاث لاتحل لہٗ حتیٰ تنکح زوجا غیرہ وقال اللیث عن نافع کان ابن عمر اذا سئل عمن طلّق ثلاثا قال لو طلقت مرّۃ او مرتین (لکان الرجعۃ) فان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم امرنی بھذا فان طلقتھا ثلاثا حرمت علیک حتی تنکح زوجا غیرہ. (بخاری ص ۷۹۲، ج۔ ۲ کذافی مسلم ص ۴۷۶، ج۔ ۱)

ترجمہ: طلاق ثلاث کے بارے میں فرمایا کہ جب تک زوج ثانی سے نکاح نہ ہو جائے اس وقت تک عورت شوہر پر حلال نہ ہو گی چنانچہ لیث نے نافع سے اور نافع نے ابن عمر سے روایت کی ہے کہ ابن عمر سے بیک وقت تین طلاقیں دینے والوں کی جانب سے سوال کیا جاتا تو آپ فرماتے اگر تو تین طلاقوں کی جگہ پر اپنی بیوی کو ایک یا دو مرتبہ طلاق دیتا (تو تجھے رجوع کا حق حاصل ہوتا) کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایسا ہی حکم دیا ہے اور اگر تو نے تین طلاقیں دیدیں تو بیوی (تمہارے اوپر) حرام ہو جائیگی اور اس وقت تک حلال نہ ہو گی کہ دوسرے آدمی سے نکاح ہو کر حلالہ ہو جائے۔

بخاری کی یہ حدیث اور اہل علم کی تائید پھر حدیث ابن عمر کو شواہد میں پیش کرنے کے بعد مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ تین طلاقیں بیک وقت دینے سے تمام اہل علم کے نزدیک تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

(۳) دوسری حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ

عن عائشه رضی الله عنها ان رّجلاً طلّق امرأته ثلاثا فتزوجت فطلق فسئل النبی صلی الله علیه وسلم أتحلّ للأوّل قال لاحتّی یذوق عسیلتها کما ذاق الاول (بخاری ص ۷۹۱، ج ۲ نسائی ص ۱۰۰)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو ایکبارگی تین طلاقیں دیدی تھیں پھر اس عورت مطلقہ ثلاثہ نے دوسری جگہ نکاح کر لیا نکاح کے بعد اس کو دوسرے خاوند نے طلاق دیدی قبل اس کہ اس سے مجامعت کرے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ معلوم کیا گیا کہ یہ عورت زوج اوّل کے لئے حلال ہوگی یا نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حلال نہیں ہے یہاں تک کہ دوسرے شخص سے دخول (یعنی ہمبستری) نہ ہو جائے۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ طلاق ثلاثہ ایک بارگی دینے کے بعد بھی اس طرح حرمت غلیظہ آجاتی ہے جس طرح متفرق طور پر دینے سے حرمت آتی ہے۔ پھر حدیث میں خاص طور پر اس بات کی وضاحت کردی گئی کہ مطلّقہ ثلاثہ زوج اول کے لئے اس وقت تک حلال نہ ہوگی جب تک زوج ثانی اس سے نکاح کرنے کے بعد مجامعت نہ کرے پھر طلاق نہ دیدے جس سے معلوم ہوا کہ زوج ثانی کا صرف نکاح کرنا بھی موجب حلت نہیں بلکہ نکاح کے بعد صحبت بھی لازم وضروری ہے۔

حدیث کی وضاحت سے یہ شبہ دور ہو گیا کہ دوسرا شوہر اور مطلقہ ثلاثہ دونوں برضاء ورغبت اگر مجامعت نہ کریں یا ان کی غیرت وحمیت اس کی اجازت نہ دے پھر زوج ثانی طلاق دیدے تو عورت زوج اول کیلئے حلال ہوگی یا نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح الفاظ میں فرمادیا کہ ہر حالت میں زوج ثانی کی مجامعت ضروری ہے اس کے بغیر عورت زوج اوّل کے لئے حلال نہ ہوگی۔

(۴) بخاری میں رفاعۃ القرظی کی بیوی کو تین طلاق دینے کا ذکر ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ مطلقہ ثلاثہ نے دوسرے شخص سے نکاح کر لیا لیکن مجامعت سے قبل دوسرے شوہر نے بھی طلاق دیدی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ مطلقہ ثلاثہ دوسرے شخص کے طلاق دینے کے بعد زوج اوّل کے لئے حلال ہے یا نہیں آپ ؐ نے فرمایا کہ نہیں، جب تک دوسرے شوہر سے دخول اور مجامعت نہ

ہوجائے اس وقت تک مطلقہ ثلاثہ زوج اوّل کے لئے حلال نہیں ہوتی۔

متن حدیث بخاری ص ۷۹۱-۷۹۲، ج ۲ نسائی شریف ص ۱۰۰-۱۰۱ میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

(۵) عن محمود بن لبيد قال اخبر رسول الله صلى الله عليه وسلّم عن رجل طلّق امراته ثلاث تطليقات جميعا فقام غضبانا ثم قال ايلعب بكتاب الله وانا بين اظهركم حتّى قام رجل وقال يا رسول الله الا أقتله . رواه النّسائى ص ۹۹، ج. ۲ قال فى الجوهر النقى بسند صحيح ص ۱۱۳، ج. ۲ وفى النيل قال ابن كثير اسناده جيّد ص ۲۲۷، ج. ۶

ترجمہ: محمود بن لبید سے روایت ہے کہ ایک آدمی اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا جب آپ کو اس کے متعلق بتایا گیا کہ اس نے مجلس واحد میں تین طلاقیں دی ہیں تو آپ ناراض ہوکر کھڑے ہوگئے پھر فرمایا تم لوگ کتاب اللہ سے مذاق کرتے ہو جبکہ میں تمہارے پاس موجود ہوں۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ آپ اجازت دیں تو میں اس شخص کو قتل کردوں۔ جوہر نقی میں ہے کہ حدیث سند صحیح کے ساتھ مروی ہے۔ اسی طرح نیل الاوطار میں بھی ابن کثیر سے اس کی تصحیح منقول ہے۔

روایت مذکور میں آپ تین طلاقیں بیک وقت دینے پر ناراض تو ہوئے کہ اس نے طلاق جیسی ایک بری چیز میں حد سے زیادتی کی ایک طلاق یا دو طلاق دے سکتا تھا اس نے بلاضرورت تین طلاقیں دیدی ہیں جس کی وجہ سے اس نے قرآنی ہدایت (کہ زیادہ سے زیادہ دو طلاقیں دینی چاہئیں) کی مخالفت کی۔

لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طلاقوں کو جائز اور نافذ کردیا ہے۔

(۶) مالک انّهٗ بلغه ان رجلا قال لابن عباس انى طلّقت امراتى مائة تطليقة فما ذاترىٰ علىٰ فقال له ابن عباس طلّقت منک بثلاث وسبع وتسعون اتخذت بها آيات الله هزوا (مؤطا امام مالک ص ۵۱۰)

امام مالک سے روایت ہے کہ ایک شخص نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس آکر پوچھا کہ میں نے اپنی بیوی کو ۱۰۰ سو طلاقیں دے دی ہیں اب میرے لئے کیا حکم ہے آپ نے جواب دیا کہ تمہاری بیوی تین طلاقوں سے مطلقہ ہوگئی ہے باقی ستانوے ۹۷ طلاقوں کے ذریعہ تو نے کتاب اللہ کی آیات کا مذاق کیا ہے۔

حدیث مذکور میں عبداللہ بن عباسؓ نے واضح طور رفرمایا کہ تین طلاقیں مجلس واحدہ میں واقع ہوگئی ہیں۔

(۷) مالک أنه بلغه ان رجلا جاء الیٰ عبداللّٰہ ابن مسعود فقال انّی طلّقت امرأتی بما ئتی تطليقات فقال ابن مسعود فماذا قيل لک قال قيل لی انهاقد بانت منّی (ای: فلا تحلُّ لی الّا بعد الزوج) فقال ابن مسعود صدقوا.

(ص ۵۱۱.۵۱۰)

ترجمہ: امام مالک سے روایت ہے کہ مجھے یہ حدیث پہونچی ہے کہ ایک آدمی عبداللہ بن مسعود کے پاس آیا اور پوچھا کہ میں نے اپنی بیوی کو دوسو طلاق کے ساتھ طلاق دی ہے (اس کا حکم شرعی بیان فرمائیے) آپؐ نے پوچھا کہ دوسرے علما نے کیا جواب دیا ہے اس نے کہا مجھے کہا گیا کہ بیوی جدا ہوگئی اور حرام ہوگئی اور زوج ثانی سے نکاح کئے بغیر حلال نہ ہوگی اس پر عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا ان علماء نے جواب صحیح دیا ہے۔

واضح رہے کہ مؤطا مالک کی ان دونوں روایتوں میں فقہاء صحابہ میں سے دوفقیہ اور مفتی کے فتویٰ کا ذکر ہے کہ انہوں نے تین یا اس سے زائد طلاقوں پر تین طلاقوں کا فتویٰ دیا ہے۔

(۸) عن ابن نمير عن الاعمش عن مالک بن الحارث عن ابن عباس اتاه رجل فقال ان عمی طلق امرأته ثلاثا فقال ان عمک عصیٰ اللّٰہ فاندمه اللّٰہ فلم يجعل لهٗ مخرجا. اخرجه ابن ابی شيبة، وهٰذا سند صحيح، الجوهر النّقی.

(ص ۳۳۲، ج. ۷)

ترجمہ: ابن نمیر اعمش سے اور وہ مالک بن الحارث سے اور وہ عبداللہ بن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص ابن عباس کے پاس آیا اور پوچھا کہ میرے چچا نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں اس کا کیا حکم ہے ابن عباس نے جواب دیا کہ تیرے چچا نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو رسوا کیا ہے اب اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے کوئی راستہ نہیں رکھا ہے۔

حدیث کا مضمون واضح ہے۔ ابن عباس نے فرمایا کہ جو شخص تین طلاقیں مجلس واحدہ میں یا ایک ہی لفظ میں دیدیتا ہے وہ کتاب اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کی بیوی پر تین طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں پھر وہ رسوا اور شرمندہ ہوکر رہ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے لئے کوئی راستہ رجوع کا یا تجدید نکاح بدون زوج ثانی کے نہیں رہتا۔

سنن ابوداؤد میں ابن عباس کی روایت ہے کہ

(۹) عن مجاهد قال كنت عند ابن عباس فجاءه رجل فقال انه طلّق امرأته ثلاثا قال فسكت حتىٰ ظننت انّهٗ رادها اليه ثم قال ينطلق احدكم فيركب الحموقة ثمّ يقول يا ابن عباس يا ابن عباس و انّ اللّٰه قال ومن يتق اللّٰه يجعل لهٗ مخرجا قال انك لم تتق اللّٰه فلا اجد لک مخرجا وعصيت ربک وبانت منک امرأتک . (ص ۲۹۹، ج. ا رواه الدار قطني ايضا ص ۴۳۰، ج. ۲)

مطلب یہ ہے کہ مجاہد سے روایت ہے کہ ایک دفعہ میں عبداللہ بن عباس کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا ایک آدمی آیا اور کہا یا ابن عباس میں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدی ہیں، ابن عباس نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش ہوگئے ہم سب خاموش بیٹھے تھے۔ مجاہد کہتے ہیں مجھے گمان ہوا کہ شاید ابن عباس اس کی بیوی کو واپس لوٹانے والے ہیں۔ پھر ابن عباس نے فرمایا تم میں سے بعض لوگ ایسے ہیں کہ ان پر حماقت سوار ہوتی ہے۔ پھر میرے پاس آتا ہے اور کہتا ہے یا ابن عباس یا ابن عباس، جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ومن یتق اللّٰه یجعل لهٗ مخرجا الآیة جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے وہ اس کے لئے راستہ نکالتا ہے اور تو اللہ سے ڈرا ہی نہیں اور بیک وقت تین طلاقیں دیدی ہیں اس لئے قرآن کے مطابق تمہارے لئے میں کوئی راستہ نہیں پاتا تو نے خدا کی نافرمانی کی ہے اور تمہاری بیوی تم پر حرام ہوگئی اور تم سے جدا ہوگئی۔

(۱۰) عن يونس بن يزيد فقال سئلت ابن شهاب عن رجل جعل أمرا مرأته بيدا بيه قبل ان يدخل بها فقال ابوه هي طالق ثلاثا كيف السنة في ذالک فقال اخبرني محمد بن عبدالرحمن بن ثوبان مولىٰ بني عامر بن لوئ ان محمّد بن اياس بن بكير الليثي وكان ابوه شهد بدراً اخبره ان أباهريرة قال بانت عنه فلاتحلّ له حتى تنكح زوجا غيره وانه سال ابن عبّاس عن ذٰلک فقال مثل قول ابي هريرة. وسال عبداللّٰه بن عمر و بن العاص، فقال مثل قولهما.

(رواه ابوبكر البرقاني في كتابه المخرج علىٰ الصحيحين، نيل الاوطار ص ۲۲۹، ج. ٦)

ترجمہ: یونس بن یزید سے روایت ہے انہوں نے کہا محمد بن شہاب سے میں نے اس شخص کے بارے میں سوال کیا جس نے رخصتی سے قبل بیوی کو طلاق دینے کا اختیار باپ کو دیا تھا اور باپ نے کہا اس کو تین طلاق ہیں اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کیا ہے؟ انہوں نے

جواب میں کہا کہ مجھے محمد بن عبدالرحمٰن بن ثوبان مولیٰ عامر بن لوئ نے حدیث بیان کی ہے کہ محمد بن ایاس بن بکیر اللیثی جن کے والد غزوۂ بدر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک تھے ان سے حدیث روایت کی ہے کہ اس سلسلہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت منقول ہے کہ عورت پر تین طلاقیں واقع ہوگئی ہیں۔ عورت شوہر پر حرام ہوگئی ہے زوج ثانی سے نکاح کے بغیر عورت زوج اوّل کے لئے حلال نہیں ہے پھر انہوں نے ابن عباس سے بھی اس بارے میں سوال کیا۔

عبداللہ بن عباس کا جواب بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے موافق تھا۔ پھر عبداللہ بن عمرو بن العاص سے سوال کیا انہوں نے حضرت ابو ہریرہ اور ابن عباس جیسے جوابات دیئے۔

ابو بکر البرقانی نے اپنی کتاب المخرج علی الصحیحین میں اس طرح روایت کی ہے۔

(بحوالۂ نیل الاوطار)

حدیث مذکور مفہوم ومعنی کے لحاظ سے بالکل واضح ہے اس میں کسی تاویل کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش ہے بلکہ حدیث سے مجلس واحدہ میں تین طلاقیں تین واقع ہونے کے علم ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ طلاق کا اختیار دوسرے کو بھی دیا جاسکتا ہے اور جس کو طلاق کا اختیار دیا گیا ہے اس کے طلاق دینے سے طلاق واقع ہوجاتی ہے۔

نیز یہ کہ قبل الدخول کلمۂ واحدہ سے تین طلاقیں دینے سے تین ہی واقع ہوتی ہیں۔ یہ دس احادیث صحاح، میں نے بطور نمونہ نقل کردی ہیں ورنہ بیسیوں احادیث اس پر موجود ہیں۔ سمجھنے والے کے لئے مسئلہ کی نوعیت اور حقیقت سمجھنے کے واسطے اتنی دلیلیں کافی ہوتی ہیں۔

اب محدثین اور فقہائے کرام کی چند نقول ملاحظہ فرمائیں۔

محدّثین اور فقہائے امّت کی رائے

(۱) امام بخاری نے فرمایا کہ

قال اهل العلم اذا طلق ثلاثا فقد حرمت علیه (ص ۷۹۲، ج ۲)

ترجمہ: اہل علم نے فرمایا کہ اگر تین طلاقیں ایک بار دی جائیں تو اس سے حرمت غلیظہ آجاتی ہے بیوی حرام ہوجاتی ہے۔

(۲) حافظ ابنِ حجر عسقلانی الشافعی فتح الباری شرح بخاری میں تحریر فرماتے ہیں۔

فالراجح فی الموضعین تحریم المتعة و ایقاع الثلاث للاجماع الذی انعقد فی عهد عمر علیٰ ذٰلک ولا یحفظ ان احدا فی عهد عمر خالفه فی واحدة منهما وقد دل اجماعهم علیٰ وجودنا سخ وان کان خفی عن بعضهم قبل ذٰلک حتی ظهر لجمیعهم فی عهد عمر فالمخالف بعد هٰذا الاجماع منابذله علیٰ عدم اعتبار من احدث الاختلاف بعد الا تفاق. (ص ۳۱۹، ج. ۹)

ترجمہ: راجح اور صحیح قول یہ ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاقیں تین ہی واقع ہوتی ہیں کیونکہ عہد صحابہ میں اسی پر فقہاء صحابہ کا اجماع ہو چکا ہے اور کسی صحابی سے بھی یہ روایت منقول نہیں ہے کہ کسی نے بھی حضرت عمرؓ کے زمانے کے اجماع سے اختلاف کیا ہو اور تمام صحابہ کرام کا اجماع ہو جانا اور کسی کا اختلاف اس میں نہ پایا جانا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ اب اس اجماع کے خلاف کرنا ایسا ہے جیسا کہ کسی اجماعی واتفاقی مسئلہ میں کسی نے اختلاف پیدا کیا ہو سو ظاہر ہے کہ ایسے اختلاف پیدا کرنے کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا نہ ایسے اختلاف کی کچھ وقعت ہے۔

فتح الباری کی مذکورہ بالا عبارت سے صاف ظاہر ہوا کہ تین طلاقیں ایک مجلس میں تین شمار ہونے میں پوری امت کا اجماع واتفاق ہے اور اس اجماع کے بعد کسی کو اختلاف پیدا کرنے کا حق ہی نہیں رہتا ہے۔

صاحب فتح الباری اگرچہ پکّے شافعی ہیں لیکن اس مسئلہ میں انہوں نے نہ صرف پوری امت کی ترجمانی کی ہے بلکہ تمام محدثین اور فقہاء کرام کے مذہب کو بیان کیا ہے۔

(۳) طلاق ثلاثہ پر بحث کے تحت شارح مسلم امام نودی نے حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے۔

قد اختلف العلماء فیمن قال لامراته انت طالق ثلاثا فقال الشافعی ومالک وابو حنیفة و احمد بن حنبل، و جماهیر العلمآء من السّلف والخلف انه یقع الثلاث. (ص ۴۷۸، ج ۱)

ترجمہ: اس مسئلہ میں (کہ اگر کسی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہیں) اس میں علماء کا اختلاف ہے امام شافعیؒ امام مالکؒ امام ابوحنیفہؒ امام احمد بن حنبلؒ اور جملہ سلف وخلف اور جمہور علماء نے کہا کہ اس سے تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی اور یہی حق اور صحیح ہے۔

(۴) ابن حزم اپنی تصنیف المحلی میں لکھتے ہیں۔

وجدنا حجّة من قال ان الطلاق الثلاث مجموعة سنة لا بدعة قول الله تعالیٰ

فان طلقها فلاتحل له من بعد حتّى تنكح زوجاً غيره فهذا يقع علىٰ الثلاث مجموعة و مفرقة ولايجوز ان يخصّ بهذه الاية بعض ذالك دون بعض بغير نصّ. (ص ۱۷۰، ج. ۱)

ابن حزم فرماتے ہیں کہ جو بیک وقت تین طلاقوں کو سنت سمجھتے ہیں نہ کہ بدعت، ان کے دلائل میں ایک دلیل قرآن کی آیت فان طلقها الخ۔ ہے اور یہ آیت تین طلاقیں بیک وقت مجلس واحدہ میں اور متفرق مجلسوں میں دونوں کو شامل ہے لہٰذا اس کی مشمولات میں سے کسی کو بلانص شرعی خاص کر لینا جائز نہیں ہے۔

ابن حزم ظاہری کا استدلال بالکل واضح ہے کسی تشریح کا محتاج نہیں ہے کہ آیت قرآنی میں عمومیت ہے خواہ تین طلاقیں مجلس واحدہ میں دی جائیں یا مجلس متعدّدہ میں ایک کلمہ کے ذریعہ طلاق دی جائے یا کئی کلمے کے ذریعہ، ہر صورت میں تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی۔

اس واسطے ابن حزم اپنی رائے اور فیصلہ بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

والحق هو ما قال جماهير اهل الاسلام من الصحابة وغيرهم ان الثلاث واقعة مجتمعة ومتفرقة فى المدخول بها وفى غير المدخول بها تقع مجتمعة

(اعلاء السنن ص ۱۷۹، ج. ۱۱ المحلى ص ۷۹، ج. ۲)

حق وہ ہے جس کو جمہور صحابہ کرام اور ان کے علاوہ دیگر علمائے کرام نے فرمایا ہے کہ تین طلاقیں ایکبارگی دیں یا متفرق طور پر دیں۔ مدخول بہا عورت پر تینوں واقع ہو جاتی ہیں اور غیر مدخول بہا میں بھی ایک کلمہ میں تین طلاقیں دیدی جائیں تو واقع ہوں گی۔ (حوالہ نمبر ۱۱ میں اس عبارت کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیں)۔

(۵) علامہ بدرالدین عینی عمدۃ القاری شرح بخاری میں رقمطراز ہے۔

قوله تعالىٰ الطلاق مرّتان معناه مرّة بعدمرة فاذا جاز الجمع بين اثنين جاز بين الثلاثة واحسن منه ان يقال ان قوله "اوتسريح باحسان" عام متناول لايقاع الثلاث دفعةً واحدة. (ص ۵۳۸، ج. ۹)

اللہ تعالیٰ کا قول "الطلاق مرّتان" کا معنی یہ ہے کہ ایک مرتبہ طلاق دینے کے بعد دوسری مرتبہ طلاق دی جائے معلوم ہوا کہ دو طلاقوں کا جمع کرنا جائز ہے تو تین طلاقوں کا جمع کرنا بھی جائز ہوگا اور بہتر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قول "اوتسریح باحسان" کو عام کہا جائے جو کہ تین طلاقیں ایکبارگی دینے کو بھی شامل ہے۔

شارح بخاری علامہ بدر الدین عینی نے جو بات کہی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیت سے ایکبارگی دوطلاقیں دینا ثابت ہے جب دوطلاقوں کا جمع کرنا شوہر کے لئے جائز ہے تو تین طلاقوں کو بھی وہ جمع کرسکتا ہے یعنی قرآن کے حکم کے تحت اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو دوطلاقیں دینا چاہتا ہے تو وہ الگ الگ مجلس میں متعدد اوقات میں دوطلاقیں دیدے یا ایک ہی مجلس میں دوطلاقیں دیدے ہر دونوں صورتیں قرآنی حکم میں داخل ہیں۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو تین طلاقیں دینا چاہتا ہے تو بحکم خداوندی ''اوتسریح باحسان'' تین طلاقیں متعدّد مجلس میں بھی دے سکتا ہے اور ایک ہی مجلس میں بھی دے سکتا ہے کیونکہ الطلاق مرّتان سے دوطلاقوں کا جمع کرنا جائز معلوم ہوتا ہے اور جب دوطلاقوں کا جمع کرنا جائز ہے تو تین کا جمع کرنا بھی جائز ہوگا جبکہ ''اوتسریح باحسان'' کی عمومیت میں اس کی گنجائش موجود ہے۔

(٦) اسی واسطے صاحب تفسیر قرطبی، اور صاحب احکام القرآن ابوبکر الجصّاص نے واشگاف الفاظ میں فرمایا ہے۔

قوله تعالیٰ "الطلاق مرتان الخ" يدّل علیٰ وقوع الثلاث معاً مع كونه منهيًّا عنه. (قرطبی ص ۱۲۹، ج. ۳ جصاص ص ۳۸٦، ج. ۱)

آیت الطلاق مرّتان بطور اشارہ دلالت کررہی ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں واقع ہوتی ہیں اگرچہ اس طرح تین طلاقیں دینا منع ہے۔

(۷) شارح ہدایہ علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر میں مجلس واحدہ میں تین طلاقیں دینے سے تین ہی واقع ہونے پر احادیث وآثار پیش کرنے کے بعد مخالفین کے جوابات دیئے ہیں اور آخر میں تحریر فرماتے ہیں۔

وقد اثبتنا النّقل عن اكثرهم (اى الصحابة) صريحاً بايقاع الثلاث ولم يظهر لهم مخالف فماذا بعد الحق (الاالضلال .ص ٢٦، ج. ٣ كذا فى ردّالمحتار ص ٢٣٣، ج. ٣)

مطلب یہ کہ ہم نے احادیث اور روایات اور ائمہ اربعہ کے اقوال سے ثابت کردیا ہے کہ جمہور صحابہ مجلس واحدہ میں تین طلاقوں کو تین ہی شمار کرتے تھے کسی صحابی نے ان کی مخالفت نہیں کی۔

لہٰذا جب حق یعنی تین طلاقیں مجلس واحدہ میں تین ہونا ثابت اور واضح ہوگیا تو اس کے بعد کسی دوسری رائے کا اظہار کرنا گمراہی اور ضلالت کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے؟

(۸) صاحب اعلاء السنن تحریر فرماتے ہیں۔

ومما يجب التنبيه عليه ان لاخلاف بين الائمة الاربعة فى وقوع الطلاق

الثلاث جملة كما صرح به ابن القيمؒ فی زادالمعاد. (ص ۱۸۰، ج. ۱۱)

اور جس بات پر آگاہ کرنا ضروری ہے کہ ائمۂ اربعہ کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ایک بارگی تین طلاقیں دینے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے جس کی تصریح ابن القیمؒ نے زادالمعاد میں کی ہے۔

(۹) شارح کنز فخر الدین الزیلعی تبیین الحقائق میں تحریر فرماتے ہیں

وثلاثا فی طهرا وبكلمة بدعّی ای تطليقها ثلاثا فی طهر واحد اوبكلمة واحدة طلاق بدعّی وكذالک الثنتان فی طهرواحد اوبكلمة واحدة.

مصنف کا قول تین طلاقیں ایک طہر میں یا ایک ہی کلمہ میں تین طلاق بدعی ہیں اسکا مطلب یہ ہے کہ ایکبارگی تین طلاقیں ایک ہی طہر میں دینا یا ایک ہی کلمہ سے دینا خلاف سنت ہے گناہ ہے۔

وقال الشافعی لايكون الثلاث فی طهر واحد اوبكلمة بدعة لأنه مشروع وهو لا يجامع الحظر عنده بخلاف الطلاق فی حالة الحيض.

وذهب اهل الظاهر وجماعة منهم الشيعة الٰی ان الطلاق الثلاث جملة لايقع الا واحدة (تبيين الحقائق ص ۱۹۰، ج. ۲)

امام شافعی فرماتے ہیں کہ ایکبارگی مجلس واحدہ میں ایک طہر میں تین طلاقیں دینا بدعت نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ مشروع ہے اور امر مشروع منع کے ساتھ جمع نہیں ہوتا بخلاف اس کے کہ حالتِ حیض میں طلاق دی جائے وہ بدعت ہے۔

بعض ظاہر ییں اور شیعہ فرقہ اس طرف گئے ہیں کہ تین طلاقیں ایکبارگی دینے سے ایک طلاق ہوتی ہے جبکہ جمہور کے نزدیک تین ہوتی ہیں۔

(۱۰) صاحب بحر علامہ زین الدین ابن نجیم فرماتے ہیں۔

قوله ثلاثا فی طهرا و بكلمة بدعی، ای: تطليقها ثلاثه متفرقة فی طهر واحد اوثلاثا بكلمة واحدة بدعیّ ای منسوب الی البدعة والمراد بهاهُنا المحرّمة لانهم صرحوابعصيانه ومراده بهذا القسم ماليس حسناولا احسن الخ

(بحر الرائق ص ۲۳۹، ج. ۳)

مصنف کا قول ایک طہر میں یا ایک کلمہ سے تین طلاق بدعت ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ اس

طرح ایک ہی طہر میں متفرق طور پر یا ایک بارگی تین طلاقیں دینا بدعت ہے اور یہاں پر بدعت سے مقصد یہ ہے کہ ایک بارگی تین طلاقیں دینا حرام اور گناہ ہے اور یہ اس طرح طلاق دینا طلاق حسن یا طلاق احسن میں شامل نہیں ہے۔

احادیث صحیحہ اور فقہاء و محدثین کے اقوال اور عبارات سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ ایک بارگی تین طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں اس پر جمہور صحابہ اور ائمہ اربعہ اور جمہور محدثین کرام کا اجماع واتفاق ہے۔ اس میں صرف شیعہ امامیہ اور غیر مقلدین کا اختلاف ہے جس کی کچھ حقیقت نہیں ہے۔

بطور دلائل یہ چند مختصر نقول پیش کردی گئی ہیں تاکہ اصل حقیقت سامنے آجائے اسکے بعد غیر مقلدین کے چند شبہات اور ان کے جوابات بھی ملاحظہ ہوں۔

غیر مقلدین کا ایک شبہ اور اسکا جواب

بعض غیر مقلدین امام رازی کی تفسیر رازی سے تین طلاقیں ایک ہونے کا حوالہ نقل کرتے ہیں اس کو ناقص طریقہ پر نقل کرتے ہیں۔

امام رازی اس موقع پر آیت ''الطلاق مرّتان'' کے سلسلہ میں تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آیت الطلاق مرتان میں ''اوتسریح باحسان'' کا ٹکڑا ہے۔

(۱) بعض نے کہا کہ آیت مذکورہ مستقل کلام ہے جس کا معنی یہ ہے کہ طلاق کے بعد طلاق دی جائے۔ ان کے نزدیک طلاقوں کا جمع کرنا درست نہیں حرام ہے۔

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت مذکورہ مستقل کلام نہیں بلکہ سابق کے ساتھ متعلق ہے جس کا معنی یہ ہے کہ طلاق رجعی دو طلاقیں ہیں۔ تین طلاقوں کے بعد رجعت نہیں اور یہی قول امام شافعی وغیرہ کا ہے۔

پھر ان میں فریق اول میں اختلاف ہوا بعض کہتے ہیں اصل یہ ہے کہ تفریقاً طلاق دی جائے اجتماعاً دو تین طلاقیں بیک وقت دینا حرام ہے لیکن اس کے باوجود طلاقیں واقع ہوجائیں گی۔ یہی قول امام ابو حنیفہ وغیرہ کا ہے۔ اور بعض دوسرے کہتے ہیں کہ جب دو اور تین طلاقوں کو جمع کرنا حرام ہے تو طلاقیں واقع نہ ہوں گی جیسا کہ ظاہر یہ اور شیعہ کہتے ہیں۔

(۳) امام رازی نے یہاں پر تیسرا قول بھی نقل کیا ہے اور ترجیح تیسرے قول کو دی ہے وہ یہ ہے کہ آیت مذکورہ مستقل کلام نہیں بلکہ ماقبل کے ساتھ متعلق ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آیت میں زوج کو حق

رجعت دیا گیا ہے اور یہ حق غیر معینہ مدت تک اور غیر محدود نہیں بلکہ دو طلاقوں تک رجعت کا حق محدود ہے اس کے بعد رجعت کا حق نہیں رہتا ہے اور یہی تفسیر آیت کی ترتیب اور نظام کے لحاظ سے بہتر ہے چنانچہ لکھتے ہیں۔

فھٰذا تفسیر حسن مطابق لنظم الآیة (ص ۳۷۳، ج ۲)

عبارت مذکورہ سے واضح ہوا کہ امام رازی نے آیت مذکورہ کی تفسیر کے سلسلہ میں تین اقوال ذکر کر کے قول ثالث کو ترجیح دی ہے کہ آیت میں حق رجعت کی حد بتائی گئی ہے الگ الگ طلاق دینے یا بیک وقت طلاق دینے کی بحث بالکل مقصد نہیں ہے جس سے معلوم ہوا کہ غیر مقلدین تفسیر کبیر کی عبارت نقل کر کے قارئین کو دھوکہ دینے کی سعی لا حاصل کرتے ہیں۔

غیر مقلدین کا دوسرا شبہ اور اس کا جواب

(۲) بعض غیر مقلدین اللہ تعالیٰ کے قول **لعلّ اللّٰہ یحدث بعد ذالک اَمراً** سے تین طلاقیں ایک طلاق ہونے پر استدلال کرتے ہیں یہ ان کے ذہن کی پیداوار ہے جو قطعاً نا قابل التفات ہے۔

ابن قدامہ المغنی میں آیت مذکورہ کی تفسیر کے تحت لکھتے ہیں۔

(الف) عن مالک بن الحارث قال جاء رجل الی ابن عبّاس فقال ان عمی طلق امراتہ ثلاثا فقال ان عمک عصی اللّٰہ و واطاع الشیطان فلم یجعل لہ مخرجا و وجہ ذالک قول اللّٰہ تعالیٰ یا ایّھا النّبی اذا طلّقتم النّسآء فطلقوھنّ لعدتھن الیٰ قولہ لاتدری لعلّ اللّٰہ یحدث بعد ذالک امرا ثمّ قال بعد ذالک ومن یتق اللّٰہ یجعل لہ مخرجا ومن یتق اللّٰہ یجعل لہ من امرہ یسراً ومن جمع الثلاث لم یبق لہ أمر یحدث ولایجعل اللّٰہ مخرجا ولامن امرہ یسراً.

(ص ۱۰۲، ج ۷)

مالک بن حارث سے روایت ہے کہ ایک شخص ابن عباس کے پاس آئے اور عرض کیا کہ میرے چچا نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہیں تو ابن عباس نے فرمایا کہ تیرے چچا نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور شیطان کی اطاعت کی۔ اس لئے تیرے چچا کے لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی آسانی نہیں ہے پھر آیت **یا ایّھا النّبی اذا طلّقتم الخ** کو تلاوت فرمایا اس کے بعد آیت "**ومن یتق اللّٰہ یجعل لہ مخرجاً**" "**ومن یتق اللہ یجعل لہ من امرہ یسرا**" کو

تلاوت فرمایا اور کہا جو شخص بیک وقت تین طلاقوں کو جمع کرتا ہے تو اس کے حق میں کوئی امر باقی نہیں رہا نہ ہی اس کے لئے کوئی راستہ یا کوئی آسانی ہے۔

(ب) امام نووی شرح مسلم میں آیت مذکورہ کی شرح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

واحتج الجمهور بقوله تعالیٰ ومن يتعد حدود الله فقد ظلم نفسه لاتدری لعل الله يحدث بعد ذالک أمراً قالوا معناه ان المطلق قد يحدث له ندم فلا يمكنه تدارکه لوقوع البينونة فلو كانت الثلاث لم تقع لم يقع طلاقه هذا الّا رجعيًا فلا يندم (ص ۴۷۸، ج ۱)

جمہور اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی حدود سے تجاوز کرتا ہے وہ اپنے اوپر ظلم کرتا ہے اسے یہ معلوم نہیں کہ اگر حدود اللہ کو تجاوز نہ کرتا تو کوئی نئی صورت پیدا ہو جاتی علماء نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ طلاق دینے والے کو کبھی طلاق دینے کے بعد ندامت ہوتی ہے طلاق بائنہ ثلاثہ دینے کے بعد تدارک کی کوئی صورت نہیں رہتی۔ اگر تین طلاقیں بیک وقت واقع نہ ہوتیں اور ایک طلاق رجعی واقع ہوتی تو طلاق دینے والے کو کوئی ندامت یا پریشانی نہیں ہوتی شاید کوئی راستہ نکل جاتا۔

لیکن اس نے تین طلاقیں دیدی ہیں لہٰذا تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی کیونکہ طلاق دینے والے نے حدود اللہ کی رعایت نہیں کی۔ اس لئے اس کے واسطے کوئی راستہ باقی نہیں رہے گا۔ اگر بیک وقت تین طلاقیں نہ دیتا تو حدود اللہ کے اندر رہنے کی وجہ سے کوئی صورت رجعت کی یا عقد ثانی کی پیدا ہو جاتی۔

غیر مقلدین کا تیسرا شبہ اور اس کا جواب

(۳) بعض غیر مقلدین حدیث رکانہ سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ اس میں تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دیا گیا ہے۔

درحقیقت رکانہ کے طلاق کے سلسلہ میں جو روایات منقول ہیں ان میں ابن عباس کی روایت متعدد طریق سے منقول ہے اور تمام طرق حدیث میں وہ طریق قابل اعتبار اور صحیح ہے جس کو امام ابوداؤد نے لفظ البتّہ کے ساتھ نقل کیا ہے اور جن طرق میں تین طلاقوں کا ذکر موجود ہے وہ تمام طرق نا قابلِ اعتبار اور ضعیف ہیں۔

چنانچہ حدیث رکانہ عن ابن عباس کے سلسلہ میں محدثین کرام فرماتے ہیں۔

(الف) قال النووی واما الروایة التی رواها المخالفون أن رکانة طلق ثلاثا فجعلها واحدة فروایة ضعیفة عن قوم مجهولین (ص ۴۷۸، ج ۱)

امام نووی فرماتے ہیں کہ تین طلاق کے مخالفین نے جو روایت نقل کی ہے کہ رکانہ نے تین طلاقیں دی ہیں اور نبی علیہ السلام نے اس کو ایک طلاق قرار دیا۔ یہ روایت ضعیف ہے اور مجہول اور غیر معروف لوگوں نے روایت کی ہے۔

(ب) امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ اس حدیث کی تمام اسانید ضعیف ہیں امام بخاری نے بھی اس کی اسانید کو ضعیف قرار دیا ہے (مختصر سنن ابی داؤد ص ۱۲۲، ج ۳)

(ج) امام بیہقی سنن کبریٰ میں تحریر فرماتے ہیں کہ۔

وهذا الاسناد (فی حدیث رکانه) لاتقوم به الحجة مع ثمانیة رووا عن ابن عبّاس رضی اللّٰه عنهما فتیاه بخلاف ذالک ومع روایة اولاد رکانة ان طلاق رکانة کان واحدة (ص ۳۳۹، ج ۷)

حدیث رکانہ کی تمام اسانید نا قابل اعتبار ہیں قابل احتجاج ولائق استدلال نہیں جبکہ اس کے مقابل ابن عباس سے روایت کرنے والوں میں آٹھ راویوں سے اس کے خلاف ابن عباس کا فتویٰ منقول ہے اور اولا د رکانہ کی روایت ابن عباس کی روایت طلاق ثلاثہ کے مخالف ہے اولا د رکانہ کی سند میں ایک طلاق دینے کا ذکر ہے۔

لہٰذا حدیث رکانہ جتنے طرق سے مروی ہے ان میں سے صرف وہ سند اور طریق لائق احتجاج اور صحیح ہے جس میں ایک طلاق کا ذکر ہے اور البتّة کا لفظ موجود ہے جیسا کہ ابوداؤد شریف میں ہے۔

عن یزید بن رکانة انه طلق امرأته البتّة فجعلها النبی صلی اللّٰه علیه وسلم واحدة.

(ابوداؤد ص ۲۹۹، ج ۱ کذا فی فتح الباری ج. ص ۳۱۶، ج. ۹ وکذا فی شرح المسلم للنووی ص ۴۷۸، ج. ۱)

یزید بن رکانہ کی روایت ہے کہ اس کے والد رکانہ نے اپنی بیوی کو طلاق بتہ دی تھی جس کو نبی علیہ السلام نے ایک طلاق قرار دیا۔

یہ حدیث باعتبار اسناد صحیح ہے غرض یہ کہ حدیث رکانہ عن ابن عباس جس میں تین طلاقوں کا ذکر ہے اس کے جملہ طرق ضعیف ہیں۔

(د) حدیث رکانہ عن ابن عباس جس میں تین طلاقوں کا ذکر ہے یہ حدیث ضعیف ہونے کے ساتھ

ساتھ حضرت ابن عباس کے فتویٰ کے مخالف ہے جیسا کہ بیہقی کے حوالہ سے معلوم ہوا کہ حضرت ابن عباس تین طلاقیں بیک وقت دینے پر اسے تین طلاقیں شمار کرتے تھے اور تین طلاقوں پر فتویٰ دیا کرتے تھے۔

ظاہر بات ہے جب حضرت ابن عباس تین طلاقوں کو تین شمار ہونے پر فتویٰ دیا کرتے تھے تو ایک طلاق والی ضعیف روایت آپ کے فتویٰ کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ابن قدامہ نے اعتماد کے ساتھ کہا ہے۔

لایسوغ لابن عبّاس ان یروی ھذا عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ویفتی بخلافہ. (المغنی ص ۱۰۵، ج. ۷، کذا فی فتح الباری ص ۳۱۷، ج. ۹)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے لئے یہ بات ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تو تین طلاقیں ایک ہونیکی حدیث روایت کرے اور فتویٰ اس کے خلاف (یعنی تین طلاقیں تین شمار ہونے کا فتویٰ) دیا کرے۔

(ہ) ابن عباس سے جتنی احادیث منقول ہیں ان میں تین طلاقیں تین شمار ہونے والی احادیث صحیح ہیں اور یہ ان روایات صحیحہ (جو کہ اس سلسلہ میں دوسرے صحابہ سے مروی ہیں) کے بھی موافق ہیں۔

(و) ابن عباس کی روایت تین طلاقیں تین شمار ہونے کی اجماع صحابہ اور جمہور امت کے موافق ہے جبکہ تین طلاقیں ایک ہونے کی روایت دوسری روایات صحیحہ اور اجماع امت کے بھی مخالف ہے۔

(ح) روایت ابن عباس کے سلسلہ میں امام احمد بن حنبل سے روایت ہے کہ لوگوں نے امام احمد بن حنبل سے سوال کیا کہ ابن عباس کی اس روایت کا کیا جواب ہوگا جس میں انہوں نے ذکر کیا کہ نبی علیہ السلام کے زمانے میں اور عہد صدیق اکبرؓ میں تین طلاقیں ایک شمار ہوتی تھیں اور خلافت عمر میں تین شمار ہونے لگیں تو امام احمد بن حنبل نے جواب دیا کہ اس کا جواب وہ احادیث ہیں جو اس کے مخالف ابن عباس سے بہت سارے راویوں نے روایت کی ہیں کہ طلاقیں تین شمار ہوں گی اور بعض نے یہ بھی جواب دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور عہد صدیق اکبرؓ میں لوگ عموماً ایک ہی طلاق دیا کرتے تھے ورنہ حضرت عمرؓ کے لئے کیسے ممکن تھا کہ تین کو تین شمار کر کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مخالفت کرلے اور دوسرے صحابہ اس پر خاموش رہیں۔

اور کیسے ممکن ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ تین طلاقیں ایک واقع ہونے کی روایت کریں اور

فتویٰ اس کے خلاف دیں۔ (المغنی ص ۱۰۵، ج ۷، ابو داؤد ص ۲۹۹، ج ۱، فتح الباری ص ۳۱۷، ج ۹)

(ط) نیز ابن عباس کی یہ حدیث جس میں تین طلاقیں ایک واقع ہونے کا ذکر ہے سند کے لحاظ سے اور الفاظ کے لحاظ سے بھی مضطرب ہے جو فن حدیث کے اعتبار سے بڑا نقص شمار ہوتا ہے۔

سند حدیث میں اضطراب یوں ہے۔

(۱) بعض طریق میں طاؤس عن ابن عباس ہے۔

(۲) دوسری سند میں عن ابن الجوزاء عن ابن عباس ہے کمافی مسلم ص ۴۷۸، ج ۱

اور الفاظ حدیث میں اضطراب اس طرح ہے۔

(۱) کیونکہ بعض طریق میں طلاق الثّلاث۔

(۲) اور بعض طریق میں ثلاث تطلیقات۔

(۳) اور بعض طریق میں البتّۃ

(۴) اور بعض طریق میں بتّۃ کا لفظ ذکر ہے۔

صحیح احادیث کے مقابلے میں یہ حدیث جو کہ سند و متن کے اعتبار سے مضطرب ہے احادیث صحیحہ کے مخالف بھی ہے کسی طرح قابل احتجاج نہ ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ جمہور امت نے اس حدیث کو نا قابل عمل قرار دیا۔ البتہ شیعہ حضرات کے نزدیک یہ حدیث قابل عمل ہے وہ تین طلاقوں کو ایک شمار کرتے ہیں۔

چنانچہ غیر مقلدین حضرات شیعوں کا اتباع کر رہے ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی الباری میں تصریح کی کہ تین طلاقیں ایک واقع ہونے کا مذہب شیعوں اور بعض اہل ظاہر کا ہے، فتح الباری ص ۳۱۵، ج ۹

غیر مقلدین کا چوتھا شبہ اور اس کا جواب

بعض غیر مقلدین محمود بن لبید کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ آپؐ نے سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے تو اس کا جواب یہ ہے۔ محمود بن لبید کی حدیث کو اگر صحیح تسلیم کیا جائے تو یہ حدیث جمہور امت کے لئے دلیل ہے کیونکہ اس حدیث میں تین طلاقیں بیک وقت دینے کا ثبوت ہے البتہ چونکہ ایک بارگی تین طلاقیں دینا گناہ ہے اس لئے نبی علیہ السّلام نے غصہّ کا اظہار فرمایا۔

لیکن آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ تین طلاقیں ایک واقع ہوگی تم رجوع کرلو۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں تحریر فرماتے ہیں کہ حدیث مذکور میں اس بات کی تصریح نہیں کہ آپؐ نے تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دیا یا کالعدم قرار دیا بلکہ صرف اس کا ذکر ہے کہ آپؐ نے ناراضگی کا ظہار فرمایا جس سے زیادہ سے زیادہ تین طلاقیں بیک وقت دینا حرام معلوم ہوتا ہے جو کہ ابوحنیفہ کا مسلک ہے۔

بعض غیر مقلدین خاص طور پر محمود بن لبید کی روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ:

(الف) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طلاقیں دینے پر ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے جبکہ حقیقت یہی ہے کہ محمود بن لبید کی حدیث پر محدثین نے اعتراض کیا ہے کہ اس کا سماع نبی علیہ السّلام سے ثابت نہیں ہے۔ (فتح الباری ص ۳۱۵، ج۔ ۹)

(ب) تہذیب التہذیب میں ہے کہ محمود بن لبید تابعی ہے حضرت عمرؓ سے حدیث سنی ہے۔ (ص ٦٦، ج۔ ۱۰)

الجرح والتعدیل ص ۲۸۹، ج۔۴ میں ہے محمود بن لبید کی نبی علیہ السلام سے ملاقات نہیں ہوئی جس سے معلوم ہوا کہ یہ حدیث متصل السند نہیں ہے۔

(ج) یہ حدیث مخالف اجماع صحابہ ہے۔

(د) یہ حدیث تعامل امت کے بھی خلاف ہے۔

(ہ) ائمۂ اربعہ اور جمہور فقہا و محدثین نے اس روایت کو ناقابل عمل قرار دیا ہے۔

تین طلاقوں کے بارے میں حضرت عمر کا فیصلہ

نہ ذاتی تھا نہ سیاسی

نیز تین طلاقوں کو تین شمار کرنے کا فیصلہ حضرت عمر کا ذاتی فیصلہ نہ تھا بلکہ تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم کی موجودگی میں فیصلہ ہوا تمام صحابہ نے اس فیصلہ سے اتفاق کیا جس میں حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت عبداللہ بن مسعود۔ حضرت عبداللہ بن عباس وغیرہم سب فقہاء صحابہ بھی موجود تھے اور کسی ایک صحابی نے بھی اس فیصلہ سے اختلاف نہیں کیا۔

اس واسطے حافظ ابن حجر نے کہا کہ حدیث ابن عباس کا علم دوسرے حضرات کو بھی تھا لیکن سب کو اس کے مخالف احادیث جو تین طلاقیں تین شمار ہونے کی ہیں وہ بھی سامنے تھیں چنانچہ حضرت عمرؓ کا فیصلہ شرعی

تھا سیاسی نہ تھا اس لئے کسی نے اعتراض نہیں کیا اور یہ شرعی فیصلہ تھا سیاسی فیصلہ نہ تھا کیونکہ سیاست حلت وحرمت میں تغیر وتبدل پیدا نہیں کرتی۔

ظاہر ہے کہ جب حدیث ابن عباس اور خود ابن عباس کے ہوتے ہوئے جمہور صحابہ کا اجماع ہوا ہے کہ تین طلاقیں تین شمار ہوں گی تو اب روایت ابن عباس کہ تین طلاقیں ایک طلاق شمار ہوتی تھی کی حجیت باقی نہ رہی اور یہ اجماع شرعی حکم پر ہوا ہے کسی سیاسی مسئلہ پر نہیں ہوا کیونکہ سیاسی فیصلہ عارضی اور وقتی ہوا کرتا ہے اور اس کے لئے کسی دلیل نسخ واجماع کی حاجت وضرورت نہیں پڑتی۔

نیز عہد رسالت میں لوگ تین طلاقیں دیا کرتے تھے اور اس کو تین ہی شمار کیا جاتا تھا جیسا کہ حدیث رفاعۃ اور حدیث عجلانی وغیرہ سے ظاہر ہے۔

(۷) حضرت عمرؓ کی ندامت کا قصہ اور اسکا جواب

غیر مقلدین یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ اس فیصلہ پر کہ تین طلاقیں مجلس واحدہ میں تین واقع ہوتی ہیں بعد میں نادم ہو گئے تھے یہ دعویٰ بالکل افتراء اور جھوٹ ہے۔

(الف) چنانچہ: علامہ شیخ زاہد الکوثریؒ اپنی تصنیف "الاشفاق" میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تین طلاقوں والے فیصلے پر پشیمان ہونے کی روایت غلط اور باطل ہے من گھڑت اور موضوع ہے اس کی سند میں خالد بن یزید بن ابی مالک ہے جو کہ اپنے والد کے بارے میں جھوٹ بولتے تھے۔

(ب) یحییٰ بن معین نے کہا کہ خالد بن یزید اپنے باپ پر جھوٹ بولنے پر اکتفاء نہیں کرتا تھا یہاں تک کہ اس نے صحابہ کرام پر بھی جھوٹ باندھا ہے۔ بحوالہ الاشفاق ص ۵۸، اور اس کی کتاب "کتاب الدیات" اس لائق ہے کہ اسے دفن کر دیا جائے۔

(۸) نیز مولانا عبدالحئی لکھنوی صاحبؒ "عمدۃ الرعایۃ علیٰ شرح الوقایہ" میں تحریر فرماتے ہیں۔

وحكم عمرؓ بامضاء الثلاث ووافقه جمهور الصحابة فليس حكمه مخالفا للشرع الثابت ولاهو محمول على مجرّد السّياسة اذلا يظنّ بأحد من الصحابة فضلاً عن عمرؓ انه يبدل حكماً شرعيّا سياسةً انتهى.

(عمدة الرعاية ص ۷۱، ج ۲)

حضرت عمرؓ نے تین طلاقیں بیکبارگی کے وقوع کا فیصلہ کیا اور جمہور صحابہ نے ان کی موافقت

کی اس لئے حضرت عمر کا فیصلہ نہ تو شرعاً کسی ثابت شدہ حکم کے خلاف ہے اور نہ محض سیاست پر محمول ہے کیونکہ کسی بھی صحابی کے بارے میں یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے شرعی حکم کو سیاسۃً تبدیل کردیا ہے چہ جائیکہ حضرت عمر خلیفہ راشد کے بارے میں یہ گمان کیا جائے۔

بہر حال حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ کا فیصلہ اور اجماعی حکم شرعی تھا سیاسی نہ تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں اجماع منعقد ہوجانے کے بعد حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ حضرت حسنؓ حضرت معاویہؓ بلکہ تمام ادوار خلافت سے لیکر آج تک جمہور امت کا عمل اسی پر رہا ہے۔

اور فقہاء صحابہ وائمۂ مجتہدین اور جمہور امت نے اسے قبول کیا ہے۔

مذاہب اربعہ اور ائمہ حدیث نے اس کو شرعی فیصلہ کی رو سے نقل فرمایا ہے لہٰذا جو شخص یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ فیصلہ خالص سیاسی اور عارضی حکم تھا تو اس کا یہ عقیدہ بالکل باطل اور لغو ہوگا۔

غیر مقلدین کا فتح القدیر کی ایک عبارت سے

شبہ اور اس کا جواب

بعض غیر مقلدین حضرات بعض حنابلہ کی طرف منسوب ایک عبارت سے جمہور پر اعتراض کرتے ہیں وہ عبارت یہ ہے۔

قال بعض الحنابلة القائلين بهٰذا المذهب انه توفى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن مائة الف عين رأته فهل صح لكم من هٰؤلآء أوعشر عشرهم القول بلزوم الثلٰث بفم واحد بل لوجهد تم لم تطيقو انقله عن عشرين نفساً.

اب قارئین کرام اصل حقیقت ملاحظہ فرمائیں کہ معترضین فتح القدیر کی عبارت "قول بعض الحنابلة" سے ابتداء کلام کو نقل کرکے آخر میں "باطل" کے قول کو چھوڑ دیتے ہیں جس سے بعض حنابلہ کے قول کی تردید ہوجاتی ہے اور یہ علمی میدان میں بدترین خیانت ہے۔ فتح القدیر کی پوری عبارت ملاحظہ کرنے کے بعد حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔ اب اصل عبارت ملاحظہ فرمائیں۔

وقول بعض الحنابلة القائلين بهٰذا المذهب توفى رسول الله صلى الله عليه وسلّم عن مائة الف عين رأته فهل صحّ لكم عن هٰؤلآء اوعن عشر عشرهم

القول بلزوم الثلاث بضم واحد بل لو جهدتم لم تطيقوا نقله عن عشرين نفسا باطل الخ.

بعض حنابلہ کا قول کہ جو تین کو ایک شمار کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے لاکھوں صحابہ چھوڑ کر جنھوں نے خود اپنی آنکھوں سے آپ کو دیکھا تھا کیا ان میں سے ایک فیصد بھی ایسا ملے گا جو تین طلاقوں کو تین شمار کرتے ہیں بلکہ تم اگر کوشش کرو گے تو بیس ۲۰ صحابہ سے نقل ملنا ممکن نہ ہوگا۔ یہ قول باطل ہے۔

ابن ہمام نے بعض حنابلہ کے اعتراض کو نقل کر کے اس کو رد کیا ہے اور اس اعتراض کا جواب ابن ہمام نے اس طرح دیا ہے کہ بعض حنابلہ کی رائے غلط ہے اور اس کی مختلف وجوہ ہیں۔

جنانچہ ابن ہمام اس کے جوابات دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

امّا اوّلاً فاجما عهم ظاهر فانه لم ينقل عن أحد منهم أنه خالف عمر رضى الله عنه حين أمضى الثلاث وليس يلزم فى نقل الحكم الا جماعى عن مائة الف ان يسمّى كلّ ليلزم فى مجلّد كبير حكم واحد علىٰ انه اجماع سكوتى واما ثانياً، فانّ العبرة فى نقل الا جماع نقل ما عن المجتهدين لا العوام والمائة الا لف الذين توفىّ عنهم رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تبلغ عدّة المجتهدين الفقهاء منهم اكثر من عشرين كا لخلفآء والعبادلة و زيد بن ثابت ومعاذ بن جبل وأنس وابى هريرة رضى اللّٰه عنهم وقليل والباقون يرجعون اليهم ويستفتون منهم وقد اثبتنا النقل عن اكثرهم صريحا بايقاع الثلاث ولم يظهر لهم مخالف فماذا بعد الحق الا الضلال. (ص ۳۳۰، ج.۳)

بعض حنابلہ کا قول ان وجوہ سے باطل ہے اولاً اس مسئلہ پر صحابہ کا اجماع منعقد ہو چکا ہے اور کسی ایک صحابی سے منقول نہیں کہ اس نے حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ سے اختلاف کیا ہو اور حکم اجماعی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ایک لاکھ صحابہ سے نقل کیا جائے اور ہر ایک کا نام بھی ذکر کیا جائے تا کہ ایک ضخیم کتاب میں اس کا تذکرہ ہو جائے جبکہ یہ اجماع سکوتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے نقل اجماع کے بارے میں اعتبار مجتہدین کی نقل کا ہے عامۃ الناس کی نقل کا اعتبار نہیں ہوتا اور لاکھوں صحابہ جن کی حیات میں حضور علیہ السلام کی وفات ہوئی ان میں سے مجتہدین اور فقہاء کی تعداد بیس سے زیادہ نہیں ہوگی جیسے خلفاء اربعہ عبادلہ ثلاثہ زید بن ثابت،

معاذ بن جبل حضرت انس وابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اجمعین وغیرہم ہیں باقی صحابہ کرام مسائل کے بارے میں ان ہی کی طرف رجوع کرتے تھے اور ان ہی سے فتویٰ لیا کرتے تھے۔ ابتداء سطر سے ہم ان مجتہدین فقہاء صحابہ کے اکثریت کی تین طلاقوں کے وقوع پر تصریح نقل کر چکے ہیں اور کوئی فرد صحابہ کے اجماع کی مخالفت کرنے والا نہ ملا اب حق ثابت ہوجانے کے بعد تین طلاقوں سے انکار کرنا گمراہی کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے۔

فتح القدیر کی عبارت سے صاف معلوم ہوا کہ بعض حنابلہ کا قول کہ تین طلاقیں ایک ہوتی ہے غلط اور باطل ہے اکثر حنابلہ کا قول یہ ہے کہ تین طلاقیں تین ہی شمار ہوتی ہیں یہی مذہب امام شافعی، مالک، ابو حنیفہ، احمد بن حنبل کا ہے۔

غیر مقلدین کا بعض صحابہ کرام پر افتراء اور جھوٹ باندھنا

(۱۰) بعض غیر مقلدین اپنی حمایت میں حدیث ابن عباس کے علاوہ حضرت علی حضرت ابن مسعود اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا نام بھی لیتے ہیں اور دلیل میں یہ حوالے پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ غیر مقلد لکھتے ہیں۔

(الف) نقل عن ابن عباس وعلي و ابن مسعود و عبدالرحمن بن عوف و ابن تيمية و ابن القيّم انه يقع طلقة واحدة رجعيّة،

(بحواله "الطلاق فى الشرعيه الاسلاميه و القانون" ص ۲۴۱)

(ب) نیل الاوطار میں بھی ان مذکورہ بالا حضرات کے نام اس سلسلہ میں ایک طلاق واقع ہونے کے متعلق بتاتے ہیں۔

اس افتراء اور جھوٹ کا جواب

(الف) پہلی بات تو یہ ہے کہ ابن تیمیہ اور ابن القیم کو صحابہ کی فہرست میں کس طرح جگہ مل گئی وہ اس صف میں کب سے شامل ہوگئے ہیں یہ تو چھ سو سال کے بعد کے لوگ ہیں صحابہ کرام کی فہرست میں ان کا نام ذکر کرنا بہت غلط ہے۔

(ب) دوسری بات یہ ہے کہ جن صحابہ کرام کا نام لیا گیا ہے انہیں حضرات سے تین طلاق ہونے کی روایتیں موجود ہیں اور وہ تین طلاقیں واقع ہونے پر فتویٰ دیا کرتے تھے۔ جن کے کچھ حوالے اس سے قبل گزر چکے ہیں مزید کچھ حوالے اور لیجئے۔

ابن عمر کا فتویٰ

چنانچہ علامہ ابن ہمام فتح القدیر میں فرماتے ہیں۔

وذهب جمهور الصحابة والتابعين ومن بعد هم من ائمة المسلمين الٰى انه يقع ثلاث ومن الادلة فى ذالک مافى مصنّف ابن ابى شيبة والدار قطنى فى حديث ابن عمر قلت يا رسول اللّٰه أرأيت لو طلقتها ثلاثا قال اذاً قد عصيت ربک وبانت منک امرأتک. (فتح القدیر ص ۳۰، ج. ۳)

جمہور صحابہ وتابعین اور انکے بعد ائمہ مسلمین نے اس کو اختیار کیا ہے کہ ایک دفعہ تین طلاق دینے سے تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی۔ ان کے دلائل میں سے وہ حدیث ہے جو مصنف بن ابی شیبہ اور دار قطنی میں ابن عمر سے مروی ہے ابن عمر فرماتے ہیں کہ میں نے کہا یا رسول اللہ میں اگر یکبارگی تین طلاقیں دیدیتا پھر اس پر کیا فیصلہ ہوتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر تم اپنے رب کی نافرمانی کرتے اور تمہاری بیوی تم سے جدا ہوجاتی۔

دیکھئے اس میں جمہور صحابہ کی رائے تین طلاقوں کا تین شمار ہونا معلوم ہوا خاص طور پر ابن عمر کی روایت ہے بحوالۂ فتح القدیر۔

ابن عباسؓ ابن مسعودؓ اور دیگر صحابۂ کرام کا فتویٰ

ابن عباس کی روایت تین طلاق تین ہونے کے بارے میں بھی بخاری ابوداؤد موطا امام مالک کے حوالے سے گزر چکی ہے۔ اسی طرح ابن مسعود کی روایت اور آپ کا فتویٰ ابوداؤد، موطاً مالک کے حوالہ سے گزشتہ صفحات میں مذکور ہوا۔

چنانچہ ابن ہمام نے اس موقع پر عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود ابو ہریرہؓ عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمرو بن العاص، حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت عبادۃ بن الصامت وغیرہم کے نام ذکر کئے ہیں ان سب حضرات کے نزدیک تین طلاقیں بیک وقت تین طلاقیں شمار ہوتی ہیں۔

(فتح القدیر ص ۲۵، ۲۶، ج. ۳)

ابن حزم ظاہری نے حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت زید بن ثابت کے علاوہ جعفر بن الصادق، عبداللہ بن زبیر وغیرہم کے نام بھی ذکر کئے ہیں۔

(کذا فی "الاشفاق علیٰ احکام الطلاق" ص ۳۰. ۳۲. ۳۸)

عطاء بن ابی رباحؒ کا فتویٰ

امام محمدؒ نے کتاب الآثار میں عطاء بن ابی رباح سے روایت تین طلاقوں کے بارے میں نقل کی ہے۔

عن عطاء عن ابن عباس قال اتاه رجل فقال انی طلقت امرأتی ثلاثا قال یذهب احدکم یتلطخ بالنّتن ثمّ یا تینا اذهب فقد عصیت ربک وقد حرُمت علیک امرأتک لاتحل لک حتّٰی تنکح زوجا غیرک قال محمد وبه نأخذ وهو قول ابی حنیفة وهو قول العامّة لا اختلاف فیه الخ. (صفحه نمبر ۱۰۵)

عطاء بن ابی رباح ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدی ہیں ابن عباس نے فرمایا کہ تم میں بعض لوگ اپنی ناک کو گندگی سے آلودہ کرتے ہیں پھر میرے پاس آتے ہیں مسئلہ پوچھنے کے لئے۔ جاؤ تم نے اپنے رب کی نافرمانی کی ہے اور تمہاری بیوی تم پر حرام ہوگئی۔ امام محمد نے کہا کہ ہم اسی قول کو لیتے ہیں وہ امام ابوحنیفہ اور عامۂ فقہاء کی رائے بھی ہے۔

طاؤس بن کیسانؒ کا فتویٰ

اسی طرح ابن عباس کے شاگرد طاؤس سے بھی ابن عباس سے تین طلاقوں کی روایت منقول ہے امام طاؤس نے کہا کہ جوان کی طرف تین طلاق ایک ہونے کے قول کی نسبت کرتے ہیں جھوٹ کہتے ہیں، (کذافی الاشفاق)

لہٰذا بعض غیر مقلدین نے حضرت ابن عباس کی طرف تین طلاقیں ایک واقع ہونے کی جو نسبت کی ہے وہ غلط اور جھوٹ ہے۔ (نیز غیر مقلدین کا حضرت علیؓ کی طرف تین طلاقوں کا ایک واقع ہونے کی نسبت بھی جھوٹ اور باطل ہے)

صحیح حدیث میں منقول ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک تین طلاقیں ایک مجلس میں دینے سے تین طلاق واقع ہوجاتی ہیں جیسا کہ ''الاشفاق علیٰ احکام الطلاق'' ص ۳۶۔ ۳۷ اور فتح القدیر ص ۲۵۔ ۲۶ ج۔ ۳ کے حوالے سے گزرا ہے۔

نیز حافظ ابن رجب حنبلی اپنی تصنیف ''بیان مشکل الأحادیث الواردة فی ان الطلاق

الثلاث طلاق واحدة" میں لکھتے ہیں کہ کوفہ میں ایک شیخ تھا وہ حضرت علی کی طرف تین طلاقیں ایک واقع ہونے کی نسبت کرتا تھا، لوگ اس سے مسئلہ پوچھنے آتے اور وہ حضرت علی کی طرف منسوب کر کے ایک طلاق واقع ہونے کا فتویٰ دیتے۔

اعمش کہتے ہیں کہ ایک روز میں اس شیخ کے پاس حاضر ہوا اور اس سے پوچھا کہ تو نے حضرت علی سے سنا ہے کہ وہ تین طلاقوں کو ایک شمار کرتے تھے اور تو نے حضرت علی سے کہاں پر یہ روایت سنی ہے اس نے کہا میں اپنی کتاب یادداشت دیکھتا ہوں اس میں کیا لکھا ہے پھر بتاتا ہوں اس نے اپنی کتاب نکالی جس میں یہ عبارت تحریر ہے۔

بسم اللّٰہ الرّحمن الرّحیم ھٰذا ماسمعت علی بنؒ ابی طالب یقول:

اذا طلّق الرّجل امراته ثلاثا فی مجلس واحد فقد بانت منه ولا تحل له حتیٰ تنکح زوجا غیره قلت ویحک ھٰذا غیر الذی تقول قال الصحیح ھوھذا ولکن ھؤلآء أرادونی علیٰ ذٰلک الخ. (الاشفاق علیٰ احکام الطلاق ص ۴۱، ۴۲)

بسم اللہ کے بعد یہ وہ حدیث ہے جو حضرت علی سے میں نے سنی ہے کہ جو کوئی اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دیدے تو وہ بائنہ ہوجائے گی زوج ثانی سے نکاح کئے بغیر زوج اوّل کے لئے حلال نہ ہوگی اعمش نے کہا کہ تمہارے لئے ہلاکت ہو اب تم جو سناتے تھے اس کے مخالف نکلا۔ شیخ نے کہا کہ صحیح یہ ہے لیکن ان لوگوں نے مجھے ایسا کرنے پر آمادہ کیا ہے۔

دیکھئے عبارت مذکورہ میں کوفہ کے ایک شیخ کس طرح دھوکہ دہی اور غلط بیانی سے تین طلاقیں ایک ہونے کا بیان کیا کرتے تھے کیا ایسی روایت سے کسی حکم شرعی پر استدلال درست ہے۔

زید بن علی اور جملہ اہل بیت کا فتویٰ

علامہ شوکانی نے زید بن علی کی طرف تین طلاقیں ایک واقع کرنے کی نسبت کی ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے چنانچہ روض النضیر میں تصریح ہے کہ ان کے نزدیک تین طلاقیں بیک وقت تین ہی شمار ہوتی ہیں۔

بلکہ تمام اہل بیت کے علماء علی بن حسین، زید بن علی، محمد بن علی الباقر، محمد بن عمر بن علی، جعفر بن محمد، عبداللہ بن حسن، محمد بن عبداللہ سب کے نزدیک تین طلاقیں تین ہی شمار ہوتی ہیں۔

بلکہ حضرت حسنؓ نے فرمایا کہ آل رسول کا اس پر اجماع ہو چکا ہے کہ جو شخص ایک کلمہ سے تین

طلاقیں دے گا اس کی بیوی اس پر حرام ہوجائے گی خواہ اس سے ہمبستری کی ہو یا نہیں۔ (ملاحظہ ہو الاشفاق ص ۸۵)۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی طرف

تین طلاقیں ایک ہونیکی نسبت غلط اور جھوٹ ہے

بعض غیر مقلدین حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی طرف تین طلاقیں بیک وقت ایک شمار ہونے کی نسبت کرتے ہیں یہ بھی غلط ہے۔

چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ میں تین طلاقوں کا فتویٰ ان سے منقول ہے۔

(ص ۱۱، ج. ۵ کذافی مجلہ البحوث الاسلامیہ.)

باقی رہا ابن تیمیہ اور ابن القیم کی رائے کہ ان کے نزدیک تین طلاقیں ایک واقع ہوتی ہیں تو اس کا جواب ظاہر ہے کہ احادیث صحیحہ اور آثار صحابہ اور اجماع صحابہ کے مقابلے میں ان کی آراء کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

بقول ابن القیم احادیث صحیحہ کے مقابلے میں جو رائے ہوگی وہ رائے مذموم ہوگی کوئی شرعی حکم نہ ہوگا۔

(۱۳) علامہ عینی نے صحیح بخاری کے باب من اجاز الطلاق الثلاث کے تحت چند تابعین کے نام ذکر کئے ہیں کہ وہ تین طلاق کو بیک وقت ایک شمار کرتے تھے۔

لیکن اس کے بعد کہتے ہیں کہ جمہور صحابہ و تابعین کی اتنی بڑی جماعت کے مقابلے میں بعض تابعین کی روایاتِ شاذّہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

نیز طاؤس وابراہیم النخعی وغیرہ سے تین طلاقیں تین واقع ہونے پر فتویٰ منقول ہے۔ چنانچہ بدر الدین عینی نے نقل کیا کہ امام اوزاعی، ابراہیم النخعی، سفیان ثوری، امام ابوحنیفہ واصحاب ابی حنیفہ، امام شافعی اوران کے متبعین، امام مالک اوران کے متبعین، امام احمد بن حنبل اوران کے متبعین، اسحاق، ابوثور، ابوعبید اوراس کے علاوہ بے شمار فقہاء اور محدّثین نے کہا کہ جس نے بیک وقت اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدی ہیں تو تین ہی واقع ہوجائیں گی اگر چہ وہ شخص تین طلاق کو جمع کرنے سے گناہ گار ہوگا اور جو لوگ اس اجماع کی مخالفت کرتے ہیں وہ بہت ہی تھوڑے اور گنے چنے لوگ ہیں ان کا قول شاذ ہے اس کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ (عمدۃ القاری ص ۲۳۳، ج. ۱۲)

بعض احناف و مالکیہ کی طرف تین طلاقوں کا ایک ہونیکی نسبت غلط ہے

بعض غیر مقلدین ابن تیمیہ کے حوالہ سے یہ بھی کہتے ہیں کہ غیر مقلدین کے ساتھ بعض اصحاب احناف اور بعض مالکیہ بھی ہیں لیکن اسکی کچھ اصل نہیں ہے کیونکہ فقہاء حنفیہ وشافعیہ و مالکیہ وحنابلہ کا اس مسئلہ میں بالکل اتفاق واجماع ہے خود ابن تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں تصریح کی ہے۔

والثانی انه طلاق محرم لازم وهو قول مالک وابی حنیفة و احمد فی الروایة المتأخرة عنه اختارها اکثر الصحابة وهذا القول منقول عن کثیر من السلف من الصحابة والتابعین الخ. (مجموع الفتاویٰ ص ۸، ج. ۳۳)

دوسرا یہ کہ تین طلاقیں بیک وقت تین طلاقیں ہوجائیں گی اس سے بیوی حرام ہوجائے گی۔ یہی قول امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام احمد کی آخری روایت ہے اوراسی کو اکثر صحابہ نے اختیار کیا ہے اور یہ قول بہت صحابہ اور تابعین کی ایک بڑی جماعت سے منقول ہے۔ الخ

ابن تیمیہ کے اس حوالہ سے ایک متلاشی حق فیصلہ کرسکتا ہے کہ حق اور صحیح بات کیا ہے کیونکہ جس قول کو اکثر صحابہ نے اور جملہ تابعین اور ائمہ اربعہ اور ائمۂ حدیث نے اتفاق رائے کے ساتھ قبول کیا ہے اس کو رد کرنا گمراہی کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے۔

فقہ حنبلی کی معتبر کتاب المغنی لابن قدامہ میں، جس پر حنبلی مذہب میں فتویٰ دیا جاتا ہے ابن قدامہ تحریر فرماتے ہیں۔

قال ابن قدامة و ان طلق ثلاثا بکلمة واحدة وقع الثلاث وحرمت علیه حتی تنکح زوجاً غیره ولافرق بین قبل الدخول و بعده روی ذٰلک عن ابن عباس و ابی هریرة و ابن عمر و عبدالله ابن عمرو و ابن مسعود و انس وهو قول اکثر اهل العلم من التابعین و الائمة بعدهم الخ.

(المغنی ص ۱۰۴، ج. ۷، کذا فی فتح القدیر ص ۲۶، ج. ۳، والشامی ص ۲۳۳، ج. ۳)

ابن قدامہ نے کہا کہ اگر تین طلاقیں ایک لفظ میں دی جائیں تو تین طلاقیں واقع ہوجائینگی اس کی بیوی حرام ہوجائے گی زوج ثانی سے نکاح کیے بغیر زوج اوّل کے لئے حلال نہ ہوگی ہمبستری

سے قبل طلاق دی ہو یا بعد میں اس سے کچھ فرق نہیں ہوگا اور یہ عبداللہ بن عباس اور ابو ہریرہ اور ابن عمر اور ابن مسعود اور انس سے منقول ہے اور یہ قول اکثر تابعین اور اکثر ائمۂ مجتہدین کا ہے۔

(بعض غیر مقلدین عمدۃ الرعایۃ علیٰ شرح الوقایہ کے حوالہ سے تین طلاقوں کو ایک ہونے کی نسبت مولانا عبدالحی لکھنوی کی طرف کرتے ہیں یہ بھی غلط ہے)

کیونکہ مولانا عبدالحیؒ نے جمہور کی رائے بھی لکھی ہے۔ چنانچہ طلاق کے سلسلہ میں پوری بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

والقول الثالث ان الثلاث تقع بايقاعه سواء كانت المرأة مدخولة أوغير مدخولة وهو قول جمهور الصحابة والتابعين والأئمة الاربعة وغيرهم من المجتهدين واتباعهم فعن عمر انه قال فى الرجل يطلق امرأته ثلاثا قال هى ثلاث لاتحلّ له حتى تنكح زوجاً غيره اخرجه سعيد بن منصور ومثله روى عن على أخرجه البيهقى و ابو نعيم وعن ابن عباس و ابى هرير ة و ابن الزبير و عائشة اخرجه مالک و عن ابن عمر اخرجه مالک و عن مغيرة بن شعبة اخرجه البيهقى وعن الحسن بن على اخرجه البيهقى و فى الباب آثار كثيرة شاهدة على ماذكرنا وأجابوا عن حديث ابن عباس بوجوه عديدة الخ

(عمدة الرعاية علىٰ شرح الوقاية ص ۷۱، ج. ۲)

تیسرا قول یہ کہ یکبارگی تین طلاقیں واقع کرنے سے واقع ہو جاتی ہیں برابر ہے عورت مدخول بہا ہو یا غیر مدخول بہا یہی قول جمہور صحابہ اور جملہ تابعین وآئمۂ اربعہ و دیگر مجتہدین اور انکے متبعین فقہاء و محدثین کا ہے۔ حضرت عمر سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اس شخص کے بارے میں جو اپنی بیوی کو یکبارگی تین طلاقیں دیدے کہ اس سے تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی چنانچہ زوج ثانی سے نکاح کئے بغیر عورت اس کے لئے حلال نہ ہوگی حضرت عمر سے اس روایت کو سعید بن منصور نے تخریج کیا ہے اس جیسی روایت حضرت علی سے بھی ہے جس کو بیہقی و ابونعیم نے تخریج کیا ہے نیز ابن عباس وابی ہریرہ وابن زبیر و عائشہ سے بھی اس جیسی روایت منقول ہے جس کو امام مالک نے تخریج کیا ہے بیہقی نے مغیرہ بن شعبہ سے بھی اس جیسی روایت کی تخریج کی ہے۔ اسی قسم کی روایت حسن بن علی سے بھی آئی ہے جس کو بیہقی نے تخریج کیا ہے۔ محشّی صاحب فرماتے ہیں کہ اس باب میں بے شمار احادیث وآثار موجود ہیں جو کہ ہمارے قول مذکور پر شاہد وناطق ہیں نیز حدیث ابن عباس (جس سے یکبارگی تین طلاقوں کے

ایک واقع ہونے سے استدلال کیا گیا ہے) کے مختلف طریقوں سے جوابات دیئے گئے ہیں۔

علامہ عبدالحئ لکھنوی عمدۃ الرعایۃ علیٰ شرح الوقایہ میں یکبارگی تین طلاقوں کے بارے میں شرح مذاہب اربعہ کے بعد رقمطراز ہیں کہ حدیث ابن عباس کے متعدّد جوابات دیئے گئے ہیں چنانچہ انہوں نے امام نووی سے نقل کیا کہ

ماذکره النووی وغیره ان الناس کانوا فی العهد النبوی وما بعده یطلقون بالفاظ ثلاثة ویریدون بها الواحدة وتأکید هاولذالک کانت تجعل واحدة ثم لـمّا تتابع النّاس علی الثلاث واختلفت النیّات واشکل البناء علی النیة حکم عمر بامضاء الثلاث و وافقه جمهور الصحابة فلیس حکمهٗ مخالفا للشرع الثابت ولا هو محمول علی مجرّد السیّاسة اذلا یظن باحدمن الصحابة فضلاً عن عمرانه یبدل حکما شرعیاّ سیاسة. (عمدة الرعایه ص ۷۱، ج. ۲)

روایت ابن عباس کے سلسلہ میں جس جوانب کو امام نووی نے ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ لوگ عہد نبوی اور اس کے بعد دور میں اپنی بیوی کو تین الفاظ سے طلاق دیا کرتے تھے اور اس سے ایک طلاق واقع کرنے کا ارادہ کرتے تھے جبکہ تین الفاظ کے ساتھ طلاق دینے کو محض تاکید للطلاق شمار کیا جاتا تھا اس بناء پر اس زمانے کے لوگوں کی نیت کی وجہ سے تین طلاقیں ایک شمار کی جاتی تھی پھر جب لوگوں کا اپنی بیوی کو تین الفاظ کے ساتھ طلاق دینے پر مداومت جاری رہی نیز اختلاف زمانہ کی بناء پر جب لوگوں کی نیتیں بھی مختلف ہوگئیں۔

جو لوگ تین کی نیت سے تین طلاق دیا کرتے تھے ایسے لوگوں کی کثرت ہوگئی تو حضرت عمرؓ نے یکبارگی تین طلاقوں کو تین ہونے کا فیصلہ فرمایا۔ جس کی تمام صحابہ کرام نے موافقت کی اس بناء پر یہ معلوم ہوا کہ حضرت عمر کا یہ فیصلہ شرعاً ثابت شدہ حکم کے مخالف نہیں ہے یہ مراد نہیں کہ حضرت عمر کا یہ فیصلہ محض سیاست پر محمول ہے اسلئے کہ کسی بھی صحابی رسول چہ جائیکہ خلیفۂ راشد حضرت عمر کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ وہ محض سیاست واحوال ناس کی بناء پر کسی شرعی حکم کو تغیّر وتبدل کردیں۔

عبارت بالا سے واضح ہوگیا کہ مولانا عبدالحئ لکھنوی کی طرف تین طلاقوں کے ایک واقع ہونیکی نسبت کرنا جھوٹ اور باطل کے سوا کچھ نہیں ہے۔

لہٰذا عمدۃ الرعایۃ کی پوری عبارت سمجھے بغیر ان کی طرف تین طلاقوں کے ایک واقع ہونے کی نسبت کرنا جھوٹ و باطل ہے۔

غیر مقلدین کا احناف پر ایک اور اعتراض اور اس کا جواب

غیر مقلدین ایک اعتراض یہ کرتے ہیں کہ تین طلاقوں کو تین واقع کر کے احناف حلالہ کو جائز قرار دیتے ہیں جبکہ حلالہ ناجائز اور ممنوع ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ احادیث کی روشنی میں مشروط طور پر حلالہ کرنا درست نہیں ہے مثلاً زوج یا زوجہ مطلقہ ثلاثہ کسی مرد سے اس شرط پر نکاح کرنے پر رضامند ہو کہ وہ نکاح کے بعد یا نکاح و ہمبستری کے بعد فی الفور یا چند روز کے بعد طلاق دے گا اس طرح شرائط کے ساتھ خواہ کسی جانب سے ہو حلالہ کرنا کرانا ناجائز و حرام ہے اس میں کسی کا اختلاف ہی نہیں۔

البتہ بلا شرط ایک شخص عورت مطلقہ ثلثہ کی عدت گزرنے کے بعد اگر اس سے نکاح کرتا ہے پھر زن وشوہر کے تعلق کے بعد وہ اپنی مرضی سے عورت کو طلاق دیتا ہے تو عدت گزارنے کے بعد وہ عورت زوج اوّل سے نکاح کر سکتی ہے اس میں حرمت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اسی طرح اگر زبانی شرط نہ کرے اور زوج ثانی کی نیت یہ ہو کہ حلالہ کر کے طلاق دیدیگا تا کہ زوج اوّل کا گھر برباد ہونے سے بچ جائے اور وہ دوبارہ شوہر کے گھر آباد کر سکے تو بھی جائز ہے اس میں بھی حرمت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اسی طرح زوج ثانی کے نکاح سے نکل کر عورت اگر زوج اوّل کے پاس نکاح میں جانا چاہے اور شرعی طریقے پر تدبیر کرے اور بوقت نکاح طلاق کا حق اپنے لئے لے لے تو بھی ناجائز نہیں ہے جیسا کہ حدیث رفاعہ سے ظاہر ہے کہ رفاعہ سے طلاق کے بعد عورت نے عبدالرحمٰن بن زبیر سے نکاح کرلیا اور اسے شوہر پسند نہ آیا۔ نبی علیہ السلام سے درخواست کی کہ وہ شوہر اول کے پاس جانا چاہتی ہے۔

تو آپ نے فرمایا کہ جب تک شوہر ثانی سے ہمبستری نہ ہو جائے اس وقت تک شوہر اوّل کے نکاح میں نہیں آسکتی۔

لہٰذا غیر مقلدین کا احناف پر یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ اور شرعی حلالہ کے جواز سے تین طلاقوں کے ایک طلاق ہونے پر استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

خلاصۃ البحث

الغرض مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر ایک مجلس میں تین طلاقیں دینے سے تین شمار ہوں گی اس کے خلاف ایک طلاق واقع ہونے کا قول ناقابل اعتبار ہے اور گمراہی ہے۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تین طلاقیں ایک وقت میں تین شمار ہوتی تھیں حدیث

رفاعہ، حدیث عجلانی حدیث ابن عمر بخاری کے حوالہ سے گزر چکی ہے۔

(۲) فقہاء صحابہ عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابوہریرہ، حضرت زید بن ثابت، حضرت مغیرہ بن شعبہ، حضرت عبادہ بن الصامت اور آل رسول محمد بن جعفر الصادق، حضرت حسن اور حسین کی اولاد کا مذہب وفتویٰ تین طلاقیں تین واقع ہونے پر ہے جیسا کہ باحوالہ تفصیلات گزر چکی ہیں۔

(۳) خلفائے راشدین ائمہ مجتہدین اور تابعین کے زمانے میں اسی پر فتویٰ ہوتا تھا کہ تین طلاقیں ایک مجلس میں تین طلاقیں واقع ہوں گی اس میں کسی ایک صحابی کا بھی اختلاف ثابت نہیں ہے۔

(۴) ائمہ مجتہدین، فقہاء ومحدثین امام ابوحنیفہ و مالک، شافعی و احمد کے علاوہ ان کے معاصرین امام سفیان ثوری، اوزاعی، لیث بن سعد وغیرہم کا متفقہ فیصلہ اور فتویٰ ہے کہ تین طلاقیں تین ہی واقع ہونگی خواہ ایک مجلس میں ہوں یا متعدد مجلس میں اسی طرح امام بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، طحاوی وغیرہم کی رائے بھی تین شمار ہونے کی ہے۔

(۵) عہد فاروقی سے مسلمانوں کے تمام زمانۂ خلافت وزمانۂ امارت میں فتویٰ اسی پر جاری ہوتا رہا ہے کہ تین طلاقیں ایک مجلس میں تین ہی شمار ہونگی۔

(۶) مسلم ممالک سعودیہ عربیہ، مصر، اردن، شام، الجزائر، کویت بحرین، یمن، پاکستان، انڈونیشیا، بنگلہ دیش کی عدالتوں میں اسی پر فیصلہ ہوتا ہے جمہور امت کے نزدیک صحابہ کرام اور ائمۂ اربعہ کا فتویٰ قابل قبول ہے غیر مقلدین کا نہیں۔

(۷) جملہ اہل سنت والجماعت کا مسلک یہی ہے کہ تین طلاقیں ایک مجلس میں تین ہی ہوں گی اس میں کسی جماعت مسلمہ کا اختلاف نہیں سوائے شیعہ امامیہ اور بعض اصحابِ ظاہر کے کمافی فتح الباری ص ۳۱۵، ج۔۹ وتبیین الحقائق۔

(۸) ابن عباس کی وہ روایات جو جمہور صحابہ کی روایت کے مطابق ہیں بمقابلہ اس روایت کے جو جمہور کے خلاف ہے قابل ترجیح ہونگی کیونکہ آپ کا فتویٰ جمہور کے موافق ہے۔

(۹) جمہور صحابہ کے اجماع، تابعین، ائمۂ مجتہدین، اہل فقہ ومحدثین کرام کے مقابلہ میں داؤد ظاہری، ابن تیمیہ، ابن قیم کی رائے کو نصوص شرعیہ کے مقابلہ میں رائے مذموم قرار دی جائیگی لہٰذا ناقابل اعتبار ہوگی۔

(۱۰) گزشتہ سال ۱۳۹۷ھ ہجری البحوث الاسلامیہ فی الریاض کے سولہ مفتیوں نے اسی فیصلۂ تین طلاق کو

مسلمانوں کے لئے قابل عمل اور سعودی حکومت کی عدالتوں کے لئے لازمی اور ضروری قرار دیا ہے ہمارے یہاں تمام مسلمانان بشمول غیر مقلدین اگر جمہور صحابہ کرام وتابعین اور ائمہ اربعہ کے فتویٰ کو قبول کرلیں تو بے شمار عائلی مسائل حل ہوجائیں گے اور عدالتوں کے لئے بھی کوئی پریشانی نہ ہوگی۔

وھٰذا صراطی و صراط جمیع المسلمین و التوفیق من اللہ وھو یھدی السبیل و صلی اللہ تعالیٰ علی نبیہ وسلم.

الجواب صحیح ولی حسن ٹونکی
رئیس دارالافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیہ
علامہ بنوری ٹاؤن کراچی۔

کتبہ محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
دارالافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیہ
نیوٹاؤن کراچی

۱۰/ذیقعدہ ۱۳۹۷ھ

عدالتوں کے غیر شرعی فیصلے پر تنقید کرنا توہین عدالت نہیں

☆ اس عنوان میں حکام یا عدالتوں کے غیر شرعی فیصلے پر تنقید کے جواز پر قرآن وسنت اور تاریخی روایات سے بحث کی گئی ہے۔

☆ عدالتوں کے غیر شرعی فیصلوں پر علماء کرام کی تنقید کو ان کا شرعی حق بتایا گیا ہے۔

☆ حکام اور عدالت کے قاضی اور ججوں پر تنقیدی حیثیت پر نظائر اور مثالیں دی گئی ہیں۔

عدالت کے غیر شرعی فیصلے پر تنقید کرنا توہین عدالت نہیں

فہرست:

۱: سوال: کیا موجودہ عدالتوں کے غیر شرعی فیصلے پر شرعی تنقید توہین عدالت ہے؟

۲: جواب: قرآن وسنت کے کسی قطعی حکم کے خلاف عدالتوں کے فیصلے کی شرعی حیثیت

۳: غیر شرعی فیصلہ کرنے والے جج اور قاضی کا حکم۔

۴: بچگانہ شبہ اور اس کا جواب

۵: عدالت کے غیر شرعی فیصلہ کی نشاندہی اور اس پر شرعی تنقید عدالت کے ججوں کے ساتھ خیر خواہی ہے۔

۶: علمائے اسلام کی جانب سے حکام اسلام پر دینی محاسبہ اور اس کے نظائر

۷: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرامؓ کو دینی محاسبہ کرنے کی تلقین کی ہے۔

۸: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود صحابہ کرامؓ کو اپنے اوپر دینی محاسبہ کرنے کی تلقین دی ہے۔

۹: حضرت عمرؓ اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہما کا واقعہ۔

۱۰: حضرت امیر معاویہؓ پر ابومسلم خولانی کا شرعی محاسبہ

۱۱: حاکم وقت اور عدالت کے قاضی کے فیصلوں کی اطاعت تب ہے کہ فیصلے میں ظلم اور خیانت نہ ہو۔

۱۲: عدالت کے قاضی اور ججوں کے فیصلوں پر شرعی تنقید توہین عدالت نہیں ہے۔

۱۳: امیر ولید بن یزید پر گورنر مدینہ سعد بن ابراہیم کا محاسبہ اور تنقید

۱۴: ابوموسیٰؓ پر ضبہ کا اعتراض

۱۵: امیر حجاج بن یوسف پر حضرت حسن بصریؒ کی تنقید اور محاسبہ

۱۶: عمر بن ہبیرہ پر حضرت حسن بصریؒ کی تنقید اور محاسبہ

۱۷: قاضی ابن ابی لیلیٰ کے عدالتی فیصلہ پر امام ابوحنیفہؒ کی شرعی تنقید۔

۱۸: خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر پر منذر بن سعید کی تنقید اور محاسبہ

۱۹: یحییٰ بن سعید پر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی شرعی تنقید اور دینی محاسبہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عدالت کے غیر شرعی فیصلے کی حیثیت اور ان پر تنقید کرنا توہین عدالت ہے، یا نہیں

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین درج ذیل مسائل کے بارے میں۔

(الف) کسی متفق علیہ شرعی حکم مثلاً حدّ زناء، حد سرقہ وغیرہ کے منکر کا شرعی حکم کیا ہے؟

(ب) اگر کوئی مسلمان یا کسی عدالت کا جج کسی متفق علیہ شرعی حکم کا انکار کرتا ہے یا عدالت کا فیصلہ کسی متفق علیہ شرعی حکم کے خلاف ہوتا ہے تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

(ج) خلاف شریعت فیصلے کے خلاف تنقید کرنا یا جج کے خلاف اور قرآن وسنت کی حمایت میں بیان دینا یا عدالت میں مقدمہ چلانے کی درخواست کرنا توہین عدالت ہے یا نہیں اور موجودہ توہین عدالت کا کوئی تصور شریعت اسلامیہ میں ہے یا نہیں؟

امید ہے کہ اس بارے میں مفصل جواب تحریر فرما کر ثواب دارین حاصل کرینگے۔

المستفتی: فیاض حسین حیدرآباد سندھ۔ ۲ شعبان المعظم ۱۴۰۳ھ

الجواب

(الف) صورت مسئولہ میں شریعت کے کسی قطعی اور متفق علیہ حکم مثلاً حد زنا، حد سرقہ وغیرہ کا انکار کرنا موجب کفر ہے لہٰذا جو شخص قرآن وسنت سے ثابت شدہ اور قطعی اور متفق علیہ حکم کا انکار کرتا ہے تو اس سے وہ کافر ہو جائے گا اور اس کا نکاح ٹوٹ جائے گا اس پر تجدید ایمان اور تجدید نکاح کرنا لازم اور واجب ہوگا اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اسلامی قانون کے مطابق یہ شخص مرتد ہے واجب القتل قرار پاتا ہے مرنے کے بعد اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی اور اس کو مسلمانوں کے مقبرے میں دفنایا نہیں جائے گا ان مذکورہ امور پر تفصیلی بحث بندہ کا مضمون ''رجم اور اس کی شرعی حیثیت'' میں مل جائیگی اور رسالہ ''بینات'' رجم نمبر طبع شدہ ۱۴۰۱ھ ماہ رجب وشعبان کے شمارہ میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

(ب،ج)

قرآن وسنت کے کسی قطعی حکم کے خلاف فیصلہ دینے کی شرعی حیثیت

واضح رہے کہ قرآن وسنت کے کسی واضح فیصلہ کے بعد کسی مسلمان کو اس بات کا اختیار ہی نہیں ہے کہ وہ اسے پس وپشت کرے یا اس میں کسی قسم کی رائے زنی کرے یا اسے مانننے سے انکار کرے جس کے دلائل یہ ہیں:

سورۂ نساء کی آیت نمبر ۶۰ میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے

"ألم ترالى الّذين يزعمون أنّهم اٰمنوا بما أنزل اليک وما أنزل من قبلک يريدون ان يتحاكموا الى الطاغوت وقد أمروا أن يكفر وابه ويريد الشيطان أن يضلّهم ضلالا بعيدا."

آیت مذکورہ کے تحت صاحب التشریع الجنائی عبدالقادر عودہ مصری لکھتے ہیں:

فمن يتحاكم الىٰ غير ماأنزل الله وما جآء به الرسول فقد حكم الطاغوت ويتحاكم اليه والطاغوت هو كلّ ماتجاوز به العبد محلّه من معبود اومتبوع اومطاع فطاغوت كل قوم من يتحاكمون اليه غير اللّٰه ورسوله. أو يعبدونه من دون اللّٰه او يتّبعونه علىٰ غير بصيرة من الله فمن اٰمن باللّٰه ليس له أن يؤمن بغيره ولا أن يقبل غير حكمه (ص ۲۲۷ اعلام الموقعين ص ۵۶، ج۔ ۱)

جولوگ قرآن وسنت کے خلاف فیصلہ کسی دوسرے کے پاس لے جاتے ہیں وہ گویا طاغوت اور شیطان کے پاس جاتے ہیں اور طاغوت سے مراد وہ طاقت ہے جو بندہ قرآن وسنت سے تجاوز کر کے اپنے لئے مانتا ہے خواہ وہ اس کو معبود بنائے یا قابل اتباع اور قابل اطاعت سب طاغوت میں داخل ہیں تو ہر قوم کی طاغوت وہ ہوتی ہے یا وہ ذات ہے جس کو وہ اپنے فیصلے کے لئے قرآن وسنت کے خلاف اختیار دیتی ہے خواہ یہ لوگ غیر شعوری طور پر اس کی عبادت کرتے ہوں یا صرف اتباع اور اطاعت کرتے ہوں لہٰذا جو شخص اللہ کی ذات پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیئے کہ اللہ اور اس کے احکام کے سوا کسی دوسرے پر یقین نہ کرے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:

ان اللّٰہ لم یجعل لمؤمن ولا مؤمنة ان یختار لنفسه اویرضیٰ لها غیر اختیار اللّٰہ و رسوله ومن تخیر غیر ذالک فهو ضالٌ لم یعرف الا یمان لقلبه سبیلا لقوله تعالیٰ "وما کان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضی اللّٰہ و رسوله امراً اَن یکون لهم الخیرة من امرهم" (سورہ احزاب ۳۶)

بے شک اللہ تعالیٰ نے کسی مومن بندہ یا مومن بندی کو یہ اختیار ہی نہیں دیا کہ وہ اپنی ذات کے لئے اللہ اور اس کے رسول کے پسندیدہ حکم کے سوا کسی دوسرے حکم کو اختیار کرے۔ اگر کوئی بندہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مقابلہ میں دوسرا حکم اختیار کرتا ہے تو وہ گمراہ ہے اس کے دل میں ایمان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کسی مومن بندہ یا بندی کو اس بات کا اختیار ہی نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کے رسول کا حکم آجاوے تو اس کو اختیار کرنے یا نہ کرنے پر کچھ فیصلہ کرلے بلکہ اس پر لازم ہوجاتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر عمل کرے۔

غرض یہ کہ اگر کسی معاملہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قطعی فیصلہ آجائے تو کسی مومن یا مؤمنہ کے لئے اس بات کا حق نہیں ہے کہ اپنے نفس کے لئے اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ کے خلاف کوئی فیصلہ کرے۔

ظاہر ہے کہ جب کسی فرد کو ذاتی طور پر اس بات کا اختیار نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے کے خلاف اپنے اختیار سے فیصلہ کرلے تو بحیثیت قاضی دوسروں کے لئے شریعت کے خلاف فیصلہ کس طرح دے سکتا ہے رجم کے بارے میں احادیث متواترہ اور اجماع امت کی رو سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ موجود ہے جس کی تفصیلات اور احکام اگر کتب متداولہ کے نہ جاننے کی وجہ سے معلوم نہیں ہوسکتیں تو ماہنامہ "بینات" کے رجم نمبر سے معلوم ہوسکتی ہیں۔

غیر شرعی فیصلہ کرنیوالے قاضی اور فیصلہ حاصل کرنیوالے کا حکم

اگر کوئی قاضی یا فیصلہ طلب کرنے والا قرآن وسنت کے خلاف فیصلہ کرتا ہے یا کرواتا ہے اور وہ اس پر راضی اور خوش ہے تو پھر غیر شرعی فیصلہ کرنے والا قاضی اور فیصلہ طلب کرنے والا مدعی مومن نہیں رہتا اس پر بے شمار نقول موجود ہیں لیکن یہاں پر چند نقول اختصار کے ساتھ پیش کردی جاتی ہیں۔

چنانچہ التشریع الجنائی میں لکھا ہے۔

فاذا أمر الله باتباع الرسول و اتباع ماأنزل علیٰ رسوله ونهیٰ عن اتباع غيره فليس لمؤمن أن يرضیٰ بغير ماأنزل الله فان رضي عنه واختاره لنفسه فهو غير مؤمن. (ص ۲۲۷، ج. ۱)

جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا ہے اور اس کے سواء کسی دوسرے کی اتباع واطاعت سے منع کیا ہے تو کسی مومن کے لئے یہ حق ہی نہیں ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے کے خلاف کسی فیصلہ پر راضی ہوجائے اگر کوئی شخص اللہ کے رسول کے فیصلہ کے خلاف کسی فیصلہ پر راضی ہوجاتا ہے تو پھر وہ شخص مومن نہیں رہتا۔

غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہر اس شخص کو جو لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتا ہے یہ حکم دیا ہے کہ ماأنزل الله علیٰ الرسول یعنی قرآن اور سنت کے مطابق فیصلہ کرے اور جو شخص اس کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا وہ کافر ہے ظالم ہے اور فاسق ہے دیکھئے (سورۃ مائدہ ۴۴/۴۷) اور اس پر امت کا اتفاق ہے کہ جو لوگ ما أنزل الله علیٰ الرسول صلى الله عليه وسلم کے فیصلہ کے مطابق راضی اور خوش نہیں ہیں یا اس کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے بلکہ اپنے لئے اور کوئی شریعت یا اور کوئی قوانین تلاش کرتے ہیں ان کے اس عمل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو کافر ظالم فاسق قرار دیتے ہیں۔

دیکھئے التشریع الجنائی ص ۲۲۸۔ ج۔۱) آگے جا کر صاحب التشریع الجنائی واضح الفاظ میں لکھتے ہیں۔

فمن أعرض عن الحكم بحد السّرقة أو القَذف أو الزّناء لانه يفضل غيره من أوضاع البشر عليه فهو كافر قطعاومن لم يحكم لعلّة أخریٰ غير الجحود و النكران فهوظالم ان كان فی حكم مضيعا للحقّ أوتار كالعدل أو مساواة والا فهو فاسق رتفسير المنازص ۴۰۵، ج. ۲ روح المعانی ص ۱۴۵، ج. ۲ تفسير قرطبی ص ۱۵۰، ج. ۶، تفسير طبری ص ۱۱۹، ج. ۶، بحواله التشريع الجنائی ص ۲۲۸، ج. ۱

مطلب یہ ہے کہ جس نے حد سرقہ، حد قذف، حد زنا سے اعراض کیا اور اس کا انکار کیا ہے اور اس کی جگہ دوسری سزا تجویز کرتا ہے تو اس نے گویا قرآنی فیصلہ کے مقابلے میں دوسرے قانون کو برتری اور ترجیح دی ہے تو ایسا شخص پکا کافر ہے لیکن جس نے کسی اور وجہ سے قرآنی فیصلہ کے مطابق فیصلہ نہیں کیا نہ کہ انکار

اور اعراض کی بنا پر تو یہ شخص اگر چہ کافر نہیں لیکن پکا فاسق اور فاجر ہے جس سے معلوم ہوا کہ جو شخص...... حد زنا، رجم (سنگسار) یا جلد (یعنی کوڑے لگانا) اور حد سرقہ (قطع ید)، حد قذف کا انکار کرے گا وہ قطعی کافر ہے اور جو شخص حدود کو حدود تسلیم کرتا ہے لیکن انکار کیے بغیر کسی اور وجہ سے اس کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا وہ ظالم اور فاسق ہے۔ سورہ نساء کی آیت نمبر ۶۵۔

"فلا وربّک لایؤمنون حتّی یحکموک فیما شجر بینهم ثم لایجدوا فی انفسهم حرجاممّا قضیت ویسلّموا تسلیما"

ترجمہ: قسم ہے تیرے رب کی یہ لوگ ہرگز مومن نہیں بن سکتے جب تک اپنے جھگڑوں اور فیصلوں میں آپکو حکم اور فیصل تسلیم نہیں کرتے۔

اس سے جمہور مفسرین اور فقہا نے استدلال کیا ہے کہ جو شخص اللہ یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی حکم کو رد کرتا اور اس کے مقابلہ میں دوسرا کوئی فیصلہ کرتا ہے وہ خارج از اسلام ہے خواہ رد کرنا شرک کی بناء پر ہو یا ترک قبول اور عدم تسلیم کی بناء پر ہو۔

چنانچہ احکام القرآن میں ہے۔

ولقد حکم الصحابة بارتداد مانعی الزکوٰة لان اللّٰه حکم بأن من لم یسلم بما جآء به الرسول ولم یسلم بقضائه وحکم فلیس من أهل الایمان.

(ص ۲۱۴، ج. ۲، اعلام الموقعین ص۵۸. ۵۷، ج. ۱، التشریع الجنائی ص ۲۳۱، ج. ۱)

یعنی صحابہ کرام نے مانعین زکوٰۃ کے بارے میں ارتداد کا حکم دیا ہے اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ دیا ہے کہ جو شخص رسول کے فیصلے کو تسلیم نہیں کرتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بتایا اس کو نہیں مانتا تو وہ اہل ایمان میں سے نہیں ہے۔

نیز احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے کہ حکام اسلام اور عدلیہ کی اطاعت اس وقت ہے جبکہ وہ قرآن وحدیث کے مطابق فیصلہ کریں اگر وہ اس کے خلاف فیصلہ کریں تو ان کی اطاعت جائز نہیں۔

۱: قال علیه الصلاة والسّلام: انما الاطاعة فی المعروف ولاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق ومن أمر بمعصیة فلاسمع ولا طاعة.

مطلب یہ ہے کہ اطاعت امر معروف میں ہے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہے جب کوئی حاکم یا امیر گناہ کا حکم دے نہ اسے سننا ہے نہ اس پر عمل کرنا ہے۔ صاحب التشریع الجنائی دوسری

جگہ پر تحریر فرماتے ہیں کہ حکام اسلام اور عدالت کے قضاۃ جب مجمع علیہ احکام میں تبدیل وترمیم کرنے لگیں اور حدود شرعیہ کو باطل کرنے لگیں اور ضروری احکام شرع کو معطل کردیں جس کی اجازت اللہ اور اس کے رسولؐ نے قطعاً نہیں دی تو یہ صریح کفر اور گمراہی ہے ایسے موقع پر تو حاکم کے خلاف خروج اور مخالفت ضروری ہو جاتی ہے اور جس کا کم از کم درجہ حکام ظالم ونافرمان کے اوامر ونواہی کی مخالفت کرنا ہے دیکھئے احکام القرآن للجصاص ص ۲۱۴، ج۔۲، تفسیر روح المعانی ص ۶۶، ج۔۵، التشریع الجنائی ص ۲۳۴، ج۔۷

ان حوالہ جات سے یہ ثابت ہوا کہ جو حکام کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے بلکہ اس میں تحریف وتبدیل کرتے ہیں اور کتاب اللہ وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مجمع علیہ مسائل کے خلاف قوانین بنا کر مسلمانوں کے اوپر تنقید کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ان کی اطاعت مسلمان رعایا پر بالکل واجب نہیں ہے، بلکہ ان کی مخالفت کرنا ضروری ہے۔'' ظاہر ہے کہ جو جج صاحبان رجم جیسی شرعی حد اور اس طرح کے اجماعی مسائل کے خلاف فیصلے دیتے ہیں یا نافذ کرتے ہیں قانون شریعت میں ان کی کیا وقعت ہوگی؟ اس واسطے قرآن وحدیث کی رو سے ایسے جج صاحبان کی شرعی حیثیت کو بیان کردینا توہین عدالت نہیں ہے بلکہ عدالت شرعیہ سے غیر شرعی فیصلے صادر ہونے کی وجہ سے عدالت کی جو شرعی حیثیت تھی وہ متاثر ہورہی تھی ان پر تنقید کرنا عدالت کی شرعی حیثیت کو تحفظ دینے کی نیک کوشش ہے۔ اور علماء کرام کے اوپر عائد شدہ دینی فریضہ اور شرعی محاسبہ کی ذمہ داری کو پورا کرنیکی جائز جدوجہد ہے اور ایسے شرعی محاسبہ سے کسی جج کی شخصی توہین یا عدالت شرعیہ کی تحقیر مقصد نہیں ہوتی بلکہ اس سے مقصد حکام بالا اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو احساس دلانا ہوتا ہے کہ وہ شرعی تقاضوں کو ادا نہیں کر رہے ان کو چاہیئے کہ وہ شرعی عدالت اور شریعت کورٹ کے تقاضوں کو پورا کریں ورنہ اس عدالت شرعیہ کے اچھے اثرات نکلنے کی جگہ معاشرہ میں اس کے بُرے اثرات مرتب ہوں گے اور اس سے گمراہی پھیلے گی فساد ہوگا۔

لہٰذا ایسے غلط فیصلے کرنے والے قاضی اور جج صاحب کا محاسبہ کرنا علماءِ حق اور فقہاء اسلام کے شرعی اور دینی فریضہ میں داخل ہے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

یہاں ایک شبہ پیدا ہوسکتا ہے جس کا ازالہ ضروری ہے وہ یہ کہ حکومت نے جب اسلامی قوانین کی ں اور اس کی تنفیذ کے لئے ادارے قائم کیے اور اس کے محاسبہ کے لئے نظریاتی کونسل، وفاقی شریعت کورٹ، وفاقی سپریم کورٹ کے ذمہ دار حضرات موجود ہیں تو ان اداروں سے غیر منسلک عالم دین مفتی کو

پھر بھی محاسبہ کرنے کا حق پہنچتا ہے؟

اس شبہ کو دور کرنے کے لئے عرض کیا جاتا ہے کہ ایک مسلمان کے لئے دوسرے مسلمان کا دینی محاسبہ کرنا دین کی خیر خواہی ہے اور قرآن وحدیث نے ہر مسلمان کو عموماً اور علماء وفقہاء کو خاص طور پر اس کا حکم کیا ہے قرآن کریم کے آخری پارہ میں سورۃ العصر میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ تمام انسان خسارے میں ہے مگر جو ایمان لا چکے اور عمل صالح کئے اور حق کی وصیت کی اور صبر کی تلقین کی۔

اس میں تواصی بالحق کی تفسیر میں علماء نے لکھا ہے کہ:

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا اور نیکیوں کی ہدایت کرنا اور برائی کی نشاندہی کر کے ان سے لوگوں کو بچانا بھی شامل ہے۔

عن تميم الدّاری رضی اللّٰه عنه قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم: ألدّين النصيحة قلنا لمن قال للّٰه ولكتابه ولرسوله ولأ ئمة المسلمين.

(رواه مسلم ص ۵۴، ج. ۱)

تمیم داریؓ سے روایت کردہ یہ حدیث ان چار احادیث میں سے ہے جن کا تعلق پورے ابواب دین سے ہے حدیث کی تشریح کے لئے تو ایک کتاب چاہیئے لیکن یہاں پر یہ بتانا مقصود ہے کہ دین وشریعت خیر خواہی کا نام ہے:

(۱) اللہ تعالیٰ کے ساتھ خیر خواہی تو یہ ہے کہ اس کی ذات وصفات میں کسی کو شریک نہ کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کی جائے اور اس کی نافرمانی سے اجتناب کیا جائے اور کتاب اللہ کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ اس پر یقین کیا جائے اس کے الفاظ ومعانی وتشریحات واحکام ومضامین پر ایمان لایا جائے اور کتاب اللہ میں دیئے ہوئے احکام پر عمل کیا جائے اور اس کے تقاضوں کو پورا کیا جائے اور قرآن کے الفاظ ومعانی اور اس میں بیان کردہ شرائع واحکام کا انکار نہ کیا جائے اور اس پر عمل کرنے سے گریز نہ کیا جائے۔ کتاب اللہ کی اشاعت وتبلیغ میں کوتاہی نہ کی جائے اس کی توزیع وتبلیغ میں رکاوٹیں کھڑی نہ کی جائیں۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خیر خواہی یہ ہے کہ ان کی رسالت پر ایمان لایا جائے اور ان کی لائی ہوئی شریعت کو واجب العمل اور ان کی ذات کو واجب الاتباع تسلیم کیا جائے پھر پورے دین و شریعت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عمل کیا جائے اور کرایا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت میں سے کسی حکم شرعی کا انکار نہ کیا جائے نہ

ہی اسے نا قابل عمل قرار دیا جائے جتنا ہو سکے خود بھی اس پر عمل کرے اور دوسروں سے بھی عمل کروائے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی جائے نافرمانی اور سرتابی سے پرہیز کیا جائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کی حمایت ونصرت کی جائے اس کی مخالفت اور نافرمانی نہ کی جائے۔

(۳) آئمۃ المسلمین کی خیرخواہی یہ ہے کہ جب تک وہ خدا اور رسول کی اطاعت کریں اور قرآن وسنت کے مطابق عمل کریں اور احکام شرعیہ نافذ کریں ان کی اطاعت کی جائے ان کی نصرت اور حمایت کی جائے اور جب وہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرنے لگیں قرآن وسنت کے خلاف احکام نافذ کرنے لگیں تو ان کا محاسبہ کیا جائے ان کو تابہ امکان صحیح اور درست کرنے کے لئے کوشش کی جائے ان کو أمر بالمعروف نہی عن المنکر کیا جائے ،قرآن کریم میں بھی اللہ تعالیٰ نے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے: جس کا ترجمہ یہ ہے۔

''امت میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو خیرخواہی کی دعوت دے اور نیکیوں کا حکم دے اور برائیوں سے روکے۔''

اسی فرض کو بجالانے کے لئے علماء امت بحیثیت وارث انبیاء ہونے کے زیادہ حق دار ہیں۔

قال علیہ السلام: العلماء ورثۃ الانبیآء

وقال علیہ السلام: علمآء أمتی کا نبیآء بنی اسرائیل

چونکہ دین خیرخواہی کا نام ہے اس لئے احادیث مذکورہ کی رو سے تو پوری امت کو عموماً اور علماء کو خصوصاً اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ نیکی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکیں ایک مسلمان بھائی غلطی کر رہا ہو تو اس غلطی کی نشاندہی کریں اور صحیح صورت حال بیان کردیں۔

عن ابی سعید الخدری عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من رای منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ و ذالک اضعف الایمان (رواہ مسلم)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص امر منکر یعنی خلاف شریعت بات کسی سے دیکھے تو اس کو ہاتھ سے روکے اگر ہاتھ سے نہیں روک سکتا تو زبان سے روکے اور اگر زبان سے بھی نہیں روک سکتا تو دل سے برا جانے اور یہ انتہائی ضعف ایمان کا درجہ ہے۔

(رواہ مسلم، بحوالہ مشکوۃ)

حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حدود اللہ اور شرعی احکام کے خلاف ورزی ہونے پر جو شخص مداہنت کرتا ہے وہ بھی خلاف ورزی کرنے والے کے حکم میں ہے۔ الحدیث (مشکوٰۃ ص ۴۳۶)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے ہوئے سنا کہ جب لوگ کسی امر منکر کو دیکھیں اور اس سے نہ روکیں تو بہت ممکن ہے کہ ان سب پر عذاب عام آجائے۔ (ترمذی، ابن ماجہ، بحوالہ مشکوٰۃ ص ۴۳۶)

ان نصوص شرعیہ اور روایات مذکورہ سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر طبقہ بہ طبقہ ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے اگر برابر کے لوگ اپنی ذمہ داری پوری نہیں کر رہے تو دوسرے لوگوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس فریضہ کو ادا کریں۔

با اختیار حکام اور با اثر لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا اور ان سب کا محاسبہ کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ یہ ظالم اور جابر کے جابرانہ اختیارات کو چیلنج کرنا ہے جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أعظم الجهاد كلمة حق عند السلطان الجائر . (ترمذی ص ۴۰، ج ۲)

عہد اسلام کے زریں ادوار میں ہمیشہ علماء حق اور فقہاء اسلام نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور حکام کا محاسبہ کرنے کے دینی فرائض کو باحسن وجوہ اور اتم طریقوں سے ادا کیا لیکن حکام پر اس دینی محاسبہ اور شرعی امور میں ان پر جرح کرنے کو خیر القرون یا اس کے بعد کی کسی شرعی عدالت نے ان کو توہین عدالت یا توہین جج کا عمل قرار نہیں دیا وہاں اسلامی دور کے بعض ظالم حکام نے بعض علماء حق کو شرعی محاسبہ پر ناجائز طور پر غیر شرعی جابرانہ اقتدار کے تحت سزا بھی دی ہے۔

چونکہ اسلام میں موجودہ مروجہ قانون توہین عدالت (کہ عدالت اگر خلاف شرع فیصلہ کرے تو اس پر اعتراض کرنا بھی توہین ہے) کا کوئی تصور نہیں ہے اس لئے جب بھی علماء حق اور فقہاء اسلام نے حکام کا محاسبہ کیا اور ان پر جرح کی تو حکام اسلام اور برسر اقتدار مسلمان افراد نے ان کے محاسبہ کو صحیح اور شرعی جرح سمجھا اور اس کو سنا اور اس پر عمل کرتے ہوئے اپنے نظام مملکت میں اصلاحات کی کوشش کیں اور ان محاسب علماء حق اور فقہاء اسلام کی دینی تنقید اور شرعی محاسبہ کو نہ صرف سراہا بلکہ تنقید کرنے والے علماء حق کو انعامات اور اعزازات سے نوازا ہے۔ تفصیلات کتب تاریخ میں موجود ہیں۔

علماءِ حق کیجانب سے حکّام اسلام پر دینی محاسبہ اور شرعی جرح پر چند نظائر

امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک باب باندھا ہے۔
(اذا قضیٰ الحاکم بجور أو خلاف اهل العلم فهو ردٌّ)
اس باب کے تحت حدیث نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

عن ابن عمر رضی اللّٰه عنه قال بعث النبی صلی اللّٰه علیه وسلم، خالد بن الولید الیٰ بنی خذیمة فدعاهم الیٰ الاسلام فلم یحسنوا أن یقولوا أسلمنا فجعلوا یقولون صبأنا صبأنا فجعل خالد یقتل ویأسرو دفع الیٰ کل رجل منّا أسیره حتّی اذا کان یوم أمر خالد أن یقتل کلّ رجل منّا أسیره فقلت واللّٰه لا أقتل أسیری ولا یقتل رجل من أصحابی أسیره حتّی قد منا علیٰ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فذکرناه له فرفع النبّی صلی اللّٰه علیه وسلم یده فقال اللّٰهمَّ انّی أبرأ الیک ممّا صنع خالد. (بخاری ص ۱۰۶۶، ۶۲۲، ج۲)

حدیث مذکور میں خالد بن ولید امیر لشکر تھے جن کی اطاعت تمام سپاہیوں کے لئے ضروری امر تھا چنانچہ کسی جنگی مہم کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید کو امیر لشکر بنا کر بھیجا اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطاء فرمائی دشمن کو شکست ہوگئی بہت سے لوگ قیدی بن کر آگئے اور ان قیدیوں میں سے بہت سے لوگ اسلام قبول کرنے پر رضا مند ہوگئے انہوں نے کہا "صبأنا" یعنی ہم نے اپنا دین بدل دیا لیکن خالد بن ولید کو غلط فہمی ہوگئی انہوں نے بعض قیدیوں کی جانب سے اسلام قبول کرنے کے باوجود صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے اسلام کا لفظ استعمال نہیں کیا اور اسلام قبول کیا کی جگہ پر "صبأنا" دین بدل دیا کہا ہے خالد بن ولید نے ان قیدیوں کو قتل کرنے اور قید ہی میں رکھنے کا حکم دیا تو عبداللہ بن عمر جو کہ فقہاء صحابہ میں سے تھے انہوں نے امیر لشکر کے اس حکم کو ماننے سے انکار کیا اور انہوں قتل کرنے اور قید میں رکھنے کی بھرپور مخالفت کی اور پوری فوج میں یہ اعلان کر دیا کہ ہم انہیں نہ قتل کریں گے نہ قید میں رکھیں گے اس طرح یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ کو جب حضرت خالد بن ولید کا حکم اور حضرت عبداللہ بن عمر کی مخالفت کا علم ہوا تو آپ نے عبداللہ بن عمر کی تصدیق اور توثیق فرمائی اور حضرت خالد پر

ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا اے اللہ میں اس چیز سے بری ہوں جس کا خالد نے ارتکاب کیا ہے۔

دیکھئے اسی روایت میں خالد بن ولید امیر لشکر تھے ان پر اعتراض اور مخالفت کرنے والے ایک جلیل القدر صحابی عبداللہ بن عمر تھے حضرت خالد بن ولید نے نہ صرف یہ کہ عبداللہ بن عمر پر کوئی نکیر نہیں کی بلکہ معاملہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے جانے پر اور وہیں یہ فیصلہ لے جانے پر رضامند ہو گئے پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید پر اظہار ناراضگی فرمائی تو حضرت خالد بن ولید نے اپنے فیصلے سے نہ صرف رجوع کیا بلکہ آپ نے توبہ واستغفار کی جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آج بھی کوئی حاکم یا امیر یا قاضی قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کے خلاف فیصلہ کرتا ہے تو علماء کو اس بات کا نہ صرف حق ہوتا ہے کہ اس پر حکام اور امراء اور قاضیوں کو متنبہ کریں بلکہ ان پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ ایسے غیر شرعی حکم کی کھل کر مخالفت کریں اور حکام کو چاہیئے کہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کریں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ان کے فیصلے قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کے خلاف ہیں تو بلا تاخیر اس سے رجوع کریں اور دربار خداوندی میں توبہ واستغفار کریں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے صحابہ کرام کو محاسبہ کرنیکی تلقین فرمائی

(۱) خطب خليفة رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول عند ما استلم الحكم فان احسنت فأعينوني وان اسأت فقوّموني، اطيعوني ما اطعت الله و رسوله فيكم. (ألا سلام بين العلماء و الحكّام ص ۷۰)

خلیفۂ رسول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب عنان حکومت سنبھالا تب خطبہ دیتے ہوئے فرمایا اگر میں کار حکومت صحیح چلاتا ہوں تو تم میری اعانت کرو اور اگر غلط کرتا ہوں تو مجھے سیدھا کرو اور جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہوں تو تم لوگ میری باتوں کو مانو اور اس پر عمل کرو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی صحابہؓ کرام کو محاسبہ کرنیکی تلقین فرمائی

(۲) الخليفة الثانى وأمير المؤمنين عمر بن الخطاب يقول من رأى منكم فيّ اعوجا جافليقوّم. (الاسلام بين العلماء والحكام ص ۷۰)

خلیفہ ثانی امیر المومنین عمر بن الخطاب نے خلیفہ ہونے کے بعد خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تم میں سے

کوئی شخص اگر میرے اندر کوئی کمی یعنی دین کے راستہ سے انحراف ہوتے ہوئے دیکھے تو فوراً مجھے ٹھیک کردے۔

دیکھئے مذکورہ بالا دونوں روایات میں خلیفۂ اوّل وخلیفۂ ثانی کا حکم یہ ہے کہ کارِ حکومت میں اگر کہیں خلافِ شرع غلطی واقع ہوجائے تو تاخیر نہ کی جائے بلکہ فوراً ٹوکا جائے اور محاسبہ کیا جائے۔

واضح رہے کہ خلیفۂ اوّل اور خلیفہ ثانی کے حکم پر عمل کرنا توہین عدالت نہیں ہے بلکہ شرعی ذمہ داری ہے اور ان کے حکم پر عمل نہ کرنا بے دینی اور دین سے انحراف ہے چنانچہ علماء نے کہا ہے۔

الاسلام أوجب على الحاكم الّذى يتولى أمر المسلمين أن يسمع لمن يحاسبه وأن يفسح لذالک كما أمره أن يخضع لهذا المحاسب ان كان موافقالأ حكام الاسلام ومنعه من عقاب يفوضه علىٰ أىّ فردمن أجل هذه المحاسبة ولوجاء ت شديدة والقول فيها غليظة.

(الاسلام بين العلماء والحكام ص ۷۰)

مطلب یہ ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کے اوپر حکومت کرنے والے شخص کو حکم دیا ہے کہ وہ محاسبہ کرنے والی رعایا کی بات سنے اور اس کو موقع دے جیسا کہ اس کو حکم دیا گیا ہے کہ محاسبہ کرنے والا یا تنقید کرنے والا اگر موافق شریعت تنقید کرتا ہے تو اس کے سامنے سر تسلیم خم کرے اور اس کو منع کیا گیا ہے کہ محاسبہ اور تنقید کی وجہ سے ناقد اور محاسب پر کسی قسم کی سزا دے اگرچہ تنقید کیسی ہی سخت کیوں نہ ہو۔"

جس سے معلوم ہوا کہ حاکم وقت پر فریضہ عائد ہوتا ہے کہ ان کے اوپر محاسبہ کرنے والے اور تنقید کرنے والوں کی تنقید اور اعراض کو سنے اگر محاسبہ قرآن وسنت کے مطابق ہے تو اسے بدل وجان خندہ پیشانی سے قبول کرے اور اس پر کسی قسم کی سختی نہ کرے اور نہ بدلہ لینے کی کوشش کرے اگرچہ محاسبہ میں سخت بات کہی گئی ہو۔

(۴) قال الأعرابى والله يا عمر لورأينا فيک اعوجا جالقومناه بحدّ سيوفنا فيومن عمر بن الخطاب لقوله ويحمد الله مسروراً من هذا الجواب (قال الحمد لله الذى جعل فى أمة محمد صلى الله عليه وسلم من يقوّم عمر بسيفه). فسيّدنا عمر يرضى بتقويم اعوجاجه. (الاسلام بين العلماء والحكام)

مطلب یہ ہے کہ ایک دیہاتی مسلمان نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا اے عمر! اگر تمہارے اندر کسی قسم کا ٹیڑھاپن دیکھا تو ہم اسے اپنی تلوار سے سیدھا کردیں گے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس پر خوش

ہوتے ہیں اور خوشی میں اس کی تعریف کرتے ہیں کہ تمام تعریفیں اللہ کی ذات کے لئے ہیں کہ جس نے اس امت میں ایسے لوگ پیدا کئے ہیں کہ جو (حضرت) عمر کی غلط روش کو تلوار سے سیدھا کر دیں گے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ محاسبہ کرنے والوں کی شدّت پر امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ سزا کیا دیتے آپ نے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا۔

(۵) أوصیٰ أمیر المؤمنین سیّدنا علی بن أبی طالب رضی الله عنه جمیع ولاته أن یقبل محاسبة من حاسبهم مادام فی تلک المحاسبة طاعة اللّٰه فقال فطوبیٰ لذی قلب سلیم أطاع من یهدیه وتجنب الرّدعلیه وأصاب السّلامة یبصرمن بصر وطاعتها وأمر (الاسلام بین العلماء والحکام ص ۷۱)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تمام گورنروں کو حکمنامے بھیجے کہ جس محاسبہ میں رضائے الٰہی مقصد ہو اس کو قبول کیا جائے حاکم پر اگر کسی فرد کو اعتراض ہو تو چاہیئے کہ اس کے اعتراض کو سنے اگر اعتراض صحیح ہو تو اس کو قبول کرتے ہوئے اس کی اصلاح کرے اعتراض کرنے والے کے لئے دعا کرے اگر اعتراض صحیح نہیں تو اس کی وضاحت کرے، آپ نے فرمایا خوشخبری ہے اس سلیم الطبع شخص کے لئے جس نے اپنے رہنما کی اطاعت کی اور اس پر نکیر کرنے سے احتراز کیا اور سلامتی کا راستہ اختیار کیا دیکھنے والے کے دیکھنے پر چلا اور راستہ بتانے والے کے راستہ پر چلا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وصیت میں حکام پر اعتراض کرنے کو توہین عدالت قرار نہیں دیا اس میں اعتراض کرنے پر توہین کی سزا کا ذکر نہیں فرمایا نہ اس پر کسی قسم کی سزا عائد کرنے کی ہدایت کی جس سے معلوم ہوا کہ حکام میں سے کسی حاکم یا جج پر اعتراض کرنا توہین عدالت نہیں ہے نہ ہی توہین جج یا توہین حاکم ہے بلکہ یہ ایک دینی خیر خواہی ہے اور حاکم اور جج کے واسطے ناصحانہ عمل ہے اس سے خیر خواہی کرنے والا مستحق اجر ہوتا ہے اور تنقید اور محاسبہ کو قبول کرنے والا بھی لائق تحسین ہوتا ہے اور مستحق اجر ہوتا ہے جب صحیح رہنمائی کو قبول کرے اور اس پر عمل کرے لیکن حاکم یا جج کے غلط فیصلہ پر اعتراض کرنے والا کبھی بھی شرعاً اس اعتراض کی وجہ سے سزا کا مستحق نہیں ہوتا۔

حضرت عمرؓ اور سلمان فارسیؓ کا واقعہ ملاحظہ ہو

حکّام پر جائز اسباب کی بنیاد پر اعتراض کرنا دین کے خلاف نہیں ہے خواہ یہ اعتراض صرف معقول شبہ کی بناء پر کیوں نہ ہو دیکھیئے حضرت سلمان فارسیؓ نے حضرت عمرؓ پر محض شبہ خیانت پر کیسے اعتراض کیا ہے۔

كانت من جملة غنائم المسلمين أبراديمانية فقام أمير المؤمنين عمر رضى اللّٰه عنه يقسم هذه الغنائم بالعدل وقد أصابه منها برد كما أصاب ابنه عبداللّٰه مثل ذالک ولما كان سيّدنا عمر رضى الله عنه بحاجة الٰى ثوب وهو الطّويل فى الجسم فقد تبرّع له عبداللّٰه ببرد ليصنع منها ثوبا يكفيه ثم وقف يخطب الناس وعليه هذا الثوب فقال بعد أن حمد اللّٰه وأثنٰى عليه وصلّى علٰى رسوله، يـآيّها الناس! اسمعوا وأطيعوا! فوقف له سلمان الفارسى الصحابى الجليل ليحاسبه فقال له.

"لاسمع لک علينا ولا طاعة" : فقال سيّدنا عمر رضى اللّٰه عنه

ولم؟ فقال سلمان الفارسى : من أين لک هذا الثوب

وقدنا لک بردواحد أنت رجل طوال، فقال عمر رضى اللّٰه عنه: يا عبداللّٰه بن عمر، فقال لبيک ياأمير المؤمنين، قال عمر: فانشدتک اللّٰه البرد الذى اترزت أهو بردک؟ فقال أللّٰهمّ نعم، قال سلمان: ألآن مُر نسمع ونطيع.

(ص ۷۲ حوالہ بالا)

مطلب یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں ایک جنگ میں مسلمانوں کو بڑا مال غنیمت ملا جس میں کچھ یمنی چادریں تھیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب چادروں کو مجاہدین میں عدل و انصاف کے ساتھ تقسیم کردیا جس میں سے ایک ایک چادر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو بھی ملی حضرت عمر چونکہ موٹے اور لمبے قد وقامت کے مالک تھے ایک چادر ان کے لئے کافی نہ تھی ان کے بیٹے عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی چادر حضرت عمرؓ کو دے دی تاکہ حضرت عمرؓ بڑی چادر بنا کر اوڑھ سکیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بڑی چادر اوڑھے ہوئے ایک مرتبہ خطبہ دے رہے تھے آپ نے اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا پھر فرمایا۔

لمّا بعد! اے اللہ کے بندو! خطبہ اور تقریر کو غور سے سنو اور اطاعت کرو۔ اتنا کہنا تھا کہ درمیان سے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر فرمایا نہ تقریر سنیں گے نہ اطاعت کریں گے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کیا بات ہے؟ تو حضرت سلمان فارسی نے عرض کیا جو چادر آپ اوڑھے ہوئے ہیں اس میں دو چادریں ہیں دوسری چادر کہاں سے ملی ہے جبکہ آپ کے حصّہ میں ایک چادر آئی تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن عمر کی طرف دیکھ کر فرمایا اے عبداللہ! دوسری چادر کیا تمہارے حصّہ کی چادر نہیں ہے

جسے تو نے مجھے چادر بنانے کے واسطے دے دی ہے عبداللہ بن عمر نے عرض کیا واللہ دوسری چادر میری تھی میں نے عمرؓ کو دے دی ہے تا کہ بڑی چادر بنا کر اوڑھ سکیں۔ اس کے بعد سلمان فارسی نے فرمایا اب شبہ دور ہو گیا اب آپ کی بات سنیں گے اور اس پر عمل کریں گے۔

دیکھیئے یہاں پر خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ پر حضرت سلمان فارسیؓ نے کیسے اعتراض کیا اور محاسبہ کے لئے دوران خطبہ کس طرح کھڑے ہو گئے لیکن اعتراض کی حقیقت کچھ بھی نہ تھی محض شبہ تھا لیکن حضرت عمر کی جانب سے محاسبہ اور شبہ کا جواب دیا گیا اس کی وضاحت کی گئی مزید کچھ نہیں کہا گیا نہ توہین خلیفہ کا مقدمہ چلایا گیا نہ ہی اس پر کسی قسم کی سزا کا حکم سنایا گیا لہٰذا آج بھی اگر کسی حاکم یا عدالت کے جج پر کوئی عالم دین یا دین کی سمجھ رکھنے والا شرعی محاسبہ کے تحت تنقید کرے اعتراض کرے تو حاکم اور جج کے ذمہ اس کی وضاحت اور جواب دینا ضروری ہوگا اسکی اجازت نہ ہوگی کہ اس پر توہین حاکم یا توہین جج یا توہین عدالت کا مقدمہ قائم کیا جاوے اس واسطے صحابہ کرام کا طرز عمل ہمارے لئے حجت ہے ان کا طرز عمل دین ہے۔ دین پر عمل کرنے پر توہین عدالت یا توہین جج و حاکم یا توہین قاضی نہیں ہوتی۔

شرعی محاسبہ کے سلسلے میں امیر معاویہؓ پر

ابو مسلم خولانی کا اعترض ملاحظہ ہو

امام غزالی رحمہ اللہ احیاء العلوم والدّین میں نقل فرماتے ہیں:

وقف أمير المؤمنين معاوية رضى الله عنه يوما علىٰ منبره بعد قطع بعض الأعطيات المالية بين افراد المسلمين فقال اسمعوا واطيعوا! وقام اليه أبو مسلم الخولا نى ليحاسبه ان هذا التصرف الخاطى فقال لاسمع ولا طاعة يا معاوية، قال معاوية: لم؟ يا أبامسلم فقال: يا معاوية كيف تمنع الاعطى وانّه ليس من كدک ولامن كدأبيک ولا من كدأ مک فغضب معاوية ونزل عن المنبر وقال للحاضرين مكانكم وغاب معاوية ساعة عن أعينهم ثمّ خرج عليهم وقد اغتسل فقال ان أبامسلم كلّمنى بكلام أغضبنى وانى سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ألغضب من الشيطان، والشيطان خلق من النّار وانّما تطفأ النّار بالماء فاذا غضب أحد فليغتسل وانى دخلت فغسلت

وصدق أبو مسلم أنه ليس من كدي ولا من كدأبي فهلموا الى عطائكم.

(احیاء علوم الدین ص ۳۲۸، ج۔ ۲)

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ بعض سرکاری عطیات کو تقسیم کرنے کے بعد جب خطبہ دینے کی غرض سے منبر پر چڑھے اور فرمایا لوگو! سنو! اور اطاعت کرو! اس پر ابومسلم الخولانی ان کے محاسبہ کے واسطے فوراً کھڑے ہوگئے اور کہا کہ سرکاری عطیات کو اس طرح غلط تقسیم کے بعد کیسی سمع اور کیسی اطاعت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا بات ہے ابومسلم خولانی نے کہا کہ عطیات سے ہمیں روکتے ہو یہ تمہاری محنت کا مال یا تمہارے باپ کی محنت کا مال نہیں ہے اس پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ غضبناک ہو کر منبر سے اتر گئے حاضرین سے یہ کہہ کر چلے گئے کہ تم لوگ بیٹھے رہو تھوڑی دیر کے بعد امیر معاویہ غسل کر کے آئے اور کہا کہ ابومسلم الخولانی کہاں ہے اس نے ایسی بات کی کہ مجھے غصہ آیا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ غضب اور غصہ شیطان کی طرف سے ہے اور شیطان تو آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور شیاطین کی آگ کو پانی سے ٹھنڈا کیا جاسکتا ہے لہٰذا تم میں سے اگر کسی کو غصہ آجاوے تو غسل کرلیوے اس حدیث کی رو سے منبر سے اترا اور غسل کر کے آیا اور ابومسلم نے صحیح کہا ہے کہ یہ مال نہ میری محنت کا ہے نہ میرے باپ کی محنت کا ہے بلکہ مسلمانوں کا ہے اب تم میں سے جن کو عطیہ نہیں ملا وہ آجاؤ اور عطیہ لے کر جاؤ۔

دیکھیئے یہاں پر امیر معاویہؓ پر ابومسلم خولانی کی تنقید اور سخت کلامی، کیسی شدید تھی اور امیر معاویہ کا غصہ آنا اور صبر وتحمل کا مظاہرہ کرنا پھر غصہ کا علاج کرنا کیسا تھا لیکن اس کے باوجود ابومسلم خولانی پر توہین امیر کا مقدمہ نہیں چلانہ کسی قسم کی سزادی گئی جس سے واضح ہوا کہ اگر رعایا کسی امیر مملکت یا حکام میں سے کسی حاکم پر اعتراض اور واقعی تنقید کرے تو اس کو سننا چاہیئے اگر اعتراض اور تنقید صحیح ہو تو اپنی اصلاح کرلے جیسا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کیا ہے اگر اعتراض غلط ہو یا تنقید بے موقع ہو تو اس کا صحیح جواب دے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سلمان فارسیؓ کے ساتھ کیا ہے جس سے معترض اور ناقد مطمئن ہو جاوے۔

قاضی اور حاکم کی اطاعت تب ہے کہ جب حکم میں ظلم اور خیانت نہ ہو

(۱) عن أبي أوفىٰ رضي الله عنه قال قال رسول الله صلّى الله عليه وسلم:

اللّٰہ مع القاضی مالم یجر فاذا جار فبرء اللّٰہ منہ ولزمہ الشیطان قال الرّمادی: مالم یخن، وفی روایۃ فاذا جار وکلہ الیٰ نفسہ

(اخبار القضاۃ ص ۲۵، ج. ۱) (رواہ الحاکم والترمذی وحسّنہ)

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس وقت تک قاضی اور حاکم کی معیت میں ہوتا ہے جب تک وہ فیصلے میں ظلم وخیانت نہ کرے لیکن جب قاضی اور حاکم اپنے فیصلے میں ظلم اور خیانت کرنے لگتے ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے برأت کا اظہار کرتا ہے پھر شیطان ایسے قاضی اور حاکم پر مسلط ہوجاتا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ ایسے قاضی اور حاکم کو اس کے نفس کے حوالے کردیا جاتا ہے۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ قاضی جب تک فیصلوں میں ظلم نہیں کرتا یا خیانت نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ کی نصرت اس کے ساتھ ہوتی ہے اور جب فیصلہ میں ظلم کرتا ہے یا غیر شرعی فیصلہ کرتا ہے یا خیانت کرتا ہے تو شیطان اس کے ساتھ ہوتا ہے اس کے فیصلے شیطانی فیصلے ہوتے ہیں ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے ذمہ میں نہ ایسے فیصلے کو قبول کرنا لازم ہے نہ اس کی اعانت اور نصرت جائز ہے بلکہ اَمر بالمعروف کے تقاضے سے اس کو راہ راست پر لانے کے لئے جدوجہد کرنا ضروری ہے اگر قاضی یا حاکم اپنے رویئے سے باز نہیں آتا تو حدیث ''من رأی منکم منکرا فلیغیّرہ بیدہ'' کی رو سے اس کو ٹھیک کرنا ضروری ہے لہٰذا جو حاکم یا قاضی قرآن اور سنت کے خلاف فیصلہ کرتا ہے خواہ طلاق کے مسئلہ میں یا یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلہ میں یا حد زناء کے بارے یا حد سرقہ کے بارے میں ہو ایسے حاکم اور قاضی سے بڑھ کر اور زیادہ ظالم اور خائن کون ہوگا ایسے لوگوں کی حمایت ونصرت ہرگز جائز نہیں ہے ایسے حاکم اور ججوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کے باوجود وہ اپنے غیر شرعی فیصلے سے باز نہیں آتے توبہ نہیں کرتے تو ان کے فیصلوں کی پیروی ہرگز جائز نہیں بلکہ ان کے خلاف ممکن اور شرعی طریقے سے اقدام کرنا ضروری ہے کیونکہ یہ لوگ اس لائق نہیں ہیں کہ انہیں ایسے حالات میں شرعی مناصب پر برقرار رکھا جاوے یا ان کا احترام کیا جاوے۔

قاضی پر اعتراض کرنا توہین عدالت نہیں ہے خواہ یہ اعتراض کسی شبہ کی بنیاد پر ہو یا واقعی ہو

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں زبیر بن العوامؓ صحابی اور حمید انصاریؓ صحابی کے درمیان پانی کے بارے میں جھگڑا ہوا زبیر بن العوامؓ کی زمین بلندی پر تھی اور حمید انصاری کی زمین نشیبی علاقے پر

تھی حمید انصاری چاہتے تھے کہ چونکہ زبیر بن عوام کی زمین اوپر ہونے کی وجہ سے پانی زیادہ پی جاتی ہے لہٰذا زبیر پہلے پانی حمید انصاری کے لئے چھوڑ دیں اور جب ان کی زمین سیراب ہو جائے پھر زبیر اپنی زمین کو سیراب کریں۔

زبیر بن عوام رضامند نہ تھے دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فیصلہ کی درخواست کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیر سے فرمایا کہ پہلے اپنی زمین سیراب کرو پھر حمید انصاری کے لئے پانی چھوڑ دو حمید انصاری رضی اللہ عنہ اس پر برہم ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے غصہ سے مخاطب ہوئے اور کہا کہ زبیر آپ کا پھوپھی زاد بھائی ہے یعنی آپ نے رشتہ داری کی بناء پر فیصلہ زبیر کے حق میں دیا ہے اس پر حضور اکرمؐ کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا پھر آپ نے فرمایا زبیر اپنی زمین کو سیراب کر پھر پانی کو روک لے یہاں تک کہ بند کے دیوار کی اونچائی تک پہنچ جاوے پھر پانی چھوڑ دینا حضرت زبیر فرماتے ہیں کہ میرا گمان ہے کہ آیت ''**فلا وربک لا یؤمنون حتیٰ یحکموک فیما شجر بینھم**'' اس پر اتری ہے۔ (بخاری ص ۳۷۳، ج ۱)

حدیث مذکور میں حمید انصاریؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شرعی فیصلہ پر نہ صرف ناراضگی کا اظہار کیا بلکہ آپؐ پر جانبداری کا الزام بھی لگایا لیکن اس پر آپ نے توہین حاکم نہیں بلکہ توہین عدالت شرعیہ کی وجہ سے مقدمہ درج نہیں فرمایا نہ اسے کسی قسم کی سزا سنائی جبکہ آپ کوئی معمولی قاضی نہیں تھے بلکہ اوّل القاضی فی الاسلام تھے پھر اس فیصلے میں رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے پہلا فیصلہ مصالحت کی بنیاد پر کیا تھا جس میں حمید انصاری کا فائدہ تھا لیکن حمید انصاری نے اعتراض کیا تو شرعی فیصلہ فرمایا۔

شرعی فیصلہ یہ ہے کہ جس کی زمین پانی کے نزدیک ہے اور اوپر ہے وہ سب سے پہلے زمین کو سیراب کرے اور زمین کی حفاظت کے لئے جو بند ہوتا ہے وہاں تک پانی کو روک لے اس کے بعد پانی چھوڑ دے تاکہ دوسری زمین والے اپنی اپنی زمینیں سیراب کر سکیں رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے اس فیصلہ کے بعد حمید انصاری پر جب سارا حال واضح ہوا تو نادم ہوئے لیکن ان باتوں کے باوجود آپ رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے اس پر کسی قسم کا محاسبہ نہ کیا جس سے معلوم ہوا کہ عدالت کے فیصلے کے خلاف اگر کوئی شرعی عدالت پر فیصلے کے بارے میں شبہ ظاہر کرے تو اس شبہ کو دور کیا جائے گا اور معترض کے اعتراض کا جواب دیا جائے گا۔

ولید بن یزید پر سعد بن ابراہیم گورنر مدینہ کا محاسبہ

ولی عہد ولید بن یزید کے زمانہ میں سعد بن ابراہیم مدینہ کے قاضی تھے ولید بن یزید نے خانۂ کعبہ

کے اوپر لوہے اور سمینٹ کے پختہ قبے بنانے کے واسطے کچھ سامان مدینہ کے گورنر کے پاس بھیجا اور اس قبے بنانے کا مقصد یہ تھا کہ ولید اور اس کے وزراء جب خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے آئیں تو قبہ کے سایہ میں طواف کریں اور دھوپ سے بچ جائیں اور یہ سامان ایک ہزار گھوڑوں پر فوج کے ہاتھ مدینہ بھجوادیا اہل مدینہ نے جب یہ دیکھا تو گھبرا گئے۔ اور سعد بن ابراہیم کے پاس گئے سعد بن ابراہیم نے حکم دیا کہ تمام سرکاری سامان جو قبے بنانے کے واسطے لایا گیا ہے اس تمام سامان کو جلا دو لوگوں نے کہا کہ سامان لانے والی ایک ہزار فوج موجود ہے لہٰذا ان سے مزاحمت مشکل ہے سعد بن ابراہیم نے خود اپنے کپڑے لئے اور سوار ہو کر فوج کے پاس پہنچ گئے اور لوگوں سے کہا آگ لاؤ میں ان کے ساتھ وہی کروں گا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے بنائے ہوئے گاؤ سالہ کے ساتھ کیا تھا سرکاری فوجی افسر برہم ہوئے اس پر حضرت سعد بن ابراہیم کے ساتھ مدینہ سے گئے ہوئے ساتھیوں نے عرض کیا کہ یہ امیر المومنین کا بھیجا ہوا افسر ہے اس کے ساتھ ایک ہزار فوجی ہیں لہٰذا آپ جلانے کا مسئلہ چھوڑ دیجئے ان کو واپس جانے دیجئے سعد بن ابراہیم نے اس کو مان لیا اور اس کو سامان سمیت شام کو لوٹنے کی اجازت دے دی چنانچہ ولید بن یزید کے بھیجے ہوئے لوگ سامان سمیت شام واپس چلے گئے۔ اس کے بعد ولید بن یزید نے سعد کو لکھا کہ عبید اللہ کو نائب امیر بنا کر آپ شام کے دار الحکومت میں مجھ سے ملاقات کریں سعد بن ابراہیم نے ایسا ہی کیا اور شام پہنچ گئے لیکن ولید نے فوراً ملاقات کا وقت نہیں دیا جبکہ امروز و فردا کرتے ہوئے ٹالتے رہے سعد بن ابراہیم چند روز تک انتظار کرتے رہے آخر ایک روز شام کے وقت دیکھا کہ سرکاری مہمان خانہ میں ایک آدمی شراب میں مست چکر کاٹ رہا ہے سعد نے اس شخص کے بارے میں خدام مہمان خانہ سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ شراب پینے والا امیر المومنین کا رشتہ دار ہے شراب پی کر شراب کے نشے میں مسجد میں چکر کاٹتا رہتا ہے اب بھی شراب پی کر آیا ہے سعد بن ابراہیم نے اپنے غلام سے کہا کوڑا لاؤ اور اسے میرے پاس حاضر کرو چنانچہ کوڑا لایا گیا تو سعد نے مسجد کے پاس اسے اسی ۸۰ کوڑے لگائے پھر خادم سے کہا کہ مدینہ چلو پس دونوں مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے اور وہ شرابی پٹائی کے بعد ولید کے پاس شکایت لے کر پہنچا ولید نے حاضرین سے سعد کو بلا کر لانے کا حکم دیا سعد اور ان کے خادم ابھی ایک مرحلہ کی مسافت بھی طے کر نہیں پائے تھے کہ ایک سپاہی نے انہیں ولید کے پاس چلنے کو کہا اور سعد بن ابراہیم ولید کے پاس حاضر ہوئے۔ ولید نے سعد سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ نے اپنے بھتیجے کے ساتھ کیا کیا ہے اس پر سعد نے جواب دیا کہ امیر المومنین آپ نے مجھے امور المسلمین پر مامور کیا ہے اور میں نے دیکھا کہ آپ کے یہاں حقوق اللہ ضائع ہو رہے ہیں۔ حدود کا نفاذ نہیں ہو رہا شرابی شراب پی

کر مسجد کا چکر کاٹتا ہے اور آپ کے پاس یہاں پر اندرون ملک اور بیرون ملک سے لوگ آتے رہتے ہیں۔ میں نے خیال کیا کہ تعطیل حدود کی بناء پر لوگ آپ سے بدظن ہو جائیں گے لہٰذا میں نے اس پر شرعی حد قائم کر دی ہے ولید نے کہا کہ اللہ آپ کو جزائے خیر دے اور سعد بن ابراہیم کے لئے انعام کا اعلان کیا اس کے بعد سعد سے اور کچھ نہیں کہا، سعد اور آپ کے خادم مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے اور اس سے ایک ہفتہ قبل خانہ کعبہ میں قبہ لگانے کے سلسلے میں بھیجے ہوئے ایک ہزار سپاہی اور خود بادشاہ کی جو توہین ہوئی اس پر ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ (اخبار القضاۃ ص ۱۶۲، ج ۱)

اس واقعہ میں دو موقعوں پر سعد بن ابراہیم نے بادشاہ وقت پر دو قسم کی ضرب لگائی بلکہ اپنے اختیارات سے باہر امیر المؤمنین کا محاسبہ کیا۔

(۱) قبہ کے بنانے کے مسئلہ میں چونکہ خانۂ کعبہ میں بادشاہ اور ان کے وزرأ کے لئے قبے بنانے کا مسئلہ سعد کے نزدیک ناجائز تھا اس لئے امیر کی اطاعت نہیں کی اور قبے بنانے کے سلسلے میں آئی ہوئی فوج اور ساز و سامان سب کو واپس کر دیا۔

امیر مملکت نے اس سلسلہ میں وضاحت کے لئے سعد کو بلایا لیکن حقیقت حال خود بخود سمجھنے کے بعد سعد سے وضاحت بھی طلب نہ کی۔

(۲) اور دوسرا کام یہ کیا کہ امیر المومنین کے پاس جا کر دار الحکومت کے شاہی محل کے قریب جا کر ایک شرابی پر شرعی حد قائم کر دی جو ان کے اختیار کے حدود سے باہر تھی لیکن بادشاہ نے ان دو واقعات کے باوجود سعد کو کچھ نہیں کہا بلکہ انہیں انعام دے کر باعزت طور پر رخصت کیا نہ ان پر توہین عدالت کا مقدمہ چلایا اور نہ ہی توہین امیر کا۔

ابوموسیٰ اشعریؓ پر ضبہ کا اعتراض

(۴) ضبہ بن محصن الغزی کی خود اپنی روایت ہے کہ بصرہ میں ابوموسیٰ اشعری امیر مقرر تھے جب وہ خطبہ دیتے تو حمد و ثناء اور درود کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لئے دعا کیا کرتے تھے اور مجھے اس سے غصہ آتا تھا میں نے ایک روز ان سے کہا کہ آپ حضرت عمرؓ کے ساتھ ساتھ حضرت ابوبکرؓ کے لئے بھی دعا کیوں نہیں کیا کرتے اس میں کیوں زیادتی کرتے ہو کہ خلیفۂ اوّل کے لئے تو دعا نہیں کرتے اور خلیفہ ثانی کے لئے دعا کرتے ہو ابوموسیٰ اشعریؓ نے اس پر حضرت عمرؓ کے پاس شکایت لکھ کر بھیجی کہ ضبہ بن محصن خطبہ کے دوران اعتراض کرتا ہے اور رکاوٹ پیدا کرتا ہے حضرت عمرؓ

نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو جواب میں لکھا کہ ضبہ بن محصن کو میرے پاس بھیج دو تا کہ میں اس سے بات کرلوں حضرت ابوموسیٰؓ نے ایسا ہی کیا اور کہا آپ کو خلیفۂ ثانی نے بلایا ہے اس پر میں حضرت عمر کے پاس حاضر ہوا حضرت عمرؓ نے مجھ سے کہا کہ آپ کون ہیں! کہا ضبہ! حضرت عمر نے فرمایا کہ تم اپنے اور اہل وعیال کے لئے خیر خواہ نہیں ہو ضبہ نے جواب دیا خیر تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور میرا کوئی اہل نہیں ہے اور نہ مال ہے ضبہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تمہارے اور میرے مقرر کردہ گورنر ابوموسیٰ کے درمیان کیا معاملہ ہوا ضبہ نے جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ حضرت ابوموسیٰ جب خطبہ دیتے ہیں تو حمد وثنا اور درود کے بعد آپ کی تعریف کرتے ہیں اور آپ کے لئے دعا کرنا شروع کردیتے ہیں اس پر میں نے کہا أین أنت من صاحبہ تفضلہ علیہ مطلب یہ کہ آپ یہ کیا کررہے ہیں عمر کے ساتھی ابوبکر جو کہ ان سے بہتر تھے ان کی تعریف نہیں کرتے ان کے لئے دعا کیوں نہیں کرتے اس بات پر ابوموسیٰ نے آپ کو میری شکایت لکھ دی ضبہ کی گفتگو کو سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت روئے اور فرمایا کہ آپ میرے ابوموسیٰ سے زیادہ أقرب الی الحق اور راہ راست پر ہیں پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھے کون معاف کرے گا ضبہ نے جواب دیا امیر المومنین اللہ تعالیٰ آپ کو معاف کرے گا۔ (احیاء العلوم ص ۳۳۸، ج۲)

اس طرح یہ معاملہ رفع دفع ہوگیا لیکن حضرت عمرؓ نے ضبہ کو حضرت موسیٰؓ پر اعتراض کرنے کی وجہ سے نہ سخت بات کہی اور نہ ہی کسی قسم کی سزا دی بلکہ خود ضبہ سے معافی چاہی کہ بلا وجہ شرعی ان کو تکلیف دی ہے۔

حضرت حسن بصری کا حجاج بن یوسف پر اعتراض

(۵) حجاج بن یوسف نے ایک مرتبہ حضرت حسن بصریؒ کو بلایا جب حضرت حسن بصریؒ حاضر ہوئے حجاج نے حسن بصری سے کہا آپ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے درہم دینار کی غرض سے اللہ کے بندوں کو ناحق قتل کیا ہے حضرت حسن بصری نے جواب دیا ہاں، حجاج نے کہا آپ کو ایسی بات کہنے پر کس نے مجبور کیا حضرت حسن بصری نے جواب دیا اللہ تعالیٰ کے اس میثاق اور عہد نے مجبور کیا جو کہ علماء دین سے قرآن وسنت کے ذریعے لیا گیا ہے۔ کہ وہ حق بات کو لوگوں میں ظاہر کریں اور اسے نہ چھپائیں حجاج چونکہ ظالم اور جابر بھی تھا اس نے حضرت حسن کو یہ کہہ کر رخصت کیا کہ آئندہ ایسی بات آپ کی طرف سے نہ سنی جائے ورنہ آپ کا سر تن سے جدا کردیا جائے گا۔ (احیاء العلوم ص ۳۴۹، ج۲)

اس واقعہ سے یہ معلوم ہوا کہ حاکم پر ناجائز اقدامات پر تنقید کرنا توہین نہیں ہے بلکہ یہ لوگوں کا شرعی

حق ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو حجاج جیسا ظالم حسن بصری کو بغیر سزا دیئے کیسے چھوڑتا لیکن اس نے واپسی کے وقت حسن بصری کو جو دھمکی دی ہے اس سے اس کا ظلم و جبر کا اثر تو ظاہر ہوتا ہے لیکن توہین عدالت کا کوئی قانون معلوم نہیں ہوتا۔

عمر بن ھبیرہ پر حضرت حسن بصریؒ کی تنقید

عمر بن ھبیرہ نے ایک مرتبہ بصرہ، کوفہ، شام اور مدینہ کے فقہاء علماء کو مشورے کے لئے بلایا سب حاضر ہوئے ابن ھبیرہ نے سب سے گفتگو کی سب نے اپنے اپنے انداز سے مشورے دیئے اور ابن ھبیرہ کے سوالات کے جوابات دیئے حضرت حسنؒ نے اس کے سامنے تقریر کی ان کی تقریر کے آخری کلمات یہ ہیں۔
جب کسی کو رعایا پر امیر یا قاضی مقرر کیا جائے تو اس کو نصیحت نہ کرنے والے کے لئے جنت حرام ہے امیر کی اطاعت ضروری ہے لیکن امیر کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے حقوق زیادہ قابل لحاظ اور امیر کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت زیادہ ضروری ہے۔ ''لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق'' (الحدیث)
یا ابن ھبیرہ! حاکم وقت کی کتاب کو اللہ تعالیٰ کی کتاب کے سامنے رکھو اگر اللہ تعالیٰ کی کتاب کے موافق ہے تو اس پر عمل کرو اگر کتاب اللہ کے مخالف ہو تو اسے پھینک دو خدا سے ڈرو کیونکہ یہ بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتے کو بھیج دے اور تجھے اپنے تخت سے اتار دے اور قصر امارت کی وسعت سے قبر کی تاریک منزل تک پہنچا دے۔ (احیاء العلوم ص ۳۴، ج. ۲)

قاضی ابن ابی لیلیٰ کے ایک فیصلہ پر امام ابو حنیفہؒ کی نکتہ چینی

محمد بن عبدالرحمان جو زیادہ تر ابن ابی لیلیٰ کے لقب سے مشہور ہیں بڑے مشہور فقیہ اور صاحب رائے تھے ۳۳ برس کوفہ میں منصب قضاء پر مامور تھے امام ابو حنیفہ اور ان میں کسی قدر شکر رنجی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ فیصلوں میں وہ غلطی کرتے تھے تو امام صاحب ان کی اصلاح کرنا چاہتے تھے اور انہیں ٹوکتے تھے یہ بات ابن ابی لیلیٰ کو ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ لیکن امام صاحب اظہار حق پر مجبور تھے۔ قاضی صاحب مسجد میں بیٹھ کر مقدمات کے فیصلے کیا کرتے تھے ایک دن کام سے فارغ ہو کر مجلس قضاء سے اٹھے راستہ میں گزرتے ہوئے ایک عورت کو دیکھا کہ وہ کسی آدمی سے جھگڑ رہی ہے ابن ابی لیلیٰ کھڑے ہو گئے اور دیکھتے رہے اثناء گفتگو میں عورت نے اس شخص کو ''یا ابن الزانیین'' کہہ دیا یعنی اے زانی اور زانیہ کے بیٹے!

قاضی ابن ابی لیلیٰ نے اپنے معاونین سے کہا کہ عورت کو گرفتار کر لیا جائے اور اس کو مسجد میں لے جایا جائے پھر خود مجلس قضاء میں واپس آئے اور حکم دیا کہ عورت کو کھڑا کر کے درّے لگائے جائیں اور دو حدیں لگائی جائیں کیونکہ اس نے دو پر تہمت زناء کا الزام لگایا بہر حال اس کو دو حدیں لگائی گئیں معاملہ ختم ہو گیا امام ابو حنیفہ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا قاضی صاحب نے اس مین چند غلطیاں کیں۔

(۱) مجلس قضاء سے اٹھ کر واپس آئے اور دوبارہ اجلاس کیا یہ آئین عدالت کے خلاف ہے۔

(۲) عورت کو حد بٹھا کر مارنی چاہیئے تھی لیکن قاضی صاحب نے اس کے خلاف حد قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔

(۳) مسجد میں حد مارنے کا حکم دیا ہے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے۔

(۴) ایک لفظ سے ایک ہی حد لازم آتی ہے دو حد قائم کرنا صحیح نہیں ہے بالفرض اگر دو حدیں لازم بھی تھیں تو ایک ساتھ دونوں کا نفاذ نہیں ہو سکتا بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ ایک حد کے بعد ملزم کو چھوڑ دینا چاہیئے کہ زخم بالکل بھر جائیں پھر دوسری حد کی تعمیل ہو سکتی ہے۔

(۵) جس کو گالی دی گئی اس کی جانب سے عدالت میں دعویٰ پیش ہونا چاہیئے تھا لیکن اس نے جب دعویٰ ہی نہیں کیا تو قاضی صاحب کو از خود مقدمہ قائم کرنے کا کیا اختیار تھا؟ امام ابو حنیفہؒ کی اس شرعی تنقید پر قاضی ابن ابی لیلیٰ نہایت برہم ہوئے اور گورنر کوفہ سے جا کر شکایت کی کہ ابو حنیفہ نے مجھ کو تنگ کر رکھا ہے کوئی فیصلہ صادر کیا جاتا ہے تو اس پر اعتراض کر دیتے ہیں کوفہ کے گورنر نے حکم بھیجا کہ امام ابو حنیفہ فتویٰ نہ دیا کریں۔ امام صاحب اگرچہ حق کے خلاف کسی حاکم یا امیر کے حکم کی پرواہ نہیں کرتے تھے تاہم اس طرح شرعی تنقید کرنے والے امام صاحب کے علاوہ اس زمانہ میں بھی بہت سے علماء موجود تھے جو امام صاحب کے ہمنوا تھے اس لئے امام صاحب کچھ عرصہ کے لئے فتویٰ دینے سے رک گئے اور حاکم وقت کی اطاعت کو مقدم رکھا اور بغیر کسی عذر کے حکم کی تعمیل کی۔

واضح رہے کہ یہ امام حنیفہ کا تقویٰ اور ورع تھا ورنہ اس طرح کی پابندی اور ایسے حکم پر عمل کرنا ضروری نہ تھا نیز اس واقعہ میں ابن ابی لیلیٰ کا امیر سے شکایت کرنا اور خود کا سزا نہ دینا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ حکام پر شرعی تنقید کے بارے میں توہین عدالت کا کوئی قانون نہ تھا تا کہ امام ابو حنیفہ کو قانون کے تحت حبس کیا جاتا یا سزا دی جاتی امیر نے شخصی حکم کے تحت چند روز فتویٰ دینے سے باز رہنے کا حکم دیا

اس کے بعد امام صاحب نے پھر دوبارہ فتویٰ دینا شروع کیا۔

منذر بن سعید کا خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر پر تنقید اور محاسبہ کرنا

خلیفہ عبدالرحمان الناصر نے عمارت زہراء کی تعمیر میں کافی سرکاری خزانہ کو ضائع کیا عمارت زہراء اپنے زمانے کی بہترین عمارتوں میں سے ایک شمار ہوتی تھی۔ اس کی تعمیر کے ایام میں خلیفہ نے اتنی دلچسپی لی کہ ایک روز اس کی مشغولیت کی وجہ سے جمعہ کی نماز تک رہ گئی۔

منذر بن سعید جامع مسجد کے خطیب تھے اور اپنے شہر کے قاضی بھی تھے انہوں نے جب دیکھا کہ علماء کی ذمہ داری اُمر بالمعروف ونہی عن المنکر اور دینی محاسبہ میں کوتاہی ہو رہی ہے اور حقوق العباد اور حقوق اللہ ضائع ہو رہے ہیں تو ارادہ کیا کہ خلیفہ عبدالرحمان کی موجودگی میں اس بارے میں نصیحت اور عبرت آموز خطبہ دیں گے جس سے خلیفہ سمجھ جائیں گے کہ قصر زہراء کی تعمیر میں غلو کیا گیا ہے ناجائز طور پر سرکاری خزانہ استعمال کیا گیا ہے تاکہ آئندہ ایسے ناجائز اقدامات سے اجتناب کرے اور یہ خطبہ جامع مسجد میں بھرے مجمع میں ہونا چاہیئے چنانچہ جمعہ کے روز جب مسجد لوگوں سے بھر گئی خلیفہ بھی مسجد میں آگئے منذر بن سعید نے خطبہ دینا شروع کیا۔ آیت ''اتبنون بکلّ ریع (الآیۃ سورہ الشعراء آیت نمبر ۱۲)'' کی تلاوت کی پھر قصر زہراء کی تعمیر میں جو اسراف فضول خرچیاں سرکاری خزانہ سے کی گئی ہیں اس کی سخت مذمت کی پھر ''أفمن أسسّ بنیانه علی تقویٰ'' تلاوت کی اور اس کی شرح بیان فرمائی غرض خلیفہ عبدالرحمٰن کو از روئے دین وشریعت جو کچھ سنانا تھا مجمع عام میں سنایا پورا مجمع لرز گیا اور سب کے سب روئے، خلیفہ کو بھی اس کا علم اور احساس ہوا کہ اس تقریر کا مقصد اس کی تذکیر ہے لیکن منذر کا یہ محاسبہ بھرے مجمع میں تھا اور اس میں سخت سے سخت الفاظ رکھے گئے تھے اور جرح میں بڑی شدت اختیار کی گئی تھی اس لئے خلیفہ کو غصہ آیا اور ناراض ہوئے لیکن خلیفہ نے منذر کو سزا دینے کا حکم نہیں دیا البتہ اس کے غصہ کا اثر یہ ہوا کہ خلیفہ نے قسم کھائی کہ منذر کے پیچھے نماز نہیں پڑھے گا بلکہ جامع مسجد قرطبہ میں احمد بن مطرف کی اقتداء میں نماز ادا کرے گا۔

خلیفہ نے منذر کی اقتدارء میں نماز پڑھنا چھوڑ دی اس کے بعد خلیفہ کے صاحبزادے نے جب یہ دیکھا کہ ان کے والد دارالحکومت کی مرکز کی بڑی مسجد کو چھوڑ کر کسی اور مسجد میں نماز پڑھ رہے ہیں اور اس سے ان کو ذہنی اور طبعی اذیت ہوتی ہے اپنے باپ خلیفہ سے کہا کہ آپ خود منذر کی وجہ سے تکلیف اٹھا رہے ہیں اس کو معزول کرنے میں آپ کو کیا خطرہ ہے خلیفہ ناصر نے اس پر صاحبزادہ کو سختی سے ڈانٹا اور کہا منذر

جیسے صاحب علم اور صاحب فضل پھر صاحب خیر کو اپنے نفس کی رضامندی کی خاطر معزول کیا جاسکتا ہے جو کہ صحیح اور ہدایت کے راستہ سے ہٹا ہوا ہو؟ اور کہا کہ میں تو اسے معزول کرنے سے ڈرتا ہوں اور یہ ڈر اللہ تعالیٰ کا ہے بس میں نے قسم کھائی اب سوچ رہا ہوں کہ کوئی راستہ مل جائے اور میں قسم کا کفارہ دے کر حانث ہو جاؤں منذر تو میری زندگی میں میرے بعد بھی اس مسجد میں نماز پڑھاتا رہے میں اس سے کسی قسم کا بدلہ لینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ (الاسلام بین العلماء و الحکام ص ۷۴)

مذکورہ بالا واقعہ میں خلیفہ عبدالرحمان نے اپنے زمانے کے علماء کے محاسبہ اور تنقید کو نہ صرف سنا بلکہ اس کو جائز اور مستحسن قرار دیا اور ان کے بیٹے نے جب منذر کو اپنے عہدے سے معزول کرنے کی خواہش ظاہر کی تو اس کو سختی سے ڈانٹا۔ یہ ہے شرعی علماء کا کردار اور صحیح حکام کا طرز عمل، ہمارے زمانے کے حکام کو اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے علماء کی طرف سے محاسبہ اور تنقید کو ناک کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیئے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی کا یحییٰ بن سعید کا محاسبہ کرنا

وهذا الشيخ عبدالقادر الگيلانی رحمه الله يقف على المنبر محاسبا ألمقتضى لأمر الـلـه و منكرا عليه تولية يحيٰى بن سعيد المشهور بابن المزاحم الظالم القضاء وقال مخاطباله وليّت علٰى المسلمين أظلم الظالمين فما جوابک غدا عندربّ العالمين واحكم الحاكمين فارتعد الخليفة وعزل المذكور لوقته.

(ألاسلام بين العلماء والحكام ص ٦٦)

مطلب یہ ہے کہ شیخ عبدالقادر گیلانی رحمہ اللہ منبر پر تشریف رکھتے ہیں اور اپنے زمانہ کے حاکم پر تنقید کرتے ہیں کہ یحییٰ بن سعید جو کہ ابن المز احم اور ظالم سے مشہور ہے اس کو کیوں عہدہ قضا پر فائز کیا ہے اور حاکم وقت کی موجودگی میں ان سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ تو نے مسلمانوں کے اوپر ظالموں سے بڑھ کر ظالم یحییٰ کو کیوں قاضی مقرر کیا ہے تم قیامت کے روز رب العالمین اور احکم الحاکمین کے سامنے کیا جواب دو گے۔ شیخ عبدالقادر گیلانی کی تنقید اور اعتراض کے بعد خلیفہ ڈر گیا اور مسجد سے نکل کر فوراً یحییٰ بن سعید کو معزول کر دیا۔ (الاسلام بین العلماء و الحکام)

دیکھئے عبرت کا مقام ہے حاکم وقت اور اپنے وقت کے علماء کے درمیان کیسا تعلق تھا اور حکّام وقت علماء کے اعتراض اور تنقید کو کیسے وقعت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے لہٰذا موجودہ دور کے امراء اور حکام پر

اگر دینی اور شرعی اعتبار سے ان کا محاسبہ کیا جاوے تو انہیں اس کو سننا چاہیئے اور اگر اعتراض اور تنقید معقول اور شرعی ہو تو اسے قبول کر لینا چاہیئے نہ یہ کہ علماء پر توہین عدالت کا مقدمہ عائد کیا جائے یہ طرز عمل شرعی حکّام کا نہیں ہے بلکہ ظالم امراء اور جابر بادشاہوں کا ہے اور غیر مسلموں کا شیوہ ہے۔ لٰہذا حکام اور عدلیہ پر شرعی تبصرہ کرنا اور قرآن وحدیث کے خلاف فیصلہ کرنے والے ججوں کو شرعی عدالت کے لئے نامناسب اور نااہل قرار دینا یہ توہین عدالت نہیں ہے کوئی مسلمان فرد یا اسلامی ادارہ قانون برطانیہ کی رو سے اگر اسے توہین عدالت سمجھتا ہے تو یہ ان کی شریعت سے ناواقفیت ہے اس بارے میں قول فیصل قرار دینا صحیح نہیں ہوگا۔ برٹش قانون کی دفعہ توہین عدالت کو شرعی عدالت کے ساتھ الحاق کرنا غلط ہے۔

قرآن کریم میں ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ؐ کی اطاعت کرو اگر تمہارے درمیان کسی بات میں اختلاف اور تنازعہ پیدا ہو تو اسے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کی روشنی میں فیصلہ کرو لٰہذا قرآنی فیصلہ کی جگہ انسانی قانون سے فیصلہ کفر اور گمراہی ہوگی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمان حکام اور خواص اور عوام کو قرآن وحدیث کے فیصلہ پر عمل کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین یا رب العالمین

الجواب صحیح	کتبہ،
ولی حسن ٹونکی	محمد عبدالسلام چاٹگامی عفا اللہ عنہ
رئیس دارالافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیہ	دارالافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیہ
علامہ بنوری ٹاؤن کراچی	علامہ بنوری ٹاؤن کراچی ۵
	۱۵؍شعبان المعظم ۱۴۰۳ھ

الجواب صحیح

محمد ادریس میرٹھی

استاذ حدیث جامعۃ العلوم الاسلامیہ

علامہ بنوری ٹاؤن کراچی۔

جھینگا مچھلی حلال ہے یا حرام
ایک سوال کا جواب

☆ اس میں جھینگا مچھلی کی شرعی حیثیت کو قرآن وسنت کے اصولوں سے اور کتب لغات اور کتب طب کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے۔

☆ جھینگا مچھلی کے حلال ہونے پر مختلف ممالک کے علماء کرام کے فتاویٰ اور تصدیقات کو شامل کر دیا گیا ہے۔

جھینگا مچھلی حلال ہے یا حرام؟

کے بارے میں اہم سوال وجواب

فہرست:

ا: حلال وحرام کے چند بنیادی اصول

۲: حلال وحرام کا ثبوت شرعی دلائل سے ہوتا ہے ذاتی تحقیق یارائے سے نہیں

۳: قرآن وحدیث کے اندر کھانے کی چیزوں میں تمام پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیا گیا ہے۔

۴: قرآن وسنت کی رو سے دریائی جانوروں میں سے اسماک یعنی تمام مچھلیاں حلال ہیں۔

۵: مچھلی کی جملہ اقسام حلال ہیں، ۱۲۴حادیث کے حوالے

۶: مچھلی کی تمام انواع حلال ہیں، مستند کتب فقہ کے تین حوالے

۷: ایک شبہ اوراس کا ازالہ

۸: مچھلی کی تحقیق وتعریف میں اہل لغت اور اہل علم کے بعد ماہرین سمک کی رائے معتبر ہوتی ہے۔

۹: جھینگا مچھلی، مچھلی ہے اور حلال ہے۔۱۰مستند ومعتبر کتب لغات کے حوالے

۱۰: چھینگا مچھلی، مچھلی ہے اور حلال ہے، ۹ کتب طب کے حوالے

۱۱: جھینگا مچھلی، شرعاً مچھلی ہے اور حلال ہے، حضرت مولانا تھانویؒ ومولانا عبدالحیؒ ودیگر علمائے کرام و مفتیان عظام کا فتویٰ

۱۲: جھینگا مچھلی کے حرام ہونے کا فتویٰ دینا ہمارے نزدیک غلط ہے۔

۱۳: درالافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوی ٹاؤن کراچی نمبر ۵ کے رفقاء کار کی تصدیقات

۱۴: بنگلہ دیش کے مختلف درالافتاء کے مفتیان کرام اور علمائے محققین کی تصدیقات۔

۱۵: تصدیق از دارالافتاء دارالعلوم دیوبند انڈیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جھینگا مچھلی کا شرعی حکم

ایک اہم استفتاء اور اس کا جواب

بعد سلام مسنون یہ کہ کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے یہاں یہ مسئلہ آج کل موضوع بحث بنا ہوا ہے کہ جھینگا کھانا حلال ہے یا حرام، بعض ساتھی جھینگا کھانے کو حلال سمجھتے ہیں اور کھاتے بھی ہیں جبکہ دوسرے کچھ ساتھی اس کو حرام سمجھتے ہیں اور سختی سے منع کرتے ہیں یہ حضرات دلیل دیتے ہیں کہ ''اخبار جنگ'' میں حضرت مولانا مفتی محمد یوسف لدھیانوی صاحب نے لکھا کہ جھینگا مچھلی نہیں ہے لہٰذا حرام ہے۔

سائل نے خود ایک دفعہ حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی صاحب مدّ ظلّہ سے اس بارے میں دریافت کیا تھا اور انہوں نے چلتے چلتے یوں فرمایا کہ اس میں علماء کا اختلاف ہے، میں اس کو مکروہ سمجھتا ہوں، اس کے بعد ایک موقع پر جناب والا سے دریافت کیا تھا آپ نے جواب دیا تھا کہ جھینگا مچھلی ہے، اس کا کھانا حلال ہے، پھر میں نے جناب والا سے دوسرے علماء کے اختلاف کو ذکر کیا تھا تو آپ نے جواب دیا تھا کہ اس وقت جو جھینگا کو مچھلی نہیں سمجھتے ان کو جھینگا کے بارے میں پوری تحقیق نہیں ہے، جناب والا نے غالباً ایک کتاب کا حوالہ بھی دیا تھا جس کا نام اس وقت مجھے یاد نہیں آرہا ہے۔

اب یہ مسئلہ ہمارے دو ساتھیوں کے درمیان لڑائی اور جھگڑے کا باعث بن گیا ہے۔

لہٰذا جناب عالی سے گذارش ہے کہ اس مسئلہ پر اپنی محققانہ نظر تحریر فرمائیں گے اور ہمارے درمیان ہونے والی غلط فہمیوں کو دور فرمائیں گے ہمارے سب ساتھیوں کا اس بات پر اتفاق ہوا ہے کہ آپ کا تحقیقی جواب آنے پر تشفی ہوگی آپ لوگ حامل دین ہیں دین کی حفاظت کرنے والے اور اس کو صحیح سمجھنے والے ہیں لہٰذا اوّل فرصت میں اس کا جواب صواب تحریر فرما کر ہماری رہنمائی فرمائیں۔

فقط والسلام

از حیات احمد و دیگر احباب مدینہ منورہ

۲۰ر ذی الحجہ ۱۴۰۶ھ

باسمہٖ تعالیٰ

مدرسہ عربیہ ضیاء القرآن
کلی تورکچھ [illegible] کوئٹہ

الجواب

وعلیکم السّلام و رحمة اللّٰہ و بر کاتہٗ

بعد سلام مسنون یہ کہ جھینگا مچھلی کے بارے میں آپ لوگوں کا تفصیلی استفتاء پڑھ کر بہت ہی افسوس ہوا کہ علماء کرام کے اختلاف کی وجہ سے لوگ کیسے کیسے جھگڑوں میں پڑ گئے اور کیسے انتشار میں مبتلا ہو گئے ہیں کاش ہمارے علماء کرام ذرا بھی تدبّر سے کام لیتے تو آج امت میں اتنا انتشار نہ ہوتا اور وہ اتنے جھگڑوں میں نہ پڑتے۔

اللہ تعالیٰ ہماری سب کی مغفرت فرمائے اور سب کو راہِ راست پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائے آمین بحرمة سیّد المرسلین.

جھینگا مچھلی کے بارے میں کچھ عرصہ سے خیال پیدا ہوا تھا کہ ایک تحقیقی جواب لکھ دینا ضروری ہے تا کہ لوگوں کو اس بارے میں عدل وانصاف کی نظر سے سوچنے اور سمجھنے کی توفیق نصیب ہو اور ان کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں کسی کی عقیدتمندی یا شہرت اور رعب میں آ کر حلال کو حرام اور حرام کو حلال سمجھنے کی عادت ختم ہو جائے لیکن امروز وفردا کر کے وقت گزرتا گیا کچھ لکھنے کا موقع نہ ملا۔

آپ لوگوں کا تفصیلی سوالنامہ موصول ہونے کے بعد ایک داعیہ پیدا ہوا جس کی وجہ سے ذہن اور قلم نے بھی آمادگی ظاہر کر دی الحمدللہ قرآن وحدیث اور کتب تاریخ ولُغات سے جو کچھ لکھا ہے دلائل وبصیرت سے لکھا ہے بلا خوف لومة لائم شرعی حکم سمجھ کر لکھا ہے اگر عنداللہ قبولیت کو پہنچے تو فللّٰہ الحمد والشکر ورنہ پھر بھی اجر وثواب کی امید ہے۔

واضح رہے کہ جھینگا مچھلی کی حلّت وحرمت پر بحث کرنے سے قبل اس بارے میں چند اصول قارئین کرام کے واسطے گوش گزار کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تا کہ مسئلہ کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہو۔

اصول نمبر۱: حلال وحرام کا ثبوت قرآن وسنت اور اجماع امت سے یا پھر ان دلائل کی روشنی میں آئمہ مجتہدین کے قیاس سے قائم ہوتا ہے کسی کی ذاتی رائے اور اجتہاد سے حلال وحرام کا ثبوت نہیں ہوتا اس اصول کو سمجھنے کے لئے قرآن کریم کی درج ذیل آیات کو بار بار پڑھیئے اور غور کیجئے۔

(۱) حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قل أرأيتم مـاأنـزل الـلّٰه لكم من رزق فجعلتم منه حراما وحلالا قل ١ اللّٰه أذن

لکم أم علی اللہ تفترون. (سورہ یونس ۵۹)

آپ کہہ دیجئے کہ تم لوگ بتاؤ اور سوچو کہ خدائے تعالیٰ نے تمہارے لئے جو رزق نازل فرمایا تم اس میں بعض کو حرام اور بعض کو حلال ٹھہراتے ہو ان سے پوچھئے کہ کیا خدا نے اس کا تمہیں حکم یا اختیار دیا ہے یا تم خدا پر جھوٹ باندھتے ہو۔

تشریح: آیت مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی سختی کے ساتھ مذمت بیان کی ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ اشیاء کو حرام اور حرام شدہ اشیاء کو حلال قرار دیا ہے اور انہیں لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر جھوٹ باندھنے والے اور افتراء پیدا کرنے والے قرار دیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ حلال وحرام کے فیصلے کرنے کا اختیار صاحب وحی کو ہے کسی اور کو اس کا اختیار حاصل نہیں ہے لہٰذا جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے حرام قرار نہیں دیا ہے ان کو حرام قرار دینے کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہے اگر کوئی شخص اس کی کوشش کرے گا تو وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے والا اور افتراء کرنیوالا ہوگا۔

(۲) دوسری جگہ پر حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

یاأیھا الذین اٰمنوا لاتحرموا طیّبات ماأحلّ اللہ لھم ولاتعتدوا ان اللہ لایحب المعتدین. (سورۂ مائدہ)

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے واسطے جن پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیا ہے تم ان کو حرام قرار مت دو اپنی طرف سے حدود اور احکام شرع میں تجاوز مت کیا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسے لوگ پسندیدہ نہیں ہیں۔

تشریح: آیت مذکورہ کی شرح کرتے ہوئے صاحب تفسیر جلالین تحریر فرماتے ہیں۔

ای لاتعتدوا تحریم الطیّبات المباحات ولا تجاوزوا الحلال الی الحرام.

(جلالین ص ۵۲۱، ج. ۱)

یعنی پاکیزہ اور مباح چیزوں کو تم اپنی طرف سے حرام قرار مت دو اور حلال چیزوں کو چھوڑ کر حرام اشیاء کا ارتکاب مت کرلیا کرو۔

مذکورہ آیات اور تشریح سے واضح ہوا کہ اشیاء کو حلال وحرام قرار دینے کا اختیار صاحب وحی کو ہے کسی امتی کو اس کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا جن اشیاء کی حرمت قرآن وحدیث کی نص سے یا نصوص شرعیہ کی روشنی میں اصحاب رسولؐ کے اجماع اور آئمہ کے اجتہاد سے ثابت نہیں ان کو کسی جدید تحقیقات کی بناء پر حرام قرار دینا خدا اور رسولؐ پر صریح جھوٹ اور واضح افتراء باندھنے کے مترادف ہوگا۔

دوسرا اصول:

یہ کہ قرآن وحدیث میں کھانے کی اشیاء میں پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیا ہے

(الف) چنانچہ حق جل مجدہ کا ارشاد ہے:

یسئلونک ماذا أحل لهم قل أحل لكم الطيبات. (سورہ مائدہ)

یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے واسطے کیا چیزیں حلال ہیں آپ انکو بتادیں کہ تمہارے واسطے پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیا ہے۔

(ب) دوسری جگہ پر حق جل شانہ کا ارشاد ہے۔

اليوم أحل لكم الطيبات. (سورہ مائدہ)

یعنی آج کے روز تمہارے واسطے اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیا ہے۔

امام ابوبکر جصاص ''احکام القرآن'' میں طیّبات کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ألطيّبات اسم يقع على مايستلذ ويشتهى ويميل اليه القلب.

(احکام القرآن للجصاص ص ۴۵۲، ج. ۱)

طیبات کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو لذیز ہو ذوق سلیم اس کو چاہتا ہو اور طبیعت اس کی طرف مائل ہو۔

صاحب جمل فرماتے ہیں:

وهذا مقيد بمالم يردنصّ يتحريمه من كتاب وسنة أو اجماع ولاقياس.

(ص ۴۶۴، ج. ۱)

یعنی پاکیزہ چیزوں کی حلّت کے بارے میں یہ آیت اور اس کا عموم تمام مأ کولات کو شامل ہے مگر جن چیزوں کی حرمت پر قرآن وحدیث یا اجماع امت یا قیاس آئمہ کا موجود ہو وہ اس اباحت میں شامل نہیں ہے۔

جس سے معلوم ہوا کہ جن اشیاء مأ کولہ کی حرمت پر قرآن وحدیث کی نص موجود نہیں ہے اور امت کا اجماع یا خیر القرون کے اصحاب حدیث یا آئمۂ فقہ کا قیاس موجود نہیں ہے وہ پاکیزہ اور حلال ہیں صدیوں کے بعد کسی نئی تحقیق سے وہ چیزیں حرام نہیں ہوں گی۔

تیسرا اصول:

اللہ تعالیٰ نے دریائی جانوروں میں اَسماک (مچھلیوں) کو پاکیزہ اور حلال قرار دیا ہے

(الف) چنانچہ حق جل شانہ کا ارشاد ہے:

أحل لکم صید البحر وطعامه. (سورہ مائدہ)

تمہارے واسطے سمندری شکار (مچھلی) اور اسکے کھانے کو حلال قرار دیا ہے۔

آیت مذکورہ کی شرح کرتے ہوئے امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں:

قوله صید البحر أرادبه السمک دون ماسواه.

(احکام القرآن للجصاص ص ۴۸۰، ج۔ ۱)

یعنی سمندری شکار سے مُراد مچھلی ہے اس کے سوا دوسرے جانور مراد نہیں ہیں۔

(ب) دوسر جگہ پر حق جل مجدہ کا ارشاد ہے:

هو الذی سخّر لکم البحر لتأ کلوا منه لحماً طریاً. (سورة النحل)

اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جس نے تمہارے واسطے سمندر کو مسخر کر دیا ہے تا کہ تم اس میں سے تازہ گوشت یعنی مچھلی کا گوشت کھاؤ۔

تشریح: مذکورہ بالا دونوں آیات میں اللہ تعالیٰ نے سمندری جانوروں میں سے مچھلی کو حلال قرار دیا ہے بلاتفریق اس کے کہ مچھلی بڑی ہے یا چھوٹی زیادہ مزیدار ہے یا کم، شکل خواہ کیسی ہو ظاہری صورت اس کی کسی کو اچھی لگے یا بری، یا کسی نے اس کو دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو، یا دیکھنے کے بعد اس کو پسند ہو یا ناپسند ہو۔

لہٰذا مچھلی کے جملہ اقسام وانواع پاکیزہ اور حلال ہیں نیز ان آیات قرآنی کے علاوہ احادیث بھی ملتی ہیں چنانچہ ملاحظہ ہو۔

جملہ انواع سمک حلال ہیں احادیث کی روشنی میں

چنانچہ سمندری پانی اور مچھلی کے بارے میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد بار سوال کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مجلسوں میں متعدد پیرائے میں پانی کے پاک ہونے اور سمندری مچھلی کی

حلّت کو بیان فرمایا ہے اور آپؐ کے بعض الفاظ یہ ہیں۔

هو الطهور ماءه والحلال ميتته. (رواه احمد ورجاله ثقات مجمع الزوائد ص ۲۲۰. ج. ۱)

سمندری پانی بالکل پاک ہے اور سمندر کی مری ہوئی مچھلی بھی حلال ہے۔

روایت مذکورہ کے تحت بہت سے واقعات اور قصّے ہیں ایک واقعہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام کی جماعت دریائی سفر میں جایا کرتی تھی ان کو سمندری پانی اور مچھلی کے استعمال کی ضرورت پڑتی لیکن ان کے استعمال میں مختلف وجوہ سے تردد تھا۔

کہ پانی پاک ہے یا نہیں، اس سے وضو اور غسل درست ہے یا نہیں، اس طرح غذا کے واسطے سمندری مچھلی تازی یا مری ہوئی کا استعمال بوقت ضرورت جائز اور حلال ہے یا نہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب اس بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؐ نے دونوں مسئلوں کے جواب میں فرمایا کہ سمندری پانی سب پاک ہے اور سمندر کی تازہ مچھلی کی طرح مری ہوئی مچھلیاں بھی حلال ہیں مگر حدیث میں جس کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے وہ حرام ہے۔

جس سے معلوم ہوا کہ سمندری مچھلیاں خواہ بڑی ہوں یا چھوٹی ہوں خواہ کسی وزن کی ہوں کسی شکل کی ہوں کسی نوعیت کی ہوں تازی یا زندہ ہوں یا مردہ وہ حلال اور پاکیزہ ہیں ان کے کھانے میں کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

واضح رہے کہ یہ حدیث جس کا حوالہ میں نے دیا ہے درجنوں سے زائد کتب حدیث میں اکثر محدّثین کرام نے دسیوں صحابۂ کرام سے اس کو روایت کیا ہے اور مختلف الفاظ سے مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔

دیکھئے۔

(۱) مسند احمد ص۳۷۳، ج۔۳ — عن جابر رضی اللہ عنہ

(۲) سنن ابن ماجہ ص۳۲ — عن جابر رضی اللہ عنہ

(۳) ابن خزیمہ ص۵۹ — عن جابر رضی اللہ عنہ

(۴) دار قطنی ص۱۳، ج۔۱ — عن جابر رضی اللہ عنہ

(۵) ابن حبان فی صحیحہ کمافی نصب الرّایہ ص۹۸، ج۔ — عن جابر رضی اللہ عنہ

(۶) مسند الحاکم ص۱۴۳، ج۔۱ — عن أبي الزبير عن جابرؓ

(۷) طبرانی فی الکبیر کمافی التلخیص ص۱۱، ج۔۱ — عن أبي الزبير عن جابرؓ

(۸) مؤطاامام محمد ص ۶۷ عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ

(۹) کتاب الام للامام الشافعی ص ۲، ج۔۱ عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ

(۱۰) ابن ابی شیبہ ص ۱۳۱، ج۔۱ عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ

(۱۱) دارمی ص ۹۸ عن المغیرۃ بن ابی بردۃ عن ابیہ عن ابی ہریرۃؓ

(۱۲) نسائی ص ۲۱۔۶۳، ج۔۱ عن المغیرۃ بن ابی بردۃ عن ابیہ عن ابی ہریرۃؓ

(۱۳) بیہقی ص ۳،۴،۱۵۳، ج۔ اعن المغیرۃ بن ابی بردۃ عن ابیہ عن ابی ہریرۃؓ

(۱۴) التلخیص ص ۱۰،۱۱، ج۔۱

(۱۵) التاریخ للامام البخاریؒ کمافی کنزالعمال ص ۹۵، ج۔۵ برقم ۲۰۳۴

(۱۶) مصنف عبدالرزاق ص ۹۴، ج۔۱، برقم ۳۲۱، عن ابن عباسؓ

(۱۷) دارقطنی ص ۱۳، ج۔۱ عن انس بن مالکؓ

(۱۸) رواہ احمد ص ۲۷۹، والدارقطنی ص ۱۳، ج۔۱ ایضاً عن ابن عباسؓ

(۱۹) رواہ الحاکم ص ۱۴۰ اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور مسلم کی شرط پر ہے

(۲۰) دارقطنی ص ۱۳، ج۔۱ عن ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ

(۲۱) دارقطنی ص ۱۳، ج۔۱ عن علی رضی اللہ عنہ

(۲۲) والحاکم ایضاً ص ۱۴۲۔۱۴۳، ج۔۱

(۲۳) ابوداؤد ص ۱۱، ج۔۱

(۲۴) ترمذی ص ج۔۱

انہیں روایات کی روشنی میں فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ مچھلی کے جملہ انواع حلال ہیں۔

مچھلی کی تمام قسمیں پاکیزہ اور حلال ہیں فقہ کی روشنی میں

(۱) امام شمس الآئمہ سرخسیؒ نے مبسوط میں لکھا ہے۔

السمک مأکول بجمیع انواعہ ثبت الحلّ فیہ بالکتاب والسنّة.

(مبسوط السرخسی ص ۲۳، ج. ۲۱)

مچھلی کی تمام انواع حلال اور کھانے کے ہیں اور ان کا حلال ہونا کتاب اللہ اور سنت رسول سے ثابت ہے۔

(۲) صاحب فتاویٰ قاضی خان تحریر فرماتے ہیں

لابأس لسائرا نواع السمک نحو الجریث والمارماهی.

(فتاوی قاضی خان علی هامش العالمگیری ص ۱۷۵، ج. ۱)

مچھلی کی جملہ اقسام جریث اور مار ماہی سمیت کھانے کے ہیں اس میں کچھ حرج نہیں ہے۔

(۳) ملک العلماء علامہ کاسانی رقمطراز ہیں۔

یستوی فی حلّ الاکل جمیع أنواع السمک من الجریث والمارماهی وغیرهما لان ماذکرنا من الدلائل فی اباحة السمک لایفصل بین سمک وسمک الاماخصّ بدلیل وقد روی عن سیّدنا علی وابن عباس رضی الله عنه اباحة الجریث والسمک ولم ینقل عن غیرهما خلاف ذالک فیکون اجماعاً.

(بدائع الصنائع ص ۳۶، ج. ۵)

مچھلی کی حلّت یعنی مچھلیوں کا حکم کھانے کے جواز اور حلال ہونے میں سب مچھلیاں برابر ہیں خواہ وہ جریث مچھلی ہو یا مار ماہی یا دوسری اور کوئی نوع تمام انواع اسکی حلال ہیں کیونکہ مچھلی کے حلال اور مباح ہونے میں ہم نے قرآن وحدیث سے جو دلائل بیان کئے ہیں وہ تمام مچھلیوں کو شامل ہیں دلائل میں کسی خاص مچھلی کی حلّت یا کسی خاص مچھلی کی حرمت کی کوئی تفصیل مذکور نہیں ہے اس واسطے کسی دلیل خاص سے جب تک کسی مچھلی کی حرمت ثابت نہ ہوگی اس وقت تک مچھلی کی کسی قسم کو حرام نہیں کہا جائے گا مثلاً جریث اور مار ماہی کے بارے میں حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے بعضوں نے سوال کیا ان دونوں فقہاء نے حلال ہونے کا فتویٰ دیا اور دوسرے کسی صحابی سے ان کے خلاف کوئی روایت منقول نہیں ہے لہٰذا جریث اور مار ماہی کی حلّت میں گویا امت کا اجماع ہو گیا ہے۔

مذکورہ کتب فقہ کے علاوہ دوسرے مذاہب کی کتب فقہ میں بھی اس طرح کی روایات موجود ہیں بخوف طوالت اس کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔

لہٰذا مذکورہ نقول سے معلوم ہوا کہ مچھلی کی تمام قسمیں خواہ بڑی ہو یا چھوٹی، ان کی صورت اور شکل کیسی ہو۔ ان کا رنگ اور ان کی ہیئت اور جسامت کیسی ہو کسی کو طبعی کراہت ہو یا طبعی رغبت، سب کی سب حلال اور پاکیزہ ہیں مچھلی کی قسم کو کسی فرد کی طبعی کراہت یا کسی ملک کے باشندوں کی عدم واقفیت یا کسی علاقہ والوں کی طبعی نفرت کی بناء پر حرام یا مکروہ قرار نہیں دیا جائے گا اس لئے کہ حرمت اور کراہت یہ دونوں چیزیں شرعی احکام ہیں جس کے لئے ضروری ہے کہ نص سے ثابت ہو البتہ پھر بھی اگر کوئی طبعی کراہت سے نہ کھائیں تو یہ دوسری بات ہے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

یہاں طالب علمانہ طور پر ایک شبہ وارد ہوسکتا ہے وہ یہ کہ جب قرآن وسنت سے تمام انواع سمک کی حلّت ثابت ہے تو پھر حضرت ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ سے اور ان کے بعد کے فقہاء کرام سے خاص طور پر جریث اور مارماہی پر بحث کرنے اور ان کی حلّت کو بیان کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ یہ اور اس کے اندر کیا حکمت ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مچھلی کی تمام انواع میں سے سوائے جریث اور مارماہی کے کسی نوع کی شکل و شباہت میں ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ کسی نوع کے بارے میں دنیا کے کسی خطہ کے لوگوں کو شبہ وارد ہوسکتا ہے کہ وہ مچھلی ہے یا نہیں ہے البتہ جریث اور مارماہی مچھلی دونوں اپنی شکل وصورت سے دوسری مچھلیوں سے کچھ ایسی مختلف نمایاں صورتیں رکھتی ہیں کہ دیکھنے والوں میں جن کو مچھلیوں کے بارے میں مہارت نہ ہو، تجربے نہ ہوں وہ انہیں آسانی سے مچھلی تصور کرنے کے لئے راضی نہ ہوں گے۔

اس لئے کہ جریث مچھلی گول مدوّر اور چپٹی سی ہوتی ہے جبکہ عام طور پر مچھلیوں کی شکل ایسی نہیں ہوتی اور مارماہی لمبی اور گول سانپ نما ہوتی ہے اور تقریباً ایک فٹ سے دوفٹ تک بھی ہوتی ہے۔

چونکہ ایسے حالات میں ناتجربہ کار اور ناواقف لوگوں کو شبہ ہونا ظاہر ہے اس لئے صحابہؓ کرام میں سے دو فقیہ حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے اس کی وضاحت فرمادی اور شبہ کے احتمال کو ختم کردیا دوسرے فقہاء کرام نے بھی جملۂ انواع سمک کی حلّت کو بیان فرمانے کے بعد حق امانت کو ادا کرتے ہوئے فقہاء صحابہ کے کلام کو نقل فرمادیا اس سے مقصد کسی تحدید کو بیان کرنا نہ تھا بلکہ ایک شبہ کو دور کرنا تھا۔

علاوہ ازیں انواع سمک تو سینکڑوں اور ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں اور کروڑوں سے بھی زیادہ اور ان گنت ہوں گے جبکہ احادیث میں صرف چند مچھلیوں کے اسماء اور تذکرے آتے ہیں جس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ صرف نامزد مچھلیاں حلال ہیں باقی حرام ہیں حالانکہ دنیا کے کسی خطّے میں بعض انواع سمک کی کثرت ہوتی ہے اور دوسرے خطّے میں دوسری قسم کی مچھلی کی کثرت ہوتی ہے اور ایسا بھی ممکن ہے کہ دنیا کے بعض علاقوں میں بعض مچھلیوں کی شہرت زیادہ ہے اور بعض دوسرے علاقوں میں دوسرے اقسام کی کثرت اور شہرت زیادہ ہوگی اور یہ حسن اتفاق ہے کہ ہمارا موضوع بحث جس مچھلی کے بارے میں ہے۔

مچھلی کی ان اقسام میں سے ہے کہ دنیا کے بیشتر علاقوں میں کثرت سے پائی جاتی ہے اور مغرب سے لے کر مشرق تک چپہ چپہ میں مشہور اور معروف ہے۔

بلکہ کئی بڑے مصری اور سعودی علمائے کرام اور بعض کلیۂ شرعیہ کے اساتذہ کے بقول جھینگا مچھلی "الذ الا سماک فی الدنیا و اغلاھا فیھا" میں سے ہے۔ کہ دنیا کی لذیز ترین اور قیمتی سب سے زیادہ دام والی مچھلیوں میں سے ہے۔

لیکن افسوس کہ پاکستان کے بعض معزز علمائے کرام اور جہاندیدہ معاصر کو بھی اس میں لغزش ہوگئی یا انہیں پوری تحقیق کی نوبت اور فرصت نہیں ملی پھر کمال کی بات یہ ہے کہ ان علماء میں بعض حضرات نے تو جھینگا کے ان اقسام غیر متناہی کو دیکھا ہی نہیں ہے۔

یہ بڑی حیرت کی بات ہے اور دکھ کی بھی، مجھے امید ہے کہ یہ حضرات اپنی تحقیقات پر نظر ثانی کریں گے اور فتویٰ دینے میں آئندہ اس بارے میں احتیاط فرمائیں گے مجھ حقیر کو ان حضرات میں سے بیشتر حضرات کی دیانت اور علمی مقام سے یہ توقع ہے کہ وہ انشاء اللہ سنجیدگی سے اس بارے میں غور فرمائیں گے۔

چوتھا اصول:

اہل لغت اور اہل دانش کے بعد ماہرین سمک کی رائے کا اعتبار ہے

مچھلی کی انواع اور اقسام کی معرفت اور پہچان کے بارے میں ماہرین سمک کی رائے معتبر ہے۔

یعنی ماہرین سمک جنہیں مچھلی قرار دیویں انہیں مچھلی قرار دیا جائے گا اور وہ جنہیں مچھلی قرار نہ دیں وہ مچھلی قرار نہ پائیں گی کیونکہ یہ بات مسلّم اور حقیقت میں سے ہے کہ اہل لسان اور اہل لغت کی تحقیق کے بعد آخری رائے اس کے ماہرین ہی دیتے ہیں اور مچھلی کی مہارت ساحل سمندر پر رہنے والوں کو ہے جن کے شب و روز بلکہ چوبیس گھنٹے کے اوقات اسی میں گذرتے ہیں اور رہتے ہیں وہ زیادہ ماہر ہوتے ہیں لہٰذا انہیں کی رائے معتبر ہوگی۔

جو علماء اس بارے میں ناواقف ہیں انہیں اہل لغت پھر اہل عرف کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

اب آیئے کہ جھینگا مچھلی کے بارے میں اہل لغت اور اہل دانش کیا فرماتے ہیں۔ اس کو دیکھیں اور معلوم کریں۔

(۱) صاحب تاج العروس امام لغت سیّد محمد مرتضیٰ الزبیدی فرماتے ہیں

ألا ربیان سمک بیض کا لدود (تاج العرس ص ۱۴۳، ج. طبع لیبیا)

جھینگا مچھلی سفید مچھلیوں کی ایک قسم ہوتی ہے اور دیکھنے میں کیڑے جیسی معلوم ہوتی ہے

(۲) صاحب قاموس المحیط الشیخ مجد الدین محمد بن یعقوب الفیر وزآبادی الشیر ازی لکھتے ہیں۔

ألا ربیان سمک کالدّود (قاموس المحیط ص ۳۳۲، ج. ۴ طبع مصر)

جھینگا مچھلی کیڑے کی شکل میں ایک قسم کی مچھلی ہے۔

(۳) صاحب صحاح الشیخ اسماعیل بن حمّاد الجوہری تحریر فرماتے ہیں۔

ألار بیان بکسر الهمزة ضرب سمک یکون بالبصرة.

(الصحاح ص ۲۳۵، طبع مصر)

جھینگا مچھلی ایک نوع کی مچھلی ہے بصرہ میں زیادہ ہوتی ہے۔

(۴) امام لغت صاحب جمہرۃ اللّغۃ محمد بن حسن بن درید الازدی البصری المتوفی ۳۲۱ھ لکھتے ہیں:

ألا ربیان نوع سمک (ص ۴۱۴، ج. ۳ طبع دائرة المعارف حیدر آباد دکن)

جھینگا مچھلیوں میں سے ایک قسم کی مچھلی ہے۔

(۵) صاحب تہذیب الصحاح محمود احمد الزنجانی لکھتے ہیں:

ألار بیان سمک من ألا سماک (ص ۹۷۴، ج. ۳ طبع مصر)

جھینگا مچھلی مچھلیوں میں سے ایک قسم ہے۔

(۶) صاحب فقہ اللّغۃ حسین یوسف موسیٰ تحریر فرماتے ہیں:

ألا ربیان سمک کالدود (ص ۹۷۵)

جھینگا کیڑا نما مچھلی ہے۔

(۷) ماہر حیوانات اور امام اللّغۃ صاحب حیاۃ الحوان علامہ دمیری تحریر فرماتے ہیں:

ألروبیان هو سمک صغیر جدًّا (حیاة الحیوان ص ۵۲۸ طبع مصر).

جھینگا چھوٹی قسم کی مچھلی ہے۔

(۸) صاحب الإفصاح تحریر فرماتے ہیں:

ألا ربیان سمک کالدود (ص ۹۷۵، ج. ۲ طبع دار الفکر)

جھینگا مچھلی ہے کیڑے کے مشابہ ہے۔

(۹) أقرب الموارد میں لکھتے ہیں

ألا ربیان سمک أبیض کالدود. (ص ۳۸۷، ج. ۱)

جھینگا کیڑا نما سفید مچھلی ہے۔

(۱۰) المنجد میں لکھا ہے۔

هو سمک یشبه هیئة البرغوث الخ (ص ۳۲ طبع بیروت)

جھینگا ایک قسم کی مچھلی ہے پسّو کے مشابہ ہے۔

احقر نے عربی حوالوں کے لئے تمثیلاً صرف دس کتابوں کے نام پر اکتفا کیا ہے ورنہ اس میں بیسیوں کتب لغات کے حوالے موجود ہیں جنہیں لغت کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اب چند اردو اور فارسی کتب لغات کے حوالے بھی ملاحظہ فرمائیں

(۱) مصباح اللّغات میں ہے۔

ألاربیان جھینگا مچھلی مصباح اللغات (عربی اردو) ص ۱۳ طبع کراچی

(۲) لغات صراح میں ہے

أربیان بکسر تین والتخفیف. نوع از ماہی (صراح ص ۵٦۰ طبع کانپور۔)

(۳) منتہی الارب میں لکھتے ہیں۔

نوع از ماہی وبہندی جھینگا است۔ (ص ٦۷۳، ج۔ ۸ طبع لاہور)

(۴) فرہنگ آصفیہ میں لکھتے ہیں:

جھینگا ایک قسم کی چھوٹی مچھلی ہے۔ (ص ۷۹، ج ۲ طبع لاہور۔)

(۵) صاحب فیروز اللغات لکھتے ہیں۔

جھینگا ایک قسم کی چھوٹی مچھلی ہے۔ (ص ۳۸٦، طبع لاہور)

(٦) فیروز اللغات اردو جدید میں لکھتے ہیں:

جھینگا ایک قسم کی چھوٹی مچھلی ہے۔ (ص ۲٦۹ طبع لاہور)

(۷) بنگلہ اردو فرہنگ ربانی میں لکھتے ہیں:

جھینگا ایک قسم کی مچھلی ہے۔ (ص ۲۳٦)

(۸) بستان المفردات میں لکھتے ہیں۔

ماہی روبیان جھینگا مچھلی ہے اور سرخ وسفید مختلف رنگ کی ہوتی ہیں (ص ۲٦۳)

(۹) کتاب المفردات میں ہے۔

جھینگا، عربی میں، سمک، روبیان، فارسی میں روبیان، ماہی، سندھی میں کانگٹ۔ ایک قسم کی مچھلی ہے پاؤں لمبے ہوتے ہیں سرخ رنگ کے کراچی میں بکثرت ملتی ہے۔ (ص ۲۰۱)

یہاں تک اردو، فارسی اور طب کی نو کتابوں کے حوالے بندہ نے دیئے ہیں اس میں سے انگریزی اور اردو انگریزی اور عربی انگریزی کی دسیوں کتب ہیں جن میں جھینگا مچھلی کی قسم میں سے کہا گیا ہے میں نے بخوف طوالت زائد حوالوں کو چھوڑ دیا ہے۔

یہاں پر میرا مقصد صرف ان حضرات علماء کرام کی توجہ اس طرف دلانی ہے جو محض ناواقفیت کی بناء پر یا سادہ پنی میں یا کسی نامعلوم وجہ سے جھینگا کو مچھلی کی بجائے کیڑا سمجھتے ہیں اور اسے اپنے گمان میں حرام اور ناجائز سمجھتے ہوئے دوسرے کو بھی ناجائز وحرام ہونے کا فتویٰ دیتے ہیں۔

ورنہ بندہ جواب میں صرف ایک دو حوالے تحریر کر دیتا غرض یہ کہ مذکورہ بالا کتب فقہ وفتویٰ اور کتب لغات وطب کے حوالوں سے قارئین کرام کو بھی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ جھینگا کے بارے میں ارباب لغات اور اطباء اور اہل عرف میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ یہ مچھلی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت فقیہ الامۃ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے اس بارے میں عدم جواز کے فتویٰ کے بعد حضرت حکیم الامّت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ دمیریؒ اور دوسرے علماء کرام کے حوالے پیش کر کے قول فیصل یہ فرمایا تھا کہ بہرحال احقر کو اس کے سمک ہونے میں بالکل اطمینان ہے۔ (امداد الفتاویٰ ص ۱۰۳ ج. ۴)

حضرت مولانا تھانویؒ کا دوسرا فتویٰ اوجھڑی اور جھینگا کے متعلق ہے اس میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ فقہاء کرام نے اوجھڑی کو بمنزلہ لحم لکھا ہے اور جھینگا کے متعلق یہ کہ درمختار وغیرہ میں تمام انواع سمک کو حلال کہا ہے اور سمک ہونا یہ عدول مبصّرین کے اخبار پر ہے اور جھینگا کو حیاۃ الحیوان میں مچھلی لکھا ہے اس لئے جھینگا اور اوجھڑی دونوں حلال ہیں جھینگا کے لفظ سے شبہ نہ کیا جائے۔

(امداد الفتاویٰ ص ۱۰۴ ج. ۴ طبع دار العلوم کراچی)

حضرت مولانا مفتی عبدالرحیم راجپوری مدظلہم نے جھینگا کو مچھلی میں سے ہونے اور حلال ہونے کے بارے میں بے شمار حوالے نقل کئے ہیں پھر آخر میں لکھا ہے کہ یہ جھینگا مچھلی ہے اس پر کیڑے ہونے کا شبہ نہ کیا جائے لہٰذا بناءً مچھلی ہونے کے وہ حلال ہے اس کو حرام قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

ان تحقیقات اور فتاویٰ کے بعد بدون حوالے کے جتنے اکابر علماء نے یا بعد کے علماء نے اس کی عدم حلّت کے بارے میں فتویٰ دیا ہے انہیں صحیح قرار نہیں دیا جائے گا بلکہ صحیح اور تحقیقی بات یہی ہے کہ جھینگا مچھلی کی قسموں میں سے ایک قسم ہے اور حلال ہے۔

نیز یہ کہ قرآن وحدیث اور صحابہ کے اجماع اور فقہاء کے اقوال میں سے کسی میں بھی اس کی حرمت اور ممانعت کا ذکر نہیں ہے بلکہ انہیں مذکورہ ادلہ کے عموم سے اور اہل لغت اور عرف کی تحقیقات اور اقوال

سے اس کا مچھلی ہونا اور حلال ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اس وجہ سے ہماری تحقیق اور رائے یہ ہے کہ جھینگا پہلے زمانے سے مچھلی تھی اور آج بھی مچھلی ہے اور پہلے زمانے سے اس کی حلّت چلی آرہی ہے آج تک اس میں کسی نے اختلاف نہیں کیا ہے اگر کسی نے اختلاف کیا ہے تو بعد والوں نے کیا ہے جس کا اعتبار شرع میں نہیں ہے اور اگر اس کی حرمت پر کسی عالم دین کے پاس نص یا روایت یا فقہاء اربعہ میں سے کسی کا قول ہوگا یا متقدمین ومتاخرین کی کتب وفقہ و فتاویٰ کی کوئی روایت پیش کی جاسکے گی تو اسے پیش کرنا چاہیئے تا کہ اس پر غور کیا جاوے بلا وجہ جہل کو دلیل تصور کر کے کسی خامہ فرسائی کی کوشش سودمند نہ ہوگی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمانوں کی رہنمائی فرمائے

وهو يهدى السبيل وصلى الله تعالىٰ علىٰ نبيه وسلم

کتبہ، بندہ محمد عبدالسلام چاٹگامی

دارالافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیہ، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی ۵

۱۲؍صفر المظفر ۱۴۰۶ھ

تصدیقات حضرات مفتیان کرام

دارالافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی نمبر ۵

(۱) حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب زید مجدھم

الجواب صحیح نظام الدین شامزی

(۲) حضرت مولانا مفتی محمد ولی درویش صاحب زید مجدھم

الجواب صحیح، محمد ولی درویش غفرلہ

(۳) حضرت مولانا مفتی ابوبکر سعید الرحمٰن صاحب زید مجدھم

جیسا کہ قدیم وجدید تحقیق سے جھینگا کا مچھلی ہونا ثابت ہے تو اسکی حلت میں کچھ شک وتردد نہیں ہے۔ ابوبکر سعید الرحمٰن غفرلہ

(۴) حضرت مولانا مفتی محمد انعام الحق صاحب زید مجدھم

الجواب صحیح۔ محمد انعام الحق

(۵) حضرت مولانا مفتی محمد شفیق صاحب زید مجدھم

الجواب صحیح محمد شفیق عارف۔

(۶) حضرت مولانا مفتی محمد عبد القادر صاحب زید مجدھم

الجواب صحیح محمد عبد القادر۔

(۷) حضرت مولانا مفتی محمد شہاب الدین صاحب زید مجدھم

الجواب صحیح محمد شہاب الدین۔

تصدیقات مفتیان کرام وعلمائے محققین، بنگلہ دیش

ڈھاکہ کے مفتیانِ کرام اور علماء دین کی تصدیقات

☆ الجواب ھو الجواب

الاحقر منصور الحق عفا اللہ عنہ

المفتی بالجامعۃ الرحمانیۃ العربیۃ

محمد پور، داکا، بنغلہ دیش

۱۵ ربیع الاول ۱۱ھ

☆ الجواب صحیح

محمد شمس الحق عفا اللہ عنہ

خادم الافتاء

مدرسہ نوریہ اشرف آباد ڈھاکہ

۵ نومبر ۱۹۹۰ء

☆ الجواب صحیح

ابو سعید

جامعہ عربیہ فرید آباد ڈھاکہ

۱۹/۴/۱۱ھ

☆ الجواب صحیح

محمد فیض اللہ ابراہیمی عفا اللہ عنہ

جامعہ محمدیہ عربیہ ڈھاکہ

۲۴ ربیع الثانی ۱۴۱۱ھ

☆ الجواب صحیح

فضل حق عفا اللہ عنہ

جامعہ قرآنیہ لال باغ ڈھاکہ

☆ الجواب صحیح

محمد صادق عفا اللہ عنہ

از دار الافتاء جامعہ اسلامیہ دار العلوم مدینہ

جاترا باری ڈھاکہ نمبر ۴۰، ۲۵/۱۰/۹۰ء

☆☆☆

تصدیقات حضرات مفتیان عظام ودیگر علماء کرام

دارالعلوم معین الاسلام ہاٹہزاری چاٹگام بنگلہ دیش

(۱) أصاب فیما أجاب وأجاد فیما افاد' مزید یہ کہ قرآن وحدیث اور فقہاء کرام کی عبارت اوراہل لغت و عرف، کے اقوال سے جب جھینگا کا مچھلی ہونا ثابت ہے تو اس کی حلت میں شک وتردد کی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے۔

(مولانا) احمد شفیع غفرلہ ۹/۵/۱۴۱۱ھ
رئیس جامعۃ اہلیہ دارالعلوم معین الاسلام
ہاٹہزاری چاٹگام

(۲) أصاب فیما أجاب و أجاد فیما أفاد"

(مولانا) عبدالعزیز غفرلہ ۱۲/۵/۱۴۱۱ھ
شیخ الحدیث دارالعلوم معین الاسلام
ہاٹہزاری چاٹگام

(۳) الجواب حق و الحق أن یتبع،

(مولانا مفتی) احمد الحق غفرلہ۔ ۱۱/۵/۱۴۱۱ھ
رئیس دارالافتاء جامعہ اہلیہ دارالعلوم معین الاسلام
ہاٹہزاری چاٹگام

(۴) ذالک جواب صحیح لاریب فیه،

(مولانا مفتی) نور احمد غفرلہ ۱۳/۵/۱۴۱۱ھ
رکن دارالافتاء جامعہ مذکورہ

(۵) الجواب صحیح (مفتی) کفایت اللہ ۱۳/۵/۱۴۱۱ھ
رکن دالافتاء

(٦) الجواب صحیح: نیز یہ کہ جبکہ جھینگا کو تمام ماہی گیر اور دنیا کے تمام ساحلی علاقے کے لوگ مچھلی کہتے ہیں بلکہ اس کو دوسری مچھلیوں کے مقابلے میں لذیذ ترین مچھلی قرار دیتے ہیں جیسا افریقی ممالک، حجاز مقدس، برما، انڈونیشیا، ملیشیا، سریلنکا، ہندوستان، بنگلہ دیش، کے ماہی گیروں کی رائے ہے تو یورپین بے دین

لوگوں کی تحقیقات کی بنیاد پر ناواقف حضرات کا اسے مچھلی کے حکم سے نکالنا فقہی اصول کے اعتبار سے غلط ہوگا اور اس میں کسی قسم کا شک وشبہ کا اظہار بھی بے فائدہ ہوگا۔

بندہ محمد جسیم الدین عفا اللہ عنہ ۱۳/۵/۱۴۱۱ھ

(۷) ہست صادق این فقیہ اندر جواب
نیست شک و اللہ اعلم بالصواب

(مولانا) محمد قاسم عفی اللہ عنہ،

۱۳/۵/۱۴۱۱ھ

(۸) الجواب صحیح (مولانا) محمد قاسم غفرلہ ولوالدیہ ہاٹہزاروی

استاذ دارالعلوم معین الاسلام ہاٹہزاری

۱۳/۵/۱۴۱۱ھ

(۹) نعم ما اجاب، (مولانا) محمد سلیمان ارمان قاسمی ہاٹہزاری

۱۳/۵/۱۴۱۱ھ

(۱۰) جواب صحیح ہے۔

(مولانا) محمد ہارون عفی اللہ عنہ ۱۴/۵/۱۴۱۱ھ

(۱) تصدیق از دارالافتاء بالجامعۃ الاسلامیہ العبیدیہ نانوپور۔ شیتاغونغ بنگلہ دیش،

التاریخ ۱۰-۳-۱۴۱۱ھ

مخدوم ومطاع حضرت مولانا مفتی عبدالسلام صاحب زیدت معالیکم

وعلیکم السّلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

امابعد۔ معروض الخدمت ہے کہ مشرفنامہ باعث شرف ہوا مافیہا سے آگاہی ہوئی بندہ بفضل اللہ تعالیٰ مع اہل جامعہ بخیر وعافیت ہے، امید ہے مزاج گرامی خیریت سے ہوں گے جھینگا مچھلی کے بارے میں جواب تو وہی ہے جو آپ کی تحریر سے بشکل رسالہ حیّز وجود میں آیا۔ فجزاکم اللّٰہ تعالیٰ عنا وعن جمیع المسلمین خیر الجزاء. وجعله كاشفاً للغطاء عن افهام اصحاب الخطاء اٰمين. بطور توضیح مقام نیز جزائے خیر سے بہرہ مند ہونے کے لئے بندہ کی جانب سے بھی اس بارے میں ایک

ٹوٹی پھوٹی تحریر ارسال خدمت ہے۔

کہ جھینگا مچھلی باجماع ائمہ اربعہ بلکہ باجماع امت حلال ہے چونکہ باستثنائے معدود چند تمام دریائی جانور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک حلال ہیں فلہٰذا جھینگا مچھلی بھی ان کے نزدیک حلال ہے اور چونکہ تمام تجربہ کار اہل عرف اور ائمہ لغات کے نزدیک اس کی پہچان مچھلی ہی کے ساتھ معروف ہے جو شی کی حقیقت شناسی کے لئے بنیادی معیار ہے بنابریں باتفاق ائمہ حنفیہ وہ حلال ہے کیونکہ ان کے نزدیک باستثنائے طافی مچھلی کا ہر فرد حلال ہے۔ کما فی ذبائح اعلاءُ السنن وبالجملہ فکل ماکان من جنس السمک لغةً وعرفاً فھو حلال بلا خلافٍ کالسقنقور والروبیان.

سواب قیاس کے ذریعہ مچھلی اور غیر مچھلی کے درمیان مابہ الامتیاز کچھ علامات بیان کر کے اسکو افراد مچھلی سے نکال کر حرام کہنے کی گنجائش نہیں ہے۔فان الاصل مسلم ان العرف قاضٍ علی القیاس ۔نیز ثبوت حرمت کے لئے دلیل قطعی کی ضرورت ہے ھکذا فی طھارة ردّ المحتار وکتب الاصول سواس کی حرمت کس طرح ثابت ہوگی جبکہ اس کے لئے دلیل ظنی بھی نہیں ہے۔ نیز وہ مچھلی ثابت.........ہونے کے باوجود اس کی حرمت کس طرح ثابت ہوگی جبکہ وہ غیر مچھلی ہونے کی صورت میں بھی مجتہد فیہ ہے۔ادھر اصل الاشیاء اباحة بھی جمہور حنفیہ کا مذہب ہے کمافی طھارة ردّ المحتار تو صرف قیاسی شکل کی بناپر قولہ تعالیٰ یحرّم علیھم الخبائث، کے ماتحت اس کو داخل کرنے کی مجال کسی کو نہیں ہے جبکہ خبائث کی تفسیر اور تعیین میں بھی اہل علم کا اختلاف ہے باوجودیکہ اس کی تفاسیر مختلفہ میں سے کسی تفسیر کا مصداق یقینی یا ظنی حیثیت سے بھی صحیح نہیں ہوگا کیونکہ دو چیز کی مشاکلت عینیت حقیقت کا مستلزم نہیں ہے جیسا کہ مار ماہی سمک ہونے کی بناپر باتفاق امت حلال ہے باوجودیکہ وہ سانپ کا ہم شکل ہے کما فی ذبائح اعلاءُ السنن الجریث نوع من السمک یشبہ الحیات.....الخ

فقط واللہ اعلم

سعید احمد غفرلہٗ

خادم دارالافتاء بالجامعة الاسلامیة العبیدیة

بنانو پور شیتا غونغ ۔ بنگلہ دیش

۱۴۱۱/۳/۱۹ ھ

(۱) جواب صحیح ہے

احقر سلطان احمد غفرلہٗ
مہتمم جامعہ الاسلامیہ عبیدیہ نانوفور چاٹگام بنگلہ دیش

(۲) جواب صحیح ہے

احقر محمد سلیمان
نائب مہتمم جامعہ الاسلامیہ عبیدیہ نانوفور چاٹگام بنگلہ دیش

(۳) جواب صحیح ہے۔

احقر ضمیر الدین عفی عنہ
معین مہتمم جامعہ الاسلامیہ عبیدیہ نانوفور چاٹگام بنگلہ دیش

(۴) میں اس تحریر سے پوری طرح متفق ہوں۔ محمد ہارون غفرلہٗ شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ عبیدیہ نانو پور چاٹگام۔ بنگلہ دیش

(۵) جواب صحیح ہے

احقر محمد شمس الحق غفرلہٗ
ناظم تعلیمات نانو پور چاٹگام۔ بنگلہ دیش

جھینگا کے بارے میں حضرت علامہ السید مولانا محمد یوسف بنوریؒ اور پیر کامل حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب رائے پوری قدس سرہ کی رائے:

عزیز السید مولانا محمد یوسف بنوری زیدت معالیکم کا بیان ہے کہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ صاحب جب کراچی تشریف لائے تھے۔ ایک مرید خاص نے آپ کو اور آپ کے ہمراہ حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کو مدعو کیا تھا۔ حضرت شاہ صاحب کے ساتھ اپنے متعلقین و مریدین حضرت رائے پوری کے مجاز بیعت اور بھائی مولانا محمد بنوری اور جامعہ کے موجودہ مہتمم محترم مولانا حبیب اللہ مختار بھی تھے کھانے میں جھینگا کی بریانی تھی۔ کھانا جب شروع ہوا تو بعض نے ان میں سے حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت مولانا بنوریؒ کی طرف مخاطب ہو کر سوال کیا۔ حضرت جھینگا کے بارے میں بعض مکروہ (حرام) کہتے ہیں اس کا حکم کیا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کھانا لیکر سب کو دے رہے تھے سائل کو زبانی کوئی جواب نہیں دیا لیکن حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے فرمایا بھائی جھینگا ہمارے نزدیک مچھلی ہے، حلال اور جائز ہے۔ سب خاموش ہو گئے خاموشی سے سب نے دعوت کھائی۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے محدث العصر و مفتی مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے علم و معلومات اور ان کے زہد و تقویٰ کی کوئی مثال اس زمانہ میں نہیں بلکہ برسوں میں ملنا مشکل ہے اور حضرت عبدالعزیزؒ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کے تلمیذ رشید اور حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے جانشین تھے۔ اب دونوں حضرات نہ صرف اس کو حلال سمجھتے تھے بلکہ عملاً تناول فرمانے کا ثبوت دیتے ہیں۔ حدیث و فقہ کے ان دونوں پہاڑوں کے مقابلہ میں کیا اس زمانے میں کوئی زید و بکر جرأت کرسکتا ہے کہ وہ کہے کہ جھینگا ہمارے نزدیک حرام ہے۔ **فاعتبر وایا اولی الابصار**

بندہ محمد عبدالسلام ۷/ شعبان ۱۴۱۴ھ

رائے گرامی محقق العصر حضرت مولانا محمد اسحاق دامت برکاتہم صاحب شیخ الحدیث جامعہ عربیہ اسلامیہ عزیز العلوم بابونگر چاٹگام۔ بنگلہ دیش

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

امابعد!

عزیز محترم مولینا مفتی عبدالسلام صاحب سلمہ ربہ نے جھینگا مچھلی کے حکم کے بارے جو تحقیق پیش کی ہے، وہ ہمارے خیال میں بالکل صحیح ہے۔ پھر بھی یہاں چند چیزوں پر روشنی ڈالنی ہم ضروری سمجھتے ہیں تاکہ مسئلہ اور بھی واضح ہوجائے۔

اوّل ۱: حرام و مکروہ کی تعریف: سو حرام وہ ہے جس کا ممنوع ہونا دلیل قطعی سے ثابت ہو۔ اور مکروہ تحریمی وہ جس کا ممنوع ہونا دلائل ظنیہ سے ثابت ہو۔

دوم ۲: مچھلی کی حقیقت اور اس کی تعریف کیا ہے؟ تو جہاں تک ہمارے ناقص تتبع کا تعلق ہے اب تک ہمیں فقہاء کرام یا شراح حدیث کی عبارات میں مچھلی کی ایسی کوئی جامع مانع تعریف یا علامت نہیں ملی جس سے یہ کہا جاسکے کہ فلاں انواع حیوانات مائیہ مچھلی ہیں اور فلاں انواع نہیں۔ "اعلاء السنن" (ص ۱۵۸، جلد ۷ الطبع فی مطبع سپر آرٹ کراچی) میں کیا خوب لکھا:

وبالجملة فكل ما كان من جنس السمك لغة وعرفاً فهو حلال بلاخلاف كالسقنقور و الروبيان ونحوهما."

سوم ۳: حیوانات بحریہ کے متعلق تمام مذاہب میں بڑی وسعت ہے کہ بعض مخصوص حیوانات مثلاً انسان، خنزیر، تمساح، ضفدع وحیہ (سانپ) کے سوا اکثر مذاہب میں سب حیوانات مائیہ حلال ہیں، حتی کہ حسب تصریح امام نووی رحمۃ اللہ علیہ "امام شافعیؒ کا صحیح قول یہ ہے کہ ضفدع کے سوا تمام حیوانات مائیہ

حلال ہیں۔'' سب سے تنگی مذہب احناف میں ہے کہ غیر طافی مچھلی ہی حلال ہے نہ کہ باقی حیوانات مائیہ۔تو یہ بھی تمام مچھلیوں کو حلال قرار دیتے ہیں۔

ایسی صورت میں جب کوئی دلیل جھینگا مچھلی کے مچھلی نہ ہونے پر موجود نہ ہو بلکہ اس کے برخلاف مچھلی ہونے کی تصریح تمام معتبر لغت کی کتابوں میں موجود ہو اور اطباء محققین اس کے مچھلی ہونے کی تصریح فرمارہے ہوں تو کسی دلیل شرعی کے بغیر اس کو مچھلی نہ کہنا یا اس پر حرمت یا کراہت کا حکم لگانا تمام مذاہب اور مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کی تضلیل کے سوا اور کیا ہوگا۔اس سے بڑھ کر جرأت اور بے احتیاطی کیا ہوسکتی ہے۔فتاویٰ شامی میں ہے۔

اذا استفتیت عمافیه تحریم و تحلیل: فلاتعجل ففی فتیاک أخطار وأهوال هذا والله أعلم بالصواب.

(نوٹ) ''درس ترمذی'' (ص۲۸۳۔۲۸۴ ج۔الطبع اوّل) میں جو ذکر کیا گیا کہ صرف ''علامہ دمیری'' ہی نے ''حیواۃ الحیوان'' میں اس کو مچھلی بتایا اور یہ ماہر حیوانات نہ ہونے کی بنا پر ان کا قول معتبر نہیں'' معلوم نہیں۔محترم مولانا عبدالسلام صاحب نے جن معتبر کتب لغات کے حوالہ سے اس کا مچھلی ہونا ثابت کیا۔جن میں سُمک'' نوع من السمک'' سُمک کالدو دُسُمک کالدوداء'' کہا گیا تو کیا ان کتب معتبرہ سے بھی اس کا مچھلی ہونا ثابت نہیں ہوتا؟ اگر نہ ہوتو پھر یہ لغت ہی کیا ہوئی جن سے لفظ کے صحیح معنی ہی ثابت نہ ہو۔پھر ان کتب لغات پر اعتماد کیسے کیا جائیگا؟ کیا ان کتابوں سے اصطلاح عرب میں اس کو مچھلی کہنا ثابت نہیں ہوتا؟ ماہر حیوانات کا ان کو مچھلی نہ کہنے سے کیا کتب لغت بھی غلط ہوجاویں گی۔دیکھئے جاحظ جیسے امام لغت وادب بھی اس کو مچھلی بتلا رہے ہیں چنانچہ ''کتاب الحیوان''للجاحظ (ص۱۰۲، ج۔۴) میں ہے ''ومع ذلک أصناف من السمک کالاربیان''وفی هامشه ''الاربیان بالکسر ضرب من السمک یعرف فی مصرباسم ''الجنبری'' کمافی معجم المعلوف. ''اوراسی کتاب الحیوان للجاحظ (ص۳۰۔ج۔۱) میں ہے ولیس أیضاً کل عائم سمكة وان کان مناسباً للسمک فی کثیر من معانیه الا تریٰ أن فی الماء کلب الماء''.........(الی ان عد أنواعاً من دواب البحر التی لیست بسمكة ولم یعد منها الاربیان بل علی خلاف ذلک ذکرما ذکرنا آنفاً من. (ج۔۴ ص۱۰۴)

دیکھئے ''بستان المفردات'' جو طب کی ایک معتبر کتاب ہے، جو ماہر فن طب حکیم محمد عبدالحکیم ابن استاد الحکماء مولٰینا حکیم کاظم علی (غالباً لکھنوی) کی تصنیف ہے۔جس پر مشہور ومعروف بڑے بڑے ماہر طب

مسلم اطباء وغیر مسلم اطباء کی تقاریظ موجود ہیں۔ اس میں ہے (اسم معروف) جھینگا مچھلی۔ (فارسی) ماہی، روبیان (عربی) روبیان (حکم) حلال ہے بکثرت کھائی جاتی ہے۔'' انتہی۔

''من علم حجة علی من لم یعلم'' اس لئے جو جھینگا کا مچھلی ہونا جانتے ہیں اور حلال ہونے کا حکم لگاتے ہیں اور ان کو کوئی تردد بھی اس میں نہیں وہ ان لوگوں پر حجت ہیں جو ان کا مچھلی ہونا نہیں جانتے۔ اور اس کی حلت وحرمت میں تردد کرتے ہیں۔ پھر ان کا مچھلی کہنا کوئی جدید زمانہ کی بات نہیں بلکہ قدیم زمانہ سے یہ بات چلی آرہی ہے تو پھر کیا اس جدید زمانہ کے بعضوں کے بے سند تردد اور شبہ سے یہ مکروہ یا حرام ہو جاوے گی۔ رہی یہ بات کہ علم الحیوان کے ماہرین، ان کو تو واسطہ اپنے تجربہ اور اپنی مانی ہوئی اصطلاح سے ہے۔ ان کو حقائق اشیاء سے کیا واسطہ۔ ان کی تعریف کی بناء پر تو احناف کے نزدیک جو مچھلی نہیں ایسے بہت جانور بھی مچھلی کی تعریف میں داخل ہو جاتے ہیں پھر کیا اس تعریف کی بنا پر احناف کو ایسے حیوانات کا کھانا جائز ہوگا جیسا کہ کلب الماء وخنزیر الماء وانسان الماء وغیر ذلک۔ پس کیا ان ماہرین علم حیوان کی تعریف کی بناء پر یہ حضرات ان کے کھانے کا فتویٰ دیں گے؟ دیکھئے ہم نے جو جاحظ کا قول نقل کیا اسکو یہاں پھر لوٹائیے اور پڑھیئے ''ولیس کل عائم سمکة وان کان مناسباً للسمک فی کثیر من معانیه الا تری ان فی الماء کلب الماء........ (الی أن عدانواعاً من دواب البحر التی لیست بسمکة ولم یعد منها الاربیان) '' انتہی تو کیا ''ریڑھ کی ہڈی ہونا'' ''گلپھڑی سے سانس لینا یہ شرعی مچھلی کی تعریف ہو سکتی ہے؟ جس میں غیر سمک بھی داخل ہو جائے یہ تو ان کی ایک اصطلاحی اور من مانی چیز ہوئی۔ رہا حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا فتویٰ تو درس ترمذی میں جس عبارت اور جس کیفیت سے اس کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس طرح پر نہیں۔ درس ترمذی والے نے جو ''حیواۃ الحیوان کے مصنف ماہر علم حیوان نہیں'' کر کے حکم لگایا حضرت تھانویؒ کے فتویٰ میں اس کی تردید موجود ہے وہاں وہ فرماتے ہیں۔ حیواۃ الحیوان والے ماہیت حیوانات کی بحث بھی کرتے ہیں پھر وہ معتبر نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔'' دیکھئے حیواۃ الحیوان کے معتبر ہونے کی دلیل میں وہ ماہیات حیوان کی بحث کرنے کو ذکر فرما کر کیا ان کا ماہر علم حیوان ہونے کا دعویٰ نہیں کر رہا؟ اب حضرت تھانویؒ کا ان کے قول کو حجت قرار دینا مدلل ہوا۔ اور درس ترمذی والے کا ان کو ''ماہر علم حیوان نہیں'' کہنا بے دلیل ہوا۔ جرح مبہم توثیق کے خلاف حجت نہیں۔ علم جہل پر حجت ہے جہل علم پر نہیں۔ دوسری دلیل حضرت تھانویؒ کے فتویٰ میں جو ذکر فرمایا وہ صاحب مخزن والے کا اس کو مچھلی کہنے کے بعد حلال کہنا ہے۔ یہ ماہرین حیوان کا حوالہ تھا۔ اب کوئی منصف انصاف سے بتائے کہ کیا یہ مدلل بات صاحب درس ترمذی کی بات سے مردود ہو سکتی ہے؟ ہاں یہ

ہوسکتا ہے کہ ان کو اطمینان نہ ہو۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں مجھے ابھی اس کے مچھلی ہونے کا پورا اطمینان ہے۔ **لعل اللہ یحدث بعد ذلک أمرا۔** جن کو ان کا فتویٰ دیکھنا منظور ہو دیکھ لے۔

پھر صاحب درس ترمذی کا یہ فرمانا کہ "عرف عام میں اس کو مچھلی نہیں سمجھا جاتا" یہ بھی ایک زبردستی حکم لگانا ہے۔ معلوم نہیں کہاں کا عرف مراد لیا گیا مچھلی اور غیر مچھلی کے عرف تعین کرنے کے لئے تو مچھلی کے علاقے کا عرف ضروری ہے جہاں مچھلی بکثرت پائی جاتی اور کھائی جاتی ہے۔ کراچی یا ہندوستان کا عرف یہاں پر معتبر نہیں ہمارے ہاں جہاں مچھلی کی کثرت ہے اور کثرت سے مچھلی کھائی جاتی ہے وہاں اگر کسی کو مچھلی لانے کے لئے بھیجا جائے اور جھینگا مچھلی لادے تو ایسے شخص کو اعلیٰ درجہ کی تعمیل حکم کرنے والا سمجھا جائے گا جیسا کہ عزیزم مفتی عبدالسلام صاحب نے بعض عرب سے "الذلا سماک" نقل فرمایا۔ **ھذا ماظھر لھذا العبدا لضعیف.**

واللہ اعلم بالصواب

محمد اسحاق غفرلہ جامعۂ اسلامیہ بابونگر۔

فٹکچری، چاٹگام

(شیخ الحدیث بجامعۃ اسلامیہ بابونغر شیتاغونغ)

(۲) فتویٰ دارالافتاء جامعہ اسلامیہ

بابونگر چاٹگام، بنگلہ دیش

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی النبی الأمی سید المرسلین محمد وعلی آلہ وأصحابہ أجمعین.

دورِ جدید کے عظیم محقق مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ نے حقیقت کی خوب نقاب کشائی فرمائی۔ فرماتے ہیں کہ:

"اسلام ایک دین فطرت اور عالمگیر مذہب ہے۔ اس کے احکام عالم، جاہل، خواندہ، ناخواندہ مرد عورت پر یکساں حاوی ہیں۔ اس کے احکام جس طرح علماً وفلاسفر اور علماء محققین، امراء وسلاطین کے لئے ہیں اسی طرح وہ جنگلوں اور پہاڑی درّوں میں رہنے والے وحشی انسانوں کے لئے بھی، اور ایسے لوگوں اور خطوں کے لئے بھی ہیں جن میں نہ جدید آلات میسّر ہیں نہ وہ ان کا استعمال کر سکتے ہیں، دوسری

طرف عبادات اسلامیہ میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ کم از کم عبادت.... اور عبادت گاہوں میں یکسانیت ہو، امیر و غریب کا امتیاز نہ ہو، ہر کلمہ گو مسلمان ایک ہی انداز سے عبادت کر سکے، عبادت کے وقت ع

"ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز"

کا منظر نظر آئے۔ حج لباس احرام کی یکسانیت منیٰ، مزدلفہ، عرفات میں بلا امتیاز ایک ہی میدان میں قیام، نماز کی صفوف کی یکسانیت وغیرہ کھلے ہوئے شواہد ہیں، اس لئے اسلام میں تمام عبادات اور تمام اوامر ونواہی کی بنیاد ایسی سادگی پر رکھی گئی ہے جو ہر زمانے، ہر ملک، ہر خطہ میں ہر مسلمان کو یکساں حاصل ہو، یہ نہ ہو کہ امیر مال اور جدید آلات کے ذریعہ اپنی عبادات کو بہتر بنا سکیں، اور غریب عبادت میں بھی دیکھتے رہ جائیں، اس لئے اسلامی عبادات نہ فلسفۂ قدیم کی رہین منت تھیں، نہ آج سائنس جدید اور اس کے مخترعہ آلاتِ جدید کی محتاج ہیں، نہ اس کے ادا کرنے میں کسی محقق فلسفی یا ماہر ریاضیات و نجوم کی ضرورت ہے"۔ (آلات جدیده. ص ۱۷۲ او ص ۱۷۳)

جب حقیقت ہی یہ ہے کہ اسلام میں تمام عبادات اور تمام اوامر ونواہی کی بنیاد ایسی سادگی پر رکھی گئی ہے جو ہر زمانے، ہر ملک اور ہر خطہ میں ہر مسلمان کو یکساں حاصل ہو، تو یہاں ایسی کون سی بات ہو گئی جس کی وجہ سے اسلام کی سیدھی سادی بنیاد کو چھوڑ کر دورِ جدید کے جدید ماہرین علم حیوانات کی جدید اختراعی بنیاد پر جدید طریقہ سے اس مسئلہ کو سوچا جائے؟ اور سائنسی اصولوں میں اس حکم کو پرکھا جائے؟

انتیسویں رمضان کی شام کو مطلع بالکل صاف تھا، ابر کا کہیں ایک دھبہ بھی نظر نہ آرہا تھا شہر کے تمام باشندوں نے خوب نظر دوڑائی کسی کو چاند نظر نہیں آیا، مگر شہر کے تمام ماہرین فلکیات سائنس کے جدید ترقی یافتہ اصول و تحقیق اور جدید ترقی یافتہ آلات کے پیش نظر قطعی طریقہ سے یہ اعلان سناتے ہیں کہ چاند واقعی نکل آیا ہے، مگر ہلال کا سائز اور اس کی روشنی اس قدر کم تھی کہ نگاہیں نہ دیکھ رہی تھیں کیا آپ اس بنیاد پر چاند نکلنے کا فتویٰ صادر فرمائیں گے؟ اور روزہ کھولنے کا فیصلہ سنا دیں گے؟ ہرگز نہیں بلکہ اسی کی تبلیغ فرمائیں گے کہ صاحب شریعت علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے اس حکم کا مدار سادگی سے رؤیت ہلال ہونے نہ ہونے پر رکھا ہے، جو اسلام کی ایک سادی بنیاد ہے جس پر ہر شخص ہر جگہ ہر حال میں بالکل آسانی سے عمل کر سکتا ہے، ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیں گے کہ یہ سائنسی بنیادیں نہ سو فیصد یقینی ہیں نہ قطعی الاثبات ہیں جیسا کہ روزمرہ کے حالات شاہد ہیں۔

شوہر موجود ہے اور بیوی عقد نکاح میں ہے، وقت پر اس سے ایک بچہ پیدا ہوتا ہے، اب تمام اطباء جدید ترقی یافتہ تحقیقات اور سائنسی آلات کے پیش نظر یہ چیلنج پیش کرتے ہیں کہ یہ بچہ شوہر کا ہرگز نہیں یہ

اور کسی کا ہے، تو کیا آپ ان ماہرین جسمانیات کی تحقیق اور اصول کی بنیاد پر اس بچہ کو غیر ثابت النسب قرار دے دیں گے؟ ہرگز نہیں، بلکہ ''الولد للفراش'' اسلام کی اس اساسی بنیاد کی بناء پر بچہ شوہر کا بتائیں گے اور اس کو ضرور بالضرور ثابت النسب قرار دے دیں گے، بلکہ آگے بڑھ کر اس کے خلاف ورزی پر غیر ثابت النسب کہنے والے پر شرعی سزا کا فیصلہ سنا دیں گے۔ اس طرح کی بے انتہاء نظائر ہیں جن میں اسلامی احکام کا مدار سیدھی سادی بنیادوں پر رکھا گیا ہے، اور وقتی، ملکی اور شخصی پر پیچ تحقیقات سے یکسر پرہیز کیا گیا ہے۔

جب مسئلہ یہی ہے تو کیوں جھینگا مچھلی ہے یا نہیں؟ اس میں سائنسی بنیاد سے کام لیا جارہا ہے قرآن مجید کے اندر رب العالمین فرماتے ہیں: ''احل لکم صید البحر و طعامه (الایة) ''یعنی تمہارے لئے دریا کا شکار پکڑنا اور اس کا کھانا حلال کیا گیا ہے۔ اس آیت میں سمک کا مراد ہونا باجماع ہے، چنانچہ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: حدیث ''هو الطهور ماء ه والحل میتته '' المراد منه السمک، کآیة ''احل لکم صید البحر'' لان السمک مراد بالا جماع ''(شامی ص ۲۶۸، ج۔۵) تو کتاب وسنت کی بنیاد سے معلوم ہوتا ہے کہ سمک باجماع حلال ہے۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ ''سمک'' کیا چیز ہے، اور اس کا مصداق کیا ہے سو کتاب وسنت کے دوسرے الفاظ جن کی تشریح اور حل ہم عرف ولغت اور آثار سے ڈھونڈتے ہیں اس کا بھی حل وہیں سے نکالیں گے، آثار میں ملنا تو مشکل ہے تو ہم عرف ولغت کی رہنمائی حاصل کریں گے، چنانچہ لغت بتاتی ہے کہ: ''السمک: حیوان مائی، وهوانواع کثیرة، لکل نوع اسم خاص یمیزه. '' (المعجم الوسیط)

تقریباً تمام کتب لغات کے اندر اسی طرح کی تشریح ہے کہ ''سمک'' ایک مائی حیوان ہے جس کی بہت ساری انواع ہیں اور ہر نوع ایک مخصوص نام سے پہچانی جاتی ہے۔ لغت نے سمک کی کوئی خاص حد بیان نہیں کی جس سے سمک کی ہر ہر نوع کو پہچاننے میں مدد ہو۔ وجہ یہ ہے کہ عرف عام جانتا ہے کہ یہ نام مائی حیوانات کی کس کس نوع پر اطلاق ہوتا ہو، جس کی بناء پر ''سمک'' کی پہچان کا ذمہ عرف عام کے سر سونپ دیا گیا، مگر لغت نے اتنا کام ضرور کیا کہ مائی حیوانات کی جس جس نوع کو سمک کہا جاتا ہے اس کے متعلق اتنا ضرور کہہ دیا کہ یہ ''سمک کی ایک نوع ہے جیسا کہ جھینگا کے متعلق تمام کتب لغت متفق ہیں کہ یہ سمک کی ایک نوع ہے۔''

اسی لئے محدث العصر حضرت ظفر احمد تھانوی رحمہ اللہ حدیث کی معرکۃ الاراء تصنیف ''اعلاء السنن'' (ج۷اص ۱۵۸) میں تصریح فرماتے ہیں کہ: وبالجمله. فکل ماکان من جنس السمک لغةً

وعرفاً فھو حلال بلا خلاف کا لسقنقو روالرو بیان ونحوھما." اور اسی بنیاد پر متقدمین کے زریں عہد سے لے کر آج تک برابر عمل درآمد ہوتا آ رہا ہے، کسی نے کبھی اپنے زمانے کی کسی نئی تحقیق کو اسی سادی بنیاد کے خلاف سمک کی پہچان کی معیار نہیں ٹھہرائی بلکہ اتنی بات تصریح فرمادی جیسا کہ امام کبیر شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ نے تصریح فرمائی: ثم جمیع انواع السمک حلال کالجریث والمار ماھی وغیرہ فی ذلک سواء ولایؤ کل سوی السمک من حیوانات الماء عندنا اھ (المبسوط. ج. ۱۱، ص ۲۴۸) لغت اور عرف عام کے پیش نظر کتاب وسنت کے الفاظ جیسا کہ ہمارے یہ لفظ "سمک" ہے ان سے جو ایک سادی بنیاد قائم ہوتی ہے، ہر زمانے کی نئی تحقیق کو اس کے مقابلہ میں اگر معیار ٹھہرائی جائے تو شرعی اصول درہم برہم ہو کر رہ جائیں گے، بنابریں ہم جدید ماہرین حیوانات کی تغیر پذیر نئی تحقیقی معیار پر ایک شرعی حکم قائم نہیں کر سکتے، لہٰذا جھینگا مچھلی ہونے نہ ہونے میں ان کی جو معیار ہے وہ شرعی نکتۂ نظر سے بالکل ناقابل اعتبار ہے:

مذکورہ بات تو اسی وقت ہے جب کہ ماہرین حیوانات کی ہر تحقیق کو تحقیق تسلیم کی جائے، ہمیں یہ بات کیسے باور ہوگئی کہ ان کی ہر تحقیق محقق ہی ہے، پھر ہمارا مبحوث عنہ مسئلہ میں ان کی جو تحقیق ہے وہ حرف آخر ہے؟ یہ دعویٰ تو انتہائی مشکل ہے کہ ان کی ہر تحقیق تحقیق ہی ہے، پھر جھینگا میں ان کی جو تحقیق اور دعویٰ ہے وہ حرف آخر ہے، اس لئے کہ ایک تو بات یہ ہے کہ کوئی کلام ماہرین سے سن کے یا پوچھ کے بتادی جائے، دوسری ان کی تحقیقات اور بیانات پر پوری طرح نظر ڈالی جائے اور غور وخوض سے کام لیا جائے، بات وہی مقبول ہوتی ہے جو دوسری بنیاد پر بولی جاتی ہے تو ہم ماہرین حیوانات کی کتابوں میں ان کی تحقیقات پر نظر ڈالنے سے اتنی سی بات معلوم کر پاتے ہیں کہ ان لوگوں نے حیوانات کے جو امتیازات اور خصوصیات رہے ہیں ان میں سے چند امتیازات اور خصوصیات اپنی طرف سے چن کے انھی کی بنیاد پر تمام حیوانات کو تین بڑی قسموں میں بانٹ دیا جن میں سے ایک قسم کو چند امتیازات کی بناء پر "سمک ذات" قرار دیا، بہت سارے اختلافات کے بعد انہوں نے آخر اس کو حرف آ کر ٹھہرانے کی کوشش کی ہے، یہ تو ان کی ایک اصطلاحی بنیاد اور اپنی اختراعی معیار ہے، کیا اس اختراعی معیار کو ایک قدیم حکم شرعی کی معیار ٹھہرائی جاسکتی ہے؟ ہرگز نہیں، لہٰذا اس بنیاد پر جھینگا کی تحقیق بالکل ناقابل قبول ہے۔

حضرات اکابرین رحمہم اللہ تعالیٰ میں سے بعض بزرگوں نے جو جھینگا کے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے وہ یا اس بناء پر کہ ان کو سمک کی انواع سے پوری اطلاع نہیں یا اہل عرف سے پوری اطلاع حاصل نہ کر سکے یا اس کی صورت سے ان کو شبہ پیدا ہو گیا ہو کہ یہ کیڑا ہے یا مچھلی، جیسا کہ متقدمین میں ایسے شبہ کی بناء پر

جزیث اور مار ماہی کی تصریح علیحدہ کرنی پڑی، لہٰذا ہمارے بعض اکابر رحمہم اللہ، اور بعض محققین عصر دامت برکاتہم کا فتویٰ اس سلسلہ میں معتمد نہیں ہوسکتا ہے۔

محقق العصر مولانا مفتی عبدالسلام صاحب دام عزہم کو رب العزت دارین میں سرخرو فرمائیں، انہوں نے بتقاضائے وقت بعض علاقہ میں اس مسئلہ کی بناء پر جو انتشار پیدا ہورہا تھا اس کو دبانے میں محقق اور کامیاب کوشش فرمائی۔ انہوں نے مسئلہ کو عام فہم اور سلیس انداز سے محقق طریقہ پر واضح فرمادیا، جس کی ضرورت بہت دیر سے ہورہی تھی، امید ہے کہ ہمارے علماء محققین دامت برکاتہم اس میں غور فرمائیں گے، اور ایک حلال چیز کو حرام یا مکروہ بنانے سے باز رہ جائیں گے۔

کتبہ

محمود حسن عفا اللہ تعالیٰ عنہ

خادم الافتاء بجامعۃ بابونگر

چاٹگام، بنگلہ دیش

تحقیق از مولانا محمد جنید البابونغری زید علمہٗ

(۳) المدرس بجامعۃ عزیز العلوم بانونگر شیتا غونغ۔ بنگلہ دیش

الحمد لأهله والصلوٰة على أهلها.

جھینگا کو جن حضرات نے حرام لکھا ہے ان کی دلیل بصورت ''شکل اوّل'' یہ ہے کہ جھینگا مچھلی کی قسموں میں سے نہیں ہے، اور ہر وہ سمندری جانور جو مچھلی کی قسموں میں سے نہ ہو حرام ہے، لہٰذا جھینگا حرام ہے۔ ان حضرات کا ''کبریٰ'' ہمیں مسلم ہے لیکن ''صغریٰ'' مسلم نہیں، لہٰذا نتیجہ صحیح نہیں، یعنی جھینگا حرام نہیں بلکہ حلال ہے۔ کیونکہ صحتِ نتیجہ کے لئے دونوں مقدموں (صغریٰ اور کبریٰ) کا صحیح ہونا شرط ہے، اور وہ یہاں مفقود ہے۔ ''صغریٰ'' (یعنی جھینگا کا مچھلی کی قسموں میں سے نہ ہونا) اس لئے ہمیں مسلّم نہیں کہ بہت سے علماء لغت اور محققین امت نے اس کے مچھلی کی قسموں میں سے ہونے پر تصریح فرمائی ہے، جیسا کہ یہ تصریحات محقق العصر حضرت مولانا مفتی عبدالسلام صاحب چاٹگامی نے مستند و معتبر کتب لغات سے متذکرہ بالا استفتاء کے جواب میں نقل فرمائی ہیں۔

نیز عرف و عادت میں بھی جھینگا کو مچھلی کہا جاتا ہے، چنانچہ بڑے اہتمام سے جھینگا کو بحیثیت مچھلی ہونے کے ایک ملک سے دوسرے ملک میں امپورٹ کیا جاتا ہے۔ اور عرف و عادت اگر کتاب وسنت وغیرہ ادلۂ شرعیہ کے خلاف نہ ہوتو شرع میں قابل اعتبار ہے۔ ''الاشباہ والنظائر'' فن اوّل، قاعدۂ سادسہ ج (ص ۱۱۶) میں ہے ''اعلم أن اعتبار العادة والعرف يُرجع اليه في الفقه في مسائل كثيرة حتى جعلوا ذلك أصلا۔'' یہی وجہ ہے کہ دیگر بہت سے علماء محققین کے علاوہ حضرت علامہ عبدالحی لکھنویؒ نے بھی جھینگا کی حلت کی تصریح کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں! اور جھینگا جس کو اربیان بکسر ہمزہ کہتے ہیں جیسا کہ صحاح وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے حلال ہے، کیونکہ وہ مچھلی کی قسموں میں سے ایک قسم ہے اور مچھلی کی تمام اقسام بالاتفاق حلال ہیں، اور جن لوگوں نے اس کو حرام لکھا ہے وہ اسے مچھلی کی قسم سے نہیں سمجھتے حالانکہ یہ مچھلی ہی ہے۔'' (مجموعہ فتاویٰ ص ۳۶۶، ج۔۲) اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ہمارے محترم حضرت مولانا مفتی عبدالسلام صاحب مدظلہم کو کہ انہوں نے مسئلہ زیر بحث پر مدلل انداز سے گفتگو فرما کر مسئلہ کا حق ادا کر دیا ہے اور کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ اس طرح آپ نے مسلمانوں کو ایک انتشار اور پریشانی سے بچالیا ہے۔

شكرا لله سعيه و كثرا مثاله.

واضح ہو کہ جن جلیل القدر حضرات علماء نے جھینگا کو حرام یا مکروہ فرمایا ہے ان کی تحقیقات کی عظمت اور شخصیات کا تقدس واحترام سر اور آنکھوں پر ہے، لیکن باوجود اس کے مسئلہ ہذا میں جو ان سے اختلاف کیا جارہا ہے وہ محض دلائل کی بنیاد پر ہے۔ اور دلائل کی بنیاد پر اختلاف کرنا اکابر واسلاف کا شیوہ اور طریقہ ہے، اگرچہ یہ اختلاف بڑوں سے کیوں نہ ہو، ورنہ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ اور مقابلہ میں امام شافعیؒ اور امام شافعیؒ کے مقابلہ میں امام احمدؒ کوئی مذہب اختیار ہی نہ فرماتے (رحمہم اللہ تعالیٰ) یہ حضرات رشد و ہدایت کے امام تھے، ہمیں ان کی پیروی کرنی چاہیئے اور اس قسم کے اختلاف کرنے ہی میں ان کی پیروی ہے۔

وصلى الله علىٰ سيّدنا محمد و على آله وصحبه و بارك وسلّم.

والله اعلم وعلمهٗ أتم واحكم

کتبہ: محمد جنید بابونگری چاٹگامی

خادم حدیث نبویؐ جامعہ اسلامیہ عزیز العلوم بابونگر

چاٹگام۔ بنگلہ دیش، ۱۷ ربیع الاوّل ۱۴۱۱ھ

تصدیق از دالافتا دارالعلوم دیوبند انڈیا

(۱) باسمہ تعالیٰ

هذا التحقيق حقيق ان لايرتاب أحد بحسب الفتوى والتقوى بمعزل عنه.

کتبہ

(مفتی) نظام الدین

۱۴۱۱/۷/۵ھ

(۲) الجواب صحیح

(مفتی) کفیل الرحمٰن نشاط

(۳) مجیب محترم قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے تمام شبہات کا ازالہ فرمادیا ہے۔ جھینگا مچھلی ہے اور ہمیشہ سے پورب میں کھائی جاتی ہے۔

جہاں دریا، تالاب نہیں ہیں یا کم ہوں اور مچھلی کی پیداوار نہیں ہے۔ دراصل وہی حضرات شبہ میں مبتلا ہوئے ہیں۔ یہ رسالہ تمام شبہات کو انشاء اللہ دور کردے گا۔

واللہ اعلم

محمد ظفیر الدین غفرلہ

مفتی دارالعلوم دیوبند

۶؍رجب ۱۴۱۱ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مشینی ذرائع سے ظاہری کیفیت حیات باقی رکھنے کا حکم

باسمہٖ سبحانہٗ

مکرمی ومحترمی جناب مفتی صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

برائے کرم مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں تفصیلی جواب عنایت فرما کر رہنمائی فرمائیں۔

بعض اوقات ایسے مریض سے واسطہ پڑتا ہے کہ جس کے صحت یاب ہونے کا امکان طبی نقطۂ نگاہ سے بالکل نہیں ہوتا یا بہت کم ہوتا ہے۔ مثلاً فالج دماغ (Coma) نظیف من شریان الدماغ، ورم الدماغ، حبوط القلب وغیرہ وغیرہ کے نتائج میں۔ مغربی ممالک میں ایسے مریضوں کے لئے مختلف طریقہ ہائے علاج دستیاب ہیں جن میں "مشینی مساعدہ" بھی ہے۔ یعنی مشینوں کے ذریعے اور مختلف آلات طبی وبرقی کے ذریعے ان کی ظاہری کیفیت حیات کو جاری رکھا جاسکتا ہے اور یہ عمل غیر معینہ مدت تک جاری رکھا جاسکتا ہے اگر اس سلسلہ کو منقطع کر دیا جائے تو مریض چند گھنٹوں سے لے کر چند دنوں کے اندر اندر مکمل طور پر وفات پا جاتا ہے۔

استفسار:

(۱) کیا مندرجہ بالا طریقہ شرعی قانون کی روشنی میں جائز ہے؟ مکروہ ہے؟ یا حرام ہے؟

(۲) کیا کسی آدمی کو شرعی اعتبار سے یہ وصیت کرنی چاہیئے کہ وہ اگر مندرجہ بالا حالت میں پایا جائے تو اس کو اس علاج سے محفوظ رکھا جائے جس کی تفصیل اوپر پیش کی گئی ہے۔ والسلام۔

ڈاکٹر جنید اختر

الجواب باسمہٖ تعالیٰ

جواب۱: واضح رہے کہ شریعت اسلامیہ نے تمام انسانوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً زندگی کے ہر ہر لمحہ کے واسطے ہدایات دی ہیں۔

حالت صحت کے لئے جس طرح احکام دیئے ہیں، حالتِ بیماری کے واسطے بھی کچھ اصول دیئے ہیں، مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی اکثریت اسلام کے زریں اصولوں کو چھوڑ کر اغیار

کے طور طریقوں کی پابند اور ان کے خود ساختہ اصولوں کی پیروکار بن گئی ہے۔ جس کی وجہ سے انسانیت ذہنی الجھن اور گوناگوں پریشانیوں میں الجھ کر رہ گئی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اور سب مسلمانوں کو ہر حالت میں اسلام کے اصولوں اور ہدایات کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جناب محترم نے جن سوالات کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے وقت کے لحاظ سے بہت ہی اہم ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ آپ اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے سوا دوسرے لوگوں کی رہنمائی کے لئے بھی سبب بنے ہیں کیونکہ ہمیں امید ہے کہ ان سوالات کے جوابات سے جناب محترم کے سوا دوسرے مسلمان بھی مستفید ہوں گے۔

آنجناب کے پہلے سوال کا جواب دینے کے لئے اس سلسلہ کے فقہاء کرام کے کچھ اصول لکھ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے تا کہ جواب سمجھنے میں آسانی رہے۔

فقہاء اسلام نے لکھا ہے کہ آدمی جب بیمار پڑ جائے یا اس کو دوسرا کوئی ضرر لاحق ہو جائے تو اس بیماری اور ضرر کے مختلف حالات ہیں اور ان مختلف حالات میں شریعت اسلامیہ نے مختلف احکام بتائے ہیں۔

مثلاً پہلی حالت:

اگر اطبّاء کے نزدیک بیماری اور ضرر کی حالت ایسی ہے کہ علاج کے ذریعہ مریض اور ضرر رسیدہ شخص کا شفایاب اور صحیح ہو جانا یقینی ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ علاج کے ذریعہ بیماری کو دور کرنے کی کوشش کرنا اور سبب ظاہری کے ذریعہ ضرر کو ختم کرنے کی جدوجہد کرنا واجب ہے۔

اور مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ شفا دینے والا دراصل اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور اس نے شفاء کو دوا میں اور دفع ضرر کو اسباب ظاہری میں چھپا رکھا ہے، اور ایسے موقع پر علاج کرنا اور کرانا توکل کے خلاف نہیں بلکہ علاج کو ترک کرنا خلافِ توکل ہے، اس واسطے کوئی شخص شفایابی کی یقینی حالت کو دیکھتے ہوئے اگر علاج ترک کر دیتا ہے اور بیماری میں مر جاتا ہے تو یہ شخص شرعاً گنہگار ہوگا، اس کے لئے دو نظائر ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) اگر کوئی آدمی بھوک و پیاس کی وجہ سے بیمار پڑ جائے، یہاں تک کہ ہلاکت کا خوف لاحق ہو جائے تو جب اس کو کھانے اور پینے کا سامان مل جائے تو اس پر واجب ہے کہ کھانے اور پینے کے سامان کے ذریعہ بھوک اور پیاس کو دور کرے کیونکہ کھانے اور پینے کے سامان سے بھوک اور پیاس کا رفع ہو جانا یقینی بات ہے، لہٰذا اس ضرر رسیدہ شخص کے واسطے کھانے اور پینے کے ذریعہ اپنے ضرر کو دور کرنا فرض اور ضروری ہے، اگر یہ شخص کھانا نہیں کھاتا اور پانی استعمال نہیں کرتا یہاں تک کہ مر جاتا

ہے تو عنداللہ گنہگار ہوگا بلکہ فقہاء کے نزدیک خودکشی کا مرتکب ہوگا۔

(۲) اسی طرح اگر کوئی شخص سخت سردی یا سخت گرمی کی وجہ سے بیمار پڑ جاوے جس سے جان کا خطرہ لاحق ہو جائے ایسے موقع پر اگر سردی کو دفع کرنے کے واسطے گرم اشیاء مل جائیں، یا گرمی کو دور کرنے کے واسطے ٹھنڈی چیزیں مل جاویں جس سے جان کا بچ جانا یقینی ہو تو اس مریض کے لئے علاج بالضد، یعنی سردی کو دور کرنے کے لئے گرم اشیاء کا استعمال کرنا فرض اور ضروری ہوگا، اگر مریض ایسا نہیں کرتا اور دفع ضرر کے اسباب میسر ہوتے ہوئے وہ اسباب استعمال نہیں کرتا یہاں تک کہ مرجاتا ہے تو یہ آدمی گنہگار رہوگا کیونکہ ظاہری اسباب کو استعمال کر کے یہ اپنی جان کو بچا سکتا تھا لیکن اس نے قصداً ایسا نہیں کیا اور مرگیا تو وہ شخص گنہگار رہوگا۔

دوسری حالت:

مریض یا ضرر رسیدہ شخص کا مرض یا ضرر ایسا ہے کہ علاج کے ذریعہ شفایاب ہونا یقینی تو نہیں لیکن ظنّی ہے، یعنی گمان غالب یہ ہے کہ اگر دوا استعمال کرے گا تو مریض شفایاب ہو جائے، تو ایسے مریض کے لئے حکم یہ ہے کہ اس کو علاج کرنا اور کرانا جائز ہے بلکہ اگر کمزور دل کا ہے تو بہتر ہے، لیکن علاج کرانا واجب اور ضروری نہیں ہے، اس واسطے اگر مریض توکلاً علی اللہ علاج نہیں کرتا اور اسی حالت میں مرجاتا ہے تو وہ گنہگار نہیں ہوگا بلکہ اس کو توکل کرنے پر اجر ملے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ دوائیوں میں شفا کا ہونا ظنّی امر ہے یقینی نہیں، ظنّی امر پر عمل کرنا علاج کے واسطے فرض یا واجب نہیں ہے اس واسطے اگر اس نے علاج کو ترک کردیا ہے تو اس کی وجہ سے گنہگار نہ ہوگا۔

اس کے لئے بھی چند نظائر ملاحظہ ہوں:

(۱) اگر کسی آدمی کو اسہال یا استسقاء کی بیماری ہے۔ اطبّاء کی رائے یہ ہے کہ علاج کرنے سے فائدہ اور شفایابی ظنّ غالب کے درجہ میں ہے اکثر مریضوں کو فائدہ ہوتا ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فائدہ نہیں بھی ہوتا ہے تو ایسے موقع پر مریض کے لئے علاج کرنا جائز ہے، واجب اور لازم نہیں ہے۔ اگر مریض اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کر کے اس خیال سے علاج ترک کر دیتا ہے کہ دراصل شفاء اللہ ہی دیتا ہے، وہ علاج اور دوا سے بھی شفا دے سکتا ہے اور اس کے بغیر بھی دے سکتا ہے جب کہ دوائیں شفایابی کے لئے یقینی اسباب نہیں ہیں، بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ مریض نے علاج چھوڑ دیا اور بغیر کسی سبب ظاہری کے قدرتی طور پر بیماری ختم ہوگئی اور مریض اچھا ہوگیا جب کہ اس کا عکس بھی ممکن ہے کہ مریض ترک علاج سے مرجائے۔

بہر حال اس دوسری حالت میں علاج کرنا جائز ہے واجب نہیں ہے لہٰذا ترکِ علاج کے بعد اتفاق سے اگر مریض پر موت آجاتی ہے اور وہ مرجاتا ہے تو عند اللہ گنہگار نہ ہوگا۔

(۲) اسی طرح اگر کسی کا خون بڑھ گیا ہے اور اطبّاء نے کہا خون نکالنے کے بعد مریض ٹھیک ہو جائے گا، تو مریض کے لئے ایسا کرنا جائز ہے لیکن واجب نہیں ہے، اس واسطے مریض اگر ایسا نہیں کرتا ہے اور خون کے بڑھ جانے سے وہ مرجاتا ہے تو وہ گنہگار نہ ہوگا کیونکہ خون کے نکالنے کے بعد مریض کا صحیح ہو جانا گمان غالب تو ہے لیکن یقینی نہیں ہے۔

(۳) اسی طرح اگر کوئی کینسر کا مریض ہے، اطبّاء نے مشورہ دیا ہے کہ خون کی تبدیلی سے صحت یابی کی امید غالب ہے تو مریض کے لئے ایسا کرنا جائز ہے لیکن واجب نہیں، لہٰذا مریض اگر علاج نہیں کرتا اور اللہ کی ذات پر بھروسہ کر کے علاج چھوڑ دیتا ہے اور اسی کینسر کے مرض میں مرجاتا ہے تو وہ گنہگار نہ ہوگا بلکہ عند اللہ ماجور اور مستحق ثواب ہوگا۔

(۴) اسی طرح اگر کوئی مریض دل یا گردے یا اندرون جسم کی کسی بھی بیماری میں مبتلا ہے اور اطباء کا مشورہ یہ ہے کہ آپریشن کے ذریعہ مریض صحیح ہوسکتا ہے تو ایسے مریض کے لئے آپریشن کے ذریعہ علاج کرنا جائز تو ہے لیکن واجب اور ضروری نہیں ہے کیونکہ آپریشن کے ذریعہ شفایابی یقینی نہیں ہے ظنّی ہے، ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ آپریشن کے دوران مریض پر موت واقع ہو جائے یا آپریشن کے چند دنوں یا چند گھنٹوں کے بعد موت واقع ہو جائے، اس واسطے ایسے مریض کے واسطے شفایابی کی امید پر علاج کرنا تو جائز ہے، علاج کے بعد اگر موت واقع ہو جاوے تو وہ گنہگار نہ ہوگا، اس کے برعکس اگر وہ علاج نہیں کرتا اور اس پر موت واقع ہو جاتی ہے تب بھی وہ گنہگار نہ ہوگا۔

تیسری حالت:

کہ مریض کے مرض یا کسی ضرر رسیدہ شخص کا ضرر اتنا شدید ہے کہ یقین ہے یا ظنّ غالب ہے کہ علاج اور اسباب کے اختیار کرنے سے بھی شفایابی نہیں ہوگی بلکہ شفایابی موہوم یعنی وہم کے درجے میں ہے۔ مثلاً خطرناک آپریشن کا مسئلہ ہے، اطباء کا مشورہ یہ ہے کہ آپریشن کے ذریعہ شفایابی کی امید روپیہ میں ایک دو آنے کے برابر ہے، زیادہ تر رجحان یہی ہے کہ مریض کی موت واقع ہوسکتی ہے، تو ایسے مریض کے لئے شرعی حکم یہ ہے کہ اگر علاج کرنا چاہیں تو جائز ہے، اس امید سے کہ صحت یابی کی بہر حال امید کچھ نہ کچھ تو ہے لیکن چونکہ گمانِ غالب اس کے خلاف ہے ایسی حالت میں ایسے شخص کا علاج کرنا مکروہ ہے اور خلاف توکل بھی ہے۔

چوتھی حالت:

کہ کسی مریض کا مرض یا ضرر رسیدہ شخص کا ضرر اتنا شدید اور خطرناک ہے کہ علاج کے ذریعہ اس کا شفایاب ہونا موہوم بھی نہیں ہے بلکہ صفر کے درجہ میں ہے اور ایسے مریض کے بارے میں علاج کے ذریعہ اطبّاء کا فیصلہ یہ ہے کہ صحت یاب تو نہیں ہوگا زیادہ سے زیادہ حیات کی کیفیت باقی رکھی جاسکتی ہے لیکن وہ کسی کام کا نہیں رہے گا وہ اسی حالت میں پڑا رہے گا یہ چوتھی حالت وہ ہے جس کا ذکر جناب مستفتی صاحب نے اپنے سوالنامے میں کیا ہے اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ ایسے حالات سے دوچار مریض کا علاج بلا فائدہ ہے، اضاعتِ مال ہے، اضاعت وقت ہے، بلکہ ظاہری حیات کو باقی رکھ کر مریض کو حالتِ مرض میں ایذا رسانی اور اس کو تکلیف دینا ہے انہیں وجوہ کی بناء پر مزید علاج جاری رکھنا شرعی اور طبی نقطۂ نگاہ سے بھی جائز نہیں۔ گناہ اور معصیت بلکہ طبعی موت کے خلاف بلا فائدہ اور ناجائز مقابلہ ہے۔

اب اس سلسلہ میں فقہاء کرام اور کتب فتاویٰ کی عبارات ملاحظہ ہوں، فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

(۱) والا شتغال بالتداوی لابأس به اذا اعتقدان الشافی هو الله تعالیٰ، وأنه جعل الدواء سبباً، واما اذا اعتقد الشافی: هو الدواء فلا. كذافی السراجية.

(هندیه ص ۳۵۴، ج. ۵)

دوا استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جبکہ اس کا عقیدہ یہ ہو کہ شفا دینے والا اللہ تعالیٰ ہے دوا کو اس نے ظاہری سبب بنایا ہے لیکن اگر دوا استعمال کرنے والے کا عقیدہ یہ ہو کہ بیماری سے شفا دینے والی دوا ہے تو اس غلط عقیدہ کی وجہ سے ایسے شخص کے لئے دوا کا استعمال کرنا ناجائز ہے گناہ ہے۔

(۲) مناقب الامام الاعظم للامام الکردری میں صاحب کتاب تحریر فرماتے ہیں:

وعندنا التداوی ماذون فیه لامندوب، ولا مدعو الیه، و تحقیق الکلام فیه: أن الأسباب المزیلة للضرر ثلاثة: (۱) مقطوع به كالماء والخبز لدفع الجوع والعطش، فتركه حرام، ولیس بتوكل، فاذا اخرا لا كل قادرا حتى مات جوعاً مات عاصیا كالذی یقتل نفسه....

ہمارے نزدیک دواء کے استعمال کرنے کی اجازت ہے لیکن یہ کوئی مستحب نہیں ہے اور نہ ہی اس کے لئے وجوبی حکم دیا گیا ہے اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ ضرر دور کرنے والے اسباب تین طرح کے ہیں، (۱) جس سے ضرر و نقصان کا دور ہونا یقینی و قطعی ہو جیسے پیاس دور کرنے کے

لئے پانی پینا اور بھوک دور کرنے کے لئے روٹی کھانا تو ایسے اسباب کا چھوڑنا حرام ہے اور ایسا کرنا توکل نہیں ہے لہٰذا کھانے پینے پر قادر ہونے کے باوجود اگر اس نے کھایا پیا نہیں اور بھوکا پیاسا مر گیا تو وہ خودکشی کرنے والے کی طرح گنہگار ہوگا۔

(۲) وموهوم كالكّي والرقى بالادعية الماذون فيها فشرط التوكّل تركه كما وصف رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم المتوكلين فى حديث ابن مسعود رضى الله عنه الذى ذكرناه.

(۲) وہ اسباب جن سے تکلیف کا دور ہونا صرف گمان اور وہم کے درجہ میں ہو جیسے لوہے وغیرہ سے داغ دینا اور ادعیہ ماثورہ سے جھاڑ پھونک کرنا تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر توکل کامل ہو تو پھر ان اسباب کا ترک کرنا بہتر ہے جیسے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے توکّل کرنے والوں کی تعریف کی ہے جس کو حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے روایت کیا ہے۔

(۳) ومظنون كالفصد والحجامة وشرب المسهل وباقى ابواب الطب من معالجة الحرارة بالبرودة ومن معالجة الضد بالضد ففعله غير مناقض للتوكل بخلاف الموهوم ففعله غير مامور به كالمقطوع لكنه ماذون لكونه موصلا غير واجب لعدم القطع حتى اذا مات ولم يعالج بهذه المظنونات لايأثم ويثاب وفعله لا ينافى التوكل. (مناقب كردى ج. ۱ ص ۸)

(۳) وہ اسباب جو کہ ظنیہ ہوں (یعنی ان کے اختیار کرنے سے ضرر کا دور کرنا گمان غالب ہو) جیسے فاسد خون نکالنا، پچھنے لگوانا، دست آور دوا کا پینا اس کے علاوہ دیگر طبّی طریقہ سے علاج کرانا جیسے گرمی کا علاج ٹھنڈک سے اسی طرح کسی چیز کا علاج اس کی ضد سے کرنا تو اس طرح سے علاج کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے لہٰذا جائز ہے بخلاف ان اسباب کے جن کے اختیار کرنے سے ضرر کا دور ہونا وہم کے درجہ میں ہو ان کا اختیار کرنا توکل کے خلاف ہے اور اسباب ظنّیہ کا اختیار کرنا اس درجہ کا ضروری نہیں ہے جس درجہ میں اسباب قطعیہ کا اختیار کرنا ضروری ہے البتہ اسباب ظنّیہ کے اختیار کرنے کی اجازت ہے اس لئے کہ اس سے دفع ضرر یا فائدے کا حاصل ہونا قطعی اور یقینی نہیں ہے لہٰذا اگر کسی نے توکلاً اسباب ظنیہ کو اختیار نہیں کیا اور وہ مر گیا تو وہ گنہگار نہ ہوگا بلکہ توکل کرنے کی بناء پر ثواب کا حقدار ہوگا البتہ لٰکن اسباب ظنّیہ کا اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں ہے۔

(۳) وفی الهندية: اعلم أن الأسباب المزيلة للضرر تنقسم الى مقطوع به كالماء المزيل لضرر العطش والخبز المزيل لضرر الجوع. والى مظنون كالفصد والحجامة، وشرب المسهل، وسائر أبواب الطب أعنی معالجة البرودة بالحرار ة، ومعالجة الحرار ة بالبرود ة، وهی الأسباب الظاهرة فی الطب والیٰ موهوم كالكی والرقية.

أمّا المقطوع به فليس تركه من التوكل بل تركه حرام عند خوف الموت واما الموهوم فشرط التوكلّ تركه اذبه وصف رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم المتوكلين.

واما الدرجة المتوسطه: وهی المظنونة، كالمداواة بالأسباب الظاهرة عند الاطباء ففعله ليس منا قضا للتوكل بخلاف الموهوم وتركه ليس محظورا بخلاف المقطوع به، بل قديكون افضل من فعله فی بعض الأحوال فی حق بعض الاشخاص فهوعلی درجة بين الدرجتين كذا فی الفصول العمادية فی الفصل الرابع والثلاثين.

فتاویٰ ہندیہ میں ہے کہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ضرر دور کرنے والے اسباب چند قسم کے ہیں (۱) جن سے ضرر کا دور ہونا یقینی اور قطعی ہو جیسے پانی پیاس کو دور کرنے اور روٹی بھوک کو ختم کرنے میں یقینی ہیں، (۲) وہ اسباب جو کہ تکلیف دور کرنے میں ظن کے درجہ میں ہیں جیسے خراب خون کسی رگ سے نکالنا، اور پچھنے لگوانا اور دست آور دوا کا پینا اسی طرح طبّی طریقہ سے دیگر علاج بھی اسباب ظنیہ کے درجے میں ہیں جیسے سردی کا علاج گرمی سے اور گرمی کا سردی سے علاج کرنا، (۳) وہ اسباب جن سے ضرر کا دور ہونا وہم اور خیال کے درجہ میں ہو جیسے لوہے وغیرہ سے داغ دینا اور ادعیہ سے جھاڑ پھونک کرنا۔

پس وہ اسباب جو کہ یقینی اور قطعی ہیں ان کا ترک کرنا توکل نہیں ہے بلکہ موت کے خطرہ کے وقت ایسے اسباب کا ترک کرنا حرام ہے، اور وہ اسباب جو کہ صرف وہمی اور خیالی ہوں ان کا ترک کرنا توکل کے عین مطابق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متوکلین کی تعریف بیان فرمائی ہے۔

اور درمیانہ درجہ کے اسباب جو کہ ظنیہ ہیں جیسا کہ اطباء اسباب ظاہرہ سے علاج کرتے ہیں تو ان اسباب کا اختیار کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے بخلاف اسباب موہوم کے کہ ان کا اختیار کرنا

توکل کے خلاف ہے اور اسباب ظنیہ کا ترک کرنا منع بھی نہیں ہے بخلاف اسباب قطعیہ کے کہ ہلاکت کے خطرہ کے وقت ان کا ترک کرنا ممنوع وحرام ہے بلکہ اسباب ظنیہ کا اختیار کرنا بعض حالات میں بعض افراد کے لئے بہتر اور افضل ہوتا ہے تو اس صورت میں اسباب ظنیہ کا اختیار کرنا نہ کرنے سے بہتر ہے جیسا کہ فصول عمادیہ کی فصل نمبر ۳۴ میں اس کی صراحت ہے۔

(عالمگیری ص ۳۵۵، ج ۵)

(۴) رجل استطلق بطنه أور مدت عينه فلم يعالج حتى أضعفه ذلك ومات منه قالوا لا اثم عليه، ولو أنه جاع ولم يأكل وهو قادر على الاكل كان آثما، وفرض عليه أن يأكل مقدار قوته لوأن رجلا ظهربه داء فقال له الطبيب عليك الدم فاخرجهٔ فلم يفعل حتى مات لايكون آثما لانه لم يتيقن أن شفاء ہ فيه.

اگر کسی کو دست کی بیماری ہو یا آنکھ میں درد ہو اور اس نے اس کا علاج نہیں کرایا یہاں تک کہ اس کی بیماری کی وجہ سے وہ کمزور ہو گیا اور اسی بیماری میں وہ مر گیا تو فقہاء کرامؒ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ بخلاف اس کے کہ آدمی بھوکا ہو اور وہ کھانے پینے پر قادر بھی ہو پھر بھی وہ نہ کھائے تو بھوک سے مرنے کی وجہ سے وہ گنہگار ہوگا اس لئے کہ قوت لایموت کی مقدار کا استعمال اس پر فرض تھا (اس کے ترک کرنے کی وجہ سے وہ گنہگار ہوگا) البتہ اگر کسی کو ایسی بیماری ہو کہ ڈاکٹر اس کا علاج جسم سے فاسد خون نکالنا بتائے لیکن مریض نے ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق خون نہیں نکالا پھر اسی بیماری میں وہ مر گیا تو وہ گنہگار نہ ہوگا اس لئے کہ یہ بات یقینی نہیں کہ خون نکالنے سے مریض قطعی طور پر صحت یاب ہو جائے گا۔ (خانیہ ص ۴۰۹، ج ۳)

(۵) وفى الهندية كذا لك والفرق بين المسئلتين: أن الأكل مقدار قوته مشبع بيقين، فكان تركه اهلا كا، ولا كذالك المعالجة والتداوى كذا فى الظهيرية.

فتاویٰ ہندیہ میں دونوں مسئلوں (بھوک اور علاج نہ کرانے کی وجہ سے ہلاکت) میں فرق کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ قوت لایموت کی مقدار کھانا یقیناً بھوک ختم کر کے سیرابی لائے گا لہٰذا اس کا چھوڑنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے، بخلاف علاج ومعالجہ اور دوا وغیرہ کے استعمال کرنے کے کیونکہ اس میں شفایاب ہونا یقینی نہیں ہے جیسا کہ فتاویٰ ظہیریہ میں ہے۔

(عالمگیری ص ۵، ج ۳۵۵)

(٦) وفيه ايضاً: وفي الكيسانيات في الجراحة المخوفة والقروح العظيمة والحصاة الواقعة في المثانة ونحوها ان قيل قد ينجو وقد يموت أوينجو ولايموت يعالج وان قيل لاينجو أصلاً لايداوي بل يترك كذا في الظهيرية

"کیسانیات" میں ہے کہ خوفناک قسم کے زخم، اور بڑے بڑے پھوڑے اور جو پتھری مثانہ میں ہو تو اگر ان کے علاج معالجہ کے بارے میں ڈاکٹر کا کہنا یہ ہو کہ علاج سے صحت یاب بھی ہوسکتا ہے اور موت بھی واقع ہوسکتی ہے یا یہ کہ صحت یاب ہوسکتا ہے اور موت کا گمان نہیں تو پھر علاج کرالیا جائے لیکن اگر ڈاکٹر یہ کہے کہ مرض لاعلاج ہے صحت یاب ہونا ممکن نہیں ہے تو اس صورت میں علاج ومعالجہ نہ کرایا جائے بلکہ علاج کرانا چھوڑ دیا جائے جیسا کہ فتاویٰ ظہیریہ میں ہے۔ (عالمگیری ص ٣٦٠، ج. ٥)

مذکورہ بالا عبارات میں نمبر ا سے تا ۵ کی عبارت سے مریض کی پہلی حالت، "دوسری حالت" تیسری حالت اور اس کے احکام پر استدلال کیا ہے اور عبارت ٦ سے مریض کی چوتھی حالت اور اس کے حکم پر استدلال ہے۔

مریض کو مذکورہ بالا احوال میں سے دوسری اور تیسری حالت میں ترک علاج کی وصیّت کرنا جائز ہے۔ کیونکہ ان حالات میں علاج کرنا یا کرانا واجب نہیں ہے۔ مگر چوتھی حالت میں ترک علاج کی وصیت نہ صرف جائز ہے بلکہ واجب ہے، اپنے پسماندگان اور ورثاء کو وصیت کرے کہ اس چوتھی حالت میں اس کا علاج جاری رکھنے کی بجائے بند کر دیا جائے۔ فقط واللہ اعلم

کتبہ

محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ

۷/ذی قعدہ ۱۴۹۰ھ

دارالافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیہ

علامہ بنوری ٹاؤن کراچی ۵

جواب: قرآن حکیم کے اندر خنزیر کی حرمت کا بیان چار مقامات پر آیا ہے سورۃ البقرہ آیت نمبر ۱۷۳ میں، سورۃ المائدہ آیت نمبر ۳ میں، سورۃ الانعام آیت نمبر ۱۴۵ میں سورۃ النحل آیت نمبر ۱۱۵ میں۔

اس سے اس کی حرمت کی شدت اور اس کی نجاست کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ باجماع تمام مفسرین عظام وفقہائے کرام خنزیر اور اس کے تمام اجزاء حرام اور نجس ہیں۔ اور نجس العین ہیں۔ یعنی جس طرح مردہ جانور کا گوشت، اور بہتا ہوا خون اور شراب، گندگی اور غلاظت کی طرح بجمیع اجزاۂ نجس اور حرام ہیں۔ اس طرح خنزیر بھی بجمیع اجزاۂ نجس اور حرام ہے۔ (احکام القرآن جصاص ص ۱۱۷، ج ۱)

☆ خنزیر اور اس کا گوشت اور دیگر تمام اجزاء کا کھانا استعمال کرنا حرام ہے ان کو حلال سمجھنا کفر ہے۔

''مصنف عبدالرزاق'' میں حضرت قتادہؓ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اگر کسی نے خنزیر کا گوشت کھایا تو اسے توبہ کے لئے کہا جائے گا ورنہ اسے قتل کردیا جائے گا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کو حلال سمجھ کر کھایا تو کافر اور مرتد ہوجائے گا۔ (اسکو توبہ کے لئے کہا جائے گا۔ ورنہ اسلامی حکومت اسے قتل کرنے کا حکم دے گی۔) (روح المعانی ص ۷، ج ۴، کذا فی الدر المنثور)

☆ اگر کوئی خنزیر کے گوشت کو حرام سمجھتا ہے۔ لیکن غلطی سے دانستہ یا نادانستہ کھالیتا ہے تو وہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ وہ آدمی فاسق ہوجاتا ہے اس پر توبہ لازم ہے۔

☆ خنزیر کا گوشت، چمڑا، اور دوسرے اجزاء دباغت کرلینے سے بھی پاک نہیں ہوتے کیونکہ وہ نجس العین خالص گندگی ہے۔

☆ لہٰذا خنزیر کا گوشت، یا اس کے اجزاء کو کھانے میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

☆ دواء میں اس کا استعمال مسلمانوں کے لئے جائز نہیں۔

☆ اشیاء خوردنی میں خنزیر اور اس کے اجزاء کو ملانا جائز نہیں ہے۔

☆ صرف حالت اضطرار یعنی جبکہ شدید بھوک ہو، جان بچانے کی کوئی صورت نہ ہو تو جان بچانے کی غرض سے بقدر ضرورت اس کا استعمال مباح جائز ہے۔

☆ اور اضطراری حالت میں خنزیر کے اجزاء والی دوا کا استعمال بھی جائز ہے۔ جبکہ مسلمان طبیب حاذق تجویز کرے کہ سوائے اس حرام دوا کے کوئی دوا مریض کے لئے مفید نہیں ہے۔

☆ خنزیر کے اجزاء، چربی، ہڈی، گوشت، وغیرہ کی خرید وفروخت جائز نہیں حرام ہے۔

☆ موچی کے لئے جوتے سینے کے لئے خنزیر کے بال کو استعمال کرنے کے بارے میں آئمہ میں

اختلاف ہے۔ جملہ فقہاء اس کو بھی حرام قرار دیتے ہیں، جبکہ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ ایک فقہی اور اجتہادی اختلاف کی بناء پر اور بوجہ ضرورت موچی کے پیشے اختیار کرنے والوں کے لئے خنزیر کے بال کو استعمال کرنے کی اجازت دیتے ہیں لیکن اس کی خرید وفروخت کرنا ناجائز قرار دیتے ہیں۔
(احکام القرآن صفحہ ۱۲۴، ج. ۴)

علامہ شامی نے مقدسی کا قول نقل کیا ہے کہ امام محمدؒ نے موچی کا پیشہ اختیار کرنے والوں کے لئے خنزیر کے بال کو استعمال کرنے کی اجازت ضرورت اور حاجت کی بناء پر دی ہے کیونکہ اس وقت کوئی مضبوط دھاگے کا انتظام نہیں تھا۔ اب چونکہ مضبوط دھاگے دوسری چیزوں کے جوتے کی سلائی کے لئے ملتے ہیں اس لئے اب فتویٰ اس کے جواز پر نہیں ہوگا بلکہ عدم جواز پر ہوگا۔ (شامی صفحہ ۲۰۶، ج. ۱)

☆ خنزیر کے بال کا برش بنانا، اوراس کا استعمال کرنا ناجائز ہے کیونکہ اس کی ضرورت نہیں ہے اور اس کے بال نجس ہیں، نیز اس کے بال والے برش بنانے اور اس خرید وفروخت کرنے میں اس کی تقویم اور تکریم آتی ہے جبکہ خنزیر بجمیع اجزاء نہ تقویم کے لائق ہے نہ تکریم کے۔

☆ بعض غیر مسلم لوگ دانتوں کی صفائی کے لئے اس کو بناتے ہیں اور بازاروں میں فروخت کرتے ہیں، مسلمانوں کے لئے اس کا خریدنا، اور بیچنا، اور استعمال کرنا ناجائز ہے۔

☆ بعض مسلمان بھائی بیرون ملک رہتے ہیں، خواہ مستقل طور پر یا عارضی طور پر ان کو خنزیر کا گوشت اور اس کے اجزاء پر مشتمل اشیاء کی دکانوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ایسے حضرات کو چاہئے کہ جن دکانوں میں، ہوٹلوں میں خنزیر کا گوشت پکتا ہے، یا کسی اشیاء خوردنی میں خنزیر کے اجزاء شامل ہیں ایسے ہوٹلوں اور دکانوں میں کھانے کے لئے نہ جائیں، نہ ملازمت کریں۔

☆☆☆

مستورات کی جماعت برائے دعوت وتبلیغ کا شرعی حکم

استفتاء

محترم المقام حضرت مولانا مفتی محمد عبدالسلام صاحب چاٹگامی۔!

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مستورات کی جماعت برائے تبلیغ و دعوت نکلنے کے سوال کے جواب میں دارالافتاء جامعہ بنوری ٹاؤن سے ایک فتوی بینات میں شائع ہوا، کچھ دنوں کے بعد جامعہ کے مؤقر جریدہ ماہنامہ ''بینات'' میں مولانا یوسف لدھیانوی صاحب دامت برکاتہم، مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق ہزاروی صاحب دامت برکاتہم، مولانا ڈاکٹر مفتی نظام الدین صاحب شامزی مدظلہم، مولانا عبدالقیوم صاحب سواتی مدظلہم اور مولانا محمد انور بدخشانی صاحب مدظلہم کے دستخط کے ساتھ دوسرا فتوی شائع ہوا کہ مستورات کی جماعت تبلیغ کے لئے نکلنا جائز ہے اور اس میں بہت سے فائدے ہیں۔ان دو متضاد فتووں کی وجہ سے ہمیں بڑی تشویش ہوئی، عوام میں بڑی بے چینی پائی جاتی ہے بلکہ ہمیں یہ سمجھنا دشوار ہوگیا ہے کہ صحیح اور اصل مسئلہ کیا ہے؟

اس وجہ سے اصولی طور پر ہم نے سوچا کہ دوبارہ دارالافتاء سے رجوع کیا جائے کہ دارالافتاء کا موقف وہی ہے جو پہلے شائع ہوا ہے یا حضرت مولانا لدھیانوی صاحب مدظلہ وغیرہم کے اختلاف سے اس میں کچھ لچک پیدا ہوئی ہے؟ اس کی پوری وضاحت آنی ضروری ہے تاکہ عوام کی تشویش دور ہو جاوے اور اصل مسئلہ منقح ہو کر سامنے آجائے۔اور اس مسئلہ میں اگر دوسرے دارالافتاء کے فتاوی بھی ہوں تو انہیں بھی ذکر کیا جائے۔آپ سے درخواست ہے کہ عجلت میں جواب تحریر فرما کر ہماری پریشانی کو دور فرمائیں گے۔

فقط والسلام

چند ساتھی لانڈھی کراچی ۱۴

۲۰ رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ

الجواب باسمہ تعالیٰ وعونہ!

استفتاء کی اہمیت اور لوگوں کی تشویش دونوں چیزوں کو دیکھتے ہوئے جواب تحریر کرنا ضروری معلوم ہو، اور نہ مسئلہ کے جوابات میں ہمارے بعض رفقاء نے جو کچھ بدنظمی پھیلائی ہے دل برداشتہ ہو کر خاموشی اختیار کر گیا تھا۔اب چونکہ آپ کا استفتاء اور تشویشناک صورتحال سامنے آگئی ہے اس کی نزاکت کو دیکھتے

ہوئے خاموشی اختیار کرنا مداہنت فی الدین خیال کرتے ہوئے جواب لکھنے کا ارادہ کیا، اللہ تعالیٰ اصل مسئلہ کی وضاحت کرنے کی توفیق بخشے اور ہم سب کو اس میں صراط مستقیم کی رہنمائی عطا فرمادے۔

مستورات کی جماعت کا خروج برائے تبلیغ و دعوت ایک امرِ مستحدث ہے جس کے لئے کوئی نص، کوئی دلیل، کوئی روایت، قرآن واحادیث اور فقہ اسلامی سے نہیں ملتی۔ اس وجہ سے جن حضرات نے اس کے جواز کے فتوی دینے کی کوشش کی ہے انہوں نے فوائد کا سہارا لے کر جواب تحریر کیا اور اس مسئلہ میں اپنی تائید کے لئے چند احباب (جن میں اکثر کا تعلق فقہ اور فتوی سے نہیں ہے) سے دستخط لے کر جواب مسئلہ کو سہارا دینے کی کوشش کی گئی ہے، سمجھدار تو سمجھ جاتے ہیں لیکن ناسمجھ لوگ الجھتے رہتے ہیں۔

چونکہ ہمارے دارالافتاء کے جواب میں کچھ اجمال تھا اور بعض ضروری دلیلیں (جن سے مسائل واضح ہوجاتے) مذکور نہیں تھیں، اس واسطے نیز مقتضائے حال کے اعتبار سے ضروری سمجھا کہ تشریح اور دلائل کے ساتھ اس کا جواب تحریر کردیا جائے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان میں غور وفکر کر کے صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق بخشے۔

واضح ہو کہ مستورات کا اصل حکم یہ ہے کہ وہ گھروں میں مستور رہیں بلاضرورت شدیدہ ہرگز ہرگز گھروں سے باہر نہ نکلیں، ضرورت شدیدہ کے موقع پر نہایت احتیاط اور پردے کے ساتھ باہر جائیں اور ضرورت پوری کر کے واپس آجائیں۔ مستورات کی جماعت کا نکلنا اور نکالنا ان ضروریات اور مستثنیات میں سے نہیں ہے جن کی بنا پر عورتیں باہر نکل سکتی ہوں، اس لئے ان کا نکلنا درست نہیں۔

(۱) دلائل ملاحظہ ہوں

حق جل مجدہ کا ارشاد ہے:

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَاتَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِیْنَ الزَّکٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَکُمْ تَطْهِیْراً ○ وَاذْکُرْنَ مَایُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ اٰیَاتِ اللّٰهِ وَالْحِکْمَةِ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ لَطِیْفًا خَبِیْراً○ (احزاب)

ترجمہ: اور عورتیں اپنے گھروں میں ٹھہری رہیں، جس طرح پہلے جاہلیت کے دنوں میں اظہار تجمل کرتی تھیں اے عورتو! اب اس طرح باہر جا کر اپنی زیب وزینت کی چیزوں کو نہ دکھاتی پھرو، نماز پڑھتی رہو اور زکوٰۃ دیتی رہو، خدا اور رسول کی فرماں برداری کرتی رہو، اے پیغمبر کے اہلِ بیت! اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تمہیں میل کچیل سے پاک وصاف کردے اور تمہارے گھروں

میں جو اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں، حکمت اور احادیث کی باتیں سنائی جاتی ہیں ان کو یاد رکھو (اور ان پر عمل کرو) بے شک اللہ احکام کی تمام باریکیوں کو جانتا ہے اور ان سے باخبر ہے۔

(۱) حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے تفسیر معارف القرآن میں لکھا ہے کہ "اس آیت میں پردہ کے متعلق اصلی حکم ہے کہ عورتیں گھروں میں رہیں یعنی بلا ضرورت شرعیہ باہر نہ نکلیں، اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ جس طرح اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت کی عورتیں علانیہ بے پردہ پھرتی تھیں اے بیویو! تم ایسے نہ پھرا کرو کیونکہ عورتوں کی تخلیق گھریلو کاموں کے لئے ہوئی ہے کہ وہ ان میں مشغول رہیں"۔

(معارف القرآن ص ۱۳۲ ج ۷)

ظاہر ہے عورتوں کے نان نفقہ اور دیگر ضروریات کو مردوں کے ذمہ قرار دیا گیا ہے تاکہ وہ تمام معاشی ومعاشرتی فکر سے بے نیاز ہو کر اللہ اور اس کے رسول کی ہدایت کے موافق حقوق اللہ اور حقوق الزوج ادا کریں، تو بلا ضرورت وہ کس وجہ سے باہر جائے گی؟ ان کو چاہئے کہ نماز وروزہ ودیگر احکام شرع گھروں میں رہ کر ادا کریں اور اس کے بعد شوہر کے حقوق ادا کریں۔ ان کا پڑھنا پڑھانا، نماز وروزہ اور دوسرے دین کے کام انجام دینا سب اپنے اپنے گھروں میں ہوگا، البتہ ضرورت وحاجت شرعیہ کے لئے وہ گھروں سے باہر جاسکتی ہیں مگر وہ بھی شرائط کے ساتھ۔

(۳) احکام القرآن للجصاص میں امام ابوبکر جصاص رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ الخ...... فيه الدلالة، على ان النساء ...... مأمورات بلزوم البيوت منهيات عن الخروج. (ص ۳۶۰، ج ۳)

یعنی اللہ کے قول: وقرن فی بیوتکن الخ کے اندر اس بات کی دلالت اور واضح اشارہ ہے کہ عورتوں کے لئے لزوم فی البیوت یعنی گھروں میں رہنا لازم ہے اور وہ اسی کی مامور ہیں اور ان کے لئے خروج ممنوع ہے۔

(۴) تفسیر ابن کثیر میں اللہ تعالیٰ کے قول وقرن فی بیوتکن کی تفسیر میں علامہ عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ أى ألزمن بيوتكن فلا تخرجن لغير حاجة. الخ

یعنی اللہ تعالیٰ کے قول: وقرن فی بیوتکن کا مطلب یہ ہے کہ اے عورتو! تم اپنے گھروں پہ رہنا لازم کرلو، پس تم ہرگز ہرگز بلا کسی ضرورت شدیدہ کے اپنے گھروں سے نہ نکلا کرو۔

(۲) حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ

جَلَابِيبِهِنَّ. (احزاب: ٥٩)

یعنی اے نبی! اپنی ازواج مطہرات اور بنات طاہرات کو اور عام مسلمانوں کی عورتوں کو آپ حکم دیں کہ اپنے جلباب استعمال کریں۔

''جلباب'' اس لمبی اور چوڑی چادر کو کہا جاتا ہے جس میں عورت سر سے پاؤں تک چھپ جائے (روی ذلک عن ابن عباس)۔

یعنی بڑی اور لمبی چادر کو اس طرح لپیٹی ہوئی ہو کہ سارا جسم مع چہرہ کے چھپ جائے صرف راستہ دیکھنے کی ضرورت کے لئے ایک آنکھ کھلی رکھے۔

حدیث میں مزید کچھ شرائط کا ذکر ہے.....

کہ عورت بضرورت جب گھر سے نکلے تو (۱) عورت خوشبوجات استعمال نہ کرے (۲) بجنے والے زیورات استعمال نہ کرے (۳) راستہ کے کنارہ پر چلے (۴) اپنی زینت کی چیزوں کو نہ دکھائے، واضح رہے کہ چہرہ پردہ میں شامل ہے کیونکہ اس سے سارے فتنے جنم لیتے ہیں، اکثر ائمہ اربعہ کا یہی فتویٰ ہے (۵) میلے کچیلے کپڑے میں باہر جائے، اچھے کپڑے کا استعمال نہ کرے (۶) اجنبی مردوں سے بلا ضرورت کوئی بات نہ کرے (۷) ضرورت کے تحت بات کرے تو نرم الفاظ میں بات نہ کرے بلکہ کڑک الفاظ میں کڑوی زبان میں بات کرے، کیونکہ نرم لہجے میں بھی فتنہ پیدا ہوتا ہے (۸) ضرورت پوری ہونے پر فوراً واپس آجائے تاخیر نہ کرے، کیونکہ اس سے فتنہ اور بے حیائی پھیل سکتی ہے۔

آج کل جو عورتیں باہر جاتی ہیں تجربے اور مشاہد سے یہ بات ظاہر ہے کہ عورتیں اچھے لباسوں میں خوشبو وغیرہ لگا کر جاتی ہیں، نرم الفاظ اور نرم لہجے میں بات کرتی ہیں خود مائل ہوتیں ہیں دوسرے کو بھی مائل کرتیں ہیں جو خالص لادینیت اور بے حیائی ہے۔ نیز یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ تبلیغ ودعوت کے لئے نرم الفاظ استعمال کرنا اور لہجے میں نرمی اختیار کرنی پڑتی ہے اور شریعت کا بھی یہی حکم ہے اور اس سے تبلیغ کا اچھا اثر ہوتا ہے اور سخت لہجہ میں تبلیغ ودعوت سے اچھا اثر نہیں ہوتا، بلکہ برا اثر پھیلتا ہے جبکہ عورتوں کے لئے حکم یہ ہے کہ اجانب سے جب بھی بات کریں تو سخت الفاظ سے بات کریں اور کڑوے لہجے میں بات کریں نرم الفاظ سے بات نہ کریں، لہٰذا شریعت نے عورتوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا ہے اور انہیں گھروں میں رہنے کا حکم دیا ہے کہ وہ جو کچھ کریں گھروں میں کریں۔ انکو شریعت نے گھروں سے باہر جا کر تبلیغ ودعوت کا مکلف نہیں ٹھہرایا یہ ذمہ داری مردوں کے ذمہ رکھ دی ہے۔

نیز وتبلیغ کا کام عورتوں پر بقدر ضرورت اپنے احاطے میں مستحسن ہے، لیکن ایسے مستحسن کام کے لئے

شریعت کی حدود کو توڑنا اور فرض احکام کی خلاف ورزی کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ اس واسطے تمام مسلمانوں کو چاہئے کہ اللہ کے حکموں کی پابندی کریں، اپنے خواہشات کی پیروی نہ کریں۔

(۳) حدیث شریف میں فرمایا ہے:

اَلْمَرْأَۃُ عَوْرَۃٌ اِذَا خَرَجَتْ اِسْتَشْرَفَهَا الشَّيْطَانُ. (مشکوٰۃ)

خواتین سرتاپا عورت اور مستور رہنے کی چیز ہیں باہر نکلنے اور نکالنے کی چیز نہیں ہے۔

حدیث میں اس کے تمام بدن کو مستور اور چھپانے کی چیز قرار دیا ہے، کسی عضو کو مستثنیٰ نہیں قرار دیا گیا۔

عورت باہر نکلنے کی صورت میں اپنے تمام بدن کو کہاں چھپا سکتی ہے؟ اگر نہیں چھپا سکتی تو شریعت کی خلاف ورزی ہوگی جو کہ معصیت اور گناہ ہے، کیا کسی امر مستحسن کے لئے کسی امر حرام اور ناجائز کا ارتکاب جائز ہوگا؟ ہر گز نہیں!۔

نیز دشمنانِ اسلام کفار اور منافقین چاہتے ہیں کہ دین کے نام پر کسی طرح عورتوں کو گھروں سے نکالا جائے، اس کے لئے کوشش کیجائے، جبکہ وہ بے دین عورتوں کو پہلے سے ہی دنیا کی ترقی کے نام پر گھروں سے نکالنے میں کامیاب ہوگئے ہیں، اب وہ اسی دین کے راستہ سے اور دینداری کی آڑ میں اشاعت فاحشہ کرنا چاہتے ہیں کہ عورتوں میں بے حیائی عام ہوجائے اور باہر نکلتے نکلتے انکی فطری حیاء میں کمی واقع ہوجائے، جس سے بچنا مسلمانوں پر ضروری اور لازم ہے، کیونکہ حق تعالیٰ شانہ اس سے منع کرتے ہیں اور اس کی مذمت فرماتے ہیں۔

(۴) حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝

ترجمہ: جو لوگ چاہتے ہیں کہ بے حیائی کی اشاعت ہو، ان میں جو ایمان والے ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے دنیا میں اور آخرت میں، (ان کے ارادے اور احوال کو) اللہ خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

یعنی جو لوگ ایمان داروں میں بے حیائی کی اشاعت چاہتے ہیں، اس کے لئے راستے ڈھونڈتے ہیں کہ عورتیں مردوں کی طرح باہر نکل آئیں اور ان کو بے پردہ اور بے حیا کرنا چاہتے ہیں ان کے واسطے دنیا میں دردناک عذاب ہے اور آخرت میں بھی عذاب الیم کی وعید ہے۔ اے ایمان

والو! اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو خوب جانتا ہے تم نہیں جانتے ہو لہٰذا تم ایسے لوگوں کی تدبیروں سے بچاؤ کی کوشش کرو۔

(۵) حدیث شریف میں ہے: حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان اَلْمَرْاَةُ تُقْبِلُ فِیْ صُوْرَةِ شَیْطَانٍ وَتُدْبِر فی صُوْرَةِ شَیْطَانٍ. (مشکوٰۃ ص ۲۹)

''عورت جب سامنے سے آتی ہے تو شیطان کی صورت میں آتی ہے اور پیٹھ دیکر جاتی ہے تو بھی شیطان کی صورت میں جاتی ہے''، یعنی ایسے حالات میں شیاطین مردوں کے دلوں میں بے حیائی کے وسوسے ڈالدیتے ہیں برے خیالات پیدا کردیتے ہیں جن سے بچنا سب کے لئے ضروری ہے، لہٰذا عورتوں کو نہ باہر جانے کی اجازت دی جائے نہ وہ خود باہر جانے کی کوشش کریں۔

(۶) ایک اور حدیث میں نبی علیہ السلام نے حضرت علیؓ کو وصیت فرمائی کہ راستے پر جب چلا کرو اور اتفاق سے عورت کا سامنے سے گذر ہو اور تمہاری نظر عورتوں پر پڑے تو فوراً نگاہ کو ہٹالو بار بار اس کو نہ دیکھا کرو، نہ تکتے رہو، کیونکہ تمہارے واسطے غیر اختیاری نظر جو کہ پہلی مرتبہ ہوتی ہے معاف ہے مگر اختیاری نظر جو دوسری اور تیسری نگاہ ہے معاف نہیں ہے۔

قَالَ عَلَیْهِ السَّلَامُ: یَا عَلِیُّ! لاَ تُتْبِعُ النَّظْرَةَ النَّظْرَةَ فَاِنَّ لَکَ الْاُوْلٰی وَلَیْستَ لَکَ الآخِرَةُ. (مشکوٰۃ شریف)

ایسے حالات میں عورتوں کو دیکھتے رہنا ناجائز وحرام ہے اور موجب لعنت ہے۔

(۷) ایک اور حدیث میں ہے: عَنِ الحَسَنِ قَال: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم: لَعَنَ اللّٰہُ النَّاظِرَ وَالْمَنْظُوْرَ اِلَیْھَا. (مشکوٰۃ ص ۲۹۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جو مرد بلاضرورت شدیدہ عورت کو دیکھتا ہے، اس پر لعنت ہے اور جو عورت مرد کو بلاعذر دیکھتی ہے اس پر بھی لعنت ہے''۔

عورت فطرۃً فتنہ کا سبب ہے، اس کے اندر شہوات بھر دی گئی ہیں۔

(۸) ایک اور حدیث میں ہے۔ عَنْ اَبِی سَعِیْدِ الْخُدْرِی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: اَلدُّنْیَا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ وَاِنَّ اللّٰہَ مُسْتَخْلِفُکُمْ فِیْھَا فَیَنْظُرُ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ فَاتَّقُوْا الدُّنْیَا وَاتَّقُوا النِّسَاءَ فَاِنَّ اَوَّلَ فِتْنَةِ بَنِیْ اِسْرَئِیْلَ کَانَتْ فِیْ النِّسَاءِ. (رواہ مسلم)

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا اور دنیا کی چیزیں خوشنما سبز باغ کی طرح ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اس میں خلیفہ بنا کر بھیجنے والے ہیں پھر وہ دیکھے گا کہ تم کیا کرتے ہو، دیکھو عورتوں سے ڈرتے رہو کیونکہ بنی اسرائیل کا سب سے پہلا فتنہ عورتوں میں تھا۔ (مسلم)

یہی وجہ تھی کہ آیت ''وَقَرْنَ فِیْ بِیُوْتِکُنَّ'' جب اتری تھی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی عورتوں کو مسجد میں جانے سے روک دیا اور کہا کہ اللہ نے عورتوں کو باہر نکلنے سے منع فرما دیا ہے۔

(۹) چنانچہ ام نائلہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں:

قَالَتْ جَاءَ اَبُوْ بَرْزَۃَؓ فَلَمْ یَجِدْ اُمَّ وَلَدِہٖ فِی الْبَیْتِ وَقَالُوْا ذَھَبَتْ اِلَی الْمَسْجِدِ فَلَمَّا جَاءَتْ صَاحَ بِھَا فَقَالَ اِنَّ اللّٰہَ نَھَی النِّسَاءَ اَنْ یَّخْرُجْنَ وَاَمَرَھُنَّ اَنْ یَّقِرْنَ فِیْ بُیُوْتِھِنَّ وَلَا یَتَّبِعْنَ جَنَازَۃً وَلَا یَأْتِیْنَ مَسْجِداً وَلَا یَشْھَدْنَ جُمُعَۃً.

(درمنثور: ص ۶۰۰، ج ۶)

یعنی حضرت ابو برزۃ رضی اللہ عنہ ایک دفعہ گھر تشریف لائے اپنی ام ولد کو گھر پر نہیں پایا جب پوچھا گیا کہ یہ کہاں گئی تو حاضرین نے بتایا کہ مسجد میں نماز کے لئے گئی ہیں۔ جب وہ واپس آئیں تو حضرت ابو برزہؓ نے ناراضگی ظاہر کی اور سختی سے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو گھر میں سے باہر نکلنے سے منع فرمایا اور ان کو حکم دیا کہ وہ گھروں میں سکون سے رہیں نہ نماز جنازہ میں جائیں نہ نماز خمسہ کے لئے مسجد میں جائیں نہ نماز جمعہ میں شریک ہوں۔

(۱۰) عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

أُحْبِسُوْا النِّسَاءَ فِی الْبُیُوْتِ اِنَّ النِّسَاءَ عَوْرَۃٌ الْمَرْأَۃُ اِذَا خَرَجَتْ اِسْتَشْرَفَھَا الشَّیْطَانُ وَاَقْرَبُ مَاتَکُوْنُ مِنْ رَحْمَۃِ رَبِّھَا فِیْ قَعْرِ بَیْتِھَا. (درمنثور ص ۶۶۰۰، ج ۶)

ترجمہ: اے ایماندارو اپنی عورتوں کو گھروں میں بند رکھا کرو اس لئے کہ عورت سرتاپا پردے کی چیز ہے یہ جب بھی گھر سے باہر قدم رکھتی ہے تو شیطان جھانکنے لگتا ہے۔ یہ عورت سب سے زیادہ اللہ کی رحمت سے قریب اس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ گھر کے اندرونی حصے میں ہوتی ہے۔

(۱۱) اس قسم کی روایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی ہے۔

(۱۲) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قَالَ: جِئْنَ النِّسَاءُ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَقُلْنَ! یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ!

ذَهَبَ الرِّجَالُ بِالْفَضْلِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمَا لَنَا عَمَلٌ نُدْرِكُ بِهٖ فَضْلَ الْمُجَاهِدِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَقَالَ: وَمَنْ قَعَدَتْ مِنْكُنَّ فِيْ بَيْتِهَا فَهِيَ تُدْرِكُ ثَوَابَ عَمَلِ الْمُجَاهِدِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ.

ترجمہ: ایک مرتبہ عورتوں کی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی اور کہا یا رسول اللہ! مرد لوگ اللہ کے فضل اور جہاد فی سبیل اللہ وغیرہ امور کے ذریعہ عورتوں سے آگے چلے گئے ہیں اب ان کے اس جہاد کے بدلہ میں ہمارا کیا عمل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے جو عورت گھر میں بیٹھی رہے گی وہ بھی مجاہدین کے عمل کی فضیلت پائے گی اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے کا اس کو ثواب ملے گا۔

یعنی عورت اگر گھر میں رہے اور شوہر کے حقوق پہچانتے ہوئے اس کو ادا کرے اور اس کی خدمت کر کے اس کو راضی کر لے، تو پھر اس کو جہاد کا ثواب ملے گا جہاد بالسیف کی ضرورت نہ ہوگی جو لوگ دعوت و تبلیغ کو جہاد قرار دیتے ہیں اور بعض عورتوں کے جہاد میں شریک ہونے کی روایات کو دعوت و تبلیغ کے لئے عورتوں کی جماعت نکلنے کے جواز کی حجت بناتے ہیں وہ کان اور آنکھیں کھول کر سنیں اور دیکھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو ان کے جہاد میں جانے کے سوال پر کیا فرمایا تھا کہ عورتیں گھروں میں بیٹھی رہیں جہاد کے لئے نہ جائیں۔

باقی رہا یہ کہ جو عورتیں غزوہ میں شریک ہوئیں تھیں وہ دراصل مردوں کی قلت کی وجہ سے مریضوں کو پانی پلانے گئی تھیں اور مریضوں اور زخمیوں کو مرہم پٹی کرنے گئی تھیں، مجاہدین کے پیچھے سامان وغیرہ حفاظت کرنے گئی تھیں۔ زخمیوں کی خدمت اور مجاہدین کی اعانت اور مصیبت زدہ لوگوں کی حال پرسی کرنے گئی تھیں، جب کہ مسلم اور ابن ماجہ کی روایات میں ہے کہ بعض عورتیں مردوں کی تابع ہو کر ان کی خدمت کے لئے جاتی تھیں۔ جہاد و تبلیغ کے لئے مستورات کی مستقل کوئی جماعت نہیں جاتی تھیں، مردوں کی خدمت کے لئے ضرورت شدیدہ کے تحت عورتیں اپنے محرم کے ساتھ جاسکتی ہیں مگر جہاد اور تبلیغ و دعوت کے لئے نہیں جاسکتیں۔ دونوں کے درمیان بڑا فرق ہے ایک صورت میں عورتوں کا جانا ثابت اور جائز ہے دوسری صورت میں عورتوں کا نکلنا اور جانا غیر ثابت اور منع ہے، ایک صورت میں ضرورت شدیدہ کی وجہ سے جاسکتی ہیں دوسری صورت میں ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے نہیں جاسکتیں۔

(۱۳) حضرت ام سلیم فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ انصار کی عورتیں غزوہ میں شریک ہوتی تھیں اور یہ مریضوں کو پانی پلاتی تھیں اور زخمیوں کو مرہم اور پٹی کرتی تھیں۔ (مسلم)

(۱۴) حضرت ام عطیہ انصاری فرماتی ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سات غزوات میں شریک ہوئی تھی۔ ان میں مجاہدین کے کجاوؤں کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں ان کے لئے کھانا پکاتی، زخمیوں کا علاج کرتی اور مصیبت زدہ صحابہ کی نگہداشت کرتی تھیں۔ (مسلم، ابن ماجہ)

غرض یہ کہ عورتوں کا مردوں کی ضرورت واعانت کے لئے ان کے تابع بن کر باہر نکلنا جائز اور ثابت ہے۔ لیکن مستورات کی جماعت اور دعوت وتبلیغ کے کام اور نام سے نکلنا ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے قرآن واحادیث کی رو سے غیر ثابت اور ناجائز ہے بلکہ احادیث میں عورتوں کو جہاد کے لئے نکلنے سے منع کیا گیا ہے۔ جبکہ جہاد فرض کفایہ ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ (جو کہ فرض کفایہ ہے) کے لئے عورتوں کا نکلنا جائز نہیں ہے، چنانچہ تبلیغ جماعت کے سابق امیر حضرت العلام محمد یوسف رحم اللہ نے ''حیاۃ الصحابہ'' کے نام سے تین جلدوں میں عربی میں کتاب لکھی ہے اس کا اردو میں ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔

(۱۵) اس میں حضرت ام کبشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ عذراء بنی قضاعہ کی ایک عورت نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا! یا رسول اللہ کیا آپ مجھے اجازت دیتے ہیں کہ فلاں لشکر کے ساتھ جہاد میں جاؤں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں۔ اس عورت نے کہا یا رسول اللہ: میرا جہاد کا ارادہ نہیں، بلکہ میں اس ارادہ سے جانا چاہتی ہوں کہ زخمیوں کا علاج کروں اور مریضوں کو پانی پلاؤں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر عورتوں کا جہاد میں جانا سنت بن جانے کا ڈر نہ ہوتا کہ لوگ یوں دلیل پکڑیں گے کہ فلاں عورت تو جہاد میں گئی تھی۔ تو میں تجھے اجازت دیتا لیکن تو گھر جا کر بیٹھ جا اور جہاد میں مت جا۔

(رواہ الطبرانی فی الکبیر والا وسط ورجالھما رجال الصحیح)(حیاۃ الصحابہ ص ۴۳ ج ۲)

(۱۶) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی اور حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ! میں عورتوں کی جانب سے آپ کے پاس قاصد بن کر آئی ہوں کہ اللہ پاک نے جہاد فی سبیل اللہ کو مردوں پر فرض کر دیا ہے اگر وہ کامیاب ہوتے ہیں تو انہیں ثواب ملتا ہے اور اگر شہید ہوتے ہیں تو اللہ کے نزدیک زندہ ہیں اور انہیں رزق دیا جاتا ہے اور ہم عورتوں کی جماعت ان کی خدمت میں لگی رہتی ہے ہمارے لئے اس میں کیا ثواب ہے؟ ابن عباس نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کسی عورت سے تو ملے گی اس کو یہ اطلاع پہنچا دینا کہ شوہر کی فرماں برداری کرنا اور اس کے حقوق کا اقرار کرتے ہوئے ان کو ادا کرنا اس میں جہاد کے برابر ثواب ہے۔

اور فرمایا تم میں سے بہت کم عورتیں ہیں جو اس فریض کی ادائیگی میں پوری اترتی ہوں۔
(اخرجه البزار حیاۃالصحابه ص ۶۴۷، ج ۳)

لہٰذا جہاد کے لئے عورتوں کا نکلنا جائز نہیں ہے۔

(۱۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک دوسری عورت آئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میں عورتوں کی جانب سے قاصد بن کر آپ کی خدمت میں آئی ہوں، ممکن ہے ان میں سے بعض کو آپ جانتے ہوں اور بعض کو نہ جانتے ہوں، سب نے میرے آنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مردوں اور عورتوں کا رب ہے اور سب کا معبود ہے اور آپ عورتوں اور مردوں دونوں کے لئے اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ پاک نے مردوں پر جہاد فرض کیا ہے اگر وہ کامیاب ہوتے ہیں تو دولت ان کے پلے میں پڑتی ہے اور اگر وہ شہید ہوتے ہیں تو اپنے رب کے نزدیک ثواب دئے جاتے ہیں اور رزق دئے جاتے ہیں اب آپ فرمائیے کہ مردوں کے اس عمل کے مقابلہ میں عورتوں کی کونسی طاعت ہوسکتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا اپنے شوہر کی اطاعت کرنا اور اس کے حقوق پہچاننا اور اس پر عمل کرنا اور تم میں سے بہت کم عورتیں ہیں جو اس کا لحاظ رکھتی ہیں۔
(فی الترغیب و الترهیب حیاۃالصحابة ص ۶۴۷، ج ۳)

حدیث پاک میں ایک دو عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے لیکن انہوں نے بتایا کہ سب عورتوں کی نمائندگی کرنے قاصد بن کر آئی ہیں، سب کی خواہش یہ ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہوں اور شہید ہوں اور کامیابی ملے تو دولت ملے اور ثواب کثیر حاصل ہو، لیکن اللہ کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عورتوں کے لئے علانیہ طور پر یہی فرمایا تھا کہ عورتوں کے لئے ایمان اور ارکان اسلام کے بعد اصل فرض یہ ہے کہ حقوق الزوج کو پہچانیں اور ان کا اقرار کریں اور ان پر عمل کرتے ہوئے اس کی خدمت کریں اور اس کی اطاعت کرتے ہوئے اللہ و رسول کے احکام گھر میں رہ کر ادا کریں، اسی سے ان کو جہاد اور تعلیم و تبلیغ اور دعوت کا ثواب ملتا رہے گا، ان کو گھروں سے باہر جانے کی ضرورت نہیں، لہٰذا از روئے حدیث جو ثواب اور جو فضیلت خواتین اپنے گھروں میں رہ کر حاصل کرسکتی ہیں ان کو حاصل کرنے کے لئے بلا ضرورت باہر کیوں جائیں گی اور کس مقصد سے جائیں گی۔

(۱۸) حدیث شریف میں ہے: قَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ: لَا يَحِلُّ لِاِمْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ اَنْ تُسَافِرَ مَسِيْرَةَ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ اِلَّا مَعَ زَوْجٍ اَوْ ذِيْ مَحْرَمٍ عَلَيْهَا.
(صحیحین)

ترجمہ: نبی علیہ السلام نے فرمایا کسی عورت کے لئے جو اللہ پر ایمان رکھتی ہے اور آخرت پر یقین رکھتی ہے حلال نہیں کہ وہ گھر سے باہر ایک دن ایک رات کی مسافت کے سفر میں جائے مگر یہ کہ اس کے ساتھ شوہر یا محارم میں سے کوئی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ عورت حج جیسی فرض عبادت کو ادا کرنے میں بھی بدون محرم کے سفر نہیں کرسکتی، ناجائز وحرام ہے تو تبلیغی سفر جو کہ امر مستحسن ہے اس کے لئے بلا ضرورت شرعیہ وحاجت طبعیہ کیسے مستورات کی جماعت باہر جائے گی، کیوں اور کیسے نکلے انکے لئے کس بنیاد پر سفر جائز ہوگا؟۔

(۱۹) فرائض خمسہ روزانہ پانچ نمازوں کی جماعت میں عورتیں نہیں جاسکتیں اور یہ ناجائز اور مکروہ تحریمی ہے۔ کیونکہ حدیث میں عورتوں کو اپنے اپنے گھروں میں نماز ادا کرنے کا حکم آیا ہے اور باہر جانے میں بے پردگی اور طرح طرح کے فتنے اور فساد کا اندیشہ ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام فقہاء کرام نے اس کو منع کیا ہے اور فرمایا:

ولا يحضرن الجماعات لقوله تعالىٰ: وقرن فى بيوتكن وقوله عليه السلام: وصلا تها فى قَعْرِ بَيْتِهَا افضل من صلاتها فى صحن دارها و صلاتها فى صحن دارها افضل من صلا تها فى مسجد هاوبيوتهن خير لهن.

وفى البحر ولانه لايؤمن من الفتنة من خروجهن، اطلقه فى الكتاب فشمل الشابة والعجوز والصلوة النهارية واللّيلية وقال المصنف: والفتوى على الكراهة فى الصلوٰة كلها ومتى كره حضورهن المسجد للصلوة فلأن يكره حضور مجالس الوعظ خصوصاً عند هولاء الجّهال الذين تحلو بحلية العلماء اولى، ذكره فخر الاسلام وفى فتح القدير: المعتمد منع الكل فى الكل الا العجائز المتفانية بحر. (ص ۳۵۸ فتاوى شامى، ص ۵۹۱، ج ۲، طحطاوى ص ۱۶۶)

یعنی فرائض خمسہ کی جماعت کے لئے عورتیں مساجد میں نہیں جائیں گی کیونکہ زمانہ فتنہ وفساد کا ہے، حالانکہ جماعت سے تخلّف پیچھے رہنا مردوں کے لئے ناجائز وحرام ہے، بلکہ حدیث میں اس کو نفاق کہا گیا ہے ایسے حالات میں عورتوں کو اس سے منع کیا گیا ہے کہ نماز کی جماعت میں نہ جائیں گھروں میں نماز ادا کریں، خیر القرون کے ابتدائی زمانہ میں عورتیں حوائج کے لئے اور نمازوں کے لئے نکلتی تھیں مگر جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ زمانہ فتنے کا شروع ہوگیا ہے تو عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے

روک دیا گیا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

لَوْاَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہِ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ رَاٰی مَااَحْدَثَ النِسَاءُ لَمَنَعَھُنَّ الْمَسَاجِدَ کَمَا مُنِعَتْ نِسَاءُ بَنِیَ اِسْرَائِیْلَ. (مسلم)

ترجمہ: اس زمانہ میں جو کچھ عورتوں نے نئی چیزیں پیدا کی ہیں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر دیکھتے تو ان کو مساجد میں نمازوں کے لئے جانے سے روک دیتے جیسا کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو اپنی عبادت خانوں میں جانے سے روک دیا گیا تھا۔

حدیث شریف سے ظاہر ہوا کہ عورتوں کا مسجدوں میں جانا باعث فتنہ ہے، لہٰذا ان کو جماعت کے لئے نہ جانا چاہیئے، حالانکہ ان کو اس میں ثواب ملتا ہے اس میں تقریر اور وعظ سن سکتی ہیں اور بہت سے فوائد ہیں پھر بھی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اور صحابہؓ نے حصول فوائد کو نہیں دیکھا بلکہ وجود فتنہ کو دیکھا کیونکہ فوائد کا حاصل کرنا تب جائز ہے جبکہ نقصانات نہ ہوں، جب زمانہ فتنے کا شروع ہو گیا ہے فسّاق و فجار کا دور شروع ہو گیا ہے اور عورتوں میں بناؤ سنگار اور اچھے لباسوں اور خوشبو وغیرہ لگا کر باہر جانے کی عادت پڑ گئی ہے تو اس سے بے شمار فتنے اور فسادات شروع ہوں گے۔ فائدے کی جگہ ایمان واعمال کے نقصانات زیادہ ہوں گے اس لئے صحابہ کرام نے انہیں مسجدوں میں جانے سے روک دیا فقہاء کرام نے کتابوں میں لکھا کہ عورتوں کے لئے فرائض خمسہ اور دوسری نمازوں کی جماعت میں شریک ہونا جائز نہیں ہے۔ لدفع الفتنة، نیز حدیث میں یہ بھی ذکر ہے کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو پہلے پہلے نمازوں کے لئے عبادت خانوں میں جانے کی اجازت تھی مگر جب ان میں فتنے شروع ہو گئے تو انہیں بھی عبادت خانوں میں عبادت کے لئے جانے سے روک دیا گیا تھا تو گویا عورتوں کا فتنہ میں مبتلا ہو جانا کوئی نئی چیز نہیں، پرانی چیز ہے اور ان کو باہر جانے سے روکنا یہ بھی کوئی نئی چیز نہیں بلکہ دوسرے مذہب میں ایسا ہوا ہے۔

غرض نماز خمسہ جیسی فرض عبادت جو کہ محلّہ میں ادا کی جاتی ہے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے زمانہ خیر القرون میں عورتوں کو اس سے روک دیا گیا ہے اور مسجد حرام اور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جہاں لاکھ اور پچاس ہزار کے ثواب کی خوشخبری اور وعدہ ہے، سے روکا گیا ہے تو ایک امر مستحسن تبلیغ ودعوت کے کام لئے عورتوں کا نکلنا کیسے جائز ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَصَلَا تھن فِیْ قَعْرِبَیْتِھِن اَفْضَلُ مِنْ صَلوٰتِھِنَّ فِیْ صِحْنِ دَارِھَا وَصَلوٰتُھن فِیْ صِحْنِ دَارِھَا اَفْضَلُ مِنْ صَلٰتِھِنَ فِیْ مَسْجِدِھَا.

ترجمہ: یعنی عورتوں کی نماز اپنے گھر کے بند کمرہ میں افضل ہے اس سے کہ گھر کے کھلے کمرے میں پڑھی جاویں اوران کی نمازیں گھر کے کھلے کمرے میں افضل ہے مسجد کے مقابلہ میں۔

انہیں مذکورہ بالا نصوص قرآنیہ اوراحادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم اور فقہی روایات کی بناء پر ہم نے اور دوسرے مفتی حضرات نے لکھا ہے کہ مروجہ تبلیغ ودعوت کے لئے عورتوں کا نکلنا یا نکالنا درست نہیں۔ بلکہ اس پرفتن دور میں ناجائز وحرام ہے زمانہ فساد کا ہے اور فساق کا، اکثر عورتیں فیشن پرست ہیں اچھے اچھے لباس، خوشبوجات، زیورات بناؤ سنگار کے ساتھ باہر نکلنے کی عادی ہوگئی ہیں۔ جگہ جگہ بے حیائی وفحاشی کے مناظر، ٹی وی وغیرہ کی کثرت ہے۔ اس میں نکلنے کے بعد اندیشہ فتنہ وفساد غالب ہے جبکہ اصلاحِ نفس اور تعلیم دین کے لئے اس سے آسان طریقے موجود ہیں، عورتیں اپنے محارم کے ذریعہ دینی معلومات حاصل کرسکتی ہیں ہفتہ وار محلّہ کے اہل علم اور ائمہ وخطباء کے ذریعہ تقریر ووعظ اور دینی مسائل و احکام معلوم کرسکتی ہیں اور مشکل اور پیچیدہ مسائل کے لئے جگہ جگہ اور شہر شہر میں دار الافتاء اور مفتی حضرات موجود ہیں اپنے محرم کے ساتھ جاکر مسائل حل کرسکتی ہیں، عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں خواتین دینی تعلیم اس طرح حاصل کرتی تھیں، مسائل واحکام کا حل اس طرح کرتی تھیں، وعظ وتقریر کے لئے کبھی کبھی نبی علیہ الصلوۃ والسلام صحابۂ کرام کو اور صحابیات کو الگ الگ جمع کرکے بیان کیا کرتے تھے اور آپ کے بعد صحابہ کرام نے بھی مستورات کی تعلیم وتبلیغ کے لئے یہی طریقہ اپنایا ہوا تھا۔ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا راستہ ہے، خیر القرون کا طریقہ ہے، یہی صراط مستقیم ہے۔ باقی نئی نئی چیزیں اگرچہ ان میں فوائد نظر آتے ہیں لیکن بے شمار فتنے وفسادات اور دینی خرابیوں کی بناء پر نیز خلاف شرع اور خلاف طریقہ مسنونہ ہونے کی وجہ سے قابل عمل نہیں بلکہ واجب الترک ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو ہدایت نصیب فرمادے اور ہر قسم کی گمراہی سے بچاوے۔

چند شبہات اوراس کے جوابات

پہلا شبہ اوراس کا جواب:

اگر کوئی کہے عورتوں کو اصلاح کی ضرورت ہے اوراس کے لئے دعوت وتبلیغ کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اصلاح کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں مگر عورتوں کو اصلاح کے لئے اس طرح تبلیغ کے لئے نکلنا ضروری نہیں ہے نہ اصلاح اس پر موقوف ہے، کیونکہ جگہ جگہ علماء اور خطباء اور

مصلحین امت موجود ہیں اور ایسی بے شمار مستند کتابیں بازار میں ملتی ہیں کہ انہیں پڑھ کر سمجھ کر وہ اپنی اصلاح کر سکتی ہیں۔ جب اصلاح کے ایسے طریقے موجود ہیں کہ ان میں کسی فتنہ وفساد کا اندیشہ نہیں ہے تو دوسرے پر خطر اور فتنہ وفساد والے طریقوں کا اختیار کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ کیا یہ **غلو فی الدین** نہیں ہے اور فتنے کا دروازہ کو کھولنا نہیں ہے؟

دوسرا شبہ اس کا جواب:

بعض حضرات کہتے ہیں کہ بنوری ٹاؤن کے دارالافتاء کے فتوی کے رد میں دوسرے حضرات نے لکھا ہے کہ عورتوں کی جماعت کے نکلنے میں اچھے نتائج برآمد ہوئے ہیں لہٰذا اس کی اجازت ہونی چاہئے۔؟

اس کا جواب ظاہر ہے کہ فقہاء کرام کا اصول ہے تداوی بالحرام یعنی حرام اشیاء کے ساتھ علاج کے ذریعہ مریض کو اگر شفاء بھی ہوتی ہے، مگر حلال دوا سے اگر علاج ممکن ہو اور اس سے بھی شفا ہو سکتی ہے تو تداوی بالحرام ناجائز اور حرام ہے۔ دیکھئے یہاں صرف نتائج برآمد ہونے کو نہیں دیکھا گیا ہے بلکہ حلال اور جائز طریقہ سے نتائج برآمد ہوئے یا حرام اور ناجائز طریقہ سے برآمد ہوئے اسی کو دیکھا گیا ہے۔

لہٰذا جب عورتوں کا نکلنا خروج من البیت کی ممانعت آیت قرآنی ''وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ'' سے ثابت ہے تو ان کے نکلنے کی اجازت کیسے جائز ہوگی جبکہ اصلاح ان کی گھروں سے نکلے کے بغیر ممکن ہے تو اصلاح کے لئے بھی بلا ضرورت نکلنا پایا گیا جو کہ ناجائز اور حرام ہے۔

تیسرا شبہ اور اس کا جواب:

بعض لوگ کہتے ہیں کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ذریعہ دین کی دعوت وتبلیغ جیسے مردوں پر لازم ہے اس طرح عورتوں پر بھی لازم ہے۔ (لعموم النصوص)

اس کا جواب بھی بالکل واضح ہے کہ مروّجہ تبلیغی جماعت میں صرف چھ نمبروں کا بیان ہوتا ہے امر بالمعروف کے ساتھ نہی عن المنکر کا بیان نہیں ہوتا لہٰذا آیت سے ان کا یہ استدلال درست نہیں ہے دوسرا جواب یہ ہے کہ تبلیغ دین وشریعت، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا عمل فرض کفایہ ہے نہ کہ مروجہ تبلیغ۔

(کما صرح به النوویؒ فی شرح مسلم ص ۵۱، ج ۱ مسلم)

دیکھئے علامہ النوویؒ فرماتے ہیں: کہ امر بالمعرف اور نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے، بعض حضرات اس کو انجام دیں تو سب کی طرف سے کافی ہے سب کو نکلنا ضروری نہیں ہے، لہٰذا مرد حضرات جب تبلیغ دین کے فریضہ کو ادا کر رہے ہیں تو خواتین اس کے لئے کیوں جائیں گی ضرورت تو مرد حضرات سے پوری

ہو جاتی ہے، البتہ ضرورت و حاجت شرعیہ کے لئے وہ گھر سے باہر جا سکتی ہیں لیکن شرائط کے ساتھ اور چونکہ مردوں کے ذریعہ تبلیغ دین کا یہ فرض کفایہ بھی ادا ہو رہا ہے جیسے دیگر فرائض کفایہ نماز جنازہ؟ جہاد فی سبیل اللہ ادا ہو رہے ہیں۔ تو عورتوں کے خروج کی کیا ضرورت ہے، جب ان کو نکلنے کی ضرورت نہیں ہے تو جیسے نماز جنازہ اور جہاد کے لئے نکلنا ان کے لئے جائز نہیں ہے اسی طرح تبلیغ و دعوت کے لئے ان کا نکلنا ناجائز ہوگا۔

چوتھا شبہ اور اس کا ازالہ:

بعض حضرات تبلیغ و دعوت، اور عورتوں کی ضرورت تعلیم و تعلم کے واسطے نکلنے کے جواز پر حدیث (طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة) پیش کرتے ہیں حالانکہ یہ استدلال غلط ہے کیونکہ تحصیل علم کے مختلف ادوار ہیں۔

(الف) بچپن یعنی بلوغ سے قبل لڑکیاں ضروری تعلیم اپنے علاقہ کے مدرسوں میں حاصل کر سکتی ہیں، ضروری فرائض حقوق اللہ اور حقوق الناس اور حقوق الزوج کا علم حاصل کر سکتی ہیں بلوغ کے بعد ضرورت سے زائد علم گھر میں اپنے محارم سے حاصل کر سکتی ہیں۔

(ب) اور اگر قبل البلوغ کسی نے ضروری علم حاصل نہ کیا ہو تو بعد البلوغ محارم سے یا محارم کے ذریعہ اور ان کے واسطے سے ضروری علم حاصل کر سکتی ہیں، مدرسوں میں داخلہ لینا علماء کے پاس جا کر علم حاصل کرنے کے واسطے وہاں ٹھہرنا ضروری نہیں ہے۔ فقہاء کرام نے ان مسائل کی تفصیلات لکھ دی ہیں۔

(ج) قبل البلوغ اگر بچے اور بچیوں کی تعلیم اور ضروری معلومات کے واسطے اگر دینی مکاتب اور مقامی مدارس کا انتظام کیا جاوے تو پانچ چھ سال میں یہ بچیاں اچھی خاصی دینی تعلیمات سے آراستہ ہو سکتی ہیں اگر اسی مدت میں میٹرک تک تعلیم حاصل کر سکتی ہیں تو دینی علم کیوں حاصل نہیں کر سکتیں مگر بات یہ ہے کہ بچیوں کے ماں باپ اور سرپرستو کو ان چیزوں کی طرف توجہ نہیں ہے۔

(د) اور اگر لاشعوری میں زندگی گذر جاتی ہے بڑی عمر میں جا کر بھی دین اور دینی معلومات حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو یا علماء کا بیان اور وعظ سن کر تعلیم کا ارادہ ہو تو اس کے لئے بھی شریعت میں انتظام ہے کہ مقامی علماء، ائمہ کرام اور مؤذنوں، اور مکاتب و مدارس کے اساتذہ جو کہ علماء اور حفاظ ہوتے ہیں ان سے مسائل کا ایک ایک باب مثلاً وضوء کا طریقہ، وضوء کے فرائض، وضو کی سنتیں، غسل اور اس کے فرائض اور سنتیں وغیرہ سیکھی جا سکتی ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے محارم، شوہر، یا باپ بیٹے میں سے کسی کو واسطہ بناوے، پہلے محارم جا کر مسائل سیکھ لیں پھر گھر میں آ کر وہ عورتوں کو سکھا دیں۔ اس طرح تمام ضروری

مسائل کا علم بھی ہوجائے گا اور یاد بھی ہوجائے گا اور عمل بھی آسان ہوگا۔ اس کے لئے تبلیغی سفر کی ضرورت نہ ہوگی، جبکہ بلاضرورت سفر کرنا ان کے لئے ممنوع ہے۔

پانچواں شبہ اور اس کا جواب:

سوال یہ ہے کہ کیا زمانۂ سابق کی طرح عورتیں جہاد میں دوا تیمارداری کے لئے اور مریضوں کی حال پرسی کے لئے نہیں جاسکتیں؟

جواب! اس زمانہ میں عورتیں دوا تیمارداری کرنے اور مجاہدین کے خدمت کے لئے بھی نہیں جاسکتیں لعدم الحاجۃ، پہلے زمانہ میں قِلّت عددِ مسلمانان کے سبب انکے واسطے جہاد میں دوا تیمارداری وغیرہ کے لئے جانا جائز تھا، اب وہ قلت ختم ہوگئی ہے ماشاء اللہ مبلغین و معلمین اور مجاہدین کی کثرت ہے اور ان کے خدام بھی بے شمار ہیں، لہٰذا اس زمانہ میں دوا علاج میں مدد دینے کے لئے عورتوں کا نکلنا جائز نہ ہوگا، چنانچہ فتاوی عالمگیری میں ہے! ولا تخرج الشواب لمداواۃ الجرحیٰ وَسقیِ الماء والطبخ والخبز لأجل الغزاۃ. (ص ۱۹۰ ج ۲)

یعنی مجاہدین کے زخمیوں کے علاج کے لئے اور پانی پلانے کے لئے، کھانا اور روٹی پکانے کے لئے اس زمانہ میں خواتین گھر سے نہیں نکلیں گی، کیونکہ سب ضروریات اب مرد حضرات انجام دے سکتے ہیں اس لئے جوان اور مشتہات خواتین کے نکلنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی، لہٰذا اس قسم کی ضروریات کے بہانے خواتین باہر نہیں جاسکتیں، سفر نہیں کرسکتیں کیونکہ ایسا سفر بلاضرورت ہے، ناجائز ہے، نہ تعلیم وتبلیغ کے نام سے مستوارت کی جماعت جائے گی نہ مبلغین کی خدمت کے نام سے جائیں گی، کیونکہ نصوص وروایات سے سب امور کا ناجائز ہونا معلوم ہوگیا ہے، یہی وجہ ہے کہ کتب فتاوی میں اس کی ممانعت کردی گئی ہے۔ چنانچہ فتاوی عالمگیری میں ہے۔ لاتخرج الشواب لمداواۃ الجرحی الخ.

یعنی مجاہدین کے زخمیوں کے علاج کے لئے اور پانی پلانے کے لئے کھانا اور روٹی پکانے کے لئے اس زمانہ میں عورتیں جہاد کے واسطے نہیں جائیں گی کیونکہ یہ سب ضروریات اب مرد حضرات پورا کرسکتے ہیں لہٰذا جوان عورتوں کا نکلنا ناجائز وحرام ہوا غرض نصوص قرآنی اور احادیث اور روایات فقہیہ کی رو سے تعلیم وتبلیغ اور اصلاح کے واسطے مستورات کی جماعت کا نکلنا ممنوع اور ناجائز معلوم ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اکابرین تبلیغ حضرت مولانا الیاس صاحبؒ، شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ، مولانا یوسف صاحبؒ، مولانا انعام الحسنؒ نے مستورات کی جماعت کا نہ انتظام کیا نہ اس کی طرف توجہ دی بلکہ حضرت مولانا یوسفؒ نے

مستورات کی اصلاح کے واسطے ان کی تعلیم کے واسطے مستقل اور الگ ہدایات دیں۔

چنانچہ آپ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ عورتوں کی تبلیغ کے سلسلہ میں صرف یہ کہا جائے کہ عورتیں دینی کتب پڑھیں پڑھائیں اور دوسروں کو پڑھ کر سنائیں اسلامی رواج کی پوری پابندی کریں ار اپنے متعلقین کو پابندی کرائیں اور اپنے مردوں کو دین سیکھنے کے لئے تبلیغ میں بھیجیں تاکہ وہ جو کچھ سیکھ کر آئیں وہ ان کو بھی سکھائیں ان کو گشت کی قطعاً اجازت نہ دیجائے۔

(سوانح مولانا محمد یوسف کاندھلوی ص ۴۶۲)

جب اکابرین علماء وصلحاء جو تبلیغ وعوت کی فکر کو لے کر چلنے والے تھے اور اس کام کو شروع کرنے والے ہیں انہوں نے قرآن وحدیث اور فقہ کی رو سے ایک چیز (مستورات کی جماعت نکلنے) کو ناجائز سمجھتے ہوئے اس کی اجازت نہیں دی تو دوسرے حضرات جو کہ اہل علم نہیں اہل فقہ وفتاوی نہیں صرف تبلیغ و دعوت ان کا مشغلہ ہے نصوص شرعیہ اور روایات فقہیہ کو دیکھنے یا سمجھنے کی فرصت نہیں ایسے حضرات کی رائے کا کیسے اعتبار کیا جائے، جبکہ اہل علم اہل فقہ وفتاوی کی متفقہ رائے یہ ہے کہ اصلاح اور تعلیم کے واسطے صرف مرد حضرات نکلیں، مستورات کی جماعت نہ نکلے کیونکہ انکا نکلنا بوجہ نصوص وروایات فقہیہ ممنوع وناجائز ہے لہٰذا خواتین ومستورات کے واسطے مرد حضرات گھروں میں، محلوں میں، تعلیم وتبلیغ کا انتظام کریں۔

جماعت مستورات کے بارے میں چند اہم شرعی فتاوی

واضح رہے کہ مستفتی حضرات نے استفتاء میں خواہش ظاہر کی تھی کہ مستورات کی جماعت کے بارے میں دوسرے مفتی حضرات کے فتاوی موجود ہوں تو ان کو بھی نقل کر دیا جائے، لہٰذا یہاں رسالہ ''کشف الغطاء عن تبلیغ النساء'' تالیف مولانا مفتی سیف اللہ صاحب مدظلہم رئیس دارالافتاء دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پاکستان سے چند فتوے درج کئے جارہے ہیں۔ ان سے مسئلہ پر بڑی روشنی پڑے گی۔

(۱) حضرت مفتی اعظم ہند مہتمم مدرسہ امینیہ دہلی مولانا مفتی محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ

سوال: دعوت وتبلیغ کے لئے عورتوں کا نکلنا جائز وناجائز کے بارے میں علماء ومفتیان کرام کیا کہتے ہیں؟

الجواب! تبلیغ دین ہر مسلمان پر بقدر اسکے مبلغ علم کے لازم ہے لیکن تبلیغ کے لئے سفر کرنا ہر مسلمان پر فرض نہیں، بلکہ ان لوگوں پر جو تبلیغ کی اہلیت بھی رکھتے ہوں اور فکر معاش سے فارغ ہوں تبلیغ کے لئے سفر کرنا جائز ہے، فرض لازم ہر مسلمان کے ذمہ نہیں ہے اور عورتوں کا تبلیغ کے لئے گھروں سے نکلنا خیر القرون میں نہ تھا نہ اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے الخ۔

(کفایت المفتی ص ۱۱ ج ۲)

(۲) حضرت مفتی سید مہدی حسن صاحب رحمہ مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند کا فتوی

(۱) سوال: مستورات کی جماعت کے سوال کے بارے میں فرماتے ہیں:

الجواب: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے زمانہ میں تبلیغ کے لئے عورتیں سفر نہ کرتی تھیں اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور نہ صحابہ کرام نے تبلیغ کے لئے عورتوں کو سفر کرنے کا حکم فرمایا نہ خود تبلیغ کے لئے سفر میں روانہ کیا: اس عمل سے ثابت ہوا کہ عورتوں کے ذمہ تبلیغ کے لئے سفر کرنا جائز نہیں۔ خیر القرون کے زمانہ میں اگر کسی عورت کو کسی مسئلہ کی ضرورت ہوتی تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا ازواج مطہرات یا صحابہ کی بیویوں سے دریافت کر لیتی تھی، تبلیغ مردوں کے ذمہ اس زمانہ میں مقرر تھی اور عورتیں پردے کے ذریعہ سے احکام معلوم کر کے دین کی باتیں سیکھتی تھیں، مردوں کا کام یہ تھا کہ وہ اپنی عورتوں کو دین سے واقف کرائیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تبلیغ کے لئے سفر کرتے تھے، جہاد میں جاتے تھے لیکن عام طور پر عورتوں کو اپنے ساتھ نہ لیجاتے تھے۔ جب اس خیر کے زمانہ میں یہ صورتحال رہی تو اس شر اور فتنوں کے زمانہ میں عورتوں کو تبلیغ کے لئے سفر کرنا اگر چہ محرم کے ساتھ کیوں نہ ہو کیونکر جائز ہو سکتا ہے، یہ خیال کہ عورتوں کو کس طرح تبلیغ ہو گی؟ اس بناء پر صحیح نہیں کہ ان کے مردان کو تبلیغ کریں اور دین کے احکام ان کو سکھائیں اور خود مرد دین کی باتیں دوسرے واقف کاروں سے سیکھیں یا سیکھنے اور سکھلانے کے لئے سفر کریں ورنہ عام طور پر عورتوں کا تبلیغ کے لئے سفر کرنا فتنے کا دروازہ کھول دینا ہے، جو آج دنیا پر نظر ڈالنے سے مشاہدہ بھی ہے۔

۲: اپنے اہل وعیال کے نان ونفقہ کا انتظام کرنا مردوں پر ضروری ہے واجب ہے اس کے انتظام سے وقت اگر فارغ ہو تو تبلیغ کے لئے سفر کرنا جائز ہو گا اہل وعیال کو بھوکا چھوڑ کر تبلیغ کے لئے سفر کرنا جائز نہیں۔

شریعت نے تمام مردوں پر تبلیغ کرنے کو فرض اور ضروری نہیں قرار دیا بلکہ انہیں پر تبلیغ کرنے حکم ہے جو تبلیغ کے اہل ہیں اور جو تبلیغ کے اہل نہیں ہیں ان پر تبلیغ کرنا فرض نہیں بلکہ بسا اوقات نا اہلوں کی تبلیغ سے فتنوں کے دروازے اور زیادہ کھل جاتے ہیں، جس کا مشاہدہ ہو رہا ہے اور اس طرح قرآن میں یہ نازل ہوا ہے:

فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ. (توبہ: ۱۲۲)

حدیث میں یہ بے شک وارد ہے:

بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَة وَفِيْ رِوَايَةٍ وَلَوْ كَلِمَة وَفِيْ رِوَايَةٍ وَلَوْ حَرَفًا. (الحدیث)

لیکن یہ حکم عام طور پر مردوں کے لئے ہے نہ عورتوں کے لئے اور جو عورتیں پردہ نشین ہیں دوسری عورتیں یا دوسرے مرد آکر دریافت کر جائیں تو حدیث کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

یہ اس بناء پر کہ عورتوں کو گھر میں رہنے اور پردہ کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا حکم ہے اور بلا ضرورت و مجبوری گھر سے باہر نکلنے اور سفر کرنے سے بتاکید منع فرمایا گیا ہے۔

۳: جواب بالا سے معلوم ہوا کہ تمام مردوں اور عورتوں پر تبلیغ کرنا ضروری نہیں بلکہ جماعت میں سے بعض لوگوں پر فریضہ تبلیغ عائد ہوتا ہے اور وہ وہی لوگ ہیں جو تبلیغ کے اہل ہوں۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہر واقف کار پر فرض اور ضروری ہے ہاں اگر تمام مسلمان تبلیغ دین چھوڑ دیں تو گنہگار ہوں گے، واللہ تعالیٰ سبحانہ اعلم۔

کتبہ سید مہدی حسن غفرلہ
۲۵/۲/۱۳۷۱ھ

(۳) از ہر ہند دار العلوم دیوبند کا دوسرا فتویٰ

از مولانا مفتی حبیب الرحمٰن صاحب:

سوال: کیا مروجہ تبلیغ کے لئے عورتوں کا نکلنا جائز ہے؟

الجواب وباللہ التوفیق: قرآن پاک میں عورتوں کو اپنے گھروں میں رہنے کا حکم دیا گیا ہے، ہاں ضرورت شدیدہ کی بناء پر پردہ کے ساتھ نکلنے کی اجازت دی ہے، پنج وقتہ نماز کے لئے محلّہ کی مسجد میں جانا ممنوع ہے جبکہ وہ سنت مؤکدہ بلکہ واجب کے درجہ پر ہے پھر تبلیغ کے لئے نکلنے کی اجازت کیونکر ہو سکتی ہے جبکہ عورتوں

کو تبلیغ ودعوت کا مکلف شریعت نے نہیں بنایا ہے تعلیم واصلاح کا بہانہ لے کر ادھر ادھر دور دراز اجتماعات میں تبلیغ کے لئے عورتوں کا نکلنا، نکالنا ایک فتنہ کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے، عورتیں اپنے شوہروں سے یا محلہ یا پڑوس کے اہل علم سے پردہ کی پوری رعایت کے ساتھ مسائل واحکام سیکھیں اور آج کے فتنہ وفساد کے دور میں ہرگز تبلیغ کے لئے باہر نہ جائیں نئی رسم کی داغ بیل نہ ڈالیں نہ ڈالنے دیں۔ خیر القرون میں یہ طریقہ رائج نہ تھا، نہ ہی قرآن وحدیث میں اس کا ذکر ملتا ہے اس لئے یہ واجب الترک ہے۔

کتبہ: حبیب الرحمٰن عفا اللہ عنہ
مفتی دار العلوم دیوبند ۱۴۱۹ھ

(۴) مروجہ تبلیغ میں مستورات کی جماعت کے بارے میں مفتی محمد نظام الدین صدر مفتی دار العلوم دیوبند کا فتویٰ:

تحریر فرماتے ہیں:

مروجہ تبلیغ کے لئے عورتوں کا نکلنا اور نکالنا قطعاً ممنوع اور ناجائز ہے، اس مروجہ تبلیغ کا پتہ خیر القرون میں بالکل نہیں ملتا، بلکہ من احدث فی امرنا هذا ما لیس منه فهورد یعنی جس نے ہمارے دین میں کوئی نئی بات ایجاد کی جو دین میں نہیں ہے وہ مردود میں داخل ہے، عزیزم مولانا مفتی حبیب الرحمٰن سلمہ کا جواب بالکل درست ہے۔

کتبہ محمد نظام الدین غفرلہ از دیوبند
۱۹ ارمضان المبارک ۱۴۱۹ھ

(۵) مفتی آگرہ یوپی انڈیا کا فتویٰ:

نسائی تبلیغ کے سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

نحمد ونصلی علی رسولہ الکریم: حدیث شریف میں علامات قیامت میں سے ایک علامت یہ بھی بتائی گئی ہے کہ قیامت کے قریب فتنوں کی جیسے بارش ہونے لگے گی اور یکے بعد دیگر فتنوں کا اس طرح ظہور ہوگا جس طرح تسبیح کا دھاگہ ٹوٹ جانے پر تسبیح کے دانے یکے بعد دیگرے گرنے لگتے ہیں۔ آج کل جبکہ آئے دن ایک تحریک شروع ہوتی ہے ایک نئی جماعت قائم ہوتی ہے، ضرورت ہے کہ عام مسلمان

پوری طرح چوکنا اور ہوشیار رہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث شریف میں پیش گوئی فرمائی ہے کہ میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی جن میں سے صرف ایک فرقہ جنت میں جائے گا بقیہ تمام فرقے دوزخ میں جائیں گے، صحابہ کرام نے دریافت کیا کہ جنت میں جانے والا فرقہ کونسا ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ فرقہ جنت میں جائے گا جو میرے اور میرے اصحاب کے طریقہ پر چلے گا یہ حدیث صحیح طور پر سب کے لئے مشعل راہ ہے اور اسی کی روشنی میں ہمیں حق و ناحق کو سمجھنا پہچاننا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے، کوئی بھی کام ہمیں کتنا ہی اچھا لگے اگر وہ کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک یا حضرات صحابہ کے زمانہ میں نہیں ہوا تھا تو دین و شریعت کے لحاظ سے اسے ہرگز ان حضرات کے طرف منسوب نہ کیا جائے گا۔

اہل زیغ نے ایک گمراہ کن طریقہ کار یہ اختیار کیا کہ بعض آیات قرآنی اور بعض روایات حدیث کا مطلب وہ اپنے عمل اور اپنے طریقہ کار کی تائید میں استعمال کرتے ہیں حالانکہ حضرات مفسرین کرام اور شراح حدیث نے ان آیات و روایات کا وہ مطلب نہیں بیان کیا ہے تو یہ انتہائی خطرناک اور صریح گمراہی ہے۔

مودودی صاحب تو تفسیر بالرائے کی گمراہی میں بہت پہلے سے مبتلا تھے ہی، دیکھا یہ جارہا ہے کہ دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والے بھی اب اس قسم کی غلطیوں میں مبتلا ہوتے جارہے ہیں۔ اور محض اپنی بات میں وزن اور زور پیدا کرنے کے لئے بعض آیات قرآنی اور روایات حدیث کو اپنے مزعومہ مطلب کی تائید کے لئے بے دھڑک پیش کردیتے ہیں۔

تبلیغ کا یہ کام پہلے تو صرف مردوں تک ہی محدود تھا لیکن ادھر پچھلے تقریبا...... سال پہلے سے عورتوں کی جماعتیں بھی تبلیغ کے لئے نکالنے کا ایک غلط اور ناجائز طریقہ شروع کردیا گیا ہے اور اب ادھر بیس پچیس سال سے یہ سلسلہ اور بڑھتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔

اہل دین اصحاب اصلاح و صلاح کی دینی ذمہ داری امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا تقاضا ہے کہ دین و تبلیغ کے نام پر اٹھنے والے اس فتنہ کا سد باب کریں، حدیث شریف میں ہے:

من رأی منکم منکراً فَلْیُغَیِّرْہُ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان، (مشکوٰۃ)

ترجمہ: تم میں سے کوئی برائی اور غلط بات دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے اگر یہ نہ کرسکے تو زبان سے اس کی اصلاح کرلے اور یہ بھی نہ کرسکے تو کم از کم دل سے اسے برا سمجھے یہی ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے زمانہ خیر القرون میں جب کہ دعوت وتبلیغ کی ضرورت اس سے زیادہ تھی اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کی جماعتیں تبلیغ کے لئے کہیں نہیں بھیجیں اس لئے اس زمانہ میں جو لوگ یہ طریقہ کار اپنا رہے ہیں وہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی و نیابت کو یقینی طور پر نظر انداز کر رہے ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور ازواج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو نماز فرض تک کے لئے مسجد میں جانے کو پسند نہیں فرمایا، کیا یہ مروجہ تبلیغ فرض نماز سے بھی بڑھا ہوا کام ہے؟ بڑی خوشی کی بات ہے کہ بعض اصحاب خیر نے اس فتنہ کے سد باب کے لئے ہندوستان کے مستند و مشہور حضرات علمائے کرام و مفتیان عظام کے ان فتووں کی اشاعت کا ارادہ فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بیش از بیش جزائے خیر مرحمت فرمائے اور امت کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

کتبہ: عبدالقدوس رومی مفتی آگرہ شہر انڈیا

(۶) مفتی سعید احمد سابق صدر مفتی مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کا فتویٰ:

سوال: عورتوں کی جماعت برائے تبلیغ و دعوت کے بارے میں مفتیان کرام نے جو رائے دی ہیں درست ہیں یا نہیں؟

الجواب! بندہ کے نزدیک سب جوابات صحیح ہیں۔ اس فتنہ کے زمانہ میں عورتوں کا سفر کرنا بہت سے خطرات کا سبب ہے اس لئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، مقامی طور پر ہر جگہ ان کی تعلیم و تبلیغ پردہ کی رعایت کے ساتھ ہونی چاہئے، سفر اور گشت ان کے لئے ہرگز مناسب نہیں۔ واللہ اعلم

کتبہ: سعید احمد غفرلہ
مفتی مظاہر علوم سہارنپور
۱۰ جمادی الثانی ۱۳۷۰ھ

(۷) مفتی مظفر حسین صاحب صدر مفتی مظاہر علوم وقف سہارنپور یوپی انڈیا کا فتویٰ

استفتاء:

مخدومی و مکرمی حضرت مفتی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، بعد تسلیم ممنون گذارش یہ ہے کہ

حسب ذیل مسائل کا جواب تحریر فرما کر ممنون فرمائیں۔

۱: عورتوں کا عورتوں میں تبلیغ کے لئے گھر سے نکلنا درست ہے یا نہیں؟

۲: چند عورتیں ملکر ایک محلہ سے دوسرے محلہ کی عورتوں میں جا کر کلمہ نماز کی تبلیغ کرتی ہیں اس طرح چند عورتوں کا مل کر جانا بدعت کی وعیدوں میں شامل ہے یا نہیں؟ اور متقدمین کی عورتوں کا اس طرح تبلیغ کرنا ثابت ہے یا نہیں؟

۳: چند عورتوں کا ایک شہر سے دوسرے شہر میں اپنے محرم کے ساتھ تبلیغ کے لئے جانا اور ان میں بعض کے محرم ہوتے ہیں اور بعض کے نہیں ہوتے۔ اس صورت میں جن کے محرم کے ساتھ نہ ہوں ان کا جانا درست ہے یا نہیں؟

۴: مصافحہ کے بعد بعض لوگ سینہ پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں یہ درست ہے یا نہیں ایسا کرنے والا گنہگار تو نہیں ہے؟ (مسائل بندہ محمد سعید دہلوی ۵ جولائی ۱۹۵۲ء)

الجواب! تبلیغ کی اہمیت اور موجودہ دور میں اس کی ضرورت سے انکار نہیں مگر جو حدود اس کے لئے مقرر کردئے گئے ہیں ان سے تجاوز کرنا بھی درست نہیں، تمام احکام شرعیہ میں افراط وتفریط کی سخت ممانعت آیات وروایات میں وارد ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام وتابعین کے زمانہ میں عورتوں کا تبلیغ کے لئے سفر کرنا ثابت نہیں اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سفر کا حکم فرمایا۔ عورتوں کے لئے تو ''وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ'' کے تحت قرار فی البیوت ایک ایسا اہم فریضہ ہے کہ اس کا ثواب جہاد فی سبیل اللہ کے برابر ہے۔

اَخْرَجَ الْبَزَّارُ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ: جِئْنَ النِّسَاءُ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قُلْنَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ذَھَبَ الرِّجَالُ بِالْفَضْلِ وَالْجِھَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ تَعَالٰی فَھَلْ لَنَا مِنْ عَمَلٍ نُدْرِکُ بِہٖ فَضْلَ الْمُجَاھِدِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ تَعَالٰی فَقَالَ عَلَیْہِ السَّلَامُ: مَنْ قَعَدَ فِیْ بَیْتِھَا فَاِنَّھَا تُدْرِکُ عَمَلَ الْمُجَاھِدِیْنِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ.

(روح المعانی ص ٦١ ج ۵)

اس لئے عورتوں کو سفر کرنے کی ممانعت ہے اور بعض ضرورتوں میں خاص شروط مثلاً ترک زینت اور وجود محرم وغیرہ کے ساتھ درست ہے۔ اور جو عورت بلاضرورت اور بلارعایت شروط سفر کرتی ہے اس کی ممانعت بہت سی روایات سے ثابت ہے: قال علیہ الصلوٰۃ و السلام: لا یحل لامراۃٍ تومن باللّٰہ والیوم الآخر ان تسافر مسیرۃ یوم ولیلۃ الا مع ذی محرم (متفق علیہ.)

حج اہم فرض اور عبادت ہے اور شروط کے پائے جانے کے بعد فرض عین ہے۔ مگر اس میں بھی عورت کو بلا محرم سفر کرنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے، البتہ نبی علیہ السلام کے زمانہ میں کسی عورت کو اگر کسی مسئلہ کی ضرورت ہوتی تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لیتی تھی، اس وجہ سے فقہاء نے عورت کو مجلس علم میں حاضر ہونے سے بھی منع کیا ہے اور شوہر کو حق دیا ہے کہ وہ اس کو روک دے، فی الدر المختار: وله منعها من الغزل الى قوله ومن مجلس العلم الا لنازلة امتنع زوجها من سوالها الخ (درمختار ج ۳ طبع ایچ ایم سعید)

عورتوں کی تعلیم کا خیال مردوں کو رکھنا چاہئے لیکن مرد اس کو پورا نہ کر سکے تو پھر احتیاط کے ساتھ مسئلہ وغیرہ پوچھنے کے لئے نکل سکتی ہے، اس فتنہ کے زمانہ میں جبکہ مردوں کے لئے بھی سفر میں مشکلات ہیں تو عورتوں کے سفر میں کس قدر فتنے ہوں گے۔ ابتداء اسلام میں عورتیں خاص شروط کے ساتھ شرعی ضرورتوں میں باہر نکلتی تھیں مگر خیر القرون میں ہی اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ عورتوں کو مساجد میں آنے سے بھی روک دیا جائے، چنانچہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔

لَوْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاٰى مَا اَحْدَثَ النِّسَاءُ لَمَنَعَهُنَّ الْمَسَاجِدَ كَمَا مُنِعَتْ نِسَاءُ بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ. (مسلم)

حضرت ابن عمرؓ نے ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرمایا: کہ اذا یتخذنه دغلا وهو الفساد والخداع. (مسلم ص ۱۸۳ ج ۸) وغیر ذالک.

الغرض نماز جیسی عبادت کہ شہر اور محلّہ کی مسجد میں ادا کیجاتی ہے اور زیادہ دور بھی اس کے لئے نہیں جانا پڑتا۔ خیر القرون میں ہی اس کے لئے مساجد میں آنے سے روک دی گئی تھیں اور مسجد نبوی اور مسجد حرام کے ثواب معہود سے محروم ہو گئی تھیں۔ فقہاء لکھتے ہیں۔

وَلَا يَحْضُرْنَ الْجَمَاعَاتِ، كنز، وَفِى الْبَحْرِ لِقَوْلِهِ تَعَالٰى : وَقَرْنَ فِىْ بُيُوْتِكُنَّ وَقَالَ عَلَيْهِ السَّلَامِ :صَلٰوتُهَا فِىْ قَعْرِبَيْتِهَا اَفْضَلُ مِنْ صَلٰوتِهَا فِىْ صِحْنِ دَارِهَا وَصَلٰوتُهَا فِىْ صِحْنِ دَارِهَا اَفْضَلُ مِنْ صَلٰوتِهَا فِىْ مَسْجِدِهَا وَبُيُوْتُهُنَّ خَيْرٌ لَّهُنَّ وَلِاَنَّهُ لَايُؤْمَنَ الْفِتْنَةَ مِنْ خُرُوْجِهِنَّ اَطْلَقَهُ فَشَمَلَ الشَّابَّةَ وَالْعَجُوْزَ وَالصَّلٰوةَ النَّهَارِيَةَ وَا لَّلَيْلِيَةَ.

قَالَ الْمُصنف: والفتوى عَلَى الْكَرَاهَةِ فِى الصَّلٰوةِ كُلِّهَا وَمَتٰى كُرِهَ حُضُوْرُهُنَّ

الْمَسْجِدَ لِلصَّلٰوةِ فَلَانُ يُكْرَهُ حُضُوْرُهُنَّ مَجَالِسَ الْوَعْظِ خُصُوْصًا عِنْدَ هٰؤُلَاءِ الْجُهَّالِ الَّذِيْنَ تَحَلَّوْا بِحِلْيَةِ الْعُلَمَاءِ اَوْلٰى "ذَكَرَهُ فَخْرُ الْاِسْلَامِ" وَفِيْ فَتْحِ الْقَدِيْرِ: اَلْمُعْتَمَدُ مَنْعُ الْكُلِّ فِي الْكُلِّ اِلَّا الْعَجَائِزَ الْمُتَفَانِيَهِ الخ.

(بحر ص ۳۵۸ شامی ص ۵۹۱ وغیرھا)

(۲) جیسا کہ (۱) میں ہم نے بیان کیا کہ عورتوں کا تبلیغ کے لئے سفر اور گشت کرنا ثابت نہیں اس لئے ایک محلہ سے دوسرے محلہ میں عورتوں کو جماعتیں بنا کر جانا اور گشت کرنا گھر گھر پھرنا اس زمانہ میں فتنہ کا باعث ہے، البتہ اپنے محلہ میں کسی خاص مقام پر پوری احتیاط اور پردے کے ساتھ کبھی کبھی تعلیم ووعظ وتبلیغ کے لئے جمع ہوجائیں تو گنجائش ہے۔

(۳) جیسا کہ ابھی معلوم ہوا کہ یہ سفر ثابت نہیں لیکن اگر سفر کیا جائے اور پوری احتیاط کی جائے تو اس سفر میں ہر عورت کا محرم اس کے ساتھ ہونا ضروری ہے یہ صورت کہ بعض کا محرم سفر میں ساتھ ہوا اور بعض کا نہ ہو یہ ہرگز درست نہیں ہے۔

فقہاء احناف نے تو حج جیسے اہم فریضہ میں بھی ایسی صورت کو جائز نہیں لکھا ہے چہ جائیکہ تبلیغ کے لئے ایسی صورت کو جائز رکھا جائے ایسی صورت میں تنہا سفر کرنے سے زیادہ فتنہ کا اندیشہ ہے۔

وَتُعْتَبَرُ فِي الْمَرْاَةِ اَنْ يَكُوْنَ لَهَا مُحْرِمٌ تَحُجُّ بِهِ اَوْ زَوْجٌ اِذَا كَانَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ مَكَّةَ مَسِيْرَةَ ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ وَقَالَ الشَّافِعِيُّ: يَجُوْزُ لَهَا الْخُرُوْجُ اِذَا خَرَجَتْ رَفْقَةٌ مَعَهَا نِسَاءٌ ثِقَاتٌ لِحُصُوْلِ الْاَمْنِ الْمُرَافِقَةِ وَلَنَا قَوْلُهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: وَلَا تَحُجَّنَّ امْرَاَةٌ اِلَّا وَمَعَهَا مُحْرِمٌ لَهَا وَلِاَنَّهَا بِدُوْنِ الْمُحْرِمِ يُخَافُ عَلَيْهَا الْفِتْنَةُ وَتَزْدَادُ بِانْضِمَامِ غَيْرِهَا (هداية ص ۲۱۳ ج ۱)

۴: مصافحہ کرنا ثابت ہے مگر مصافحہ کے بعد سینہ پر ہاتھ پھیرنا ثابت نہیں اس لئے نہ کرنا چاہئے۔

فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ مظفر حسین مظاہری

مظاہری دار الافتاء مدرسہ مظاہر علوم

سہارنپور یوپی انڈیا ۱۶ اشوال ۱۳۷۱ھ

الجواب صحیح عبد اللطیف

ناظم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور۔

الجواب صحیح: سعید احمد

مفتی مظاہر علوم سہارنپور ۷ اشوال ۱۳۷۱ھ

(۸) استاذ الاساتذہ حضرت مولانا عبدالحق مدظلہ فاضل مظاہر علوم سہارنپور ضلع اٹک کا فتویٰ

تبلیغ نساء کے جملہ فتاوی کو اول سے آخر تک مطالعہ کیا یقیناً یہ فتاویٰ صحیح اقوال اور قوی دلائل پر مشتمل ہیں۔اس پرفتن دور میں عورتوں کا تبلیغ کے لئے نکلنا خواہ جوان ہو یا بوڑھی، قرآن وسنت اور سلف کے اقوال کی رو سے بالکل ناجائز اور حرام ہے اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم الا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیة. کی بنیاد پر ہر خاوند اور صاحب خانہ کو چاہئے کہ وہ اپنے گھر کی عورتوں کی دینی اصلاح کریں جن کے بارے میں وہ قیامت کے دن جوابدہ ہوں گے اپنی اصلاح کے لئے عورتوں کو نکلنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں ہوگی۔

بندہ من وعن تمام فتاویٰ سے بالکل متفق ہوں
عبدالحق فاضل مدرسہ مظاہر علوم
سہارنپور انڈیا ساکن ضلع اٹک

(۹) حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانویؒ سابق صدر دارالافتاء جامعہ اشرفیہ کا فتویٰ

نسائی جماعت برائے تبلیغ ودعوت کے سوال وجواب میں تحریر فرماتے ہیں۔

میں تقریباً سال بھر سے بیمار ہوں ڈاکٹروں اور حکیموں کے زیر علاج ہوں مدرسہ میں سے کسی نے جواب نہ لکھا ہوگا نہ مجھے بتایا تھا کہ میں کسی وقت جواب لکھ دیتا، آیات ولا تبرجن تبرج الجاهلية الاولیٰ اور اس سے پہلے ”وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ“ سے گھر سے نکلنے کی ممانعت ہے سوائے سخت مجبوری کے اور عمر زیادہ ہونے کے، اگر ایسا ہونا اسلامی کام ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اور پھر خیر القرون صحابہ کرامؓ وتابعین کے یہاں بھی ہوتا مگر کہیں نہیں ملتا۔

عورتوں کے گھر سے نکلنے میں جو خطرات ہیں وہ ہر طرح سے نکلنے میں ہیں۔ ہمیشہ عورتوں کے لئے مردوں کا

سن کر نقل کرنا یا محفوظ مکان میں پردہ میں تقریر سننا ہی منقول ہے، اس لئے ایسا کرنا ہو تو ۷۰، ۸۰ سال کی عمر کی قید ضروری ہے کہ ایسی عمر میں التفات نہیں ہوتا فساد کا خطرہ نہیں ہوتا پردہ کی سختی بھی واجب نہیں رہتی۔ فقط واللہ اعلم۔

بندہ جمیل احمد تھانوی غفرلہ

دارالافتاء جامعہ اشرفیہ لاہور

(۱۰) مفتی محمد عیسیٰ رئیس دارالافتاء مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کا فتویٰ

نسائی تبلیغ ودعوت جو کہ ایک قسم جہاد ہے کے سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

الجواب! زمانہ سلف میں عورتوں نے حدیث فقہ اور تفسیر میں بڑا انعام حاصل کیا ہے جن کا استقصاء مشکل ہے۔

تاریخ اور سیر میں جا بجا ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ علمی میدان میں وہ بعض اوقات اور ازمنہ میں مردوں سے بھی سبقت لے گئی ہیں، چاہئے تھا اب بھی ان کی تعلیم وتعلم کے میدان میں رہنمائی کیجاتی اپنے اپنے گھروں اور شہروں میں بآسانی اس مقصد کو حاصل کیا جاسکتا ہے اور تبلیغی میدان صرف مردوں کے لئے زیبا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سوال کے جواب میں عورتوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: **جِهَادُ كُنَّ الْحَجُّ** تمہارا جہاد حج ہے۔ گھروں سے نکل کر عورتوں کے لئے تبلیغ ہوتی تو قرآن وحدیث اس کا واضح ذکر ہوتا جس طرح مردوں کا ذکر ہے۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ. (آل عمران ۱۰۴)

لیکن جہاں ازواج مطہرات کے لئے فرمایا: وَمَا يُتْلٰى فِي بُيُوتِكُنَّ" کی قید لگادی وَ اذْكُرْنَ مَايُتْلٰى فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ. (الاحزاب ۳۴)

یعنی ذکر اور یاد کرو جو تمہارے گھروں میں اللہ تعالیٰ کی آیات اور حکمت پڑھی جاتی ہیں۔

اور اس سلسلہ میں مفتی سیف اللہ حقانی دام مجدہ نے جو حوالے پیش کئے ہیں وہ قابل قدر ہیں اور علماء کرام کے نقل کردہ فتاوی تو بالکل واضح اور صریح ہیں۔

فَجَزَاهُ اللّٰهُ عَنَّا وَعَنْ سَائِرِ الْمُسْلِمِيْنَ آمِيْن.

کتبہ محمد عیسیٰ

مفتی مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

(۱۱) مفتی محمد فرید صاحب دامت برکاتہم صدر مفتی دار العلوم حقانیہ پشاور کا فتویٰ

سوال: مروجہ تبلیغ میں خواتین کی جماعت کا نکلنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب! کیونکہ موجودہ تبلیغ نسواں میں شرائط معتبرہ غیر متیقن ہیں۔ بسا اوقات غیر والد کو والد قرار دیتے ہیں لہٰذا میں اس تبلیغ نسواں کا مخالف ہوں۔

''نیز وہ دوسرے ایک فتوی میں فرماتے ہیں'' کہ مروجہ تبلیغ کا کام سرے ہی سے بدعت حسنہ ہے حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ کے خلیفہ اجل مولانا احتشام الحسن نے لکھا ہے کہ یہ کام مولانا الیاس صاحبؒ کے دور میں بدعت حسنہ تھا ان کے بعد یہ کام اور بھی نیچے گر چکا ہے لہٰذا عورتوں کا تبلیغ کے لئے نکلنا جائز نہیں فتنہ سے خالی نہیں، فقط واللہ اعلم۔

کتبہ احقر محمد فرید غفرلہ

دار العلوم پشاور

(۱۲) دار الافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی پاکستان کا فتویٰ

سوال: کیا فرماتے ہیں اس بارے میں علمائے کرام کہ تبلیغ دین کے لئے عورتوں کی جماعت کا خروج اور اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ عبداللہ کراچی۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب، تبلیغ دین یا مروجہ تبلیغ کے لئے مردوں کی طرح عورتوں کی جماعت کا خروج قرون اولی سے یا کسی نص شرعی یا روایت فقہی سے ثابت نہیں۔ بلکہ عورتوں کے لئے نصوص و روایات کے اندر فرمایا گیا ہے گھروں میں تلاوت قرآن، قرآنی تعلیم اور احادیث کو پڑھنا ان پر عمل کرنا شوہر کے حقوق کو پہچان کر حقوق کو ادا کرنے کا حکم ہے لہٰذا ایسے حالات میں مستورات کی جماعت اس پر فتن دور میں ہرگز جائز نہیں ہے۔

البتہ شوہر کے ساتھ یا شوہر کی اجازت سے محلّہ کے کسی گھر میں وعظ تقریر سننے کے لئے جمع ہو جائیں، وہاں پر کوئی عالمہ عورت یا پردے کے ساتھ کوئی دینی عالم دین کے بارے میں اور احکام و مسائل کے بارے میں بیان کرے تو جائز ہے یہاں تک تو سنت وحدیث سے ثابت ہے کہ مدینہ منورہ کی عورتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں محلّہ کے کسی مکان میں جمع ہو جاتیں اور نبی کریم، صلی اللہ علیہ وسلم اس مکان میں تشریف لیجاتے اور تقریر و وعظ و خطاب سے ان کے دلوں کو منور فرماتے۔

ویسے بدون محرم کے یا محرم کے ساتھ مگر بے پردہ ہو کر یا بن سنور کر اچھے اچھے لباس کے ساتھ جیسا

کہ آج کل کے دور میں معمول اور مشاہدہ ہے نکلنا جائز نہیں ہے۔

مزید یہ کہ مروجہ تبلیغ نہ فرض عین ہے نہ واجب ہے، فی الجملہ تبلیغ دین فرض کفایہ ہے، جس کو بے شمار مرد حضرات مختلف انداز میں مختلف طریقے پر انجام دے رہے ہیں، ان کے ہوتے ہوئے عورتوں کی جماعت کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی، لہٰذا ضروری ہے کہ خواتین گھر پر رہیں، دینی تعلیم اور دینی معلومات گھر پر رہتے ہوئے حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ جماعت کی شکل میں باہر نہ جائیں کیونکہ قرآن حکیم کا واضح حکم یہ ہے وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ جس پر عمل کرنا ضروری اور واجب ہے اسی حکم کے تحت عورتوں کو مسجد کی جماعت، جمعہ کی نماز، عیدین کی نماز، جنازہ کی نماز، تدفین میت، جہاد فی سبیل اللہ، امامت صغریٰ (نمازوں کی امامت) اور امامت کبریٰ (ملک کی حکمرانی) وغیرہ امور اسلامیہ سے سبکدوش کر دیا گیا ہے تا کہ ان کو بلا ضرورت شدیدہ گھر سے باہر جانا نہ پڑے اور چشم غیر سے زیادہ سے زیادہ پوشیدہ رہیں کیونکہ عورت کی ذات اپنی فطرت کے اعتبار سے چھپی رہنے کی چیز ہے چنانچہ ارشاد نبوی ہے۔

اَلْمَرْاَةُ عَوْرَةٌ اِذَا خَرَجَتْ اِسْتَشْرَفَهَا الشَّيْطَانُ. (رواه الطبرانی) ورجاله رجال الصحيح (مجمع الزوائد ص ۳۴ ج ۲)

فقط واللّٰہ اعلم

الجواب صحیح — کتبہ مولانا مفتی انعام الحق نائب مفتی دارالافتاء

محمد عبدالمجید دین پوری غفرلہٗ — جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن

نائب رئیس دارالافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیہ — ۲۸ رمضان ۱۴۱۸ھ

بنوری ٹاؤن کراچی — احقر محمد عبدالقادر

نائب مفتی جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن

واضح رہے کہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کا سابق فتوی جاری کردہ مورخہ ۲۸ رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ بابت نسائی تبلیغ اب بھی وہی ہے کہ مستورات کی جماعت برائے تبلیغ و دعوت بلا ضرورت ہے اور قرآن وحدیث کی رو سے ناجائز اور نادرست ہے۔

وصلى الله على النبی الكريم وآله وأصحابه اجمعين الى يوم الدين فقط والله اعلم.

کتبہ بندہ محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ

دارالافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی۔۵

۱۵ شوال ۱۴۲۰ھ

تبلیغ کی شرعی حیثیت

ضروری استفتاء

بخدمت حضرت مفتی محمد عبدالسلام صاحب چاٹگامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ؛

امابعد یہ کہ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ موجودہ تبلیغ ودعوت کے لئے سفر کرنا اس میں چلہ دینا، وقت لگانا، شریعت کی رو سے فرض ہے یا واجب؟

بندہ ایک ملازم پیشہ آدمی ہے، ماہانہ تنخواہ پر گزر اوقات کرتا ہے، چار بچے اور ایک بیوی ہے، والدین سے الگ ہے، والدین آبائی زمین پر گزارا کرتے ہیں، کبھی کبھی ہم سب بھی کچھ نہ کچھ مانگتے ہیں، حسب گنجائش ان کو بھی دینا پڑتا ہے، ساری تنخواہ ماہ بماہ ختم ہوجاتی ہے، بچتی نہیں بلکہ کم پڑتی ہے، تھوڑ بہت قرض سے گزارا کرلیتا ہے، تنخواہ ملنے پر قرض ادا کردیتا ہے، الحمدللہ پانچ وقت نماز ادا کرنے کی کوشش ہوتی ہے، گھر والی بھی صوم صلوٰۃ کی پابند ہے، بچے دو حفظ وناظرہ میں پڑھتے ہیں اور دو ابھی چھوٹے ہیں۔

ہمارے علاقہ میں جماعت آتی ہے ان کے بیانات سنتا ہوں مسجد میں تبلیغی نصاب کی تعلیم ہوتی ہے اس میں بیٹھنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن چلہ نہیں دے سکتا، وقت نہیں لگا سکتا ہے، کیونکہ جس آدمی کے پاس میری ملازمت ہے وہ خود بریلوی مسلک کا ہے، مسجد کی تعلیم وبیانات میں بیٹھنے کی اجازت تو دیتا ہے، مگر سہ روزہ، چالیس روزہ چلہ کی اجازت نہیں دیتا، وہ کہتا ہے اگر چلہ دینا ہے تو چلے جاؤ آدمی بہت ہیں، ہم اپنا بندوبست کرلینگے، مفتی صاحب! یہاں مجھے جو تنخواہ ملتی ہے وہ میری ضروریات کے لئے تقریبا کافی ہوتی ہے دوسری جگہ ملازمت ملتی ہے لیکن تنخواہ بہت کم ہے میری ضروریات کے لئے ناکافی ہے، پھر اس بندے سے ضرورت کے تحت قرض مانگتا ہوں وہ قرض کے بجائے امداد کردیتے ہیں اس میں میرا بہت فائدہ ہوتا ہے اس لئے میں اس ملازمت کو چھوڑنا نہیں چاہتا، میرا ایک تبلیغی ساتھی ہے وہ مجھے کہتا ہے تم تبلیغ کے لئے چلہ دو، ایمان اور عمل کو ٹھیک کرنے کے لئے اس میں وقت لگانا ضروری ہے۔ بلکہ بزرگ تو بتاتے ہیں کہ تبلیغ میں وقت لگانا فرض ہے، میں جب اس کو اپنا عذر بتاتا ہوں تو وہ مجھے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو مالک حقیقی ہے تم اس پر بھروسہ نہیں کرتے ہو اور مالک مجازی پر بھروسہ کرتے ہو۔

یہ تمہارے ایمان کی کمزوری ہے، تبلیغ میں جائے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا بلکہ ناقص اور کمزور رہتا

ہے، جناب مفتی صاحب! بندہ علمائے کرام کا معتقد ہے اور حضرت مفتی محمودؒ اور مولانا یوسف بنوریؒ کو دیکھا ہوا ہے اور ان کی تقاریر، ان کے بیانات سنے ہیں ان کو اپنا پیشوا اور مقتداء جانتا ہے، مگر اس تبلیغی بھائی کا اصرار ہے کہ تبلیغ میں جانا میرے لئے ضروری ہے، اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا، میں بہت پریشان ہوں کہ کیا کروں؟ بالآخر میں نے ساتھی سے کہا کہ بنوری ٹاؤن کے مفتی حضرات سے پوچھونگا پھر آپ کو جواب دونگا میرا ساتھی کہتا ہے بنوری ٹاؤن کے بعض مفتی بھی تبلیغ کے خلاف ہیں ان سے پوچھنے کے بجائے نہ پوچھنا بہتر ہے، کیا میرے ساتھی کی ساری باتیں از روئے شرع درست ہیں آپ سے گزارش ہے کہ آپ میرے اس تفصیلی خط کا مکمل جواب عنایت فرمائیں گے تاکہ میری پریشانی بھی دور ہو اور مسائل بھی واضح ہو جائیں۔

فقط والسلام

آپ کا تابعدار ایک بندۂ خدا

جمشید روڈ کراچی ۵

الجواب باسمہ تعالیٰ ومنہ الصدق والصواب

واضح رہے کہ مستفتی کے سوالنامہ میں چند باتوں کا استفسار ہے۔

۱: قرآن وحدیث کی روشنی میں تبلیغ مروجہ کی شرعی حیثیت کیا ہے فرض ہے یا واجب؟

۲: تبلیغ مروج میں جائے بغیر ایمان وعمل کی تکمیل ممکن ہے یا ناممکن؟

۳: تبلیغ مروج کے لئے جانا وقت دینا ہر حال میں ضروری ہے؟ ہر شخص کے لئے ضروری ہے یا نہیں؟

۴: سائل کے کچھ حالات ہیں ان کی روشنی اس کے لئے تبلیغ کے لئے نکلنا جبکہ اس میں نقصان کا اندیشہ غالب ہے ضروری ہے یا نہیں؟

۵: بنوری ٹاؤن کے دارالافتاء میں بعض حضرات تبلیغ کے مخالف ہیں یہ بات کہاں تک درست ہے؟

ان سوالات کے جوابات ترتیب وار ملاحظہ فرمائے۔

جواب نمبر ۱، ۲، ۳، ۴، اس بارے میں سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ تبلیغ دین محمدی ﷺ کسے کہتے ہیں اور تبلیغ دین محمد ﷺ اور تبلیغ مروجہ میں کیا فرق ہے؟

اس سلسلہ میں گزارش ہے کہ تبلیغ دین محمدی ﷺ ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کے ساتھ دوسرے ایمانیات ضروریہ کا جاننا اور ان پر خود ہی عمل کرنا اور دوسروں کو یقین وعمل کی دعوت دینا اور ساتھ ساتھ

شریعت اسلامیہ کے دوسرے اوامر (کرنے کی چیزیں) ونواہی (نہ کرنے کی چیزیں) کو جاننا ان پر خود کا عمل کرنا پھر دوسروں کو ایمان ویقین کے ساتھ عمل کی دعوت دینے کا نام ہے، چنانچہ سورۃ العصر کے اندر سب سے پہلے ایمان کا ذکر آیا ہے پھر عمل کا، اس کے بعد وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ اور وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ یعنی دوسرے کو نیکی کا حکم اور صبر کی تلقین کا حکم دیا ہے اور اس میں شریعت کی ساری چیزیں آگئی ہیں، اللہ تعالیٰ نے دین محمد ﷺ کا جو دستور اور جو کتاب نازل فرمائی ہے، اس میں سب سے پہلے آپ ﷺ کو الفاظ قرآن کی تصحیح و تعلیم کا حکم فرمایا پھر تعلیم کتاب یعنی اس کے معانی، احکام، ومسائل کی تعلیم کا حکم فرمایا پھر تعلیم حکمت، قرآنی احکام کی دیگر تفصیلات احادیث کے تحت بیان فرمانے حکم دیا پھر لوگوں کے تزکیۂ اخلاق رزیلہ کا حکم فرمایا ان سب کاموں کے بعد جو لوگ تیار ہوں گے ان کو بھی انہیں امور کی تعلیم وتبلیغ کا حکم دیا ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ الخ یعنی جو بھی چیز دین کے سلسلہ میں آپ کی طرف وحی کی گئی ہے خواہ قرآن کے ذریعہ ہو یا حدیث کے ذریعہ سے ان سب چیزوں کی تعلیم وتبلیغ آپ کے ذمہ ضروری اور واجب قرار دی گئی ہے، ان کی تعلیم تبلیغ نہ کرنے پر وعید سنائی گئی ہے، اس واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال کی مدت رسالت میں پورے دین اور دینی امور کو پہنچانے میں کوئی کسر اور کوتاہی نہیں کی بلکہ پورے کے پورے دین کو پہنچایا اور اس پر صحابۂ کرام سے اقرار لیا اور انکو گواہ بنایا، ''قَالَ: هَلْ بَلَّغْتُ قَالُوْا: بَلَّغْتَ يَارَسُوْلَ اللّٰه'' آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اللہ کے حکم کے مطابق پورے دین اور دینی احکام کو تمہارے تک پہنچایا؟ صحابۂ کرام نے ایک زبان ہو کر فرمایا ہاں آپ اپنے رب کے حکم کے مطابق دین کو ہمارے پاس پہنچایا ہم سب اس پر گواہ ہیں، تو آپ ﷺ جو دین اسلام صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین تک پہنچایا ہے اس کے بنیادی ارکان وفرائض اور اس کے ضروری اوامر ونواہی اور دین سے متعلق سب اعمال کو اپنے مراتب و درجے کے ساتھ امت تک پہنچا دیا، ان کی حدود ابعہ متعین کردی ہیں، اب ان میں نہ کسی فرض یا واجب کا اضافہ ہو سکے گا نہ آپ ﷺ کے بیان کردہ امور میں سے کسی چیز کو گھٹایا جا سکے گا، دین کی ان سب چیزوں کا جاننا، ان پر ایمان لانا، پھر ضروری امور پر عمل کرنا اور ایمان کے خلاف چیزوں سے اجتناب کرنا، جن امور سے روکا گیا ہے ان سے پرہیز کرنا پھر دوسروں تک سب چیزوں کو پہنچانا اس کا نام دین اسلام اور مکمل دین ہے اس کی تعلیمات کی مکمل تعلیم وتبلیغ کرنا مکمل دین اسلام کی تبلیغ کرنا کہلاتا ہے۔

ہر مسلمان کے لئے بقدر طاقت تمام ضروری ایمانیات کا جاننا، ان پر عمل کرنا اور تمام ضروری اعمال کو اختیار کرنا اور ناجائز اعمال سے اپنے آپ کو بچانا ضروری اور واجب ہے، دین کی سب ضروری اور قطعی

چیزوں کو انجام دینا کامل ایمان کی علامت ہے اور بعض کو انجام دینا اور بعض انجام نہ دینا کوتاہی اور ناقص ایمان کی علامت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انہیں سب باتوں کو دیکر مبعوث فرمایا ہے کہ جب تعلیم ہو تو سب چیزوں کی تعلیم ہو، تبلیغ ہو تو سب چیزوں کی تبلیغ ہو۔

اسلام کی کتاب مقدس قرآن کریم کے الفاظ کی تصحیح اور قرأت کی تعلیم جیسے ضروری ہے ایسے ہی معانی قرآن اور تفسیر قرآن کی تعلیم بھی ضروری ہے، جیسے تفسیر قرآن کی تعلیم ضروری ہے ویسے ہی احکام قرآن اور مسائل قرآن کی تعلیم بھی ضروری ہے، ان سب چیزوں کی تعلیم بھی ہو اور تبلیغ بھی ہو، بلکہ صرف تعلیم و تبلیغ کافی نہیں جب تک ان میں اخلاص نہ ہو، عمل نہ ہو، احکام قرآن پر عمل ایسے کیا جائے کہ احسانی کیفیت بھی پیدا ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو دین کے سلسلہ میں تمام امور کے لئے معلم بنا کر بھیجا ہے۔ لہٰذا سب امور دینیہ اور احکام قرآنیہ کی تعلیم و تربیت بقدر طاقت سب کے لئے ضروری ہے، مقاصد نبوت میں سب چیزیں داخل ہیں۔

کہ (۱) تلاوت قرآن اور تصحیح قرآن بھی آپ کرائیں اور (۲) تعلیم معانی قرآن و مفاہیم قرآن بھی آپ کریں، (۳) ان کی تفصیلات و تشریحات بھی حکمت کے ساتھ آپ بیان کریں پھر (۴) ان سب لوگوں کے تزکیۂ اخلاق بھی آپ کریں چنانچہ آپ ﷺ نے ان سب امور کو انجام دیا، جیسا آپ کو حکم فرمایا گیا تھا آپ نے سب امور دینیہ کی تعلیم و تبلیغ فرائض انجام دیئے، بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ کو خوب نبھایا۔

دین اسلام کے ارکان اور فرائض، او امر و نواہی کی تمام تفصیلات کو کھول کھول کر بیان فرمایا اور ان کو عملی جامہ پہنانے کی بھرپور کوشش فرمائی، اسلام اور احکام اسلام کی حدود اربعہ متعین فرمادیں کہ انسان ان حدود اربعہ کے اندر رہ کر مسلمان اور ایماندار بن کر رہے اور خلاف اسلام و ایمان کوئی کام نہ کرے، تاکہ اسلام اور احکام اسلام کی جملہ تعلیمات کو اختیار کرکے وہ دین و دنیا کی صلاح و فلاح حاصل کرکے چاہے مقام صدیقیت حاصل کرے یا مقام شہدائے کو پہنچ جائے، یہ نہ ہو سکے تو کم از کم مقام صالحین کو حاصل کرکے درجۂ کاملین پہنچ جائے یا پھر احکام اسلام کی تعلیم و تبلیغ اور اس کے عمل میں کوتاہی کرکے اپنے اسلام و ایمان کو ناقص اور نامکمل چھوڑ دے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین تلامذہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے آپ ﷺ سے پورے کے پورے دین کی تعلیمات حاصل کیں اور ان کو عملی جامہ پہنایا اور سب باتوں پر نہ صرف یقین کیا بلکہ

ان پر عمل کیا اور دوسروں تک ان تعلیمات نبوی ﷺ کو پہنچایا، جس کی وجہ سے آپ ﷺ نے ان کے لئے طغرۂ امتیاز (خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم) کی سند عطا فرمادی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اپنی رضا وخوشنودی کا اعلان فرمادیا ﴿رضی اللّٰہ عنهم و رضوا عنه﴾ اللہ تعالیٰ ان صحابہ کرام سے راضی ہوگیا اور وہ بھی اللہ سے راضی اور خوش ہوگئے، انہیں دنیا ہی سے صلاح و فلاح اور تقوی کی بشارت مل گئی۔ أولٰئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَأُولٰئِکَ هُمُ الْمُتَّقُوْن.

غرض آپ ﷺ کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہ نے دین اسلام کی تعلیمات اور اس کی نشر و اشاعت اور پورے دین کو اُمت تک پھیلانے کے لئے بڑے مجاہدے کئے، اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسے تلامذہ اور شاگرد عطا کئے، کہ انہوں نے پوری دینی تعلیمات کو نہ صرف قبول کیا، بلکہ ان پر یقین کرتے ہوئے ان کو عملی جامہ پہنانے کی بھرپور کوششیں کیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی کوششوں کو قبول فرمایا، انہیں اخیار کا طغرۂ امتیاز عطا فرمایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کے لئے فرمایا کہ میرے زمانے کے بعد کے لوگ بھی ایمان وعمل کے اعتبار سے خیر میں رہے، زمانۂ نبوت کے قریب ہونے کیوجہ سے دین کی سب خیر وبرکات انہیں نصیب ہوں گی پھر ان کے بعد تابعین رحمہم اللہ اور تبع تابعین رحمہم اللہ کا دور آیا انہوں نے دین اسلام کے جملہ احکام وتعلیمات پر محنت کی، پورے دین پر ایمان لایا، پورے دین پر عمل کیا، اور پورے دین کی تعلیمات کی تعلیم وتبلیغ کر کے دوسروں تک پہنچایا، انہوں نے ایمان وعمل کے اعتبار سے خیر ہی کو پالیا، ان میں شر کا غلبہ نہ ہوسکا، یہ زمانہ بھی خیر القرون میں شامل ہوگیا، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہ کے قریب زمانہ تھا، اس لئے ان کے ایمان وعمل بھی صحابۂ کرام جیسا تھا اور تعلیمات دین اور اس کی تعلیم وتبلیغ کا عمل بھی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہ جیسے انجام دیا۔

غرضیکہ پورے دین کی تعلیمات پر یقین کر کے پھر تعلیمات اور عمل کو جاری رکھ کر ہی دین اور دین کے مطابق صلاح وفلاح حاصل کیجا سکتی ہے ورنہ نہیں، دور نبوت اور دور صحابہ اور دور تابعین وتبع تابعین کے بارے میں آپ ﷺ نے قطعی طور پر اعلان فرمادیا کہ یہ زمانے بالعموم خیر القرون ہیں، آنے والے زمانے میں ایسا زمانوں کہ خیر عام ہو نہیں آئیگا، بلکہ شر پھیلے گا خیر کم ہوجائیگی، ایمان وعمل کمزور ہوجائیگا تاہم جو مسلمان ان میں دین اور دینی تعلیمات کو پوری جاری رکھتے ہوئے اپنے ایمان واعمال کو درست رکھنے کی کوشش کریں گے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تحت پورے دین اسلام کی تعلیم وتبلیغ میں محنت مجاہدہ کریں گے وہ بھی خیر سے محروم نہیں ہوں گے، انہیں بھی صلاح وفلاح مکمل طور پر ملے گی، ان کے ایمان وعمل کو کامل اور مکمل گردانا جائیگا، ایمان وعمل کی برکات وثمرات انہیں حاصل ہوں گی، عمومی خیر نہ

ہوگی مگر جزوی خیر کا معاملہ چلے گا، اور قیامت تک چلے گا اللہ تعالیٰ کا قول ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ تمام ادوار کے مسلمانوں کو شامل ہے کہ جو لوگ پورے دین کی تعلیمات پر یقین کے تحت ان پر عمل کریں گے اور دوسروں تک پورے کے پورے دین کی تعلیمات کو پہنچاتے رہیں گے، نیکیوں کا حکم کریں گے اور برائیوں سے منع کریں گے ان کو بھی نسبت خیر و شرافت حاصل ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ زمانۂ خیر القرون میں سے پہلے دور کے لوگ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہ نے نبی علیہ الصلوٰۃ السلام سے قرآن اور قرآنی علوم کو حاصل کیا ان میں بڑے بڑے حفّاظ وقرّاء تیار ہوئے، مفسر قرآن اور بڑے بڑے فقیہ اور مفتی بنے، پھر اس دین اسلام پر انہوں نے ایسا عمل کیا کہ دین کی ایک ایک چیز کو سیکھا اور اس پر عمل کیا ایمان اور ایمانیت کو حاصل کیا عبادات اور ان کے احکام کو حاصل کیا، پھر ان سب باتوں پر عمل کیا، معاملات اور ان کے احکام کو حاصل کیا، پھر ان پر عمل کیا بیع تجارت کے احکام کو حاصل کیا اور ان پر عمل کیا آداب واخلاق کے احکام کو حاصل کیا ان پر عمل کیا کہ وہ بہتر اخلاق والے بنے شریعت کے خلاف چلنے والوں کو دعوت وتبلیغ کر کے سمجھایا جب انہوں نہ مانا بلکہ اسلام کے خلاف مسلمانوں کے سامنے صف آرا ہوئے تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ علم جہاد بلند کیا انہیں قتل کیا جہنم رسید کیا خود بھی شہید ہوئے، جنت الفردوس کے جاگزیں بنے اور مسلمانوں میں سے جنہوں نے شریعت اور شرعی حدود کے خلاف ورزی کی شریعت کا بند توڑا ان کو سزا دی، زنا میں رجم کیا کوڑے لگائے اور شراب نوشی اور بہتان تراشی پر بھی کوڑے لگائے حدود شرعیہ کی حفاظت فرماتے رہے۔

خلاصہ یہ کہ شریعت کے کسی حکم کو پامال ہونے نہ دیا ان کے بعد تابعین وتبع تابعین نے بھی اسی طرح دین اسلام اور اس کی تعلیمات کو برقرار رکھا ان پر ایمان ویقین کے ساتھ عمل پیرا ہونے کی مکمل کوششیں کیں وہ بھی کامیابی سے ہمکنار ہوکر دنیا سے رخصت ہوگئے، درجہ بدرجہ بعد والے بھی دین اور پوری دینی تعلیمات کو برقرار رکھنے کی کوشش فرماتے رہے، لیکن جس قدر خیر القرون میں کامیابی حاصل ہوئی، اس قدر اب نظر نہیں آتی پھر بھی الحمد اللہ ثم الحمد اللہ دین اسلام کے تمام شعبوں میں کام جاری ہے، درس وتدریس بھی جاری ہے، تعلیم وتبلیغ دین مختلف ذرائع سے اور مختلف طریقوں سے ہو رہی ہے درس و تدریس سے، تقریر وبیان سے، وعظ ونصیحت سے، تالیف وتصنیف سے غرض دین اور دینی تعلیمات کا سلسلہ تسلسل کے ساتھ شروع دن سے الی یومنا ھذا جاری وساری ہے، کہیں انقطاع نہیں ہے، انقطاع ہوگا بھی تو کیونکر؟ جبکہ حق جل مجدہ نے فرمایا ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ الآیۃ

مطلب یہ کہ دین کی بنیادی کتاب قرآن حکیم کو ہم نے ہی نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔

تو جس دین اسلام اور اس کی کتاب اور کتابی احکام وتعلیمات کی حفاظت کی ذمہ داری خود ربُّ العالمین، خالق کائنات، کتاب والے نے لے لی ہے وہ حَیٌّ وَقَیُّوْمُ بھی ہے، اس کی طاقت وقدرت میں کسی قسم کی کمی یا کمزوری نہیں ہے تو اس کی حفاظت میں کیسے کمزوری یا کمی آئے گی، لہٰذا تسلسل کے ساتھ حفاظت قرآن الفاظ ومعانی کے ساتھ تفسیر وتشریح کے ساتھ، ایمان ویقین کے ساتھ، عمل وکردار کے ساتھ رواں دواں ہے اور قیامت قائم ہونے تک حفاظت ہوتی رہے گی، لہٰذا اس دینی تعلیم وتبلیغ کے خلاف کوئی ادنیٰ مسلمان نہیں ہو سکتا ہے، چہ جائیکہ کوئی عالم دین ومفتی اس کی مخالفت کرے، ہاں دشمنان دین، یہود ونصاریٰ اور ان کے پیروکار دین اسلام اور اس کی تعلیمات وتبلیغ ودعوت کے خلاف پہلے سے تھے، اب بھی مخالفت کر سکتے ہیں۔

اس طرح ہمارے اکابرین علمائے دیوبند میں سے حضرت مولانا الیاس صاحب نور اللہ مرقدہ اور ان کے رفقائے کار نے جو جزوی طور پر تعلیم وتبلیغ کا عمل شروع کیا ہے اس کی بھی اپنے اصول وضوابط کے تحت حدود وقیود کے ساتھ کوئی مخالفت نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ بھی اسلام کی تعلیم وتبلیغ کے مختلف ذرائع اور مختلف شعبوں میں سے ایک نیک شعبہ اور اچھا ذریعہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تبلیغ ودعوت اگرچہ پورے دین کی تعلیمات پر مشتمل نہیں ہے، لیکن اسے پورے دین میں آنے کا ایک باب اور دروازہ کہا جا سکتا ہے، ہاں ان بزرگوں کے تعلیم وتبلیغ کے اس عمل کو کوئی فرد یا افراد مکمل دین اور دین کے دیگر شعبے سے صرف نظر کر دیں یا ان میں کسی شعبہ کا انکار کر دیں تو زبردست غلطی اور بہت بڑی گمراہی ہوگی۔

اس تشریح سے پورے دین کی تعلیمات اور اس کی تبلیغ کا معنی اور مروجہ تبلیغ کے عمل میں فرق واضح ہو گیا ہے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقصد بعثت پورے دین کی تعلیم وتبلیغ ہے اور مروّجہ تبلیغ کا مقصد پورے دین کی تعلیم وتبلیغ نہیں ہے، بلکہ اس کے بعض حصے کی تعلیم وتبلیغ ہے جو کہ ذریعہ بن سکتا ہے، پورے دین کے لئے جبکہ کوئی شخص ہمت واصلاح کی نیت سے آگے محنت ومجاہد کو جاری رکھتے ہوئے پورے دین کی کوشش کرے، پورے دین کی تعلیمات کو جاننے اور اس کو حاصل کر کے اس پر عمل کرنے کی سعی کرے اور دوسروں کو بھی ان تعلیمات کی تعلیم وتبلیغ کرے، گویا مکمل تبلیغ دین اسلام اور تبلیغ مروجہ کے درمیان عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے۔

نیز یہ بھی واضح رہے کہ پورے دین کی تعلیمات پر ایمان ویقین ہر مسلمان پر لازم اور ضروری ہے اور بقدر طاقت پورے دین پر اور دین کے تمام شعبوں پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔

جبکہ مروجہ تبلیغ اور اسکی تعلیمات میں سے ضروری حصہ پر عمل ضروری ہے اور مروجہ تبلیغ کے علاوہ دین کے دوسرے ضروری شعبے کی تعلیمات پر ایمان وعمل بھی واجب اور لازم ہے۔

لہٰذا مروجہ تبلیغ میں جانا جبکہ پورے دین کی نیت سے ہو کہ اس میں جانے کے بعد شاید اللہ تعالیٰ پورے دین پر ایمان وعمل کی توفیق عطاء فرمائے گا نہ صرف جائز ہے بلکہ امر مستحسن ہے اور موجب اجر و ثواب ہے، لیکن اس کو مکمل دین سمجھ کر جانا اور وقت لگانا کہ دین کے دوسرے فرائض واجبات پر ایمان و عمل واجب نہیں اس لئے ان سے صرف نظر کرنا تو یہ شدید درجہ غلط اور غلط فہمی ہے بلکہ گمراہی ہے کیونکہ تبلیغ مروجہ میں پورے دین کی تعلیمات کی تعلیم وتبلیغ نہیں ہوتی نہ یہ ممکن ہے، لہٰذا تبلیغ میں چلہؐ وغیر لگانے کے بعد بھی دین کے دوسرے شعبوں پر ایمان وعمل کے بے شمار فرائض وواجبات بندہ کے ذمہ میں رہ جاتے ہیں۔

اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اولاً مروجہ تبلیغ میں جانا فرض وواجب نہیں بلکہ مستحب ہے، وقت ہو، بیوی، بچوں، اور دوسرے حقوق وذمہ داریوں سے فارغ ہو، اور آدمی چلا جاوے تو ثواب ہے، بیوی بچوں اور دوسرے لوگوں کے حقوق کو ضائع کر کے جانا درست نہیں نیز یہ عمل ہر آدمی پر واجب نہیں اور ہر حال میں ضروری نہیں حالات کے تابع ہے۔

لہٰذا آپ کے جو حالات ہیں ان کے روشنی میں آپ کے لئے اس وقت تبلیغ میں جانا نہ ضروری ہے نہ فرض ہے بلکہ نقصان دہ ہے لہٰذا جب حالات بدل جائیں گے مناسب جگہ ملے گی اپنے ذمہ حقوق لازمہ سے فارغ ہونگے تو جانا چاہئے، فی الحال اپنی مسجد کے بیانات اور تبلیغی نصاب کی تعلیم میں بیٹھا کریں اور پیش آنے مسائل مقامی امام صاحب یا دوسرے علمائے دین سے معلوم کر کے زندگی گزاریں، اللہ تعالیٰ چاہے گا تو دین کے لئے بہتر راستہ نکالے گا۔ بس

۵: باقی رہا آپ کے ساتھی کا یہ کہنا کہ بنوری ٹاؤن کے بعض مفتی بھی تبلیغ کے مخالف ہیں اس لئے وہ صحیح مسئلہ نہیں بتائیں گے لہٰذا ان سے پوچھنے سے کچھ فائدہ نہیں ہے، یہ خالص غلط فہمی پر مبنی ہے، دین اور دینی معلومات سے ناواقفیت اور گمراہ کن خیالات ہیں۔

کیونکہ جواب کے شروع میں بندہ نے لکھا ہے کہ دین وتبلیغ دین اپنے وسیع معنی ومفہوم کے لحاظ سے اس پر بقدر طاقت عمل کرنا اور دوسروں کو درجہ بدرجہ بتانا ہر مسلمان پر لازم ہے اور علمائے دین اپنی

اپنی طاقت کے مطابق اپنے اپنے شعبۂ دین میں خدمات انجام دے رہے ہیں اور کوئی بھی اس کا مخالف نہیں ہے۔

دینی جامعات و مدارس عربیہ میں اساتذۂ کرام خدمات انجام دے رہے ہیں، جہاں ایمان اور ایمانیات کی تعلیم ہوتی ہے، عبادات اور عبادات کے احکام و مسائل کی تعلیم ہوتی ہے، معاملات اور معاملات کے احکام کی تعلیم ہوتی ہے، اخلاق اور اخلاقیات کے تمام احکام پڑھائے جاتے ہیں، ان پر بقدر طاقت عمل بھی ہوتا ہے۔ غرض دین کے تمام شعبوں کی تعلیمات و تبلیغ کا انتظام ہے اور طلباء کرام کی تعلیم کے ساتھ تربیت و تزکیہ کا عمل ہوتا ہے، وعظ و تقریر سے تالیف و تصنیف سے اور خانقاہی انداز میں غرض ہر طرح کی تعلیم و تبلیغ کو کوشش ہوتی ہے اور مروجہ تبلیغ کی تائید و نصرت کے لئے اس میں بھی حصہ لیتے ہیں۔

غرض جو علماء اور مفتی حضرات اپنی اپنی طاقت کے مطابق اپنے اپنے شعبے میں پورے دین کی تعلیم و تبلیغ ہی میں لگے ہوئے ہیں، وہ مکمل تبلیغ دین یا مروجہ تبلیغ کے کیسے مخالف ہوں گے کیونکر مخالفت کریں گے؟ لہٰذا نہ وہ پورے دین کی تعلیم و تبلیغ کے مخالف ہیں، نہ تبلیغ مروجہ جو کہ جزوی تعلیم و تبلیغ ہے اور صرف اشیاء ستہ کی تعلیم و تبلیغ ہے اس کے مخالف ہیں، وہ تبلیغ مروجہ کو بھی دین کے دیگر شعبوں کی طرح ایک شعبہ اور ایک حصہ سمجھتے ہیں لہٰذا آپ کے ساتھی کے خیالات بے بنیاد ہیں۔ یا ان فاسد خیالات کے مجموعہ ہے، جو بعض بد دین لوگوں نے تبلیغ میں جا کر عوام کو گمراہ کرنے کے لئے پھیلائے ہوئے ہیں۔

۱: مثلاً بعض بد دین لوگوں نے اس میں یہ خیال اور نظریہ پھیلایا ہے کہ تبلیغ مروجہ فرض عین ہے، اس میں جانا اور اس میں وقت لگانا ہر آدمی کے لئے ہر حال میں فرض اور واجب ہے، ورنہ وہ گناہ گار ہونگے، جہنم میں جائیں گے، جیسا کہ آپ کے ساتھی کے انداز بیان سے بھی یہی معلوم ہو رہا ہے۔

یہ خیال و نظریہ قرآن وحدیث اور روایت فقہیہ اور دلائل عقلیہ کی رو سے غلط بھی ہے اور فاسد بھی، کیونکہ مروجہ تبلیغ پون صدی سے رواج پذیر ہوئی ہے، ہمارے بعض بزرگوں نے اسے عوام الناس کو عام گمراہی سے بچانے اور بے طلب و بے رغبت لوگوں کو دین پر لانے کے لئے تجویز کیا ہے۔

جس کی وجہ سے آج بے شمار لوگ دین کی طرف آرہے ہیں اور اس کی برکات و ثمرات صرف ہندوستان پاکستان میں نہیں بلکہ عالم اسلام اور عالم کفر تک میں نظر آرہے ہیں، ان تمام باتوں کے باوجود اس عمل کو پورے دین کی تعلیم پر مشتمل تبلیغ نہیں کہا جائے گا پھر یہ منصوص چیز نہیں کہی جائی گی بلکہ اس کو دین کی تعلیم کے لئے ایک امر مستحدث اور مفید طریقہ کہا جائیگا۔

۲: دوسرا غلط خیال اور فاسد نظریہ اس میں یہ پھیلایا گیا ہے کہ تبلیغ مروجہ میں جائے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوسکتا۔

یہ خیال بھی قرآن وحدیث اور تجربے ومشاہدے کے اعتبار سے غلط اور فاسد ہے کیونکہ جو عمل ۱۴ صدیوں کے بعد شروع ہوتا ہے وہ دین وایمان کی تکمیل کا سبب کیسے بنے گا، اس پر تکمیل ایمان وعمل کیسے موقوف ہوگا، اس طرح تو پورا دین ہی غلط ثابت ہوجائے گا، عہد نبوی ﷺ سے لے کر تیرہویں صدی تک کے لوگوں کا ایمان وعمل نامکمل قرار پائے گا، جو کہ نصوص وروایت کے صریح خلاف اور باطل خیال ہے۔

۳: تیسری چیز جو بعض بددین لوگوں نے وہاں پر پھیلائی ہے وہ یہ کہ کفار محارب اور منافقین مبارز سے قتال کرنا جہاد کرنا خالص قتل وخونریزی ہے، فساد اور غارتگری ہے۔

مسلمانوں اور اسلام پر اعتراض کرنے والے بے دین لوگ جہاد فی سبیل اللہ کو دہشت گردی قرار دیتے ہیں، یہ بددین لوگ بھی اس جہاد اسلامی کو دہشت گردی کہہ دیتے ہیں۔ **أعاذنا اللہ تعالیٰ عن هذ الخيالات الفاسده** تفصیل طویل ہے کہاں تک ذکر کروں۔

حالانکہ نبی کریم ﷺ نے دین اور اسکی تعلیم وتبلیغ کے لئے اصول بیان کئے ہیں کہ دعوت وتبلیغ کی حد کب تک اور کہاں تک ہے؟ کہ دعوت وتبلیغ کے بعد بھی اگر کفار راہ راست پر نہ آئیں بلکہ دین اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہوں اور مسلمانوں کے خلاف صف آراء ہوجائیں مسلمانوں کے لئے جہاد فی سبیل اللہ فرض اور ضروری ہوجاتا ہے، تاکہ اسلام اور مسلمانوں کا بول بالا ہو اور اللہ کے دین کا غلبہ ہو۔

اسلامی جہاد دینی فریضوں میں سے ایک اہم فریضہ ہے وقت کے لحاظ سے فرض عین، کفایہ، مستحب قرار دیا جاتا ہے۔ مگر اس کا انکار کرنے سے دین کے ضروری حکم کا انکار لازم آتا ہے پھر ایمان کہاں رہتا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس ۲۷ غزوات میں شریک ہوکر لڑائیوں میں حصہ لیا اور دوسری جہادی تحریکوں اور لڑائیوں کے بارے میں احکامات جاری کئے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہ نے جہاد کیا ان میں جو شہید ہوئے ان کے لئے قرآن میں جنت کی بشارت دی گئی اور جو کامیاب ہوکر واپس ہوئے انہیں غازی قرار دیا گیا اور مستحق اجر وثواب قرار دیا ہے۔ اور آپ ﷺ نے واضح الفاظ میں یہ بھی فرمادیا کہ جہاد منسوخ نہیں ہوا ہے بلکہ قیامت قائم ہونے تک جہاد اسلامی جاری رہے گا، ان تمام باتوں کے باوجود اگر کوئی فرد یا جماعت، دینی جماعت کی آڑ میں یہ کہتی ہے کہ جہاد اسلامی دہشت

گردی ہے، قتل وغارت گری ہے، تو یہ دین کے خلاف بہت بڑی سازش ہے، لہٰذا بنوری ٹاؤن کے کسی مفتی صاحب نے اگر تبلیغ میں جانے والوں میں سے کسی دین کے خلاف بیانات دینے والوں کے خلاف کچھ کہا یا لکھا ہے، تو یہ درحقیقت تبلیغ کے خلاف بات ہرگز نہیں ہے، بلکہ بد دین لوگوں کے باطل خیالات اور فاسد نظریات کے خلاف کہا یا لکھا ہوگا، آپ حضرات کو چاہئے کہ دین کی باتوں کو دین کے اصول قرآن وحدیث کے ذریعہ سمجھیں، دین کے وارثوں علمائے حقانی سے سمجھیں، لوگوں کی افواہوں سے دین اور دینی احکام کو سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔

اللہ تعالیٰ تبلیغ وتبلیغی جماعت کے اکابر کو توفیق دے کہ اس میں فاسد نظریات اور باطل خیالات پھیلانے والوں کی خبر لیں، اور انکی اصلاح کی کوشش کریں، ورنہ انہیں تبلیغی جماعت سے الگ رہنے کی ہدایت دیں، ان تفصیلی جوابات سے امید ہے کہ آپ کی پریشانی دور ہو جائے گی اور آپ کی طرح بہت سے لوگ ہوں گے جو غلط فہمی میں مبتلا ہیں، ان کی غلط فہمی بھی انشاء اللہ دور ہو جائے گی، اور ہدایت نصیب ہوگی۔ واللہ الھادی وھو یھدی السبیل.

فقط السلام

کتبہ بندہ محمد عبد السلام دعفا اللہ

۲۹ ذی الحجہ ۱۴۲۱ھ

استفتاء

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عاقلہ و بالغہ کے نکاح کی شرعی حیثیت

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس بارے میں کہ جناب والا کے علم میں ہوگا کہ گذشتہ دنوں میں لاہور ہائی کورٹ نے عاقلہ بالغہ کے اپنی مرضی سے کئے ہوئے شرعی نکاح کو ناجائز اور کالعدم قرار دیتے ہوئے یہ فیصلہ صادر فرمایا ہے کہ کوئی عاقلہ بالغہ لڑکی اپنے ولی سے اجازت لئے بغیر نکاح نہیں کرسکتی، اگر کسی نے اس طرح نکاح کیا تو وہ نکاح ناجائز اور کالعدم ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہمارے جاننے والوں میں بعض لڑکے اور لڑکیاں اپنے ہی خاندان میں والدین سے اجازت لئے بغیر کورٹ میرج کر کے ازدواجی زندگی گذار رہے ہیں اور بعضوں کا اب بھی اس طرح کرنے کا ارادہ ہے جبکہ خاندانی رنجش کی وجہ سے والدین نہیں چاہتے کہ ان کے لڑکے اور لڑکیوں کے باہمی نکاح ہوں، حالانکہ لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان کوئی رنجش یا اختلاف نہیں ہے، وہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں مگر لاہور ہائی کورٹ کے حالیہ فیصلہ کے بعد سب تذبذب کے شکار ہیں۔

ہمارے بعض ساتھی تعلیم یافتہ اور دین سے لگے ہوئے ہیں، ان کا خیال ہے کہ مسئلہ قرآن و حدیث سے متعلق ہے دین کا مسئلہ ہے لہٰذا علمائے دین اور مفتیان شرع متین سے رجوع کرنا چاہئے، اس وجہ سے ہم نے جناب عالی سے رجوع کیا ہے۔

اس سلسلہ میں ہم نے کچھ ترتیب وار سوالات لکھے ہیں ایک تو ان کے جوابات مطلوب ہیں، دوسرے یہ کہ اس سے قبل اس طرح ماں باپ کی اجازت کے بغیر اپنے یا دوسرے خاندان میں جو نکاح ہوئے اور اس کے نتیجے میں اولاد در اولاد بھی ہونے والی ہے ان کے احکام بھی بیان فرمائیں۔

(الف): آیا مسلمان عاقلہ بالغہ لڑکی اپنا نکاح بدون اجازت ولی نہیں کرسکتی؟ اس بارے میں قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کی رو سے کیا حکم ہے؟۔

(ب): بعض دفعہ عاقلہ بالغہ بلکہ تعلیم یافتہ لڑکیاں ۲۰ سے ۳۰ سال تک مناسب رشتے نہ آنے کی وجہ سے یا والدین کی مرضی کے موافق نہ ہونے کی وجہ سے بدون نکاح گھروں میں پڑی رہتی ہیں، جوانی کی عمریں گذر رہی ہوتی ہیں، آیا یہ لڑکیاں اپنے خاندان میں یا غیر خاندان میں ہم پیشہ، ہم مذہب، مالی اعتبار سے برابر یا معمولی اونچ نیچ کے لڑکوں کے ساتھ نکاح بدون اپنے ولی کے نہیں

کرسکتیں؟ اگر نہیں کرسکتیں تو اس کی شرعی وجہ کیا ہے؟

(ج): بعض دفعہ ہر جہت سے برابر کے لڑکے ملتے نہیں مگر بعض چیزوں میں برابر کے ہوتے ہیں اور بعض چیزوں میں نچلے درجے کے ہوتے ہیں، مگر ہوتے ہیں مسلمان، پابند صوم وصلوۃ۔ بلکہ متوسط گھرانے کے ہوتے ہیں شریف اور تعلیم یافتہ ہوتے ہیں کیا بڑے خاندان کی لڑکیاں اپنی مرضی و خوشی سے ان میں سے پسند کے لڑکے کے ساتھ نکاح نہیں کرسکتیں؟ اگر نہیں کرسکتیں تو کیا وہ زندگی بھر نکاح کے بغیر رہیں گی اس بارے میں شریعت کیا کہتی ہے؟

(د): پاکستان میں مختلف اقوام پٹھان، پنجابی، ہندوستانی، سندھی، بلوچی رہتی ہیں، ان کے باہمی کاروباری، سماجی، سیاسی اور مذہبی ارتباط بھی ہیں کیا ان کے لڑکے اور لڑکیاں باہمی رضامندی سے نکاح نہیں کرسکتے جبکہ ولی اس کے مخالف ہوں؟

(ہ): شریعت میں نکاح کے لئے کفو کو ضروری قرار دیا جاتا ہے اس بارے میں شرعی حد کیا ہے؟

(و): جن لڑکیوں کے خاص ولی نہیں ہوتے یا ولی بے پرواہ یا بے دین قسم کے ہوتے ہیں بڑی عمروں کے باوجود لڑکیوں کا نکاح اپنے ذاتی مفاد و منافع کی غرض سے نہیں کرتے ان کے لئے شریعت میں کیا حل ہے؟ آیا وہ اپنی مرضی سے ہم مذہب، ہم پیشہ اور معمولی اونچ نیچ کے لڑکوں سے نکاح کرسکیں گی یا نہیں؟

امید ہے کہ جناب ان سوالوں کے جوابات قرآن وحدیث کی رو سے عنایت فرمائیں گے تاکہ ہمیں قطعی طور پر اپنے فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔

چند احباب گلشن اقبال
نزد سفاری پارک کراچی
۵ جنوری ۱۹۹۷ء

حامداً و مصلّیًا و مسلماً

اما بعد یہ کہ استفتاء کے مستفتی حضرات نے چند ایسے اہم اور ضروری امور سے متعلق سوالات کئے ہیں کہ بجائے خود یہ مسائل توضیح طلب ہیں مگر جن حالات میں اور جس عدالتی فیصلے کے حوالے سے سوالات کئے گئے ہیں اس جہت کو دیکھا جائے تو ان مسائل کا واقعی اور قرآن وسنت کی رو سے شرعی حل کا بتانا ہر اس عالم دین پر جو قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کے فیصلے سے آگاہی رکھتا ہو ضروری اور واجب ہے اور اس میں معاشرہ یا عدالت سے متاثر ہو کر شرعی فیصلے سے عامۃ الناس کو آگاہ نہ کرنا اور اس کو چھپانا

صریح دینی مداہنت اور کتمان حق ہے جس پر بڑی وعیدیں آئی ہیں، نیز موجودہ عدالتوں کے متضاد فیصلوں سے عوام بلکہ بعض خواص میں بھی تشویش پائی جاتی ہے اس تشویش کو دور کرنا بھی ضروری ہے لہٰذا سادہ اور عام فہم الفاظ میں ان مسائل کے مفصل اور مدلل جوابات دیئے جائیں گے چونکہ مستفتی حضرات نے عدالتی فیصلے کی نقل یا اس کے اخباری تراشے وغیرہ کچھ پیش نہیں کئے اس لئے عدالتی فیصلوں کے حوالوں سے کچھ نہیں لکھا جائے گا بلکہ اصل مسائل کے تحقیقی جوابات پیش کئے جائیں گے، قوی امید ہے کہ اس تحقیقی اور مفصل تحریر کے ذریعے بہت سے اشکالات رفع ہوجائیں گے اور یہ مفصل تحریر اصل مسائل کے حل کے لئے بھی انشاء اللہ کافی ووافی ثابت ہوگی۔

الجواب باسمہ تعالیٰ وتوفیقہ

واضح رہے کہ اسلام سے قبل معاشرے میں عورتوں کی حیثیت گھریلو اسباب معیشت سے زیادہ نہ تھی، شادی بیاہ میں اس کا کوئی اختیار نہ تھا، اپنے ماں باپ کی جائیداد ودیگر اموال ومتاع میں اس کا کچھ حق ہونے کا تصور نہ تھا، بلکہ دیگر اموال کی طرح عورتوں کو وراثت میں تقسیم کیا جاتا تھا اور عورتیں ہر طرح کے ظلم وتشدد کا شکار تھیں، غرض ان کے ساتھ انسانیت کا سلوک نہیں کیا جاتا تھا، مگر جب دین اسلام کا سنہرا دور آیا تو اللہ تعالیٰ نے وحی یعنی قرآن وحدیث کے ذریعے ان کی انسانی حیثیت جو کہ روز اول سے انہیں حاصل تھی اجاگر فرمائی۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وخلق منها زوجها وبث منهما رجالا كثيرآ ونساء. الاية

(سورۃ نساء آیت ۱ ۱۱۶ پ ۴)

اور انہیں قرآن وحدیث کی نصوص کے اندر جملہ احکام (ایمانیات، عبادات، معاملات، اخلاقیات و عقوبات) میں اس طرح مکلّف اور پابند ہونے کو فرمایا جیسے مردوں کو۔ اور انہیں اس طرح مخاطب کیا گیا جیسے مردوں کو کیا گیا۔ سورۃ نساء، سورۃ احزاب، سورۃ بقرہ، سورہ المومنون، سورہ طلاق کی آیات اس سلسلہ میں واضح ثبوت ہیں۔

غرضیکہ دین اسلام نے قرآن واحادیث کے ذریعہ جس طرح مردوں کے لئے احکام دیئے عورتوں کیلئے بھی دیئے، جس طرح مردوں کے واسطے عورتوں پر بعض حقوق ہونے کو بیان کیا ہے اسی طرح مردوں پر عورتوں کے واسطے کچھ حقوق کے واجب ہونے کو بیان کیا ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف وللرجال علیهن درجة والله عزیز حکیم.
(البقرہ ۲۲۸)

ترجمہ: ''اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے دستور کے موافق اور مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے۔ اور اللہ زبردست ہے تدبیر والا۔''

تشریح: یعنی یہ امر تو حق ہے کہ جیسے مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں ایسے ہی عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں جن کا قاعدہ کے موافق ادا کرنا ہر ایک پر ضروری ہے۔ تو اب مرد کو عورت کے ساتھ بدسلوکی اور اس کی ہر قسم کی حق تلفی ممنوع ہوگی، مگر ان حقائق کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ مردوں کو عورتوں پر فوقیت اور فضیلت ہے اس لئے عدت میں رجوع کا اختیار مرد کو ہوگا نہ کہ عورت کو۔ پھر بعض تخلیقی و فطری امور میں چونکہ اللہ نے عورتوں کو ضعیف اور کمزور بنایا ہے اور مردوں کو عورتوں پر برتری اور فوقیت دی ہے اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر سرپرست اور نگراں مقرر کیا ہے۔ چنانچہ حق جل مجدہ کا ارشاد ہے۔

الرجال قوامون علی النساء بما فضل الله بعضهم علی بعض وبما انفقوا من اموالهم. الآیة (بقرہ ۳۴)

ترجمہ: ''مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس واسطے کہ بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر اور اس واسطے کہ خرچ کئے انہوں نے اپنے مال۔''

مردوں کو عورتوں پر نگراں اور سرپرست بنانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ عورتوں پر ظلم و تشدد، جبر و زیادتی کو جائز قرار دیا جائے یا ان کے جائز حق خود ارادی کو مطلقاً سلب کر لیا جائے بلکہ اس سرپرستی کا مقصد وحید یہ ہے کہ عورتوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے اور ان کے حقوق میں سے کوئی جائز حق ضائع نہ ہو اور عورتوں کی فطری و تخلیقی کمزوریوں کا مداوا ہو جائے اور یہ کہ ان کی جسمانی ساخت کے ضعف اور قویٰ کی کمزوری کی بناء پر دوسرا ان کے شرعی و انسانی حقوق پر کوئی ناجائز اور خلاف شرع، خلاف عدل ڈاکہ نہ ڈالے۔

اسی واسطے کوئی شخص خواہ باپ یا دادا ہی کیوں نہ ہو بالغ عورت کو کسی شخص کے ساتھ نکاح پر مجبور نہیں کر سکتا اس کی ملکیت پر غاصبانہ تصرف نہیں کر سکتا اگر وہ اپنی عاقلہ بالغہ لڑکی کا نکاح اسکی اجازت کے بغیر جبراً کر بھی دیتا ہے تو یہ نکاح عورت کی اجازت پر موقوف رہے گا، نکاح کی مجلس میں اگر عورت اجازت دے گی تو نکاح منعقد ہوگا ورنہ کالعدم اور باطل ہوگا۔ اسی طرح ولی اگر بالغ لڑکی کی ذاتی املاک میں بلا

ضرورت شدیدہ غاصبانہ تصرف کرتا ہے تو وہ گنہگار اور مجرم قرار پاتا ہے۔ اسی طرح شوہر نے اگر اپنی عورت کو طلاق دی اور اس کی عدت گزر گئی تو اب وہ عورت اپنی ذات کے حق میں خود مختار ہے، چاہے کسی سے نکاح کرے یا نکاح نہ کرے۔ اس عورت کے سرپرست کو اس بات کا اختیار نہیں کہ وہ عورت کو دوسری شادی سے روکے، یا عورت اگر نکاح نہ کرنا چاہے تو اس کے باوجود اس کا نکاح کسی مرد سے زبردستی کردے۔

یہی حال اس کے حق وراثت کا ہے کہ عورت تنہا اس کی مختار ہے چاہے اسے وصول کر کے فروخت کردے یا کسی کو ہبہ کردے یا جائز طور پر وصیت کردے یا صدقہ کردے یا وہ اس کو سرے سے لینے کے بجائے کسی وارث کو بخش دے یا بطور عاریت دے دے غرض یہ کہ عاقل و بالغ عورت اپنے مال اور ذات کے بارے میں بالکل آزاد اور خود مختار ہے۔

عورت کو اس کا سرپرست اس کی افادیت اور مضرت والے امور میں مشورہ دے سکتا ہے رہنمائی کرسکتا ہے مگر کسی معاملہ میں وہ جبر و اکراہ سے کام نہیں لے سکتا۔ اور اسی بات کا شرافت انسانی تقاضا بھی کرتی ہے کیونکہ مرد کی طرح عورت بھی انسان ہے، انسانیت میں دونوں برابر کے شریک ہیں اور انسانی حقوق میں دونوں برابر ہیں۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ قرآن وحدیث کی نصوص اور عقل و تجربے کی رو سے عورت مرد کے مقابلہ میں ضعیف اور کمزور ہے وہ ناقصة العقل ہے اس بناء پر اللہ تعالیٰ نے اس کی کمزوری اور ضعیفی کے تدارک کے لئے مرد کو اس کا سرپرست اور نگران مقرر کیا ہے۔

اگر مردوں کی نگرانی سے عورتوں کو بالکل آزاد کردیا جائے تو تجربے اور مشاہدے سے بھی یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ انسانی معاشرہ کے لئے خطرہ عظیم بن سکتا ہے جس سے معاشرہ میں فساد، خون ریزی اور طرح طرح کے فتنے پیدا ہونا لازمی امر ہے، اس واسطے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے عورتوں کے لئے انسانی حقوق کو بیان کرتے ہوئے انہیں بالکل آزاد نہیں چھوڑا بلکہ ان پر مردوں کو حاکم اور سرپرست مقرر کردیا تا کہ ان کی ممکنہ بے اعتدالی کو روکا جاسکے اور ممکنہ خطرات و فسادات سے خود ان کو اور معاشرہ کو بچایا جاسکے۔ اس تمہید کے بعد اب آیئے زیر بحث مسائل کے جوابات ملاحظہ فرمائیے۔

جواب نمبرا: پہلا سوال اور اس کے چاروں حصوں کا خلاصہ یہ ہے کہ عاقلہ بالغہ عورت بذات خود برابر کے خاندان میں نکاح کا اختیار رکھتی ہے یا نہیں؟ اس بارے میں قرآن وحدیث کی رو سے کچھ تفصیلات ہیں جن پر تفصیلی بحث انشاء اللہ آئندہ صفحات میں کی جائے گی یہاں اس کے بارے میں اسلام کے قرون

اولیٰ، ثانیہ وثالثہ کے ماہرین کی تحقیق اوران کے موقف کو پھران کے دلائل کو قرآن وحدیث سے تحریر کیا جاتا ہے تا کہ علی وجہ البصیرت مسئلوں کو سمجھنے میں مدد ملے۔

اہل السنّت والجماعت کے ائمہ اربعہ کا مذہب

(الف): امام مالکؒ، امام شافعیؒ اورامام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ عورت خواہ عاقلہ وبالغہ ہی کیوں نہ ہو براہ راست اپنا نکاح نہیں کر سکتی نہ کسی دوسری عورت کا نکاح کرا سکتی ہے، بلکہ عورتوں کے نکاح کا اختیار ولی کو ہوتا ہے یعنی والد، دادا یا دوسرے قریبی رشتہ دار جن کی تفصیلات کتب فقہ میں موجود ہیں البتہ عاقلہ بالغہ عورت کی رضامندی بہرحال ضروری ہے ان کی رضامندی کے بغیر ولی ان کا نکاح نہیں کراسکتا خواہ باپ دادا ہی کیوں نہ ہو۔

بالفرض ولی نے ایک عاقلہ وبالغہ عورت کا نکاح اس کی اجازت ورضامندی کے بغیر کردیا ہے تو یہ نکاح عورت کی اجازت پر موقوف رہے گا، اگر اطلاع پر اس نے رضامندی ظاہر کردی تو نکاح درست تسلیم کیا جائے گا اور اگر اس نے نکاح کو مسترد کردیا تو اس کو کالعدم اور باطل سمجھا جائے گا۔

(ب): امام ابوحنیفہؒ، سفیان ثوریؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ (آخری قول کے مطابق) فرماتے ہیں کہ آزاد اور عاقلہ وبالغہ عورت، خواہ وہ کنواری ہو یا شادہ شدہ، مطلقہ ہو یا بیوہ ہو، بہرصورت اس کو اپنے برابر کے خاندان میں نکاح کرنے کا اختیار ہے، خواہ ولی کی رضامندی ہو یا اس کی رضامندی کے بغیر۔ البتہ ولی کے توسط سے اس کی نگرانی اور سرپرستی میں اور اس کی رضامندی سے نکاح ہونا مسنون طریقہ ہے اور یہ افضل ہے، مگر کسی وجہ سے اگر ایسا نہ ہوسکا اور عاقلہ بالغہ عورت نے بدون اجازت ولی کے اپنے کفو یعنی برابر کے خاندان میں کسی دینی یا دنیوی مصلحت سے نکاح کرلیا ہے تو یہ نکاح منعقد ہے اور لازم ہے ایسے موقع پر ولی کو چاہیئے کہ وہ بھی نکاح کی موافقت کرے یعنی نکاح کی اجازت دے دے مخالفت نہ کرے، لڑکی کی جانب سے غلطی کی وجہ سے اس کو انا کا مسئلہ نہ بنائے کیونکہ ایسے موقع پر ولی کو حق اعتراض نہیں ہوتا نہ ایسا کرنے سے کچھ فائدہ ہوتا ہے، بلکہ اس نکاح کو ختم کرنے کی کوشش سے دو خاندانوں میں جو رشتہ نکاح قائم ہوگیا ہے، ان میں بلا کسی شرعی وجہ کے سخت دشمنی پیدا ہوجاتی ہے اور مختلف قسم کے فتنے اور فسادات برپا ہوتے ہیں، اس لئے اسی کو عافیت اور مصلحت سمجھ کر خاموشی سے اس نکاح کو غنیمت سمجھے اور اس غیر معروف اور غیر مہذبانہ فعل کو اپنی کوتاہی اور اولاد کی ناقص تربیت ونگرانی تصور کرے اور خدا سے معافی کی درخواست کرے۔

کیونکہ اس طرح کا نکاح منعقد ہو جانے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ نکاح کا اصل اختیار عورت کو حاصل ہے۔ اس نے کسی مصلحت سے اپنے جائز حق کو استعمال کیا ہے اور ولی کو جو اختیار حاصل ہے وہ ولایت ناقصہ اور ولایت ضعیفہ کے تحت ہے جو کہ بہت ہی ناقص اور کمزور ہوتی ہے، لہٰذا برابر کے مرد کے ساتھ انعقاد نکاح کے بارے میں ولی کو اعتراض کا حق نہ ہوگا نہ فسخ نکاح کا اختیار ہوگا۔

ہاں عورت نے چونکہ اپنے سرپرست اور نگران ولی کی ولایت نکاح (جو کہ استحباب کے درجہ میں ہے) کی کوئی رعایت کی اس لئے ایسے نکاح کو شرعاً وعرفاً معاشرہ میں مکروہ اور برا سمجھا جائے گا، اس کو ایک گونہ بے حیائی تصور کیا جائے گا، لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس طرح نکاح کرنے والے مرد اور عورت دونوں پر حقوق نکاح عائد ہوں گے اور ان پر احکام نکاح لاگو ہوں گے۔ اس کے بعد فریقین میں سے کوئی فریق اگر اس نکاح کو ختم کرنا چاہے تو اگر وہ فریق مرد ہو اسے طلاق دینی پڑے گی اور عورت ہو تو اسے شوہر سے خلع حاصل کرنا پڑے گا۔ اگر شوہر خلع اور طلاق پر راضی نہ ہو تو عدالت میں نکاح توڑنے کی معقول وجوہ دو گواہوں سے ثابت کر کے نکاح کو توڑنے کی کوشش کرنی پڑے گی نکاح فسخ کرانا پڑے گا۔ اس کے بغیر نکاح ختم نہ ہوگا۔

۲: عاقلہ بالغہ عورت نے بدون اجازت ولی اگر نکاح کسی غیر کفو یعنی اپنے برابر کے خاندان میں نہیں کیا بلکہ دینی لحاظ سے یا نسب وشرافت کے لحاظ سے یا پیشہ اور مالداری کے اعتبار سے کسی کم تر مرد سے نکاح کیا ہے یا مہر مثل سے کم مقدار میں نکاح کیا ہے تو ایسے حالات میں چونکہ مرد اور عورت دونوں عاقل وبالغ ہیں اور بنیادی طور سے شرعی ضابطے کو پورا کر کے نکاح کیا ہے تو احناف کی ظاہر روایت میں نکاح اس میں بھی منعقد ہو جائے گا، البتہ ولی کو حق اعتراض رہے گا اور عدالت کے ذریعے اگر چاہے اس نکاح کو ختم کرا سکے گا اور احناف کی غیر ظاہر روایت، جس پر بعض متاخرین مشائخ نے فتویٰ بھی دیا ہے، یہ ہے، کہ ایسا نکاح سرے سے منعقد ہی نہیں ہوگا اس پر احکام نکاح لاگو نہ ہوں گے نہ ان میں سے کسی پر حقوق عائد ہوں گے۔ ایسے جوڑوں کو اپنی مرضی سے دوسری جگہ رشتے کرنے کی اجازت ہوگی، چونکہ احناف کی ظاہر روایت کے مطابق عاقلہ بالغہ عورت کا نکاح غیر کفوء میں اور بدون اجازت ولی کے منعقد ہو جاتا ہے، لہٰذا ایسے جوڑے پر احکام نکاح عائد ہوں گے کیونکہ یہ دونوں افراد ایک تو عاقل وبالغ ہیں، دوسرے یہ کہ ان کو بحیثیت انسان کے اپنے مال میں اور اپنی ذات میں ولایت واختیار حاصل ہے، اور انہوں نے انعقاد نکاح کی بنیادی چیزوں (یعنی ایجاب وقبول) کو گواہوں کے سامنے استعمال کیا ہے، لہٰذا نکاح تو بہر حال منعقد ہو جائے گا۔ البتہ

عورت نے یہاں شرعی اور عرفی لحاظ سے دو بڑی غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے۔

ا: اس نے غیر شرعی طریقہ استعمال کیا ہے، ولی کے توسط اور اس کی سرپرستی میں نکاح نہیں کیا، جو کہ غیر مہذبانہ اور غیر معروف طریقہ ہے۔

۲: دوسری غلطی اس نے یہ کی ہے کہ غیر کفو میں نکاح کیا ہے، جس سے خاندانی رو سے ولی کی بے عزتی اور بے حرمتی ہوئی ہے، لہٰذا اس کی تلافی کے واسطے ولی کو حق ہوگا کہ اس نکاح میں سوچے اور غور کرے اگر وہ غور وفکر کر کے سمجھے کہ یہ نکاح اگرچہ غیر شرعی طریقہ سے ہوا ہے اور اس میں ایک گونہ ہماری بے عزتی بھی ہوئی ہے، مگر چونکہ لڑکے کے اندر بہت سے خوبیاں ایسی موجود ہیں کہ اس نکاح کو برقرار رکھا جاسکے تو وہ اس نکاح کو برقرار رکھ سکتا ہے اور اس نکاح کو فسخ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اور اگر وہ غور وفکر کے بعد یہ سمجھے کہ اس نکاح کو ختم کرنا ضروری ہے تو بذریعہ عدالت لڑکے کے غیر کفو ہونے کو عدالت میں دو گواہوں سے ثابت کر کے نکاح فسخ کرا سکتا ہے اس میں کسی فریق کے لئے کچھ نقصان بھی خاص نہیں ہوتا اور ہر فریق کو سوچنے اور غور کرنے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔

ظاہر روایت کے مطابق جب تک بذریعہ عدالت نکاح فسخ نہیں کیا جاتا تب تک چونکہ نکاح برقرار ہے، لہٰذا اس دوران زوجین کے درمیان اگر تعلقات قائم ہوئے ہیں تو اسے جائز تعلق کہا جائے گا، شوہر نے اگر طلاق دی تو اس کے ذمہ پورا حق مہر ادا کرنا ہوگا اور اگر زوجین نے خلع کیا تو حق مہر ساقط ہو جائے گا، ہاں لڑکی کے ولی نے اگر نکاح فسخ کرا لیا ہے تو قبل الدخول (میاں بیوی کے درمیان ازدواجی تعلقات قائم ہونے سے قبل) فسخ ہونے کی صورت میں حق مہر ساقط ہے کیونکہ ولی نے نکاح فسخ کرایا ہے وہ اس کا ذمہ دار ہے اور بعد الدخول (یعنی ازدواجی تعلقات قائم ہو جانے کے بعد) نکاح فسخ ہونے کی صورت میں مکمل حق مہر واجب ہوگا، البتہ غیر ظاہر الروایہ رحمۃ اللہ میں حسن بن زیاد رحمۃ اللہ کی روایت کے مطابق چونکہ نکاح سرے سے منعقد ہی نہیں ہوا ہے اس لئے عورت کو نہ طلاق کی ضرورت ہے نہ خلع حاصل کرنے کیلئے ولی کے ذمہ عدالت میں جانے کی ضرورت ہے نہ ہی فسخ نکاح کی حاجت ہے، اکثر متاخرین فقہاء نے اس پر فتویٰ دیا ہے جب کہ متاخرین میں سے بعض دوسرے فقہاء نے ظاہر الروایہ پر فتویٰ دیا ہے ہمارے اکابرین احناف سے دونوں قسم کے فتوے منقول ہیں۔ کما فی البحر۔ ایسے ہی اکابر علماء دیوبند سے بھی دونوں قسم کے فتوے منقول ہیں چنانچہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ کا طریقہ راقم الحروف نے پچیس سال تک یہی دیکھا

ہے کہ وہ جب خود فتوی تحریر فرماتے تو غیر ظاہر الروایۃ پر فتوی دیتے مگر دوسرے رفقاء فتوی تحریر کرتے تو ان تمام فتوؤں پر تصدیقی دستخط فرماتے جو کہ ظاہر الروایۃ کے مطابق ہوتے یعنی نکاح منعقد ہونے اور ولی کو بذریعہ عدالت فسخ کرانے کو کہا جاتا۔ اکثر متاخرین مشائخ کے فتوی کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ جن حالات میں اکثر مشائخ نے فتوی غیر ظاہر الروایۃ کے مطابق دیا ہے وہ موجودہ زمانے سے مختلف تھے اب تو عدالت کے طریقے سے لڑکی کے اولیاء کیسے ناواقف ہوں گے جب کہ خود لڑکیاں عدالت میں جاکر نکاح کرلیتی ہیں لہٰذا غیر کفو میں نکاح ہونے کی صورت میں اولیاء اگر اس نکاح پر راضی نہ ہوں تو انہیں بذریعہ عدالت نکاح فسخ کرانے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی، نہایت آسانی کے ساتھ لڑکے کے غیر کفو ہونے کو ثابت کر کے نکاح فسخ کرا سکتے ہیں ہمارے اکابر کے دونوں طرح کے فتوے ہیں لہٰذا دونوں طرح کے فتوے دینے کی گنجائش ہے۔

غرض اس تقریر میں استفتاء کے سوالات میں سے چار سوالات کے جوابات آگئے ہیں کہ فقہاء شافعیہ وغیرہ کے نزدیک عاقلہ بالغہ عورت کا خود نکاح ناجائز ہے۔ فقہاء احناف وغیرہ کے نزدیک جائز ہے، ہمارے یہاں چونکہ فقہ حنفی کے ماننے والوں کی اکثریت ہے اس اعتبار سے ان کے لئے حکم ہے کہ نکاح منعقد ہے اور صحیح ہے۔ فقہاء احناف کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اب دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور احمدؒ وغیرہم فرماتے ہیں کہ

(۱) قرآن حکیم کے اندر حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: نکحوا الا یامی منکم والصالحین من عبادکم وإمائکم ان یکونوا فقراء یغنهم الله من فضله والله واسع علیم.

(نور. ۳۲)

ترجمہ: ''اور نکاح کردو رانڈوں کا اپنے اندر اور جو نیک ہوں تمہارے غلام اور لونڈیاں، اگر ہوں گے مفلس اللہ ان کو غنی کردے گا اپنے فضل سے اور اللہ کشائش والا ہے، سب کچھ جانتا ہے۔''

آیت مذکورہ کے اندر عورتوں کے اولیاء اور سرپرستوں کو خطاب کیا گیا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ اے عورتوں کے سرپرستو! تم اپنی ماتحت عورتوں کا نکاح کردیا کرو۔ عورتوں سے نہیں کہا گیا کہ عورتیں خود اپنے نکاح کرلیا کریں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ عورت کو نکاح کا اختیار نہیں ہے خواہ عاقلہ و بالغہ ہی کیوں نہ ہو۔

(۲) قرآن حکیم کے اندر دوسری جگہ پر حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: **واذا طلقتم النساء فبلغن اجلهن فلا تعضلوهن ان ينكحن ازواجهن اذاترا ضوا بينهم بالمعروف.**

(بقرہ ۲۳۲)

ترجمہ: ''جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر پوری کر چکیں اپنی عدت تو اب نہ روکو ان کو اس سے کہ نکاح کرلیں اپنے خاوندوں سے جب کہ راضی ہو جاویں آپس میں موافق دستور کے۔''

اس آیت مذکورہ میں بھی اولیاء اور سابق شوہروں کو اس بات سے منع اور روکا گیا ہے کہ بے شوہر عورتیں اگر کسی مناسب جگہ پر نکاح کرنا چاہیں، خواہ کنواری ہو یا شادی کے بعد طلاق ہوئی ہو اور عدت بھی گذر گئی ہے، ان کو نکاح کرنے سے نہ روکا جائے بلکہ انہیں نکاح کے لئے اجازت دی جائے جس کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ عورتوں کے نکاح کے بارے میں ولی کو نکاح کی اجازت دینے اور روکنے کا اختیار ہوتا ہے نیز یہ کہ اولیاء کی اجازت کے بغیر ان کا نکاح نہیں ہو سکتا ہے۔

احادیث میں سے یہ حضرات یہ دلائل پیش کرتے ہیں۔ مثلاً

(۳): **عن ابی هريرة رضی الله تعالیٰ عنه ان رسول الله صلی الله عليه وسلم قال: لاتنكح الايم حتى تستامر ولا تنكح البكر حتى تستاذن قالوا يا رسول الله! كيف اذنها قال: ان تسكت.** (رواہ مسلم ج ۱ ص ۴۵۵)

ترجمہ: ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بے شوہر عورتوں کا نکاح اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک ان سے مشورہ نہ لیا جائے اور کنواری کا اس وقت تک نکاح نہ کیا جائے جب تک ان سے اجازت نہ لی جائے''۔

صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ان سے اجازت کی کیا صورت ہوگی تو آپ نے فرمایا ان کی اجازت یہ ہے کہ نکاح کی اطلاع دینے پر وہ خاموشی ظاہر کریں انکار نہ کریں۔

حدیث مذکور کے اندر بھی ولی سے خطاب کیا گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولیاء سے فرمایا کہ عاقلہ، بالغہ بے شوہر عورت، خواہ غیر شادی شدہ ہو یا شادی شدہ، مطلقہ ہو یا بیوہ، ان کا نکاح ان سے مشورہ اور ان سے اجازت لئے بغیر نہ کیا کرو، بلکہ نکاح سے پہلے ان سے مشورہ اور ان سے اجازت لو پھر نکاح کیا کرو جس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ نکاح کرنے کا اختیار تو ولی کو ہوتا ہے البتہ عاقلہ و بالغہ عورت سے مشورہ اور اجازت لینے کا حکم ہے۔

(۴) دوسری حدیث شریف میں ہے : عن عائشة رضی الله عنها قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ايما امراة نكحت بغير اذن وليها فنكاحها باطل فنكاحها باطل فنكاحها باطل.

(رواہ الترمذی)

ترجمہ: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس عورت نے بھی بدون اجازت ولی خود نکاح کیا ہے اس کا یہ نکاح باطل ہے اس کا نکاح باطل ہے۔اس کا نکاح باطل ہے(یعنی غیر معتبر ہے)۔''

(۵) تیسری حدیث میں ہے : عن ابی هريرة رضى الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لاتزوج المراة المر ولا تزوج المراة نفسها فان الزانية هي التي تزوج نفسها اخرجه الدار قطني وابن خزيمة.

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت کسی دوسری عورت کا نکاح نہیں کرائے گی اور اپنا نکاح بھی ازخود نہیں کرے گی اس وجہ سے کہ جو عورت خود اپنا نکاح کرتی ہے وہ زنا کرنے والی کے حکم میں ہے۔''

(دار قطنی، ابن خزیمہ)

واضح رہے کہ مذکورہ دونوں حدیثوں میں سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں عورت کے کئے ہوئے نکاح کو باطل اور کالعدم کہا گیا اور حدیث ابوہریرہؓ کی روایت میں جو عورت بدون اجازت ولی نکاح کرتی ہے اسے زانیہ کہا گیا ہے، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عورت، خواہ عاقلہ وبالغہ ہی کیوں نہ ہو وہ، بدون اجازت ولی نکاح نہیں کرسکتی۔

(٦) چوتھی حدیث میں ہے : قال عليه الصلوٰة و السلام: لايزوج النساء الا الاولياء.

ترجمہ: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ولی کے بغیر عورتوں کا نکاح نہیں کیا جائے گا۔''

(۷) پانچویں حدیث میں ہے : عن رسول الله صلى الله عليه وسلم: لانكاح الابولی.

ترجمہ: ''ولی کی اجازت کے بغیر کوئی نکاح نہیں۔''

(۸): چھٹی حدیث میں ہے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حفصہ بنت عبدالرحمٰنؓ کا نکاح ان کے

باپ عبدالرحمٰنؓ کی غیر حاضری میں منذر بن الزبیرؓ سے کردیا تھا، جب عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکرؓ سفر سے واپس آئے اور اپنی بیٹی کا نکاح ان کی غیر حاضری میں کردینے کا علم ہوا تو آپ نے شدید برہمی کا اظہار کیا۔

یہ حضرات شوافع وحنابلہ اپنی فقہی رائے میں یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ

(۹): قرآن وحدیث کی رو سے عورتیں ناقصات العقل والدین (عقل ودین میں کمی کا شکار) ہیں، مصالح اور مفاسد نکاح کو جس قدر اولیاء سمجھتے ہیں عورتیں نہیں سمجھ سکتیں، خصوصاً جب وہ خواہشات سے مغلوب ہوتی ہوں اور جذباتی انداز سے سوچتی ہوں تو پھر ہر کس وناکس نکاح کرنے پر رضامند ہوجاتی ہیں۔

پھر یہ حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ ایسے نکاح جو خود عورتیں اپنی پسند سے کرتی ہیں اکثر دیرپا نہیں ہوتے زوجین کے درمیان بہت جلد نااتفاقی اور ناچاقی پیدا ہوجاتی ہے اور معاملہ جدائی تک پہنچ جاتا ہے حالانکہ نکاح پوری زندگی کے سکون اور راحت کے لئے ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا دلائل اور اس قسم کے دوسرے دلائل اور وجوہات کی بنیاد پر شوافع اور حنابلہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ عاقلہ وبالغہ عورت اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں کرسکتی۔

اس کے برعکس امام اعظم امام ابوحنیفہؒ جو کہ تابعی ہیں چند صحابہ کرامؓ سے آپکو شرف ملاقات حاصل ہے، اور علم وتقویٰ میں آپ سب ائمہ سے فوقیت رکھتے ہیں، ان کے تلامذہ امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ جو کہ علم فقہ وحدیث ودیگر علوم وفنون اسلامیہ کے ماہر ہیں اور امام سفیان ثوریؒ وامام اوزاعیؒ وغیرہ سب حضرات فرماتے ہیں کہ قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کی رو سے عاقلہ بالغہ عورت، بدون اجازت ولی اپنا نکاح کفو یعنی برابر کے خاندان میں کرسکتی ہے۔ اس طرح نکاح کرلینے کے بعد از روئے شرع نکاح منعقد اور لازم ہوجاتا ہے، البتہ اگر ولی کی اجازت سے نکاح ہوجاوے تو افضل اور بہتر اور تہذیب و اخلاق کی رو سے مستحسن ہے، اس میں ولی اور خاندان کی عزت ہے کسی کو کچھ کہنے کا موقع نہیں ملتا، ورنہ رواج وعرف کے تحت کچھ سننا پڑتا ہے۔ اس واسطے عاقلہ وبالغہ عورت اگر اپنے برابر کے گھرانے میں کسی مرد سے نکاح کرنے کے لئے خواہش ظاہر کرتی ہے تو ولی کو منع نہیں کرنا چاہئے بلکہ اجازت دے دینی چاہئے، ورنہ روکنے کی صورت میں رسوائی اٹھانے کا اندیشہ غالب ہے اور بڑا فساد برپا ہونے کا خدشہ ہے جب کہ قرآن وحدیث کی رو سے کفو میں نکاح کرلینے سے نکاح منعقد ہوجاتا ہے۔ نیز یہ بھی یاد رہے کہ ولی نے اگر نکاح سے پیشتر اجازت نہیں دی تھی مگر نکاح کے بعد اجازت دے دی تو یہ بھی درست ہے،

نکاح تو ہر حال میں منعقد ہو جاتا ہے البتہ بدون اجازت ولی ہونے کی وجہ سے رواج اور عرف کے اعتبار سے اس نکاح کے اندر جو کمی محسوس کی جارہی تھی، اجازت لاحقہ کی وجہ سے وہ پوری ہو جاری ہو جائے گی، نکاح کے بعد اجازت دینے سے دوبارہ تجدید نکاح کی ضرورت نہیں۔

امام اعظم ابو حنیفہؒ اور دیگر ائمہ حضرات قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کے درج ذیل دلائل پیش کرتے ہیں۔

(۱) حق تعالیٰ جل مجدہ کا ارشاد ہے: فان طلقها فلاتحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره الآية. (بقرة . ۲۳۰)

ترجمہ: پھر خاوند نے اگر اس عورت کو طلاق دی (یعنی تیسری بار) تو اب حلال نہیں اس کو وہ عورت اس کے بعد جب تک نکاح نہ کرے کسی خاوند سے اس کے سوا پھر اگر دوسرا خاوند طلاق دے دے تو کچھ گناہ نہیں ہے ان دونوں پر کہ پھر باہم مل جائیں اگر غالب گمان ہو کہ قائم رکھیں گے اللہ کا حکم، یہ حدیں باندھی ہوئی ہیں اللہ کی۔ بیان فرماتا ہے ان کو جاننے والوں کے واسطے۔

قرآن حکیم میں اس آیت مذکورہ کے اندر جہاں یہ مسئلے بیان کئے گئے ہیں کہ (۱) تیسری طلاق کے بعد عورت شوہر پر قطعی طور پر حرام ہو جاتی ہے یہاں تک کہ دوسرے مرد سے نکاح کر لے (۲) اور دوسرے شوہر کے ساتھ زن و شوہر کا تعلق قائم ہونے کے بعد اس نے اگر طلاق دی ہے تو بعد عدت عورت شوہر اول کے لئے حلال ہو سکتی ہے۔

وہاں یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ زوج ثانی کے ساتھ نکاح کرنے یا نہ کرنے کا اختیار عورت کو ہے کیونکہ قرآن کریم کے واضح الفاظ یہ ہیں حتى تنكح زوجا غيره یعنی جب تک عورت باختیار خود دوسرے شخص سے نکاح نہیں کرتی اس وقت تک زوج اول کے لئے وہ حلال نہیں ہو سکتی، جس کا واضح مطلب یہ نکلتا ہے کہ دوسرے مرد سے نکاح کا اختیار عورت کو ہے، خواہ ولی اس نکاح پر راضی ہو یا نہ ہو اور ولی سے اجازت لی گئی ہو یا نہ لی گئی ہو۔

چنانچہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے صاحب روح المعانی تحریر فرماتے ہیں:

(۲): وعلى ان الولى ليس شرطا فى النكاح؛ لانه اضاف العقد اليها. (ص ۱۴۱. ج ۳)

یعنی آیت میں کسی لفظ سے نہیں معلوم ہوتا کہ نکاح کے لئے ولی شرط ہے بلکہ آیت کے صیغہ سے

یہی معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کے لئے ولی کا موجود ہونا یا اس کی اجازت ہونا بالکل شرط نہیں ہے، کیونکہ آیت کے اندر انعقاد نکاح کی نسبت عورت کی طرف کی گئی ہے۔ حتی تنکح زوجا غیرہ میں صیغہ مونث استعمال کیا گیا ہے یعنی بعد طلاق وعدت عورت خود جب تک دوسرے مرد سے نکاح نہیں کرتی، تب تک زوج اول کے لئے حرام رہے گی، اس سے واضح ہوا کہ عاقلہ بالغہ عورت کو اپنے برابر کے خاندان میں اپنی مرضی سے نکاح کرنے کا اختیار ہے، خواہ ولی راضی ہو یا نہ، کیونکہ آیت مذکورہ میں ولی کی اجازت کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ البتہ بعض احادیث میں ولی کی اجازت سے نکاح کا ذکر آتا ہے، مگر وہ متکلم فیہ ہیں جو کہ دوسری صحیح اور مستند احادیث کی مخالف ہونے کی وجہ سے قابل استدلال نہیں بن سکتیں۔

(۳): نیز آیت مذکورہ کی تشریح میں امام ابوبکر جصاصؒ اپنی تفسیر احکام القرآن میں لکھتے ہیں۔

وقدحوی الدلالة علی وجھین علی ماذ کرنا، احدھما: اضافة عقد النکاح الیھا والثانی: ما اشترط اذن الولی فیھا. (ص ۴۰، ج ۲)

یعنی آیت مذکورہ دووجوہ سے اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عاقلہ بالغہ اپنے اختیار سے بلا اجازت ولی نکاح کرسکتی ہے، ایک وجہ یہ کہ آیت میں نکاح کی نسبت عورت کی طرف کی گئی ہے نہ کہ ولی کی طرف، دوسری وجہ یہ کہ اس میں ولی کی اجازت شرط ہونے کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ہے۔

(۴) قرآن حکیم میں دوسری جگہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں **واذا طلقتم النساء فبلغن اجلھن فلا تعضلوھن ان ینکحن ازواجھن اذا تراضوا بینھم بالمعروف ذلک یوعظ بہ من کان منکم یومن باللّٰہ والیوم الاخر ذلکم ازکی لکم واطھر واللّٰہ یعلم وانتم لاتعلمون. الآیة.** (بقرہ ۲۳۲)

ترجمہ: مطلب یہ ہے کہ ''جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو اور عورتیں اپنی میعاد (عدت) پوری کرچکیں تو تم ان کو اس امر سے مت روکو کہ وہ (دوبارہ) اپنے انہیں شوہروں سے نکاح کرلیں جب کہ باہم رضامند ہوجائیں قاعدہ کے موافق اور اس مضمون سے نصیحت کی جاتی ہے اس شخص کو جو تم میں سے اللہ تعالیٰ اور قیامت پر یقین رکھتا ہو اس نصیحت کو قبول کرنا تمہارے لئے زیادہ صفائی اور زیادہ پاکی کی بات ہے اور اللہ (تمہاری مصلحتوں کو) جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

آیت مذکورہ کے اندر حق تعالیٰ نے اولیاء عورت کو ہدایت کی ہے کہ مطلقہ عورتیں انہیں (سابقہ) شوہروں سے قاعدے کے موافق شریعت کے اصول کے تحت نکاح کرنا چاہیں تو تم انہیں مت روکو بلکہ

ان کو اپنے اختیار پر عمل کرنے دو کیونکہ اگر تم ایسا کرو گے تو ان پر زیادتی ہوگی، ظلم ہوگا اور اس سے معاشرہ میں فساد پھیلے گا۔

چنانچہ اسی سلسلہ میں حضرت معقل بن یسارؓ اور جابر بن عبداللہؓ کی بہنوں کا مسئلہ پیش آیا تھا، ان کے شوہروں نے انہیں طلاق رجعی دی تھی اور رجوع نہیں کیا تھا، بعد عدت ان عورتوں اور ان کے شوہروں کے درمیان مصالحت ہوگئی تھی کہ تجدید نکاح کر کے ازدواجی زندگی قائم کرلینا مناسب ہوگا مگر حضرت معقل بن یسارؓ اور جابر بن عبداللہؓ نے اپنی اپنی بہن کو دوبارہ ان کے طلاق دینے والے شوہروں سے نکاح کرنے سے انکار کردیا، اس پر قرآن حکیم کی مذکورہ آیت اتری جس میں حکم دیا گیا کہ عاقلہ و بالغہ عورتیں جن کو ان کے شوہروں نے طلاق رجعی دی ہے بعد عدت وہ اگر اپنے شوہروں سے نکاح کرنا چاہیں تو ان کو اس کا حق و اختیار ہے تم انہیں نکاح سے مت روکا تمہیں اس بات کا اختیار نہیں ہے۔ آیت کی نص مطلقہ عورت کے بارے میں ہے لیکن آیت کی دلالت بتاتی ہے کہ یہی حکم ہر عاقلہ و بالغہ عورت کا ہے کہ وہ اگر قاعدہ کے موافق اپنی پسند کے شوہر سے نکاح کرنا چاہے تو تم انہیں مت روکا کرو، تمہیں اس بات کا اختیار نہیں ہے۔ چنانچہ مذکورہ واقعات میں جو دونوں صحابی اپنی اپنی بہن کا نکاح ان کے شوہر سے کرنے سے مانع تھے، انہوں نے فی الفور رجوع کرلیا اور ان کا نکاح کردیا۔

(۵) آیت مذکورہ کی تفسیر کرتے ہوئے صاحب روح المعانی علامہ آلوسیؒ تحریر فرماتے ہیں

وليس في الاية على اى وجه حملت دليل على انه ليس للمراة ان تزوج نفسها كما وهم ونهي الولياء عن العضل ليس لتوقف صحة النكاح على رضاهم بل لدفع الضرر عنهن لانهن وان قدرن على تزويج انفسهن شرعا لكنهن يحترزن عن ذالک مخافة اللوم والقطيعة اومخافة البطش بهن.

(ص ۱۴۵، ج ۳. روح المعانی)

جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ عاقلہ بالغہ عورت اپنے نکاح کے بارے میں خود مختار ہے وہ اپنی مرضی اور پسند سے کفو یعنی برابر کے گھرانے میں بلاشبہ نکاح کرسکتی ہے مگر عادۃً اور شرعاً جب وہ ولی کے ماتحت رہتی ہے تو بلا کسی مجبوری کے ایسا نہ کرے بلکہ اپنے اولیاء کے توسط سے عمل نکاح کو انجام دے تاکہ کوئی عرف و رواج کے خلاف ہونے کی بناء پر یہ نہ کہے کہ عورت نے ولی کے ہوتے ہوئے خود اپنا نکاح کرلیا اور اپنے اولیاء کی کوئی رعایت اور لحاظ نہ کیا۔ یہاں شریعت نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ عاقلہ و بالغہ عورت اگر کفو یعنی برابر کے گھرانے میں دستور کے موافق نکاح کرنا چاہے تو ولی کو چاہئے کہ کسی قسم کی رکاوٹ نہ

ڈالے، نہ انا کا مسئلہ بنائے بلکہ بخوشی اس کی اجازت دے دے اور اگر غلطی سے عورت نے پیشگی اجازت نہ لی اور بلا اجازت نکاح کر لیا ہے تو چونکہ شرعی اصول کے مطابق یہ نکاح منعقد ہو گیا ہے لہٰذا اس پر اس وجہ سے نکیر نہ کرے کہ اس سے پیشگی اجازت نہیں لی گئی اور نہ اسے فسخ کرنے کی ناروا کوشش کرے۔ اگر ولی ایسا کام کرے گا تو آیت کی رو سے غلط کرے گا۔

(٦) آیت مذکورہ کی شرح کرتے ہوئے امام ابوبکر جصاصؒ نے احکام القرآن میں لکھا ہے

قوله: ولا تعضلوهن قددلت الاية من وجوه على جواز النكاح اذا عقدت على نفسها بغير ولى اوإذن وليها احدها: اضافة العقد اليها من غير اذن الولى والثانيه: نهيه عن العضل اذا تراضى الزوجان. (احکام القرآن ص ۴۰۰، ج ۱)

تفسیر کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قول فلاتعضلوهن الخ ۔کئی وجوہ سے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عاقلہ، بالغہ عورت اگر بدون اجازت ولی خود نکاح کر لیتی ہے تو یہ نکاح جائز ہے۔ وجہ اول یہ کہ آیت کے اندر جواز نکاح کی نسبت عورت کی طرف کی گئی ہے اور اس میں ولی کی اجازت ضروری ہونے پر کوئی لفظ موجود نہیں ہے۔ وجہ دوم یہ کہ آیت میں مرد و عورت اگر نکاح پر رضامند ہو جائیں تو ولی کو ایسے نکاح میں مانع بننے سے منع کیا گیا ہے کہ ولی اس میں رکاوٹ پیدا نہ کرے۔

یہاں تک تو قرآنی آیات اور تفسیر کے چند حوالے پیش کئے گئے ہیں جب کہ فقہاء احناف وغیرہم احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس بات پر استدلال کرتے ہیں کہ عاقلہ بالغہ عورت کو کفو یعنی برابر کے گھرانے میں اپنا نکاح خود کرنے کی اجازت ہے اگر چہ ولی کی اجازت نہ ہو۔

چنانچہ حدیث میں ہے۔

(۷) عن سهل بن سعد ان رسول الله صلى الله عليه وسلم جاء ته امراة فقالت: يا رسول الله! انى وهبت نفسى لک فقامت طويلا فقام رجل فقال: يا رسول الله! زوجنيها ان لم تكن لک فيها حاجة فقال: هل عندک من شئى تصدقها قال: ماعندى الا ازارى هذا قال :فالتمس ولوخاتما من حديد فالتمس فلم يجد شيئا فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: هل معک من القرآن شئى قال:نعم سورة كذا و سورة كذا فقال: قد زوجتكها بما معک من القرآن وفى رواية قال: انطلق فقد زوجتكها فعلمها من القرآن. متفق عليه. (مشکوۃ ص ۲۷۷، ج ۲)

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ''ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا یا رسول اللہ! میں نے اپنی ذات کو آپ کے لئے ہبہ کر دیا آپ قبول فرمائیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا کوئی جواب نہیں دیا اور عورت کافی دیر تک کھڑی رہی یہ صورتحال دیکھ کر ایک آدمی مجلس میں سے کھڑا ہوا اور آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کو اگر اس عورت کی حاجت نہیں ہے تو آپ اس کا نکاح مجھ سے ہی کر دیجئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی سے دریافت کیا کہ کیا تمہارے پاس حق مہر ادا کرنے کے لئے کچھ ہے اس آدمی نے جواب دیا میرے پاس سوائے اس ازار کے جو بدن میں ہے اور کچھ نہیں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تلاش کرو اگرچہ ایک لوہے کی انگوٹھی سہی اس آدمی نے ادھر ادھر لوگوں کے پاس جا کر دیکھا لیکن کہیں کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ اور واپس آیا پھر اس آدمی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تمہیں قرآن کی سورتوں میں سے کچھ یاد ہے اس نے کہا ہاں فلاں فلاں سورتیں یاد ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان سورتوں کی وجہ سے میں اس عورت کا نکاح تم سے کر دیتا ہوں اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا اب جاؤ میں نے تمہارا نکاح اس عورت سے کر دیا ہے، تم ان سورتوں کی تعلیم اس عورت کو دو۔ (بہر حال آپ نے عورت کا نکاح اس آدمی سے کر دیا)۔

واضح رہے کہ یہاں اس عورت نے اپنی ذات کو آپؐ کے لئے ہبہ کیا تھا بلا مہر نکاح کی درخواست کی تھی چنانچہ دوسرے شخص سے نکاح میں آپؐ نے حق مہر کا کوئی تعین نہیں فرمایا۔ اس طرح بلا مہر نکاح کر دینا آپؐ کے لئے مخصوص ہے، لیکن امت کے لئے یہ قانون ہے کہ کم از کم دس درہم یا اس کی مالیت کے برابر رقم یا کوئی چیز دینا ضروری ہے اور زیادہ سے زیادہ مہر کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

حدیث مذکور کی شرح میں شارحین حدیث نے بیان کیا ہے کہ اس میں چند مسائل کا ذکر ہوا ہے۔

۱: عاقلہ بالغہ عورت اپنے نکاح کی پیش کش بدون اجازت ولی اپنی پسند کے مرد کو کر سکتی ہے۔

۲: عاقلہ بالغہ عورت اگر اپنے نکاح کا اختیار کسی مرد کو دیتی ہے، خواہ وہ ولی ہو یا غیر ولی، وہ مرد عورت کا نکا نامزد مرد سے کرا سکتا ہے۔

۳: حق مہر کا نکاح کے وقت دے دینا واجب نہیں ہے بعد میں بھی دیا جا سکتا ہے۔

۴: بلا ذکر مہر نکاح کیا جائے تو نکاح منعقد ہو جاتا ہے مگر بعد میں مہر مثل یا فریقین (کم از کم مہر) دس درہم یا اس سے زیادہ جو بھی مقرر کریں دینا واجب ہے، شوافع کہتے ہیں، اس حدیث کی رو سے تعلیم قرآن کو بدل مہر ٹھہرانا بھی ثابت ہوتا ہے۔

۵: نیز یہ کہ نکاح کے لئے لفظ نکاح کا استعمال ضروری نہیں ہے، ہبہ وغیرہ کے الفاظ کا بھی استعمال جائز ہے جن سے تملیک نفس یعنی اپنی ذات کا کسی کو مالک بنا دینے کا معنی نکلتا ہو۔

۶: حدیث مذکور میں سب سے بنیادی اور واضح طور پر جو مسئلہ معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ بدون اجازت ولی عاقلہ بالغہ عورت اپنے نکاح کا اختیار رکھتی ہے، وہ اگر کسی مرد کو شرعی حدود میں رہ کر پسند کر کے نکاح کرتی ہے تو یہ جائز ہے، ولی اجازت دے یا نہ دے، ہاں ولی کی اجازت سے ہو جائے تو یہ بہتر ہے جیسا کہ دوسری احادیث سے اس کا استحباب معلوم ہوتا ہے۔

۷: نیز حدیث مذکور اور دوسری احادیث کے تقاضے سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کے موقع پر مہر یا اس کا کچھ حصہ دیدینا مسنون ہے۔

(۸) عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنہما عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: لیس للولی مع الثیب امر. (بدائع ج ۲ ص ۲۴۸)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ شادی شدہ عورت کے بارے میں ولی کو کوئی اختیار نہیں ہے یعنی شادی شدہ عورت مطلقہ ہو یا بیوہ اگر شرعی حدود میں رہتے ہوئے اپنی مرضی سے اپنی پسند کے کسی مرد سے نکاح کرنا چاہے تو کر سکتی ہے اس بارے میں ولی کو کوئی اختیار نہیں ہے کہ وہ عورت کو نکاح سے منع کرے یا اس کی اجازت نہ ہونے کی بناء پر رکاوٹ پیدا کرے۔

(۹) عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنہما ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: الایم احق بنفسہا من ولیہا. (مسلم ج ۱، ص ۴۵۵)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شوہر عورت (جو کہ عاقلہ و بالغہ ہے) نکاح کے سلسلے میں ولی کی بہ نسبت زیادہ حقدار ہے۔

غرض یہ کہ بالغہ عورت، خواہ کنوری ہو یا شادی شدہ، مطلقہ ہو یا بیوہ، نکاح کی ضرورت و مصلحت کو ولی کے مقابلہ میں زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہے لہٰذا دستور کے مطابق مناسب رشتہ کے بارے میں اختیار کا حق اسی کو ہونا چاہئے لہٰذا وہ اگر کسی رشتہ کو پسند کرتی ہے اور شرعی حدود میں رہتے ہوئے وہ نکاح کر لیتی ہے یا ولی سے نکاح کے بارے میں کہتی ہے تو ولی کے ذمہ ضروری ہے کہ نکاح کی اجازت دے دے اور رکاوٹ پیدا نہ کرے کیونکہ نکاح کی مصلحت و ضرورت کے بارے میں وہ ولی سے زیادہ بہتر سمجھتی ہے وہ اس کی

زیادہ حقدار ہے۔

(۱۰) عن ابی ہریرۃ رضیٰ اللّٰہ عنہ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: لاتنکح الایم حتی تستامر ولا تنکح البکر حتی تستاذن قالو: ایا رسول اللّٰہ وکیف اذنہا قال: ان تسکت. (مسلم ج ۱، ص ۴۵۵)

ترجمہ: حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شوہر عاقلہ بالغہ عورت مطلقہ، بیوہ کا نکاح اس سے مشورہ کے بغیر نہ کیا جائے اسی طرح عاقلہ بالغہ کنواری عورت کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر نہ کیا جائے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یارسول اللہ! کنواری عورت کی اجازت کیسے ہوگی؟ فرمایا اس کی اجازت کے لئے یہ کافی ہے کہ جب اس سے اجازت طلب کی جائے تو وہ خاموش رہے اور انکار نہ کرے۔

تشریح: حدیث مذکور سے واضح ہوا کہ عاقلہ بالغہ عورت کا نکاح، خواہ وہ کنواری ہو یا مطلقہ یا بیوہ، ہر صورت میں اس سے اجازت لئے بغیر نہیں ہوسکتا، جس کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ نکاح اس کی اجازت اور مرضی پر موقوف ہوتا ہے، وہ اگر چاہے تو نکاح ہوگا ورنہ نہیں، خواہ سارے خاندان والے راضی ہوجائیں زور لگائیں نکاح نہیں ہوگا۔ ہاں اگر وہ خود نکاح کی اجازت دے دے تو نکاح ہوجائے گا، چاہے پورے خاندان والے ناراض ہوجائے، جب کہ نکاح کفو میں ہو۔

اور جہاں سارے خاندان والے نکاح پر رضامند ہوں لیکن تنہا عورت ناراض ہو وہاں نکاح نہیں ہوسکتا، بالفرض اگر ولی اور خاندان والوں نے زبردستی نکاح کر دیا ہے تو ایسا نکاح قابل رد ہے۔ دیکھئے اگلی حدیث میں ہے:

(۱۱) عن ابن عباس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہما ان جاریۃ بکرا اتت النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فذکرت ان اباھا زوجھا وھی کارھۃ فخیرھا النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم. (ابو داؤود ج ۱ ص ۲۸۶. ۲۸۵ ابن ماجہ ص ۱۳۵)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک کنواری عورت حاضر ہوئی اور اس نے عرض کیا کہ اس کے باپ نے اس کا نکاح ایک مرد کے ساتھ بدون اس کی مرضی کے کر دیا ہے اور وہ اس نکاح کو ناپسند کرتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو (نکاح کو مسترد کرنے کا) اختیار دیدیا یعنی یہ فرمایا تمہیں

اختیار ہے کہ تم اس کو مسترد کرو۔ کیونکہ تمہاری مرضی کے بغیر نکاح نہیں ہوسکتا۔

(۱۲) عن خنساء بنت حذام الانصارية ان اباها زوجها وهی ثیب فکرهت ذالک فجاءت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فذكرت ذالک له فرد نکاحها. (ابو داؤد ج ۱، ص ۲۸۶)

ترجمہ: حضرت خنساء بنت حذام انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ ان کے والد نے ان کا نکاح ایک مرد سے بغیر ان کی رضامندی کے کردیا تھا جب کہ وہ عاقلہ و بالغہ تھیں اور وہ اس نکاح کو ناپسند کرتی تھیں، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاکر یہ بات بتائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نکاح کو مسترد اور کالعدم قرار دیا۔ (اور ان کو اختیار دیا کہ جائیں اور اپنی مرضی سے نکاح کریں)

تشریح: یہ دونوں احادیث بالکل ظاہر ہیں کہ ان لڑکیوں کے باپ نے ان عاقلہ و بالغہ لڑکیوں کا نکاح ان کی مرضی کے بغیر زبردستی کردیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا کہ تمہیں اختیار ہے۔ ظاہراً نکاح کردینے کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ وہ مختار اور نکاح کی قید سے آزاد ہیں وہ اپنی مرضی سے دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہیں ان کے باپ کا کیا ہوا نکاح کالعدم ہے۔

حدیث کی رو سے اس میں عورتوں کے سرپرستوں کو دعوت فکر دی گئی ہے کہ عاقلہ بالغہ عورت کے نکاح کا اختیار عورتوں کو ہے، صرف ظاہرداری کی رو سے اللہ نے انہیں یہ عزت بخشی ہے کہ وہ بحیثیت ولی وسرپرست ہونے کے عورتوں کا نکاح کردیں لیکن ان کو یہ نکاح ان عورتوں کی مرضی اور اجازت سے کرنا ضروری ہے۔ اس میں پورے خاندان کی عزت ہے سب کا لحاظ ہوتا ہے لیکن جہاں تک زبردستی والی بات ہے تو ولی اور سرپرستوں کو اس کا اختیار نہیں ہے۔

(۱۳) عن عائشة رضی اللّٰه عنها انها انكحت حفصة بنت عبدالرحمن من منذر بن الزبير و عبدالرحمن غائب. الحديث. (الدراية)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنی بھانجی حفصہؓ بنت عبدالرحمٰنؓ کا نکاح منذر بن الزبیر سے کردیا جب کہ حفصہؓ کے والد عبدالرحمٰن موجود نہیں تھے سفر میں تھے۔ جب عبدالرحمٰن سفر سے واپس آئے تو اظہار ناراضگی فرمایا مگر اس نکاح کو ناقابل اعتبار نہیں گردانا بلکہ اس کو بدستور برقرار رکھا۔

اس واقعہ سے ظاہر ہوا کہ باپ کی غیر موجودگی میں کوئی دوسرا رشتہ دار، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، عاقلہ و بالغہ عورت کا نکاح اس کی رضامندی سے کرواسکتا ہے، ولی کی اجازت یا اس کی مرضی کا شامل ہونا نکاح کے لئے فرض یا واجب کے درجہ میں نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ واپسی کے بعد اظہار ناراضگی کے ساتھ یہ بھی کہہ دیتے کہ یہ نکاح میری اجازت اور مرضی کے بغیر ہوا ہے اس لئے اسے ختم کرتا ہوں، مگر آپ نے ایسا نہیں کیا ہاں عاقلہ و بالغہ عورت کا نکاح حدیث رسول کی رو سے ولی کی اجازت اور مرضی سے ہونا مستحب اور شرعاً افضل ہے اور یہ عرف و رواج کے بھی مطابق ہے، چونکہ خلاف رواج طریقے پر یہاں ان چیزوں کی رعایت نہیں کی گئی اس لئے آپ نے اظہار ناراضگی فرمایا۔ لہٰذا آج بھی اگر بلا عذر و ضرورت کوئی عاقلہ و بالغہ عورت اس سنت و استحباب کو ترک کر کے ولی کی اجازت و مرضی کے بغیر اپنی پسند کے مرد سے نکاح کر لیتی ہے تو اسے بھی ناپسندیدہ قرار دیا جائے گا اور شرعاً اس طرح کرنے کو مکروہ اور قبیح فعل کہا جائے گا۔ مگر اس کے باوجود نکاح کو کالعدم اور باطل قرار نہیں دیا جائے گا۔

(۱۴) خطب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ام سلمة فقالت: ما احد من اولیائی شاهد فقال لها النبی صلی اللہ علیہ وسلم: ما احد من اولیائک شاهد ولا غائب یکرهنی فقالت لابنها وهو غلام صغیر: قم فزوج امک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتزوجها صلی اللہ علیہ وسلم بغیر ولی.

(جصاص ج ۱، ص ۴۰۲)

مطلب حدیث: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو نکاح کا پیغام دیا تھا تو حسب دستورِ عرف ام سلمہؓ نے کہا کہ میرے اولیاء میں سے اس وقت کوئی موجود نہیں (میں ان کے بغیر کیا کہہ سکتی ہوں؟) اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا، تمہارے اولیاء میں جو غائب ہیں یا حاضر ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے کہ میرے ساتھ تمہارے نکاح کو برا جانے گا اس کے بعد ام سلمہؓ نے اپنے ایک بیٹے کو جو نابالغ اور صغر سنی میں تھا لیکن ہوشیار تھا ان سے فرمایا بیٹے آؤ تم اپنی ماں کا نکاح اللہ کے رسول سے کر دو (چنانچہ اس بیٹے نے نکاح کا انتظام کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی ماں کا نکاح کر دیا) اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح بدون اجازت ولی کے کیا۔

تشریح: دیکھئے حدیث شریف بالکل واضح ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے پیغام نکاح کے بعد دستور اور عرف کے مطابق کہ ولی کی اجازت کے بغیر عورت کیا

جواب دے گی کسی قسم کا جواب دینے سے عذر کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا کہ تمہارے اولیاء میں سے کوئی ایسا نہیں جو اس نکاح پر نکیر کرے، اس لئے تم میرے ساتھ نکاح کے بارے میں ''ہاں'' کہہ سکتی ہو، جب انہوں نے انکار نہ کیا تو انہوں نے اپنے بیٹے کی وکالت میں جو کہ حقیقی معنی میں ولی نہیں تھا نہ اس کے اندر ولایت کی اہلیت تھی محض وکیل کی حیثیت سے نکاح منعقد کرنے کو فرمایا چنانچہ نابالغ بیٹے کی وکالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شرعی نکاح ام سلمہؓ سے ہوگیا اور بعد نکاح کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ ولی کا موجود ہونا یا اس کی اجازت ہونا نکاح کے انعقاد کے لئے بمنزلہ فرض یا واجب یا شرط نہیں ہے، اس کے بغیر بھی عاقلہ بالغہ عورت کا نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔ ہاں ولی کی موجودگی اور اس کی اجازت سے نکاح ہونا افضل و بہتر اور عرف و رواج کے مطابق ہے۔ مگر جب کوئی عذر یا ضرورت ہو تو اس کو بھی ترک کیا جاسکتا ہے کیونکہ نکاح اس پر موقوف نہیں رہتا۔

واضح رہے کہ یہاں کوئی شخص طالب علمانہ سوال کر سکتا ہے کہ حدیث مذکور میں نکاح کرنے والے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں پھر عام امتی کے لئے یہ حجت کیسے بنے گی؟ اس طرح نکاح کرنا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے بھی ہوسکتا ہے۔ اس کا جواب بالکل ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جو خصوصیات ہیں نصوص میں اس کی صراحت یا اس کا اشارہ موجود ہوتا ہے جو کہ دلیل خصوصیت ہوتی ہے۔

چنانچہ بدون حق مہر کے نکاح کرنا خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص تھا، نص میں اس کا تذکرہ موجود ہے، امت کے لئے تو مہر سے نکاح منعقد کرنا فرض ہے۔ اسی طرح چار بیویوں سے زائد عورتوں سے نکاح کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خاص تھا امت کے لئے تو بیک وقت چار بیویوں تک جائز ہے اس سے زائد ناجائز اور حرام ہے نص میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اسی طرح صوم وصال یعنی مسلسل روزے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے امت کے لئے منع ہے نفل نماز میں قیاماً وقعوداً (کھڑے ہوکر پڑھے یا بیٹھے بیٹھے پڑھے ہر حال میں) برابر کا ثواب ملنا نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خصوصیات میں سے ہے، امت کے لئے یہ ہے کہ کھڑے ہوکر پڑھے تو پورا ثواب ملے گا اور بیٹھ کر پڑھے تو آدھا ثواب ملے گا، اس طرح کی اور بھی بہت سی چیزیں ہیں مگر عاقلہ بالغہ عورت سے بدون ولی کے نکاح کرنے کے بارے میں آپ کی خصوصیت ہونے پر کوئی وجہ یا دلیل حدیث میں مذکور نہیں ہے جبکہ اس کے خلاف

دسیوں روایات اس مسئلہ میں عدم خصوصیت پر دلالت کرتی ہیں۔

(۱۵) بیہقی میں ہے: ان علیا رضی اللّٰہ عنہ اجاز نکاح امراۃ زوجتھا امھا برضاھا. (الجوھر النقی مع سنن البھقی ج ۷، ص ۱۱۲ الجواب عما قال فیہ البیھقی)

مطلب یہ ہے کہ ”ایک عورت نے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا ولی کی اجازت نہ تھی تو حضرت علیؓ نے اس عورت کے نکاح کو جائز قرار دیا جس کی ماں نے اس کا نکاح اس کی رضامندی سے کر دیا تھا۔“

دیکھئے یہاں عورت کا نکاح اس کی رضامندی سے ماں نے کر دیا تو حضرت علیؓ نے اسے جائز قرار دیا یہ نہیں فرمایا کہ بدون اجازت ولی نکاح نہیں ہو سکتا۔ معلوم ہوا کہ بدون اجازت ولی عاقلہ و بالغہ عورت کا نکاح ہو جاتا ہے۔

(۱۶) کان علی رضی اللّٰہ عنہ اذا رفع الیہ رجل تزوج امراۃ بغیر ولی دخل بھا امجاہ. (الجوھر النقی علی ھامش سنن البیھقی ج ۷، ص ۱۱۲)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ کے پاس اگر کوئی ایسا آدمی آتا جس نے کسی عاقلہ و بالغہ عورت سے نکاح بدون اجازت ولی فقط عورت کی رضامندی سے کیا ہوتا اور اس سے ملاپ بھی کر لیا ہوتا تو آپ ایسے نکاح کو نافذ اور درست قرار دیا کرتے تھے۔

روایت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ خلیفہ رابع و خلیفہ راشد جو کہ فقہاء صحابہؓ میں سے تھے اور اقضی الصحابہ یعنی بڑے قاضی تھے آپؓ کا یہی معمول تھا کہ کوئی مرد اور عاقلہ و بالغہ عورت باہمی رضامندی سے شرعی طور سے نکاح کر لینے کے بعد توثیق کے لئے اگر آپ کے پاس آتے تو آپ ان کے نکاح کی توثیق فرما دیا کرتے اگر ایسا نکاح نا قابل اعتبار ہوتا اور قرآن وسنت کے خلاف ہوتا تو آپؓ فقہاء صحابہ میں سے تھے خلیفہ راشد تھے اور عدالتی معاملات کو سب سے زیادہ سمجھتے تھے پھر اسے کیسے برقرار رہنے دیتے؟ معلوم ہوا کہ قرآن وسنت کی رو سے مسئلہ یہی ہے کہ عاقلہ و بالغہ عورت کا نکاح اس کی رضامندی سے کفو اور برابر کے گھرانے میں صحیح اور درست ہے۔

(۱۷): بخاری شریف میں جلیل القدر صحابی عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے ام حکیم بنت قارظ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ آپ اپنے نکاح کا اختیار مجھے دیتی ہیں؟ ام حکیمؓ نے جواب دیا ہاں میری جانب سے آپ کو میرے نکاح کا اختیار ہے تو عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے فرمایا میں

نے تم سے نکاح کر لیا۔ (ج۲،ص۷۷۰)

دیکھیے اس واقعہ میں عاقلہ بالغہ عورت کی رضا مندی سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا اس سے نکاح کر لینے کا ذکر ہے اس میں ولی سے اجازت لینے یا ولی کی اجازت پر نکاح کو موقوف کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ قدماء صحابہ میں سے ہیں دو مرتبہ ہجرت فرمائی حبشہ اور مدینہ میں بھی اور عشرہ مبشرہ میں سے تھے، ایسے صحابی کا عمل قرآن وسنت کے موافق ہی تھا نہ کہ قرآن وسنت کے خلاف۔ اگر ایسا ہوتا تو اس زمانہ میں بے شمار فقہاء صحابہ موجود تھے اس کے خلاف فتویٰ صادر کیا جاتا مگر ذخیرہ احادیث میں کہیں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔

(۱۸) عن عقبة بن عامر رضی اللّٰه عنه انه علیه الصلوة والسلام قال لرجل: اترضی ان ازوجک فلانة بنت فلان قال: نعم وقال للمراة: اترضین ان ازوجک فلانا قالت: نعم فزوج احدهما صاحبه ابو داؤد بسند صحیح عن علیؓ. علی شرط الشیخین، (اعلاء السنن. ج ۱۱، ص ۷۸)

ترجمہ: عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ (جو کہ حاکم مصر تھے) سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی سے فرمایا کیا تم اس بات پر راضی ہو کہ میں تمہارا نکاح فلاں عورت سے کر دوں؟ اس نے جواب دیا ہاں یا رسول اللہ، پھر آپ نے اس عورت کے یہاں جا کر فرمایا آیا تو اس بات پر راضی ہے کہ تیرا نکاح فلاں مرد سے کر دوں؟ اس نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ، تو آپ ﷺ نے ان دونوں کو بلا کر ان کا نکاح کر دیا۔ امام الحدیث امام ابوداؤد نے اس حدیث کو صحیح سند سے نقل کیا ہے۔ (صاحب اعلاء السنن کہتے ہیں کہ) صحت کی رو سے یہ حدیث بخاری ومسلم کی شرط پر ہے۔"

آپ نے دیکھا کہ یہاں آپ نے دو بالغ مرد وعورت کا نکاح ان کے ولی سے پوچھے بغیر کر دیا۔

ان جملہ احادیث وروایات سے ثابت ہوا کہ عاقلہ بالغہ عورت کا نکاح بدون اجازت ولی جائز اور درست ہے۔ جس کا انکار نص کی رو سے ناممکن ہے احناف کے ائمہ ثلاثہ یہی کہتے ہیں۔

اوپر تو قرآن وحدیث سے استدلال کیا جارہا تھا کہ عاقلہ بالغہ عورت کا نکاح بدون اجازت ولی نفس میں جائز اور منعقد ہے ہاں ولی کی اجازت سے ہونا مستحب اور افضل ہے۔

اب فقہی عبارات اور درایت کی رو سے بھی اس مسئلہ پر استدلال پیش کیا جاتا ہے۔

(۱۹): علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی معرکتہ الاراء تصنیف "بدائع الصنائع" میں فرماتے ہیں۔ خلاصہ یہ

کہ عاقلہ بالغہ عورت کا اختیار نکاح اس کو ہونا چاہئے نہ کہ ولی کو، کیونکہ نکاح کی حاجت تو اسی کو ہے، شوہر کے ساتھ اسی کو زندگی گزارنی ہے اگر بعض مصالح نکاح کو ولی سمجھتا ہے تو دیگر بہت سی مصالح کو عورت سمجھتی ہے، مثلاً کہاں اور کس سے محبت زیادہ ملے گی؟ کہاں زیادہ سکون ملے گا؟ کہاں اچھی رہائش اچھی معاش میسر ہوگی؟ کہاں اس کو دینی و دنیوی سہولتیں زیادہ سے زیادہ ملیں گی؟ توالدو تناسل کا سلسلہ کہاں پر بہتر انداز سے جاری رہ سکے گا؟ نیز اولاد کی پیدائش اور پرورش کہاں بہتر انداز سے ہو سکے گی؟ یہ سب امور عورت سمجھتی اور سوچتی ہے۔

پھر عورت کے مزاج میں اختلاف بھی ہوتا ہے اس اختلاف طبائع کی وجہ سے عورت کی طبیعت کا حال عورت سمجھتی ہے مرد کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا ایک ہی خاندان اور ایک ہی باپ کی چند بیٹیاں ہوتی ہیں ان کی طبیعت اور مزاج میں فرق ہوتا ہے۔ وہ مرد اور شوہر کے بارے میں مختلف انداز سے سوچتی ہیں کسی کی طبیعت میں دینی رجحان کا غلبہ ہے، قناعت وصبر کا رجحان زیادہ ہے، جب کہ دوسری کی طبیعت میں دینی رجحان کے علاوہ دنیاوی رجحان بھی ہوتا ہے اس میں صبر وقناعت کی صفت اس درجہ کی نہیں ہوتی جس طرح پہلے والی میں ہوتی ہے، اس کے برعکس تیسری بیٹی کا رجحان کچھ اور امور کی طرف ہوتا ہے، غرض یہ کہ اپنی عفت وعصمت کی حفاظت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اپنے شوہر سے متعلق بہت سے امور کو سوچتی ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ جو عورت نکاح کے بعد ساری عمر کسی مرد کے ماتحت زندگی گزارے گی اس کے انتخاب میں عورت کی رائے کی بنیادی حیثیت نہ ہو اور اس کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ انہیں وجوہ کی بناء پر فقہی روایات کے علاوہ عقل وفہم کا تقاضا بھی یہی ہے کہ عاقلہ وبالغہ عورت کو اپنے نکاح کے بارے میں پورا اور مکمل اختیار ہو اس کی رائے کو اولیت حاصل ہو ولی کو سرپرست ہونے کے اعتبار سے اگر کچھ اختیار حاصل ہو تو وہ ثانوی درجہ میں ہو عورت کی رائے کی اہمیت زیادہ ہو نہ کہ ولی کی رائے کی اہمیت۔

(دیکھیے بدائع ج ۲، ص ۲۴۹)

قرآن وحدیث کی نصوص اور روایت اس فقہ اور روایت کی تائید اور موافقت میں ہیں۔

(۲۰) علاوہ ازیں قرآن وحدیث نے عاقلہ وبالغہ عورت کو اپنے تمام تصرفات دینیہ و دنیویہ، حقوق مالیہ وغیر مالیہ میں با اختیار قرار دیا ہے۔ اور اس کے تصرفات شرعیہ کو درست اور صحیح تسلیم کیا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ تصرف نکاح میں اس کو با اختیار تصور نہ کیا جائے؟ بدائع۔

یہی وجہ ہے کہ عورت اپنی املاک، زمین اور مال کی خود مختار ہے، وہ چاہے اسے فروخت کرے یا اسے صدقہ کرے، ہبہ کرے یا اس بارے میں وصیت کرے دوسرا کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ اگر اس کے ہاتھ میں اور ملکیت میں کوئی شرعی غلام یا لونڈی ہو تو وہ اسے بیچ سکتی ہے اور چاہے تو اسے

آزاد کر سکتی ہے، دوسرا کوئی اس کی ملکیت میں حاکمانہ اختیار نہیں چلا سکتا۔ اسی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ اور ان کے بے شمار تلامذہ خاص کر اجلاء تلامذہ امام ابو یوسف ومحمد رحمۃ اللہ وغیرہ نے فتویٰ دیا ہے کہ عاقلہ و بالغہ عورت جب دوسرے تمام تصرفات کر سکتی ہے تو وہ اپنی ذات میں بھی اپنے نکاح کے سلسلے میں تصرف کر سکتی ہے لہٰذا وہ برابر کے گھرانے اور کفو کے لڑکے سے نکاح کر سکتی ہے، خواہ ولی اس پر راضی ہو یا نہ ہو۔ ولی سے پیشگی اجازت یا رائے لی گئی ہو یا نہ لی گئی ہو اور یہ کہ بعد نکاح ایسا نکاح نافذ اور لازم ہے۔ عورت کے سرپرست اور ولی کو اس پر اعتراض کا حق بھی نہیں ہے۔

البتہ عاقلہ بالغہ عورت نے اگر غیر کفو میں نکاح کیا ہے تو اس میں اتنی وضاحت ہے کہ ولی اگر بعد نکاح کسی مصلحت سے نکاح کی اجازت دیتے ہیں تو ظاہر روایت کے مطابق وہ نکاح بھی درست اور صحیح ہے۔ تجدید نکاح کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر وہ اس نکاح پر راضی نہیں ہیں تو عدالت سے شوہر کے غیر کفو ہونے کو ثابت کر کے نکاح فسخ کرا سکتے ہیں۔ غرض یہ کہ غیر کفوء میں ولی کو حق اعتراض ہے۔

(۱۲): مزید یہ کہ عورتوں کا اقرار حدود وقصاص میں معتبر ہے اس میں ولی یا سرپرست کی اجازت کی ضرورت نہیں اس میں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ کسی کی بیٹی یا بیوی، یا بہن یا ماں کے اقرار کی وجہ سے خاندان کی بدنامی ہوتی ہے بلکہ عاقلہ بالغہ عورت کے اقرار کے بعد اس کے اوپر احکام جاری ہو جاتے ہیں جب کہ یہ چیزیں ایسی ہیں کہ خود عورتوں کی جان سے تعلق رکھتی ہیں اور اس طرح کا اقرار دوسروں کے حقوق پر بھی اثر انداز ہوتا ہے مثلاً بیوی کے اقرار زنا سے اس پر حد جاری ہوتی ہے اس میں شوہر کا حق زوجیت ضائع ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ جب اتنے بڑے اہم امور میں انکا اقرار معتبر سمجھا جاتا ہے تو اقرار نکاح کو بھی معتبر ماننا ضروری ہے۔ (بدائع ج ۲، ص ۲۴۹.)

(۲۲): اور یہ کہ شریعت اسلامیہ نے عاقلہ و بالغہ عورت کے نکاح کے سلسلے میں اولیاء کو بھی مخاطب کیا ہے مگر اولیاء کو جو خطاب کیا گیا ہے اس کے انداز خطاب سے خود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عورتوں کی ولایت نکاح کے بارے میں اولیاء کا اختیار درجہ ندب واستحباب میں ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ عرف ورواج میں ولی کے ہوتے ہوئے عورتوں کی جانب سے نکاح کے لئے از خود پیش کش کرنا خلاف عادت اور خلاف مروت سمجھا جاتا ہے کیونکہ رب روز ازل نے فطری طور پر مردوں کو عورتوں کے اوپر کچھ ایسی برتری عنایت فرمائی ہے جو کہ مشرق سے مغرب تک سب دنیا جانتی اور مانتی ہے پھر اس پر قرآن وحدیث کی نصوص نے توضیح وتنقیح کے ساتھ مرد اور عورت میں سے ہر ایک کے حقوق کو تسلیم کرتے ہوئے عورتوں کے اوپر مردوں کو حاکم مقرر کر دیا ہے۔ لہٰذا نصوص اور عرف وعادت کی بناء پر بھی عورتوں کو چاہئے کہ حق

خود ارادی ہوتے ہوئے بھی اپنے معاملات میں اپنے سرپرستوں سے رجوع کریں یہی افضل ہے یہی سنت نبوی اور عرف و رواج کے مطابق ہے۔ لیکن اس کے باوجود عاقلہ و بالغہ عورت اگر کسی مجبوری یا مصلحت کی بناء پر اپنے کفو میں ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کر لیتی ہے تو شرعاً یہ ناجائز نہیں ہے اور نہ یہ شرعاً معصیت اور گناہ میں داخل ہے۔ اس لئے کہ عاقلہ و بالغہ عورت اپنی ذات کی مالک و مختار ہے اس نے اپنی ملکیت اور اختیار میں تصرف کیا ہے لہٰذا اس کا یہ فعل شرعی تصرف میں آتا ہے البتہ اس نے ولی اور سرپرست کے ایک گونہ حق ولایت کو ضائع کیا ہے جو کہ ولی کو درجۂ استحباب میں حاصل تھا، یعنی اس نے اس طریقہ سے نکاح کر کے مکروہ اور ناپسندیدہ طریقہ کو فروغ دیا ہے، عرف و رواج کے خلاف کام کیا ہے اس وجہ سے معاشرہ میں عورت کے اس فعل کو بری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور بے حیائی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور شرعاً ایسے فعل کو غیر مستحسن گردانا جاتا ہے، کیونکہ اس نے اپنے ولی اور سرپرست کا حق ولایت جو کہ از روئے قرآن وسنت بطور استحباب کے حاصل تھا اس کو نقصان پہنچایا ہے۔ بہرحال عورت کی اصل حیثیت (خود مختاری کے حق) کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جائے گا کہ نکاح منعقد اور جائز ہے اور ولی کی حیثیت (کہ اس کو عورت پر ولایت استحباب حاصل ہے) کو دیکھتے ہوئے کہا جائے گا کہ نکاح منعقد ہونے کے ساتھ ساتھ عورت نے غیر مستحسن فعل کیا ہے انہی امور کو صاحب بدائع نے مختصر الفاظ میں یوں بیان فرمایا ہے:

واما ولاية الندب والاستحباب فهي الولاية على الحرة البالغة العاقلة بكرا كانت اوثيبا في قول ابي حنيفة وزفر وقول ابي يوسف الاول الخ.

(ص ۲۴۷. ج ۲ و مجمع الانهر ج ۱، ص ۳۳۳).

یعنی آزاد اور عاقلہ و بالغہ عورت پر ولی کو جو ولایت اور اختیار ہے وہ امام ابوحنیفہؒ امام زفر رحمہ اللہ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول اول کے مطابق ولایت استحباب ہے نہ کہ ولایت اجبار، خواہ وہ عاقلہ و بالغہ عورت کنواری ہو یا شادی شدہ، اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔“

نتیجہ یہ نکلا کہ عورت نے اگر ولی کی اجازت سے نکاح کیا ہے تو اس نے شرع اور آداب نکاح کی رعایت کی ہے لیکن اگر اس نے بدون اجازت ولی نکاح کیا ہے تو اس نے اگرچہ آداب نکاح کے خلاف کام کیا ہے مگر شرعاً کوئی بڑا جرم نہیں کیا، زیادہ سے زیادہ عرف و رواج اور آداب معاشرت کی خلاف ورزی کی ہے مگر اس سے وجود نکاح میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۲۳: عاقلہ و بالغہ عورت پر سرپرست اور ولی کو جو اختیار حاصل ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ ولی عورت کا نکاح وقت کے مطابق کر دے برابر کے خاندان میں اور مناسب لڑکے سے کر دے تاکہ بعد از نکاح کوئی

پیچیدگی پیدا نہ ہو زوجین کی زندگی آرام اور سکون سے گزر جائے لہٰذا کسی وقت ولی کی غفلت وعدم توجہ کی بناء پر اگر لڑکی نے اپنے کفو میں خود یہ کام انجام دیا ہے تو اس نے کوئی غیر شرعی اقدام نہیں کیا اس سے خاندان کے لحاظ سے عدم برابری کا کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوگا۔ رہا یہ کہ ولی کے اختیار کی پھر کیا حیثیت رہے گی؟ تو اس کا جواب بالکل ظاہر ہے کہ ضرورت نکاح کا احساس جتنا عورت کو ہے ولی کو نہیں ہے لہٰذا اس ضرورت وحاجت کے سامنے ولی کی ولایت کا مسئلہ اتنا اہم نہیں ہے کیونکہ عورت کے لئے عصمت و پاکیزگی کا برقرار رکھنا ولی کی خاطر گناہ کی زندگی گزارنے سے زیادہ ضروری اور واجب ہے۔ ولی کی اجازت کا مسئلہ درجہ استحباب میں ہے ہوسکتا ہے، کہ ولی کو یہ اعتراض ہو کہ خاندان اور دینی لحاظ سے لڑکا اگرچہ کفو کا ہے مگر مزاج دونوں خاندانوں کا مختلف ہے۔ پھر یہ نکاح کیسے برقرار رہے گا تو اس کا جواب بھی اسی نہج سے سوچنا چاہئے کہ عورتوں کی طبائع اور مزاج بھی مختلف ہوتے ہیں شاید عورت کی طبیعت ومزاج اور مرد کی طبیعت ومزاج میں ہم آہنگی ہو، جس کی وجہ سے ان میں سے ایک نے دوسرے کو پسند کیا ہے اور ایک دوسرے کو زندگی کا ساتھی بنانے پر رضامند ہوگئے ہیں اس لئے لڑکی کے مزاج کے مقابلے میں ولی کے مزاج کی رعایت نہیں کی جائے گی کیونکہ زندگی تو اسی کو گزارنی ہے اور وہ اس پر خوش ہے۔

۲۴: دنیاوی لحاظ سے اس ترقی یافتہ دور میں اکثر وبیشتر عورتیں اور لڑکیاں جدید تعلیم یافتہ، چالاک اور ہوشیار ہوتی ہیں اپنے بلکہ دوسروں کے بے شمار مسائل نمٹا لیتی ہیں،، عقل وفراست میں بعض لڑکیاں اور عورتیں اپنے سرپرستوں سے کم نہیں ہوتیں تو ایسی عورتیں اگر اپنی مرضی سے برابر کے خاندان میں اور کفو میں اس لئے نکاح کر لیتی ہیں کہ سرپرست کو اپنے ماتحت عورتوں کے نکاح کے بارے میں خاص توجہ نہیں ہے اور توجہ دلانے سے مسئلہ حل ہونے کے بجائے بگڑ سکتا ہے اور اس کو گناہ کی زندگی گزارنے کی نوبت آسکتی ہے تو ازروئے قرآن وحدیث ایسا نکاح اگرچہ غیر مستحسن ہے مگر قطعاً ناجائز نہیں ہے بلکہ یہ بھی شرعی نکاح ہے جس کو توڑنے اور ختم کرنے کا اختیار ولی کو بھی نہیں ہوتا۔

تجربے اور مشاہدے سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ بعض حریص اور لالچی آدمی اپنی جوان بیٹیوں کی کمائی کے طمع اور لالچ میں جلدی ان کی شادی کر دینے کی فکر نہیں کرتے کہ ان کی شادی ہو جانے کے بعد اس کا کیا حال ہوگا، حالانکہ لڑکیاں شادی کے لائق ہیں رشتے آرہے ہیں جس کو وہ مخصوص انداز سے ٹال دیتے ہیں کہ شادی میں ابھی دیر ہے حالات اس کے متحمل نہیں ہیں۔

بعض لوگوں میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ چونکہ یہ خود دنیوی اعتبار سے بڑے تعلیم یافتہ اور بڑے عہدے پر فائز ہوتے ہیں یا کبھی ہوئے تھے تو اپنی تعلیم یافتہ یا نیم تعلیم یافتہ لڑکیوں کے رشتے میں ایسی

شرطیں رکھ دیتے ہیں کہ بڑے تعلیم یافتہ ہوں بڑے عہدوں پر فائز ہوں، دین کو دیکھتے ہیں نہ خاندان کو نہ ہی شرافت نسبی و برادری کو، بلکہ اس وقتی بلندی اور ترفع کی بناء پر جوان لڑکیوں کی شادیاں رکی ہوئی ہوتی ہیں، حالانکہ یہ سب باتیں از روئے قرآن وحدیث غیر ضروری ہیں۔ شرعی نقطہ نگاہ سے لڑکی کے نکاح کے لئے یہ دیکھا جاتا ہے کہ لڑکے والے برابر کے خاندان کے، دیندار اور اس قدر مالدار ہوں کہ لڑکی کے حقوق ادا کر سکیں اور دونوں میں تعلیم اس قدر ہو کہ لڑکے کی تعلیم لڑکی کے مقابلہ میں بہت زیادہ کم نہ ہو کہ سبب عار بنے۔ سیرت وصورت اس طرح ہو کہ لڑکی پسند کرلے جب ایسے رشتے مل جائیں تو شرعی حکم ہے کہ رشتہ کردیا جائے، خصوصاً جب کہ لڑکی خود رشتے کو پسند بھی کرتی ہو۔ ایسے رشتے مسترد نہ کئے جائیں کیونکہ پھر اس سے معاشرے میں فساد اور بگاڑ پیدا ہوتا ہے بہت سے فتنے پیدا ہوتے ہیں دونوں جانب کے رشتہ داروں کو رسوائی اور ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جمہور امت کے نزدیک بالغہ لڑکی اپنے برابر کے خاندان میں نکاح کرنا چاہے تو اسے ہرگز نہیں روکنا چاہیے۔

غرض یہ کہ فقہاء کرام کے دونوں فریقوں کے دلائل کو از روئے قرآن وحدیث قارئین کرام نے ملاحظہ کرلیا اور قوت دلیل کس طرف ہے اس کو بھی بصیرت کے ساتھ دیکھ لیا اب چند فقہی حوالے ملاحظہ فرمائیں۔

احکام القرآن میں قاضی ابوبکر جصاص فرماتے ہیں:

اختلف الفقهاء فی عقد المراة علی نفسها بغیر ولی فقال ابو حنیفةؒ :اما ان تزوج نفسها کفوًا ومع مهر المثل فلا اعتراض للولی علیها وهو قول زفر والأوزاعی ومحمد بن سیرین و الشعبی والزهری وقتادة. (ج ۱. ص ۴۱۱)

عاقلہ بالغہ عورت نے بدون اجازت ولی کفو میں نکاح کرلیا ہے سو ایسے نکاح کے بارے میں فقہا کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

اما ابوحنیفہؒ، امام زفرؒ، صاحبینؒ، امام اوزاعیؒ، محمد بن سیرینؒ، امام شعبیؒ، امام زہریؒ، قتادہؒ، ان سب کی رائے یہ ہے کہ عورت نے اگر کفو میں اور مہر مثل سے نکاح کیا ہے تو ایسا نکاح نافذ ولازم ہوجاتا ہے۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہے۔

وینعقد نکاح الحرة العاقلة البالغة برضاها وان لم یعقد علیها ولی بکراً کانت اوثیباً عند ابی حنیفة وصاحبیه.

یعنی احناف کے نزدیک آزاد عاقلہ و بالغہ عورت کا نکاح اس کی رضامندی سے کفو میں منعقد ہو جاتا ہے خواہ کنواری ہو یا ثیبہ (یعنی خاوند سے جدا شدہ عورت) اور اسی طرح فتح القدیر میں بھی ہے۔

علامہ کاسانی ” اپنی معروف تصنیف ”بدائع الصنائع“ میں تحریر فرماتے ہیں۔

فان زوجت نفسها من كفو فقد حصلت الصيانة فزال المانع من اللزوم فيلزم.

(ج ۲، ص ۲۴۹)

ترجمہ: اگر عاقلہ و بالغہ عورت نے کفو میں اپنا نکاح خود کر لیا تو لزوم نکاح سے مانع (جو غیر کفو میں نکاح سے پیدا ہوتا ہے) وہ زائل ہو جاتا ہے لہٰذا ایسا نکاح نافذ اور لازم ہے۔

بحرالرائق شرح کنزالدقائق میں ہے۔

ونفذ نكاح حرة بالغة بلا ولى لا نها تصرفت فى خالص حقها وهى هن اهله لكونها عاقلةبالغة ولهذاكان لها التصرف فى المال ولها اختيار الا زواج وانما يطالب الولى بالتزويج لئلا تنسب الى الوقاحة ولذاكان المستحب فى حقها تفويض الا مراليه الخ (ج ۳ص ۱۱۹)

آزاد اور عاقلہ بالغہ عورت کا نکاح بدون ولی کے درست اور نافذ ہے کیونکہ اس نے خالص اپنے حق اختیار کو استعمال کیا ہے اور وہ عاقلہ و بالغہ ہونے کی حیثیت سے اس کی اہلیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے حال میں تصرف رکھتی ہے۔ لہٰذا اسے اپنے شوہر کے انتخاب میں بھی اختیار ہو گا باقی نکاح کے موقع پر ولی کو کس لئے طلب کیا جاتا ہے؟ اسکا جواب ہے کہ عرفاً تاکہ عورت کی طرف بے حیائی کی نیت نہ ہو لوگ اسے برا نہ کہیں۔ اس وجہ سے عورت کے لئے مستحب یہ ہے کہ اپنا معاملہ ولی کے حوالے کر دے۔

فتاویٰ کی معروف کتاب فتاویٰ عالمگیری میں ہے

ونفذ نكاح حرة مكلفةبلا ولى عندا بى حنيفة و ابى يوسف فى ظاهر الرواية كذا فى التبيين وسئل شيخ الاسلام عطاء بن حمزة من امراة شافعية بكر بالغة زوجت نفسها من حنفى بغير اذن ابيها والاب لا يرضى ورده هل يصح هذا النكاح؟ قال :نعم كذالك لوزوجت نفسها من شافعى كذا فى الظهيرية.

(ج ۱، ص ۲۸۷)

ترجمہ: عاقلہ و بالغہ عورت کا نکاح بدون اجازت ولی امام ابوحنیفہ و ابو یوسف رحمہما اللہ کے نزدیک ظاہر روایت میں منعقد اور نافذ ہو جاتا ہے جیسا کہ تبیین الحقائق میں ہے۔ شیخ الاسلام

عطاء بن حمزہ سے ایک شافعی عورت کے نکاح کے بارے میں سوال کیا گیا جو کہ عاقلہ و بالغہ تھی اور کسی حنفی سے اس نے بلا اجازت ولی نکاح کیا تھا کہ آیا اس کا نکاح صحیح ہے یا نہیں جب کہ اس کا باپ اس پر ناراض تھا اور نکاح کو مسترد کر چکا تھا؟ شیخ نے جواب دیا کہ نکاح صحیح ہے اور لازم ہے اسی طرح اگر کسی شافعی سے نکاح کیا ہے وہ بھی صحیح اور نافذ ہے۔

فقہ حنفی کی معروف کتاب درمختار میں ہے۔

وهي هنا نوعان: ولاية ندب على المكلفة ولو بكراً و ولاية اجبار وهي على الصغيرة ولو ثيباً ومعتوهة ومرقوقة. وهو اى الولى شرط لصحة نكاح صغير و مجنون ورقيق لامكلفة فنفذ نكاح حرة مكلفة بلارضاء ولى والاصل ان كل من تصرف فى ماله تصرف فى نفسه ومالا فلا.

(درمختار مع شامی ج ۳، ص ۵۵. ۵۶)

ترجمہ: ولی کی ولایت دو قسم کی ہوتی ہے ایک ولایت تو وہ ہے جو عاقلہ و بالغہ پر ہوتی ہے اگر چہ کنواری ہو اور یہ ولایت ولایت استحباب ہے اور دوسری قسم کی ولایت معتوہہ (بے وقوف)، مجنونہ، لونڈی، یا نابالغہ پر ہوتی ہے اور یہی ولایت ولایت اجبار ہوتی ہے اور یہ صحت نکاح کے لئے شرط ہوتی ہے لیکن عاقلہ بالغہ پر ولی کو جو ولایت ہوتی ہے وہ ولایت اجبار نہیں ہے اس وجہ سے عاقلہ و بالغہ عورت کا نکاح بدون رضامندی ولی منعقد ہو جاتا ہے اور اس میں دراصل قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ ہر وہ عورت جو اپنے مال میں تصرف کا حق رکھتی ہے وہ اپنی ذات کا اختیار بھی رکھتی ہے (لہٰذا وہ اپنی نکاح خود کر سکتی ہے) اور جو عورت اپنے مال میں تصرف کا اختیار نہیں رکھتی اس کو اپنا ذات میں بھی تصرف کا اختیار نہیں ہوتا لہٰذا ایسی عورت اپنا نکاح نہیں کر سکتی۔

احناف کی ان فقہی روایات اور عبارات سے معلوم ہوا کہ آزاد عاقلہ، بالغہ عورت کسی وجہ سے اگر بدون اجازت ولی نکاح کرنا چاہے تو بلاشبہ وہ کر سکتی ہے ایسا نکاح شرعاً منعقد ہو جائے گا البتہ نکاح اگر کفو یعنی برابر کے خاندان، مالدار، دیندار، اور ہم پیشہ میں کیا ہے اور مہر مثل پر کیا ہے تو اس میں ولی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں رہتا، کیونکہ اس سے ولی کا کوئی حق واجبی ضائع نہیں ہوا لیکن اگر عورت نے نکاح غیر کفو میں کیا ہے یا مہر مثل سے کم مہر میں کیا ہے تو ولی کو حق اعتراض حاصل ہوتا ہے اور اختیار ہوتا ہے کہ چاہے اس نکاح کو برقرار رکھے، اور چاہے تو اس کو بذریعہ عدالت فسخ کرا لے، کیونکہ اس میں عورت نے اپنی خاندانی، مالداری، دینداری اور پیشہ ورانہ حیثیت کو نقصان پہنچایا ہے۔ اس صورت میں انعقاد نکاح

میں فائدہ یہ ہے کہ جو نکاح عورت کی ولایت واجبہ کے تحت ہوا ہے اس نکاح کو برقرار رکھا جاتا ہے اور اس نکاح کے ضمن میں اگر میاں بیوی کے تعلقات پیدا ہوئے تو وہ شرعی اور جائز ہوں گے، اور اس پر احکام نکاح مثلاً مہر، سکونت، عدت لازم ہوں گے اور اگر اسے سرے سے غیر منعقد مانا جائے گا تو اس میں پریشانی یہ ہوگی کہ دونوں کے تعلقات کو زنا قرار دینا پڑے گا اور عورت کے بے شمار حقوق ضائع ہوں گے، اور بدنامی الگ۔ اور اس میں دوسرا فائدہ یہ ہے کہ بعض دفعہ ولی مختلف وجوہ سے یہ چاہتا ہے کہ لڑکے سے لڑکی کا نکاح غیر کفو میں ہوتے ہوئے بھی بعض دوسری وجوہ کی بناء پر برقرار رہے مگر خود اپنی مرضی واختیار سے ایسا کرنا نہیں چاہتا دل سے اس رشتہ پر خوش ہوتا ہے ظاہر داری سے ناراضگی ظاہر کرتا ہے تاکہ اپنا وقار مجروح نہ ہو اور ظاہراً یہ کہہ دیتا ہے کہ چلو لڑکی نے اپنی مرضی سے جب نکاح کرلیا ہے پھر اسے رہنے دیا جائے، اور اس نکاح (کو ظاہری اور رسمی طور سے نہ چاہتے ہوئے بھی اس) سے موافقت کرلی جائے۔

غرضیکہ نکاح کو منعقد قرار دینے میں بالکلیہ نقصان نہیں، فریقین کے لئے اس میں فائدے ہیں، خواہ یہ نکاح عاقلہ و بالغہ عورت نے غیر کفو ہی میں کیا ہو، کیونکہ بعض دفعہ اولیاء بھی چاہتے ہیں کہ نکاح ہوجائے، پھر عورت نے اگرچہ کفو یعنی برابری کی صفت کو نہیں دیکھا بلکہ بعض دوسری صفات مثلاً مالداری یا دنیوی اعلیٰ تعلیم یا اخلاق و دینداری وغیرہ کو دیکھتے ہوئے کفو کے مرد کے مقابلہ میں غیر کفو کو ترجیح دی ہو، بعد نکاح اولیاء اس کے خلاف نہ ہوں دل سے وہ بھی اس کو برقرار رکھنا چاہتے ہوں اسی وجہ سے احناف کی ظاہر روایت یہی ہے کہ ایسے حالات میں غیر کفو میں نکاح منعقد ہوجاتا ہے البتہ مرد اور عورت کے مابین تمام چیزوں کا موازنہ کرکے اولیاء اگر سمجھتے ہیں کہ نکاح برقرار رکھنا مناسب نہیں ہے تو انہیں بذریعہ عدالت یہ ثابت کرکے کہ شوہر لڑکی کے کفو کا نہیں ہے اس وجہ سے نکاح فسخ کردیا جائے، فسخ نکاح کا حق حاصل ہوتا ہے۔

احناف کے ان تفصیلی دلائل کے بعد امام شافعیؒ وغیرہ نے جو آیات اور احادیث پیش کی تھیں ان کے جوابات ملاحظہ فرمائیں:

۱: فقہائے احناف، امام اوزاعیؒ، سفیان ثوریؒ، زہریؒ اور شعبیؒ وغیرہم کہتے ہیں کہ عاقلہ و بالغہ عورت کا نکاح بدون اجازت ولی ہوجانے کے جواز میں قرآن و احادیث کی نصوص تو بالکل صریح اور واضح ہیں (جنہیں قارئین کرام ملاحظہ فرما چکے ہیں) اس کے برعکس امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور اصحاب ظاہر جو آیات و احادیث پیش کرتے ہیں ان سے بظاہر نکاح کا اختیار ولی کو ہونا معلوم ہوتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں بہت ساری نصوص ایسی وارد ہوئی ہیں کہ جن سے نکاح کا اختیار عورت

کو ہونا معلوم ہوتا ہے اور ایسی صورت میں کہ روایات مختلف ہوں اصول کی رو سے ترجیح کو عمل میں لایا جاتا ہے یعنی اسباب ترجیح کو مدنظر رکھ کر ان میں غور کیا جائے اس کے بعد جو راجح نکلے اس پر عمل کیا جائے گا اور مرجوح کو ترک کیا جائے گا۔

ترجیح کی صورت یہ ہے کہ (جن روایات سے ولی کو عورت کے نکاح کا اختیار ہونا معلوم ہوتا ہے) ان میں سے بعض روایات تو سند کے لحاظ سے ثابت ہی نہیں اور جو ثابت ہیں ان کے الفاظ میں اختلاف ہے کہ بعض کے الفاظ تو اس اختلافی مسئلہ پر دلالت کرنے والے ہیں مگر بعض کے الفاظ کا اس مسئلہ سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ بعض روایات سند کے لحاظ سے درست ہیں اور الفاظ یعنی متن حدیث میں بھی کوئی اضطراب نہیں، لیکن الفاظ ایسے ہیں جو متعدد معنی کا احتمال رکھنے والے ہیں اور پہلے تفصیلی دلائل سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ عاقلہ بالغہ عورت کے نکاح کا اختیار خود عورت کو حاصل ہے اور یہی قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے لہٰذا متعدد معنی کا احتمال رکھنے والی روایات کا وہی مطلب مراد لینا پڑے گا جو قرآن وحدیث سے مطابقت رکھتا ہو اور قرآن وحدیث کی صراحت جس معنی کا ساتھ دیتی ہو۔ (تفصیل امام جصاصؒ کی عبارت میں آگے آئے گی)۔

یا پھر ان روایات مختلفہ میں تطبیق دینی پڑے گی تا کہ کوئی نص یا روایت متروک نہ ہو۔ اور تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جن آیات واحادیث میں عورتوں کے نکاح کے بارے میں ان کے اولیاء کو مخاطب کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کا اختیار اولیاء کو ہے ان (آیات واحادیث) سے مراد ولایت ندب و استحباب ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہے اس واسطے کہ عاقلہ و بالغہ کا نکاح، انہی نصوص و روایات کے تحت اور عرف و رواج کی رو سے بھی عموماً اولیاء کی نگرانی میں ہوتا ہے، اولیاء نکاح کرتے کراتے ہیں۔ پوری دنیا میں لوگ اسے بہتر اور افضل سمجھتے ہیں اس کے برعکس جو عورت اولیاء کے ہوتے ہوئے اپنا نکاح خود کرتی ہے عرف و رواج میں اسے بری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اس لئے معاشرہ میں عاقلہ و بالغہ عورت کی عزت و شرافت اسی میں تصور کی جاتی ہے کہ ان کے نکاح کے بارے میں اولیاء سے رجوع کیا جائے۔

مگر اس کے باوجود اولیاء کو عاقلہ و بالغہ عورت پر ولایت اجبار حاصل نہیں ہے یعنی انہیں جبر و اکراہ کر کے زبردستی نکاح کرانے کا اختیار نہیں کہ اولیاء جہاں چاہیں جس طرح چاہیں نکاح کرادیں اور عاقلہ و بالغہ عورت کا اس میں کوئی عمل دخل نہ ہو، کیونکہ اس طرح تو عورتوں کی خودمختاری کا وہ حق جو قرآن وحدیث نے انہیں دیا ہے سلب ہو جاتا ہے اور یہ ممکن نہیں ہے۔

ہاں جو عورت مسلوب العقل اور مجنونہ یا نابالغہ ہو کہ ان میں پوری طرح عقل و شعور نہیں ہوتا اس پر

اولیاء کو ولایت اجبار حاصل ہوتی ہے وہ جہاں چاہیں جس طرح چاہیں ان کا نکاح کرواسکتے ہیں، اسی طرح لونڈی ہے کہ اسے اپنی ذات کی مالک خود نہ ہونے کی وجہ سے اس کے مالک کو اس پر ولایت اجبار حاصل ہوتی ہے۔ مذکورہ صفات کی عورتوں کو کوئی اختیار یا اعتراض کا حق حاصل نہیں ہوتا، اس طرح تطبیق دینے سے تمام آیات واحادیث پر عمل ہوجاتا ہے کوئی آیت یا حدیث متروک نہیں ہوتی۔

چنانچہ امام ابوبکر جصاصؒ ''احکام القرآن'' میں لکھتے ہیں:

فاما الحديث الاول فغير ثابت و قد بيننا علله فى شرح الطحاوى وقد روى فى بعض الالفاظ: "ايما امراة تزوجت بغير اذن مواليها" وهذا عندنا فى الامة تزوج نفسها بغير اذن مولاها وقوله: لانكاح الا بولى الحديث لايعترض على موضع الخلاف لان هذا عندنا نكاح بولى لان المراة ولى نفسها كما ان الرجل يلى نفسه لان الولى هو الذى يستحق الولاية على من يلى عليه والمراة تستحق الولاية والتصرف على نفسها وفى مالها فكذلك فى بضعها.

واما حديث ابى هريرة فمحمول على وجه الكراهة لحضور امراة مجلس الاملاك لانه مامور باعلان النكاح ولذلك يجمع له الناس فكره للمراة حضور ذلك المجمع.

وقد ذكر ان قوله: " الزانية هى التى تنكح نفسها" فى قول ابى هريرة وقد روى فى حديث آخر عن ابى هريرة هذا الحديث و ذكر فيه ان ابا هريرة قال: "كان يقال: الزانية هى التى تنكح نفسها وعلى ان هذا اللفظ خطا باجماع المسلمين لان تزويجها نفسها" ليس بزنا عند احد من المسلمين ،والوطى غير مذكور فيه. (احکام القرآن ص ۴۰۳، ج ۱).

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلی حدیث (یعنی ايما امراة نكحت بغير اذن وليها فنكاحها باطل الحديث) سند کے لحاظ سے ثابت نہیں یعنی اس کے تمام طرق میں کلام ہے، شرح طحاوی میں اس حدیث میں موجود علتوں کی تمام تر تفصیلات کا ذکر ہم نے کر دیا ہے اور بعض روایات میں اس حدیث کے الفاظ اس طرح نقل کیے گئے ہیں: ايما امرة تزوجت بغير اذن مواليها یعنی حدیث کا تعلق لونڈی سے ہے کہ اس نے اگر بلا اذن مولیٰ نکاح کیا ہے تو یہ نکاح باطل ہے کیونکہ لونڈی کو ولایت نکاح حاصل نہیں ہے۔ رہی دوسری حدیث ''لانكاح الا بولى'' سو مقام خلاف میں اس سے استدلال درست نہیں

ہے، اس لئے کہ ہمارے نزدیک عاقلہ و بالغہ عورت نے اگر خود نکاح کیا ہے تو یہ نکاح ولی کی ولایت سے ہوا ہے کیونکہ عاقلہ بالغہ عورت کو اپنے اوپر ولایت حاصل ہے تو اس کا نکاح بغیر ولی کے نہیں ہوا بلکہ ولی کی ولایت سے ہوا ہے جیسا کہ بالغ مرد کا نکاح اس کی ولایت سے ہوتا ہے اسی طرح بالغہ عورت کا نکاح اس کی ولایت سے ہوتا ہے۔ نیز عورت کو اپنی ذات اور اپنے مال میں تصرف کرنے کا اختیار حاصل ہے تو اسی طرح اس نے اپنے ایک پارۂ گوشت میں اگر تصرف کرتے ہوئے نکاح کرلیا وہ بھی بالکل درست اور نافذ ہے۔"

غرض اس حدیث سے استدلال ناتمام ہے۔

باقی حضرت ابو ہریرۃؓ کی جو حدیث ہے تو یہ کراہت پر محمول ہے کہ وہ مجلس نکاح میں کیوں حاضر ہوئی ہے؟ یہ مجلس تو اعلان نکاح کے حکم کی تعمیل کے لئے ہے اسی واسطے لوگوں کو جمع کیا جاتا ہے۔ اور عورت کا مجلس نکاح اور مجمع میں حاضر ہونا معیوب ہے کہ ایجاب وقبول پورے مجمع کے سامنے عورت خود حاضر ہوکر کرے یہ ایک بے شرمی کی بات ہے، لہٰذا عورت کا مجلس نکاح اور مجمع میں حاضر ہونا مکروہ ہے۔

نیز حضرت ابو ہریرۃؓ کا قول الزانية هي التي تنكح نفسها دوسری روایت میں اس کے الفاظ اس طرح آئے ہیں كان يقال: الزانية هي التي تنكح نفسها یعنی حضرت ابو ہریرۃؓ فرماتے ہیں کہ کہا یہ جاتا تھا کہ جو عورت خود ہی نکاح کرلیتی ہے وہ زانیہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ لوگوں کا مقولہ ہے، صریح نصوص کے ہوتے ہوئے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ بالاجماع یہ لفظ غلطی سے مذکور ہوا ہے کیونکہ نفس نکاح کرنا کسی کے نزدیک بھی زنا کے حکم میں نہیں ہے، زنا تو ناجائز وطی کو کہتے ہیں، اور حدیث میں مباشرت اور وطی کا ذکر نہیں ہے، الغرض نفس نکاح کرنے کو زنا کہنا نقل وعقل کے خلاف ہے اس لئے یہ حدیث ناقابل استدلال ہے۔

حدیث ايما امرأة نكحت بغير اذن وليها فنكاحها باطل الحديث کے جواب میں محدث العصر علامہ ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں:

فالجواب عنه: انه عام مخصوص البعض للاحاديث التي ذكرت في الباب، فهذا الحديث محمول على نفي الكمال لئلا تنسب الى الوقاحة قد ورد في تزويج العبد بغير اذن مولا نحو ذلك ففي الدراية حديث ايما عبد تزوج بغير اذن مولا فهو عاهر الترمذي من حديث جابر و صححه وكذا الحاكم (۲۲۳) ويؤيد ان الحديث ليس على ظاهر معنا فعل عائشةؓ بخلافه وهو ما في

الدراية ان عائشةؓ زوجت حفصة بنت عبدالرحمن اخيها عن المنذر بن الزبير و عبد الرحمن غائب فلما قدم غضب ثم اجاز ذلک اخرجه مالک باسناد صحيح. (۲۲۰ اعلاء السنن ص ۶۹، ج ۱۱)

خلاصہ یہ کہ حدیث مذکور کا جواب یہ ہے کہ یہ مخصوص منہ البعض ہے یعنی بعض عورتوں کا نکاح (مثلاً نابالغہ، لونڈی وغیرہ کا نکاح) باطل ہے مگر عاقلہ و بالغہ عورت کا نکاح اس سے خارج ہے۔ دلیل اس کی وہ احادیث ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے اور اس سے مراد یہ کہ بدون ولی کے نکاح کرنا کامل طریقہ کا نکاح نہیں، ولی کی اجازت نہ ہونے سے اس میں ایک طرح کا نقص رہتا ہے، اسی وجہ سے عرف میں کہا جاتا ہے کہ ایسی عورت حیادار نہیں بلکہ بے شرم ہوتی ہے جیسا کہ غلام کے بارے میں حدیث وارد ہوئی ہے کہ اگر وہ مولیٰ کی اجازت کے بغیر نکاح کرتا ہے تو زنا کرنے والا ہے۔ یعنی غلام کے لئے صحیح نوعیت کا نکاح یہ ہے کہ مولیٰ سے اجازت لے کر نکاح کرے اور اگر مولیٰ سے اجازت لئے بغیر نکاح کرلیا تو اس کے منعقد ہوتے ہوئے بھی اس نوعیت کے فعل کو برا اور ایسے شخص کو بے حیا شمار کیا جاتا ہے۔

اور ایک جواب یہ ہے کہ حدیث ''فنکاحها باطل'' اپنے ظاہری معنی پر نہیں ہے اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو حضرت عائشہؓ اپنی بھتیجی حضرت حفصہ بنت عبدالرحمٰنؓ کا نکاح حفصہ کے والد حضرت عبدالرحمٰن کی اجازت کے بغیر نہ کرتیں۔ چنانچہ درایہ میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اپنی بھتیجی حفصہ بنت عبدالرحمٰن کا نکاح حضرت منذر بن زبیر سے کردیا تھا جب کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ اس وقت غائب تھے جب گھر لوٹے اس نکاح کا علم ہوا تو ناراضگی کا اظہار فرمایا اور پھر اس کو برقرار رکھا۔ اس روایت کو صحیح سند کے ساتھ امام مالکؒ نے ذکر کیا ہے۔

مشہور حنفی فقیہ ملک العلماء علامہ کاسانی رحمہ اللہ اپنی معرکۃ الاراء تصنیف ''بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع'' میں اس بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

ان ولاية الحتم والا يجاب فی حالة الصغر انما تثبت بطريق النيابة عن الصغيرة لعجزها عن التصرف على وجه النظر والمصلحة بنفسها، وبالبلوغ والعقل زال العجز و ثبتت القدرة حقيقة ولهذا صارت اهل الخطاب فی احكام الشرع الا انها مع قدرتها حقيقة عاجزة عن مباشرة النكاح عجزندب واستحباب؛ لانها تحتاج الى الخروج الى محافل الرجال، والمرأة مخدرة مستورة، والخروج الى محفل الرجال من النساء عيب فی العادة فكان

عجزها عجز ندب واستحباب لاحقيقة فثبتت الولاية عليها على حسب العجز وهي ولاية ندب واستحباب لا ولاية حتم وايجاب. (ج ۲، ص ۲۴۲)

مطلب: اور تحقیق یہ ہے کہ ولی کی ولایت حتم وایجاب صغیرہ یعنی نابالغہ پر ہوتی ہے کیونکہ صغیرہ اپنی نابالغی اور صغرسنی کی حالت میں پوری طرح عقل وشعور کی مالک نہ ہونے کی وجہ سے ہرقسم کے تصرف سے عاجز اور معذور ہوتی ہے لہٰذا وہ ولی کے تصرف کی محتاج ہوتی ہے، مگر جب وہ بالغ ہوجاتی ہے اور اس کے اندر عقل وشعور آجاتا ہے تو اس کا عجز اور نااہلی دور ہوکر تصرف کی اہلیت اور قدرت پیدا ہوجاتی ہے۔ پھر وہ اپنی ذات اور مال پر تصرف کی مالک اور حقدار بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلوغ کے بعد عورت تمام احکام شرع کی مکلّف اور مخاطب ہوجاتی ہے (اس پر تمام فرائض مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ودیگر حقوق و فرائض عائد ہوجاتے ہیں) مگر وہ اس قدرت علی التصرف کے باوجود عرف و رواج کے اعتبار سے ازروئے ندب واستحباب ایک طرح سے خود بخود نکاح کرنے سے عاجز بھی ہے، اس لئے کہ نکاح میں مردوں کے پاس جانا اور ان سے بات کرنا پڑتی ہے جب کہ عورت پوشیدہ اور پردہ میں رہنے کی چیز ہوتی ہے اور نکاح کے بارے میں عورتوں کا مردوں کی مجالس میں جانا اور ان سے اس بارے میں بات چلانا عرف کے لحاظ سے معیوب سمجھا جاتا ہے، لہٰذا حقیقت کی رو سے وہ اپنے مال اور ذات پر ولایت وحق رکھتے ہوئے بھی عرف ورواج کے اعتبار سے ایک گونہ عاجز ہوتی ہے اور یہ عجز حقیقی نہیں عارضی اور مجازی ہے، ادب واخلاق اور ندب واستحباب کی رو سے ہے۔ لہٰذا جس درجہ کا عجز ہوگا ولی کو اسی درجہ کی ولایت حاصل ہوگی اور یہ عجز چونکہ حقیقی نہیں ہے عرفی ومجازی ہے تو ولی کی ولایت بھی حقیقی نہ ہوگی بلکہ عرفی و مجازی ہوگی۔ بس اسی قدر اختیار ولی کو ہوگا جب کہ حقیقی اختیار عورت ہی کو ہوگا اور نکاح کا دارومدار حقیقی اختیار پر ہے، لہٰذا عاقلہ بالغہ عورت نے اگر اپنی مرضی سے نکاح کیا ہے حقیقی اختیار کے تحت نکاح ہونے کی وجہ سے نکاح تو منعقد اور درست ہے البتہ عرف ورواج کے خلاف اور ولی کی ولایت استحباب کے تحت اس کی اجازت سے نہ ہونے کی وجہ سے نکاح کے اس طریقہ کو معیوب طریقہ کہا جائے گا اور اس کو مکروہ کہا جائے گا۔

غرضیکہ قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کی رو سے عاقلہ بالغہ کا نکاح کفو میں یعنی برابر کے گھرانے میں بدون اجازت ولی منعقد ہوجاتا ہے جیسا کہ احکام القرآن جصاص، قاضیخان، بدائع، فتح القدیر، بحرالرائق، فتاویٰ عالمگیری، فتاویٰ شامی وغیرہ میں ہے۔ ایسے نکاح کو فسخ کرانے کا اختیار ولی کو (خواہ باپ دادا ہی کیوں نہ ہوں) نہیں ہے اور یہ فقہ حنفی کا متفقہ مسئلہ ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے نکاح کے انعقاد کے بعد نکاح کے جملہ احکام نافذ ہوجاتے ہیں، عورت کے ذمہ شوہر کے حقوق اور شوہر کے ذمہ عورت کے حقوق عائد ہوتے ہیں لہٰذا بدون طلاق یا خلع ان میں علیحدگی ممکن نہیں ہے اگر اسی حالت میں ان میں سے کسی کا انتقال ہوگیا ہے تو ایک دوسرے کا وارث ہوگا، خواہ رخصتی نہ ہوئی ہو۔

اگر میاں بیوی کے تعلقات قائم ہونے کے بعد طلاق ہوگئی یا خلع ہوا تو طلاق کی صورت میں شوہر کامل حق مہر واجب الاداء ہوگا، اور خلع کی صورت میں حق مہر معاف ہوجائے گا اور عورت پر عدت واجب ہوگی شوہر کے ذمہ عدت کا خرچہ لازم ہوگا۔ البتہ تعلقات سے قبل اگر تفریق ہوگئی شوہر نے طلاق دی تو نصف مہر اس پر واجب الاداء ہوگا، اگر خلع ہوا پھر وہ ساقط ہوجائے گا عورت پر عدت واجب نہ ہوگی، نہ شوہر کے ذمہ عدت کا خرچہ آئے گا۔

کفو کا معنی اور اس کی تفصیل

اوپر جو بیان کیا گیا ہے کہ عاقلہ بالغہ عورت نے اگر بدون اجازت ولی کفو میں نکاح کیا ہے تو وہ معتبر اور صحیح ہے۔ یہاں پر شریعت میں کفو سے کیا مراد ہے؟ اور اس کی تفصیل کیا ہے؟ کن امور میں برابری کو دیکھا جائے گا؟ کیا مرد کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ کفو میں نکاح کرے یا صرف عورت کے لئے ہی ضروری ہے؟ ان باتوں کی وضاحت بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔

لغت میں کفاءت کا معنی مساوات اور برابری ہے، شریعت میں مخصوص چیزوں میں مرد کا عورت کے برابر ہونا کفو اور کفاءت کہلاتا ہے۔ شریعت نے نکاح میں اس کا اعتبار کیا ہے تا کہ زوجین کے درمیان اتفاق واتحاد رہے، ہم آہنگی ہو، اختلاف وانتشار کم سے کم ہو۔ یہ کفاءت صرف مرد کی جانب دیکھی جاتی ہے کہ مرد کا گھرانا عورت کے گھرانے کے برابر ہے یا نہیں۔ اور یہ عورت کے حق میں فائدے کے لئے ہے عورت کی جانب کفاءت کا اعتبار نہیں ہوتا کہ کس خاندان سے ہے؟ اس کا مال کتنا ہے؟ اس کا پیشہ کیا ہے؟ کیونکہ مرد اس بات کو برا نہیں جانتا کہ عورت کس گھرانے سے تعلق رکھتی ہے، برابر کے گھرانے سے ہے یا کم تر گھرانے سے۔ چنانچہ فتاویٰ شامی میں ہے:

والکفاءة معتبرة فی ابتداء النکاح للزومه اولصحته من جانبه ای جانب الرجل لان الشریفة تابی ان تکون فراشا للدنیی، ولا تعتبر من جانبها بان تکون مکافئة له بل یجوز ان تکون دونه. (جلد ۳ ص ۸۴)

''کفاءت اور برابری یعنی مرد کا عورت کے برابر گھرانے میں سے ہونا لزوم نکاح اور صحت نکاح کے واسطے ابتداء معتبر ہوتی ہے کیونکہ عموماً شریف عورت کسی کمتر مرد کے ماتحت رہنے سے انکار کرتی ہے، اور یہ برابری عورت کی جانب معتبر نہیں ہوتی کہ عورت مرد کے برابر گھرانے کی۔ بلکہ اس سے کم درجے کی بھی ہوسکتی ہے اس وجہ سے کہ مرد ان چیزوں کو برا نہیں سمجھتا''۔

واضح رہے کہ عورت کے نکاح کے لئے جو کفاءت کو دیکھا جاتا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ ولی اور عورت دونوں کی عزت وآبرو کا لحاظ کرتے ہوئے نکاح ہو ان میں سے کسی کا حق ضائع نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ عاقلہ وبالغہ عورت اگر اپنے حق کو چھوڑتے ہوئے کسی غیر کفو مرد سے نکاح کرتی ہے تو ولی کو حق رہتا ہے کہ وہ چاہے تو نکاح کو برقرار رکھے اور چاہے تو بذریعہ عدالت فسخ کرالے۔ اسی طرح ولی اگر عاقلہ وبالغہ عورت کا نکاح کسی غیر کفو مرد سے کردیتا ہے تو عاقلہ وبالغہ عورت کی رضامندی شرط ہے، اگر وہ اسے منظور کرلیتی ہے تو نکاح لازم ہوگا اور اگر مسترد کرتی ہے تو نکاح مسترد ہوگا۔

اور اگر عورت ولی کی اجازت سے یہ معلوم ہوتے ہوئے کہ مرد غیر کفو ہے خوشی اور رضامندی سے اس سے نکاح کرلیتی ہے تو یہ نکاح لازم اور نافذ ہوجاتا ہے، کیونکہ مرد کا کفو میں سے ہونا نکاح کی شرائط میں سے نہیں بلکہ اس کے مصالح اور فوائد میں سے ہے۔ عورت اور ولی دونوں کی منفعت اور مصلحت کی غرض سے اس کا اعتبار کیا جاتا ہے جب دونوں حقداروں نے کسی اور مصلحت کے تحت اپنا حق کفو چھوڑ دیا ہے تو شرع اس میں مانع نہیں بنے گی، البتہ کسی مرد نے ابتدائے نکاح میں عورت اور ولی سے اپنے کو عورت کا کفو ظاہر کیا اور اسی شرط کی بنیاد پر نکاح ہوگیا لیکن بعد میں مرد کا حال اس کے خلاف ظاہر ہوا اور تحقیق سے یہ معلوم ہوا کہ مرد اس عورت کے کفو میں سے نہیں تھا، اس نے فریب اور دھوکہ سے کام لے کر نکاح کیا تو عورت یا ولی کو بذریعہ عدالت اس کے غیر کفو ہونے اور دھوکہ دہی کی بنیاد پر نکاح کو ختم کرنے کا اختیار ہوگا، درالمختار میں ہے

شرطوا الکفاءۃ او اخبرھم بھا وقت العقد فزوجوھا علی ذلک ثم ظھر انہ غیر کفو کان لھم الخیار. (شامی ج ۳، ص ۸۶)

ترجمہ: اگر عورت والوں نے کفاءت کی شرط رکھی یا مرد نے عقد نکاح کے وقت اپنے آپ کو کفو کا ہونا بتلایا اور انہوں نے اس بنا پر نکاح کردیا، پھر بعد میں ظاہر ہوا کہ مرد کفو یعنی برابر کے خاندان کا نہ تھا تو عورت کے اولیاء کو اختیار ہوگا چاہے نکاح کو باقی رکھیں یا فسخ کرالیں۔

غرض یہ کہ شرعاً مرد کی جانب سے کفاءت معتبر ہے کہ جن امور میں شریعت نے برابری کا

اعتبار کیا ہے ان میں عورت کے ساتھ موازنہ کیا جائے کہ مرد میں یہ امور عورت کے درجے میں ہیں یا نہیں؟ اب رہا یہ کہ کن امور میں مساوات اور کفاءت شرعاً معتبر ہیں؟ اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

جن امور میں عورت کے ساتھ مرد کا برابر اور کفو کا ہونا شرعاً معتبر ہے

(۱) کفاءت فی النسب

نسب کے لحاظ سے مرد کا عورت کا کفو اور برابر ہونا مثلاً عورت سید خاندان سے ہے تو مرد کا سید خاندان میں سے ہونا، عورت قریش خاندان سے ہو تو مرد کا قریش خاندان میں سے ہونا، عورت کسی عربی خاندان سے ہو تو مرد کا بھی عربی خاندان میں سے ہونا، اسی طرح عورت اگر شیخ برادری سے ہو تو مرد کا شیخ برادری سے ہونا یہ سب ایک دوسرے کے برابر اور کفو ہیں۔

البتہ غیر عربی عجمی نسب کے لحاظ سے سب برابر ہیں، نسب کے اعتبار سے کسی کو کسی پر فوقیت نہیں ہے۔ (کذا فی الھندیه ج ۱، ص ۳۹ و الشامی ج ۳)

(۲) کفاءت فی الحسب

یعنی شرافت کی رو سے مرد کا عورت کے برابر ہونا، واضح رہے کہ شرافت کی بنیاد دینداری، اخلاق، مروت، عدالت، شجاعت، سخاوت، ہمدردی وغیرہ امور ہیں، لوگوں میں جتنا دین ہوگا، اخلاق، مروت، عدالت وغیرہ صفات جتنی ہوں گی ان میں اتنی شرافت ہوگی، اور جن لوگوں میں یہ اوصاف کم ہوں گے وہ کم شریف ہوں گے، اور جن کے اندر یہ اوصاف بالکل نہیں ہوں گے وہ سب سے کمینہ اور خسیس لوگ ہوں گے۔

(۳) کفاءت فی الدیانہ

یعنی دیندار عورت کا کفو دیندار مرد ہے، فاسق و فاجر بے دین آدمی اس کا کفو نہیں ہے، غرض یہ کہ عورت کے خاندان میں اور عورت میں جس قدر دیانت اور دینداری ہوگی نکاح میں مرد کے اندر اور اس کے خاندان میں بھی اس قدر دینداری کو دیکھا جائے گا تا کہ دونوں میں ہم آہنگی اور موافقت پیدا ہو، ورنہ اختلاف پیدا ہوگا عدم موافقت کی وجہ سے رشتہ برقرار نہیں رہ سکے گا۔ ظاہر بات ہے عورت جب دیندار ہوگی وہ ہر عمل دین کی بنیاد پر کرنا چاہے گی، شوہر اگر دیندار نہ ہو فاسق و فاجر ہو تو وہ ہر عمل میں لاپرواہی کا

مظاہرہ کرے گا، جس سے اختلاف پیدا ہونا ظاہر ہے، اس لئے شریعت نے کہا ہے کہ نکاح سے پہلے مرد کی دینداری کو دیکھا جائے۔

ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ

واضح رہے کہ شریعتِ اسلامیہ نے تو دینداری میں کفو کا مسئلہ رکھ کر زوجین کے درمیان زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی اور موافقت، باہمی الفت ومحبت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، مگر بعض لوگ اس حد تک دین سے دور ہو گئے ہیں کہ شادی کے لئے زیادت دینداری اور تقویٰ کو تو کیا دیکھتے نکاح کے لئے دین وایمان کو ضروری ہی نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ اگر عورت کا مذہب الگ ہو مرد کا دین ومذہب الگ ہو لیکن تعلق نکاح اور رشتہ نکاح میں دونوں جڑے رہیں تو اس میں کیا قباحت ہے؟ اس طرح کی گفتگو وہی لوگ کرتے ہیں جو کہ سرے سے مسلمان اور ایماندار نہیں ہوتے یا برائے نام مسلمان تو ہوتے ہیں لیکن ان کے اندر دین نہیں ہوتا یا انہیں دینی معلومات نہیں ہوتیں۔

کیونکہ شریعت اسلامیہ کا حکم قرآن حکیم نے صاف الفاظ میں فرمادیا ہے کہ مشرک مرد اور مشرک عورت سے مسلمان کا نکاح نہیں ہوسکتا۔

حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

ولا تنكحوا المشركات حتى يؤمن ولأمة مؤمنة خير من مشركة ولو أعجبتكم ولا تنكحوا المشركين حتى يؤمنوا ولعبد مؤمن خير من مشرك ولو أعجبكم اولئك يدعون الى النار والله يدعو الى الجنة والمغفرة باذنه ويبين اٰياته للناس لعلهم يتذكرون. (بقرہ:۲۲۱)

ترجمہ: ”اور نکاح مت کرو مشرک عورتوں سے جب تک ایمان نہ لے آئیں اور البتہ مسلمان لونڈی بہتر ہے مشرک بیوی سے اگر چہ وہ تم کو بھلی لگے اور نکاح نہ کرو اپنی عورتوں کا مشرک مردوں سے جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور البتہ مسلمان غلام بہتر ہے مشرک سے اگر چہ وہ تم کو بھلا لگے وہ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف اور اللہ بلاتا ہے جنت اور بخشش کی طرف اپنے حکم سے اور بتلاتا ہے اپنے حکم لوگوں کو تا کہ وہ نصیحت قبول کریں۔“

تشریح: کافر مرد اور عورت سے نکاح کے سلسلہ میں اسلام کا حکم آنے سے قبل ہر ایک کا دوسرے سے نکاح ہوتا تھا اور اس کی اجازت تھی اس آیت مذکورہ کے ذریعہ یہ اجازت ختم کردی گئی ہے اب اگر

مرد یا عورت مشرک ہو تو اس کا نکاح مسلمان سے درست نہیں ہے یا نکاح کے وقت دونوں مسلمان تھے مگر بعد میں ایک مشرک اور کافر (مرتد) ہو گیا تو کیا ہوا نکاح ٹوٹ جائے گا، البتہ کافروں میں سے صرف یہود اور نصاریٰ کی عورت سے مسلمان کا نکاح جائز ہے یہ دوسری آیت سے معلوم ہوا ہے وہ عام مشرکین میں داخل نہیں ہیں بشرطیکہ وہ اپنے دین پر قائم ہوں، دہریہ خدا کے منکر اور ملحد خدا کے ضروری احکام کو غلط تاویل سے توڑنے والے نہ ہوں۔

غرضیکہ مشرک مرد اور عورت سے مسلمان عورت اور مرد کا نکاح ناجائز اور حرام ہے، اگرچہ ان کی خوبصورتی اور ان کے مال و دولت کی وجہ سے وہ بھلے لگیں، آیت مذکورہ میں جس بناپر مشرک مرد اور عورت سے نکاح کرنے سے منع کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان مرد اور مسلمان عورت کا نکاح کسی بے ایمان کافر سے نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ وہ ایمان نہ لے آئے، خواہ وہ ہندو ہو یا آتش پرست، قادیانی ہو یا شیعہ، منکر قرآن و منکر احکام قرآن ہو یا منکر حدیث وغیرہ، کیونکہ مسلمانوں کے نکاح کے لئے ضروری ہے کہ دوسرا فریق بھی مسلمان ہو ورنہ نکاح منعقد ہی نہیں ہوگا، یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام نے جملہ کافروں سے نکاح کو حرام اور ناجائز قرار دیا ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

ولا یجوز نکاح المجوسیات ولا الوثنیات (الی قوله) والمعطلة والزنا دقة والباطنية والا باحية وكل مذهب يكفر به معتقده كذا فى فتح القدير.

(ج ۱، ص ۲۸۱)

ترجمہ: ''آتش پرست عورتوں سے اور بت پرست عورتوں سے نکاح ناجائز ہے اور فرقہ معطلہ اور زندیق عورت، فرقہ باطنیہ کا عقیدہ رکھنے والی عورت، فرقہ اباحیہ والی عورت اور ہر اس مذہب والی عورت سے جس کی عقیدہ باطلہ کی وجہ سے تکفیر کی جاتی ہے۔ (اس سے نکاح ناجائز ہے)

بدائع الصنائع میں علامہ کاسانیؒ نے لکھا ہے:

ان الاصل ان لايجوز للمسلم ان ينكح الكافرة لان ازدواج الكافرة والمخالطة معها مع قيام العداوة الدينية لايحصل السكن والمودة الذى هوقوام مقاصد النكاح الا انه جوز نكاح الكتابية لرجاء اسلامها لانها اٰمنت بكتب الانبياء والرسل فى الجملة. (ج ۲، ص ۲۷۰)

مطلب یہ ہے کہ ''مشرک اور کافروں سے نکاح ناجائز ہونے کے بارے میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جو بھی اسلام اور ایمان سے خارج ہوگا اس کے ساتھ مسلمان مرد اور عورت کا نکاح نہیں ہو سکتا اور

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ زوجین کے درمیان جو سکون اور محبت والفت نکاح کے لئے ضروری ہے وہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے کہ دونوں کی ملت اور دین ومذہب ایک ہو کیونکہ غیر مذہب اور مخالف ملت کے ساتھ دینی عداوت ہر مسلمان مرد وعورت کی فطرت میں ہوتی ہے تو اس فطری اور دینی عداوت کے ہوتے ہوئے ازدواجی محبت والفت کیسے قائم ہوگی؟ زوجین کے درمیان جو چین وسکون پیدا ہونا ضروری ہے کیونکر پیدا ہو سکے گا؟ حالانکہ نکاح کے مقاصد میں سے یہ اہم مقصد ہے کہ دونوں کی زندگی چین وسکون اور الفت ومحبت کے ساتھ گزرے۔ رہا یہ سوال کہ پھر شریعت میں اہل کتاب یعنی یہودی اور عیسائی عورت سے نکاح کی اجازت کیوں دی گئی؟ تو اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اہل کتاب کی عورت کتب سابقہ اور انبیاء سابق پر ایمان رکھتی ہے ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین اسلام کا ذکر موجود ہے جب وہ کسی مسلمان کے نکاح میں آئے گی تو غالب گمان اور قریب یقین امید یہی ہے کہ شوہر کے عقائد واعمال دیکھ کر مسلمان ہو جائے گی۔

غرض اس امید اسلام کی وجہ سے اس کے ساتھ نکاح کو جائز قرار دیا گیا ہے بخلاف اس کے کسی مسلمان عورت کا نکاح اہل کتاب مرد کے ساتھ جائز نہیں ہے اسلام نے اس کی اجازت نہیں دی کیونکہ عورتیں شوہر کے پاس جانے سے شوہر کے دین و مذہب سے متاثر ہوتی ہیں اگر مسلمان عورت کسی اہل کتاب کے نکاح میں جائے گی تو خطرہ ہے کہ (العیاذ باللہ) وہ اسلام چھوڑ کر یہودیت یا عیسائیت قبول کر لے گی یہ بہت بڑی خطرناک بات ہوگی کفر ہوگا، مگر دوسرے کافروں کے مرد اور عورتوں سے مطلقاً نکاح جائز نہیں ہے، اسی وجہ سے کتب فقہ میں واضح طور پر موجود ہے کہ شرائط نکاح میں سے یہ ہے کہ عورت اگر مسلمان ہے تو مرد بھی مسلمان ہونا ضروری ہے ورنہ نکاح نہیں ہوگا۔

بدائع میں ہے:

ومنها اسلام الرجل اذا كانت المراة مسلمة فلا يجوز انكاح المؤمنة الكافر لقوله تعالىٰ: ولا تنكحوا المشركين حتى يؤمنوا ولان فى انكاح المؤمنة الكافر خوف وقوع المؤمنة فى الكفرلان الزوج يدعوها الى دينه والنساء فى العادات يتبعن الرجال فيما يوثرون من الا فعال ويقلونهم فى الدين.

(ج ۲، ص ۲۷۰)

نکاح کی شرائط میں سے ہے کہ عورت اگر مسلمان ہے تو مرد کا مسلمان ہونا ضروری ہے، پس

ایماندار عورت کا نکاح بے ایمان غیر مسلم اور کافر مرد کے ساتھ ناجائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے "اپنی عورتوں کا نکاح مشرک اور کافر مردوں سے مت کرو یہاں تک کہ مرد ایمان لے آئے۔" اور عقل وفہم کی رو سے بھی اگر مسلمان عورت کا نکاح کسی کافر مرد سے کر دیا جائے تو اس میں قوی خطرہ ہے کہ عورت کفر میں مبتلا ہو جائے گی وجہ اس کی ظاہر ہے کیونکہ شوہر اپنے کردار، رفتار گفتار ہر جہت سے اپنے دین ومذہب "کفر" کی طرف بلائے گا اور فطرتاً عورتیں ناقصۃ العقل اور ان کے قویٰ کمزور ہوتے ہیں اس لئے وہ اپنے مردوں کی ہر بات میں اطاعت کرتی ہیں اور باہمی تعلقات کی وجہ سے اطاعت کرنی پڑتی ہے لہٰذا اپنے مردوں کی تقلید میں کفریات اختیار کر لیتی ہیں تو عورت کے کفر کا سبب کافر کے ساتھ اس کا نکاح کر دینا ہوا اسی وجہ سے شریعت نے اس سے منع کیا ہے۔

لوگوں کو اس غلط فہمی اور شبہ میں نہیں پڑنا چاہئے کہ مرد اپنے دین پر رہے اور عورت اپنے دین پر رہے تو اور پھر نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اس طرح بے دین اور کافر لوگوں سے لڑکیوں کے نکاح کر دینے سے نکاح تو سرے سے نہیں ہوتا مزید خرابی یہ ہوتی ہے کہ خود ان کا دین برباد ہو جاتا ہے لڑکی ولڑکا خود بھی بے ایمان ہو جاتے ہیں اور ایسے نکاح کے نتیجے میں جو اولاد پیدا ہوتی ہے وہ کیسی ہوگی؟ اس کا اندازہ ماں سے لگا لیجئے۔ اس واسطے مسلمان مرد اور عورت کے لئے وضاحت کی جاتی ہے کہ نہ کسی کافر سے شادی کریں نہ ان کو لڑکی دیں ورنہ اسکی سزا دنیا وآخرت میں ماں باپ کو بھی بھگتنی ہوگی اور اگر غلطی سے دے دی اور ظاہری طور پر نکاح ہو گیا تو اسے بلا تاخیر ختم کر دیں اور رشتہ توڑ دے۔

غرض کفاءت فی الدیانت یعنی زیادت دین ونقصان دین کا بھی شرع نے اعتبار کیا ہے، عورت اگر قدیم زمانے سے مسلمان ہے تو نومسلم مرد اس کا کفو نہیں ہے، عورت اگر بدون اجازت ولی نومسلم سے نکاح کرتی ہے تو فقہ حنفی کی ایک روایت میں نکاح نہیں ہوگا، دوسری روایت میں نکاح تو ہو جائے گا مگر ولی کو یہ نکاح فسخ کرانے کا اختیار ہوگا۔ اسی طرح عورت اگر دیندار گھرانے کی ہے اور عورت خود بھی دیندار ہے پابند صوم وصلوۃ اور پرہیزگار ہے لیکن مرد نام کا مسلمان ہے اور فاسق وفاجر ہے، پابند صوم وصلوۃ نہیں ہے، حلال وحرام کا پابند نہیں ہے تو وہ دینی لحاظ سے عورت کا کفو نہیں ہے، ایسے مرد سے عورت بلا اجازت ولی نکاح نہیں کر سکتی اگر کرے گی تو ایک روایت میں نکاح نہیں ہوگا، دوسری روایت میں نکاح تو منعقد ہو جائے گا مگر ولی کو فسخ کرانے کا اختیار ہوگا۔ ہاں ولی کی رضامندی واجازت سے نکاح غیر کفو میں جائز ہے مگر اس طرح نکاح میں دین کی رو سے چین وسکون الفت ومحبت کی زندگی نصیب نہ ہوگی، نہ ہی صحیح معنی میں ازدواجی زندگی کا لطف اور مزہ آئے گا۔

(۴) کفاءت فی الحرفہ:

یعنی عورت کسی خاص اور عمدہ پیشہ والے خاندان سے تعلق رکھتی ہے تو اس کے لئے کسی اچھے پیشے والے مرد کے نکاح میں ہونا مناسب ہے کسی گھٹیا درجے کے پیشہ والا مرد اچھے پیشے والی عورت کے لئے برابر اور کفو نہیں ہے۔

مثلاً تاجر برادری کی عورت ہے اور مرد کا بھی وہی پیشہ ہے یا اس سے ملتا جلتا ہے غرض دونوں گھرانوں کی تجارت کا پیشہ قریب قریب ہے، ایک کی تجارت اجناس کی ہے دوسرے کی تجارت کپڑے کی ہے یا دوسری اشیاء کی ہے تو وہ ایک دوسرے کا کفو اور برابر ہے، اسی طرح لڑکی تعلیمی پیشہ ور سے تعلق رکھتی ہے اور مرد بھی اسی شعبہ تعلیم سے تعلق رکھنے والا ہے تو وہ ایک دوسرے کا کفو ہیں خواہ تعلیمی نوعیت میں فرق بھی کیوں نہ ہو۔

البتہ اگر لڑکی تجارت اور عام اشیاء زندگی کی دکانداری والے خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور مرد نائی کی دکان، دھوبی کی دکان والے کاروبار سے تعلق رکھتا ہے تو یہ ایک دوسرے کے کفو نہیں ہیں، کیونکہ عرف ورواج میں اس قسم کے پیشے کو گھٹیا درجہ کا پیشہ سمجھا جاتا ہے۔

زمیندار خاندان کی عورت زمیندار مرد کے خاندان کا کفو ہے یا پھر یہ اور تجارت پیشہ خاندان سے ہے تو ایک دوسرے کے کفو ہیں۔

لہٰذا جب عورت اور لڑکی کا نکاح ہو مرد کے پیشہ کو بھی دیکھنا چاہئے کہ عورت کے خاندان کے مساوی اور برابر کے پیشہ سے تعلق رکھتا ہے یا گھٹیا درجہ کے، اسی طرح یہ کہ تعلیم یافتہ خاندان سے ہے یا ان پڑھ اور غیر تعلیم یافتہ خاندان سے، اگر بالغہ عورت کسی وجہ سے بدون اجازت ولی غیر کفو خاندان سے نکاح کرتی ہے پھر بعد میں اگر ولی اجازت دے دے تو نکاح ہو جائے گا، اگر اجازت نہ دے تو اس میں بھی احناف کی دو روایتیں ہیں، ایک روایت میں نکاح منعقد ہے اور دوسری روایت میں نکاح منعقد نہیں، البتہ ولی کو بذریعہ عدالت فسخ کرانے کا اختیار ہو گا۔

(۵) کفاءت فی المال:

یعنی عورت اگر مالدار خاندان سے ہے تو مرد کا بھی مالدار خاندان سے ہونا معتبر ہے، ایسا نہ ہو کہ عورت تو مالدار خاندان سے ہو مگر مرد انتہائی غریب خاندان کا ہو جو نہ نان ونفقہ ادا کر سکتا ہو نہ حق مہر ادا کرنے کی استطاعت رکھتا ہو، غرضیکہ جس انداز سے عورت مالدار خاندان سے تعلق رکھتی ہے مرد کا بھی اسی انداز کے یا

اس کے قریب قریب مالدار خاندان سے ہونا معتبر ہے اور اگر مرد کا خاندان مالی لحاظ سے اونچا ہے تو پھر اعتراض کی بات ہی نہیں ہے بلکہ اچھی بات ہے، مگر مرد کا تعلق اس قدر کم تر خاندان سے نہیں ہونا چاہئے کہ عورت کا مناسب نان ونفقہ اور مہر ادا نہ کر سکے پھر ایسا مرد عورت کا کفو نہیں بلکہ غیر کفو ہوگا۔

یہاں اس وضاحت کی ضرورت ہے کہ مالی اعتبار سے مرد کی حیثیت عورت کے برابر یا قریب قریب ہونا جو بتلایا گیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ مرد عورت کی حیثیت کے مطابق نان ونفقہ و دیگر خرچہ دے سکے تا کہ دونوں کے درمیان موافقت ہم آہنگی الفت ومحبت تادم آخر باقی رہے، مالی پریشانی کی وجہ سے عدم موافقت کا سامنا کرنا نہ پڑے اور یہ صرف نکاح کے وقت دیکھا جائے گا نکاح کے بعد جو بھی حال پیش آئے گا دونوں اس حال کے موافق زندگی گزارنے کے پابند ہوتے ہیں۔

مرد کے لئے عورت کے ساتھ مالداری میں ہر پہلو سے برابری ضروری نہیں ہے، یعنی عورت ارب پتی ہے تو مرد ارب پتی ہو یا عورت کروڑ پتی ہے تو مرد بھی کروڑ پتی ہو، بلکہ اتنا مال اس کے پاس ہو کہ ارب پتی خاندان کی عورت کے حال کے مطابق نان ونفقہ اور حق مہر وہ دے سکے خواہ وہ ارب پتی نہ ہو کروڑ پتی ہو، یا کروڑ پتی نہ ہو، لاکھ پتی ہو، یا عورت تو لاکھ پتی خاندان سے ہے مگر مرد لاکھ پتی خاندان سے نہیں اس سے کمتر ہے، مگر وہ عورت کی حیثیت کے مطابق نان ونفقہ دے سکتا ہے اور اس کا مہر مثل ادا کر سکتا ہے تو پھر یہ مرد مذکورہ عورت کا کفو ہے۔

(۶) کفاءت فی الحریہ

یعنی عورت آزاد خاندان سے ہے تو مرد کا بھی آزاد خاندان سے ہونا چاہئے، اگر عورت آزاد ہے اور مرد غلام خاندان سے ہے تو یہ ایک دوسرے کا کفو نہیں ہیں، البتہ ولی کی رضامندی سے عورت اگر راضی و خوشی کسی دوسری مصلحت کے پیش نظر غیر کفو یعنی غلام سے نکاح کرلے تو یہ جائز ہے۔

غرض مذکورہ امور یعنی نسب، حسب، شرافت و دینداری، بزرگی، حرفہ اور پیشہ، مالداری اور حریت و غلامی میں کفو کا اعتبار ہے، ولی اگر اپنی ماتحت عورت کا نکاح کرے تو مذکورہ تمام اشیاء میں مرد کی برابری کو دیکھے یا ان میں سے زیادہ امور میں برابری کو دیکھے پھر نکاح کرے، اسی میں سارے مصالح ہیں اس کے خلاف کرنا خلاف مصلحت وخلاف حکمت ہے۔

کفاءت کا فائدہ

اوپر لکھا گیا ہے کہ عاقلہ بالغہ لڑکی اور اس کے ولی کے لئے مناسب یہ ہے کہ نکاح سے قبل مرد میں

عورت کے ساتھ کفو اور مماثلت والی صفات کو دیکھے، پھر استخارہ واستشارہ (مشورہ) کرے، اس کے بعد نکاح کی بات کرے کیونکہ مماثلت اور کفو والی اشیاء کا دیکھنا نکاح کے مصالح اور فوائد کی غرض سے بہت ضروری ہے۔ ازدواجی زندگی، گھریلو معاملات اور چال چلن میں پھر بچوں میں انہی امور کی وجہ سے موافقت ہوتی ہے اور انہی امور کے خلاف ہونے کی وجہ سے بعض دفعہ مخالفت اور مخاصمت پیدا ہوجاتی ہے یہاں تک کہ ازدواجی رشتہ ختم ہونے کی نوبت آتی ہے، لہٰذا جہاں تک ممکن ہو مرد کے اندر کفاءت والے امور مذکورہ کا دیکھنا بہت ہی ضروری ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

کفاءت کو دیکھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جہاں کفاءت والے امور پائے جائیں تو نکاح صحیح ہے اور جہاں کفاءت والے امور نہ ہوں وہاں پر نکاح صحیح نہیں ہوتا، یا غیر کفو میں نکاح کرنے سے وہ منعقد ہی نہیں ہوتا جیسا کہ عام طور سے لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ بعض لوگ یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ غیر خاندان اور غیر برادری میں نکاح ہی نہیں ہوتا کیونکہ وہ غیر کفو ہیں۔

یہ سب خیالات وشبہات بے بنیاد ہیں، علم دین سے واقفیت کی کمی کی علامت اور جاہلانہ تخیلات و رسومات ہیں کیونکہ کفاءت کا اعتبار مصالح نکاح اور اسکے فوائد کے لئے ہے، عام طور سے زوجین کے درمیان اتفاق واتحاد انہی امور سے پیدا ہوسکتا ہے مگر یہ امور شرائط نکاح میں سے نہیں ہیں کہ جہاں یہ امور نہ ہوں وہاں نکاح ہی نہیں ہوتا اور میاں بیوی میں اتفاق واتحاد پیدا نہیں ہوسکتا، تجربہ اور مشاہدہ سے ظاہر ہے کہ اکثر مرد اور عورت کے درمیان خلاف کفو میں نکاح کے باوجود اتفاق واتحاد پیدا ہوا ہے اور اس طرح کا نکاح اسلام میں اس سے قبل بھی ہوا ہے، قرآن وسنت نے بین الزوجین کفاءت کو کوئی فرض، واجب یا شرائط نکاح میں سے قرار نہیں دیا کہ کفاءت نہ ہو تو نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ ولی اور عاقلہ وبالغہ عورت کی رضامندی سے اگر غیر کفو میں نکاح کیا جاتا ہے تو وہ منعقد ہوجاتا ہے، اگر کفاءت فرض یا واجب امور میں سے ہوتی یا شرائط میں داخل ہوتی تو سرے سے نکاح منعقد ہی نہ ہوتا یا کم از کم نکاح ناقص ہوتا مگر ایسا نہیں ہے بلکہ ایسا نکاح بلا کسی کراہت کے منعقد ہوجاتا ہے، اور دین اسلام آنے کے بعد بہت سے نکاح اس طرح ہوئے ہیں مثلاً بنات رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے حضرت رقیہؓ اور ام کلثومؓ کا نکاح حضرت عثمانؓ سے ہوا جو کہ نسب کے لحاظ سے بنات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کمتر تھے اس کے باوجود سادات عورتوں کا نکاح اموی خاندان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ بنت قیسؓ کے لئے دین کی بنیاد پر اسامہ بن زیدؓ کو پیغام نکاح دیا تھا حالانکہ فاطمہ بنت قیسؓ قریش خاندان میں سے تھیں، اسامہؓ نسب کے لحاظ سے فاطمہؓ کا کفو نہ تھے، کیونکہ اسامہؓ آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہؓ کے صاحبزادے تھے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے اپنی بہن کا نکاح دین کی بنیاد پر حضرت بلالؓ سے کردیا تھا جب کہ دونوں میں کفاءت کا معاملہ نہ تھا، حضرت بلالؓ حبشی غلام تھے۔ حضرت ابوحذیفہؓ نے اپنی بھتیجی کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام سے کیا تھا، یہ سب نکاح صحابہ کرامؓ نے اور بعض خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں کئے تھے۔ (دیکھئے فتح القدیر ص ۱۸۷، ج ۳)

کفاءت کا مسئلہ فرض واجب کا مسئلہ نہیں اسی وجہ سے امام دارالھجت امام مالک بن انسؒ، سفیان ثوری رحمہ اللہ اور احناف میں سے امام کرخی رحمہ اللہ وغیرہ حضرات نے نکاح میں اعتبار کفاءت کا مطلقاً انکار کیا ہے، وہ کہتے ہیں عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے، صحیحین کی حدیث شریف میں اس کی تصریح موجود ہے، اسلام میں کسی کو اگر دوسرے پر فضیلت ہے تو تقویٰ اور دین کی بنیاد پر ہے، یہ بھی قرآن و سنت سے منصوص ہے، اور کون زیادہ متقی اور بزرگ ہے اس کا واقعی فیصلہ بھی آخرت میں ہوگا: ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (اللہ کے ہاں سب سے مکرم وہ ہے جو سب سے بڑا متقی ہے) حقیقت یہی ہے کہ کفاءت کا مسئلہ درجہ سنت واستحباب میں ہے، اس کی رعایت امت کے فائدے کے لئے کی گئی ہے کہ باہمی اتفاق واتحاد کے اسباب موجود ہوں تو موافقت اور ہم آہنگی آسان ہوتی ہے، لیکن کبھی اس کے بغیر بھی موافقت اور ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے وہ دین اور دینداری سے، لہٰذا دوسرے امور میں اگر نقصان بھی ہو مثلاً نسب، مال، پیشہ کے لحاظ سے مرد اگر عورت سے کمتر اور ناقص ہو اور ظاہری طور پر دینی اعتبار سے عورت کے برابر یا اس پر مرد کو برتری حاصل ہے تو ایسے غیر کفو میں نکاح بلا کراہت جائز ہے، شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے اوپر کی امثالیں اس کی دلیل ہیں۔

اس پر ایک دوسری حدیث بھی مؤید موجود ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر لڑکی کے نکاح کے لئے تمہیں کوئی ایسا لڑکا مل جائے کہ اس کے دین واخلاق پر تم خوش اور راضی ہو تو وہاں لڑکی کا نکاح کردو اور اگر ایسا نہیں کیا تو اس سے بڑا فساد پیدا ہوگا۔

معلوم ہوا کہ کفاءت میں جن امور کا ذکر کیا جاتا ہے اگر اتفاق سے مرد کے اندر سب چیزیں موجود ہوں تو بہت ہی بہتر ہے ایسے موقع پر نکاح نہ کرنا غلط ہے، لیکن اگر سب امور میں برابری نہ بھی ہو صرف ضرورت کی حد تک وہ امور مرد میں موجود ہوں اور دین میں عورت کا کفو یا اس سے زیادہ دینداری ہو تو

نکاح کر دینا چاہئے۔

۵: پانچویں سوال کا جواب بھی ضمناً اوپر کی تحریر سے معلوم ہوگیا مگر مزید تفصیلات کے لئے حوالے کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ کوئی عاقلہ بالغہ غیر کفو میں خود نکاح کرتی ہے یا اس کا ولی کرتا ہے تو اس کی مختلف صورتیں ہیں، ہر صورت کا جواب ملاحظہ فرمایئے۔

الف: ولی نے عاقلہ و بالغہ عورت کا نکاح اس کی رضامندی سے اگر غیر کفو میں کیا ہے تو نکاح بالاتفاق منعقد اور لازم ہو جاتا ہے۔

ب: ولی اگر عاقلہ و بالغہ عورت کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر کرتا ہے تو نکاح بالاتفاق منعقد نہیں ہوتا۔

ج: عاقلہ و بالغہ عورت اگر ولی کی رضامندی سے نکاح غیر کفو میں خود یا کسی اور کے توسط سے کرتی ہے تو نکاح بالاتفاق منعقد ہو جاتا ہے، اس میں کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہوتا۔

د: عاقلہ و بالغہ عورت اگر بدون اجازت ولی کفو میں نکاح کرتی ہے تو نکاح منعقد ہو جاتا ہے، مگر بدون اجازت ولی اس طرح نکاح کرنا مکروہ اور بے حیائی اور بدتہذیبی کی بات ہے، عورتوں کو بلاضرورت شدیدہ ایسا نہیں کرنا چاہئے اور اگر اس نے غیر کفو میں بدون اجازت ولی نکاح کیا ہے مگر بعد نکاح ولی نے اجازت دی ہے تو یہ نکاح بھی منعقد ہے مگر اس طرح پیشگی اجازت ولی کے بغیر نکاح کرنا یہ بھی مکروہ، بے حیائی اور بدتہذیبی ہے۔

و: عاقلہ و بالغہ عورت کا اگر ولی موجود نہیں یا فاتر العقل ہے اس نے خود یا بذریعہ عدالت اگر غیر کفو میں مگر اپنے سے زیادہ دیندار آدمی سے نکاح کیا ہے یا برابر یا کمتر دیندار سے نکاح کیا ہے تو نکاح منعقد ہے، کسی کو اس میں اعتراض کا حق نہیں۔

ز: عاقلہ و بالغہ عورت کا ولی کافر یا سوء الاختیار فاسق و بددین ہے، وہ کسی کافر یا بددین شخص سے اس کا نکاح کرنا چاہتا ہے لیکن عورت نے خود یا بذریعہ عدالت غیر کفو میں کسی دیندار مرد سے نکاح کیا تو یہ نکاح منعقد ہے۔

مذکورہ سب صورتوں میں نکاح منعقد اور لازم ہو جاتا ہے احکام نکاح لازم ہو جاتے ہیں مگر بعض لوگ غلط فہمی یا لاعلمی کی بنیاد پر ان صورتوں میں کسی نکاح کو ناجائز تصور کرتے ہوئے اعتراض کرتے ہیں اور گڑبڑ کرتے ہیں، اس واسطے اس کو خوب سمجھ لینا ضروری ہے، مذکورہ بالا احوال میں قرآن وحدیث اور فقہ

اسلامی کی رو سے نکاح صحیح، درست اور نا قابل تنسیخ ہوتا ہے۔

ح: البتہ عاقلہ و بالغہ عورت نے اگر بدون اجازت ولی غیر کفو میں نکاح کیا ہے اور اس کے پاس شرعی اعذار میں سے کوئی عذر نہیں ہے، ولی نے نکاح کے بعد بھی اجازت نکاح نہیں دی بلکہ اس پر معترض ہے تو ایسا نکاح منعقد ہوتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں ائمہ احناف سے دو روایات منقول ہیں۔

۱: امام اعظمؒ امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کے آخری قول کے مطابق ظاہر روایت یہ ہے کہ نکاح تو منعقد ہو جاتا ہے اور احکام نکاح بھی اس پر عائد ہوتے ہیں طلاق، نان ونفقہ، توارث، نسب وغیرہ سب شرعی احکام جاری ہوتے ہیں البتہ ولی کو فسخ نکاح کا اختیار ہوتا ہے، لہٰذا وہ چاہے تو بذریعہ عدالت نکاح فسخ کرا سکتا ہے، بہت سے مشائخ نے اسی روایت کو اختیار کیا ہے اور اسی پر فتویٰ دیا ہے۔

۲: امام ابوحنیفہؒ سے امام حسن بن زیاد رحمہ اللہ کی نادر الروایۃ یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا اور اکثر مشائخ نے اسی کو اختیار کیا ہے اور اسی کے مطابق فتویٰ دیا ہے۔

اور اس کی وجہ ان مشائخ کا ان نصوص اور روایات سے انکار نہیں ہے جن نصوص و روایات سے عاقلہ و بالغہ عورت کو نکاح کا اختیار معلوم ہوتا ہے، بلکہ انہوں نے ان سب نصوص و روایات کو تسلیم کرتے ہوئے زمانے کے بعض حالات کی بنا پر سدًا للذّرائع عدم انعقاد نکاح کا فتویٰ دیا ہے۔ اور وہ حالات یہ ہیں کہ بہت سے ولی ایسے ہیں جو عدالت اور اس کے طریق کار سے ناواقف ہیں اور بہت سے قاضی اور عدالت کے جج ظالم اور رشوت خور ہوتے ہیں صحیح فیصلہ ممکن نہیں ہو پاتا، لہٰذا اگر فسخ نکاح کے معاملہ کو ضروری قرار دیا جائے تو اس سے بڑی گڑبڑ اور پریشانی ہوگی اور فیصلہ بھی صحیح نہ ہوگا، حالات متغیرہ کی بناء پر وہ عدم انعقاد نکاح پر فتویٰ دیتے ہیں تاکہ عورتوں کی جانب سے غیر کفو میں نکاح کا سلسلہ ختم ہو جائے۔

ان دونوں روایات پر مشائخ احناف کے فتوے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

فتاویٰ قاضی خاں میں ہے

اذا زوجت المرا ۃ نفسها غیر کفؤ کان للاولیاء من العصبة حق الفسخ ولا یکون الفسخ لعدم الکفاء ۃ الا عند القاضی لانه مجتهد فیه و کل واحد من الخصمین یتمسک بنوع دلیل و بقول عالم فلا تنقطع الخصومة الا بفصل من له ولا یة علیهما کالفسخ بخیار البلوغ والرد بالعیب.

(ج ۱، ص ۳۵۱ حاشیہ عالمگیری)

مطلب اگر عورت نے غیر کفو میں اپنا نکاح کیا ہے تو ولی کو فسخ نکاح کا اختیار ہوگا، کیونکہ عدم کفاءت میں ولی کو ایک قسم کی عار اور شرمندگی ہوتی ہے لہٰذا وہ اسی بنیاد پر فسخ کرنا چاہے تو قاضی کے پاس مرافعہ کر کے نکاح فسخ کراسکتا ہے، قاضی کے پاس مرافعہ کے بغیر نکاح فسخ نہ ہوگا کیونکہ مسئلہ اختلافی ہے ہر فریق اپنے دعوی میں دلیل دے گا، کہ میں حق پر ہوں اور اپنے دعوی میں اپنے پسند کے عالم کے قول کو پیش کرے گا اس وجہ سے عدالت میں مرافعہ کے بغیر فیصلہ ممکن نہ ہوگا جیسا کہ خیار بلوغ میں اور عیب کی وجہ سے فسخ عقد بیع میں بھی مرافعہ ضروری ہوتا ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے

ثم المراة اذازوجت نفسها من غير كفو صح النكاح فى ظاهر الرواية عن ابى حنيفة وهو قول ابى يوسف آخرًا وقول محمد آخراً ايضا حتى ان قبل التفريق يثبت فيه حكم الطلاق والظهار والا يلاء والتوارث وغير ذالک ولكن للاولياء حق الا عتراض وروى الحسن عن ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ ان النكاح لاينعقد وبه اخذ كثير من مشائخنا رحمهم الله تعالىٰ كذا فى المحيط والمختار فى زماننا للفتوىٰ رواية الحسن وقال الشيخ الامام شمس الائمة السرخسى: رواية الحسن اقرب الى الا حتياط كذا فى فتاوىٰ قاضيخان فى فصل شرائط النكاح وفى البزازية ذكر برهان الائمة: ان الفتوىٰ فى جواز النكاح بكراً كانت اوثيباً على قول الامام الاعظم وهذا اذا كان لها ولى فان لم يكن صح النكاح اتفاقًا كذا فى النهر الفائق ولايكون التفريق بذلک الا عند القاضى امابدون فسخ القاضى فلاينفسخ النكاح بينهما وتكون هذه فرقة بغير طلاق. (ج ۱، ص ۲۹۲)

مطلب: پس جب عاقلہ بالغہ عورت نے اپنا نکاح کسی غیر کفو مرد سے کرلے تو امام اعظم رحمہ اللہ سے مروی ظاہر روایت اور امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہ اللہ دونوں کے آخری قول کے مطابق نکاح منعقد ہوجاتا ہے (البتہ ولی کو حق اعتراض ہے جیسا کہ معلوم ہو چکا) جب تک بذریعہ عدالت نکاح فسخ نہیں کیا جاتا اس سے قبل نکاح کے سب احکام ثابت ہوں گے طلاق، ظہار، ایلاء وراثت وغیرہ کے احکام نافذ ہوں گے امام حسن بن زیاد رحمہ اللہ کی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے غیر ظاہر روایت یہ ہے کہ نکاح منعقد ہی نہ ہوگا اسی روایت کو ہمارے احناف کے بہت سے مشائخ نے لیا ہے کذا فی المحیط۔ اور اس زمانے میں فتویٰ

کے لئے مختار روایت یہی ہے شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ نے کہا حسن بن زیاد رحمہ اللہ کی روایت احتیاط کے قریب ہے کذافی قاضیخان اور فتاویٰ بزازیہ میں برہان الائمہ رحمہ اللہ سے ذکر کیا ہے کہ فتویٰ امام اعظم رحمہ اللہ کی ظاہر روایت پر ہے کہ عاقلہ بالغہ عورت کا نکاح منعقد اور لازم ہے۔

عالمگیری کی عبارت سے واضح ہے کہ شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ کا مختار قول اور مفتی بہ روایت یہ ہے کہ نکاح غیر کفو میں منعقد نہیں ہوتا جب کہ بزازیہ کی روایت کے مطابق برہان الائمہ رحمہ اللہ کا فتویٰ یہ ہے کہ نکاح منعقد ہے البتہ ولی ہونے کی صورت میں اسے فسخ کا اختیار ہوگا اور ولی نہ ہونے کی صورت میں نکاح جوں کا توں برقرار رہے گا صاحب نہر فائق کی رائے بھی یہی ہے کہ بدون قضائے قاضی نکاح فسخ نہ ہوگا۔

اور اختلاف مذکورہ تو جب ہے کہ عاقلہ بالغہ عورت کا کوئی ولی موجود ہو مگر کسی عورت کا اگر ولی موجود نہ ہو (یا ولی سوء الاختیار ہو) تو غیر کفو میں اس کا کیا ہوا نکاح صحیح اور لازم ہے، اس پر سب کا اتفاق ہے کذا فی النہر الفائق اور اگر ولی کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر غیر کفو میں عورت نے نکاح کیا ہے تو اس کی تفریق بدون قضائے قاضی نہیں ہوگی اور جب تفریق ہوگی اور نکاح فسخ ہوگا تو فسخ نکاح طلاق کے حکم میں نہ ہوگا۔

ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں ہے

قوله: واذا زوجت المراة نفسها من غير كفؤ فللا ولياء..... ان يفرقوا بينهما دفعا للعار عن انفسهم مالم يجئى من الولى دلالة الرضا كقبض المهر او النفقة (الى قوله) ولا تثبت هذا الفرقة الابالقضاء لانه مجتهد فيه و كل من الخصمين يتشبث بدليل فلاينقطع النزاع الابفصل القاضى والنكاح قبله صحيح يتوارثان به اذا مات احدهما قبل القضاء هذا على ظاهر الرواية اماعلى الرواية المختارة للفتوىٰ لايصح العقد اصلا. (ج ۳، ص ۱۸۲)

اگر عاقلہ بالغہ عورت نے غیر کفو میں خود اپنا نکاح کیا تو اولیاء کو زوجین کے درمیان تفریق کرا دینے کا حق ہوگا بسبب دفع عار کے ان کی طرف سے اور یہ تب ہے کہ ولی نے نکاح پر رضامندی ظاہر نہ کی ہو یا ایسا معاملہ نہ کیا ہو جو رضامندی پر دلالت کرتا ہو مثلاً حق مہر پر قبضہ کرنا یا نفقہ کا مطالبہ کرنا وغیرہ وغیرہ.... (پھر کہا) اولیاء کو جو تفریق کا حق ہے وہ تفریق بھی قاضی کے پاس مرافعہ کے ذریعہ ہوگی، کیونکہ مسئلہ اختلافی ہے پھر اس میں زوجین میں سے ہر فریق اپنی طرف سے دلیل دیتا رہے گا اس طرح بلا مرافعہ الی

القاضی نزاع ختم نہ ہوگا جب تک فیصلہ نہیں ہوتا نکاح صحیح ہے، ان میں نکاح کے احکام جاری ہوں گے یہاں تک کہ ان میں سے کسی کا اگر تفریق سے قبل انتقال ہو گیا تو زوجین کے درمیان وراثت کا حکم جاری ہوگا اور یہ جو لکھا گیا ہے ظاہر روایت کے مطابق ہے لیکن فتویٰ کے لئے مختار روایت کے مطابق ایسی حالت میں نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا۔

اور بحرالرائق شرح کنزالدقائق میں لکھا ہے

قوله: من نكحت غير كفؤ فرق الولي لما ذكرنا وهذا ظاهر في انعقاده صحيحا وهو ظاهر الرواية عن الثلثة ..... وان المفتى به رواية الحسن عن الامام من عدم الانعقاد اصلا. (الى ان قال) وفي الخلاصة وكثير من مشائخنا افتوا بظاهر الرواية انها ليس لها ان تمنع نفسها اه. وهذا يدل على ان كثيرا من المشائخ افتوا بانعقاده فقد اختلف الافتاء. (ج ۳، ص ۱۲۸)

مطلب یہ ہے کہ ”غیر کفو میں عورت اگر بدون اجازت ولی نکاح کرلے تو ظاہر الروایۃ میں ہے کہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک نکاح منعقد ہو جائے گا، البتہ حسن بن زیاد رحمہ اللہ عن ابی حنیفہ رحمہ اللہ کی رو سے نکاح منعقد نہیں ہوگا اور اس پر فتویٰ دیا گیا ہے، لہٰذا ولی بذریعہ عدالت ان میں تفریق کرا سکے گا، خلاصۃ الفتاویٰ سے نقل کیا ہے کہ بے شمار مشائخ نے ظاہر الروایہ پر فتویٰ دیا ہے یعنی ایسا نکاح منعقد ہو جائے گا اور عورت کے لئے جائز نہیں ہوگا کہ شوہر اگر ملنا چاہے تو اسے منع کرے، اس سے معلوم ہوا کہ اکثر مشائخ نے ظاہر الروایۃ کے مطابق انعقاد نکاح کا فتویٰ دیا ہے، جس سے ظاہر ہوا کہ فتوی دینے میں مشائخ کے درمیان اختلاف ہوا ہے اور دونوں روایتوں پر مشائخ نے فتویٰ دیا ہے۔“

اس کا حاصل یہ نکلا کہ غیر کفو میں اگر عاقلہ وبالغہ عورت نے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا ہے تو بعض مشائخ کے نزدیک حسنؒ کی روایت کی رو سے نکاح منعقد نہیں ہوا اور انہوں نے اس پر فتویٰ دیا ہے اور بعض مشائخ نے ظاہر الروایہ پر فتویٰ دیا اور کہا کہ نکاح تو منعقد ہو جاتا ہے ان پر احکام نکاح لاگو ہو جاتے ہیں البتہ ولی چاہے تو بذریعہ عدالت نکاح فسخ کرا سکتے ہیں۔

تفریق نکاح کی مختلف صورتیں پیش آسکتی ہیں:

(الف): یہ کہ زوجین کے درمیان زن وشوہر کے تعلقات قائم ہوئے پھر تفریق ہوئی۔

(ب): یا ابھی تک فریقین کے درمیان ازدواجی تعلق قائم نہیں ہوا نہ خلوت صحیحہ ہوئی،

بحرالرائق میں ہر دونوں صورتوں کا حکم یوں بیان کیا ہے:

واذا فرق القاضی بینهما فان کان بعد الدخول فلها المسمی وعلیها العدة ولها النفقة فیها والخلوة الصحیحة کالدخول وان کان قبلهما فلامهر لها لان الفرقة لیست من قبله هکذا فی الخانیة. (ج ۳، ص ۱۲۹)

مطلب یہ کہ غیر کفو میں ہونے والے نکاح پر ولی کے اعتراض کرنے پر قاضی نے اگر زن وشوہر کے درمیان تفریق کردی تو یہ تفریق اگر جماع کے بعد ہوئی ہے تو عورت کو مہر معین ملے گا اور اسکے لئے عدت کا نان ونفقہ بھی شوہر پر لازم ہوگا اور یہی حکم خلوت صحیحہ کا بھی ہے اور اگر قاضی کی تفریق قبل الدخول ہوئی ہے تو عورت کو کوئی مہر نہیں ملے گا، کیونکہ فرقت شوہر کی جانب سے نہیں ہوئی بلکہ عورت کے ولی کی جانب سے ہوئی ہے کذا فی الخانیہ۔

فتاویٰ التاتارخانیہ میں ہے:

امراة زوجت نفسها من غیر الکفو بغیر رضا الولی فلها ان تمنع نفسها من الزوج ولا تمکنه من وطئها وفی الولوالجیة: حتی یرضی الولی وفی الحاوی: سئل ابوبکر عنه فقال :النکاح قد انعقد لایحل للمراة ان تمنع نفسها منه ولولیها ان یخاصمه وبه ناخذ وهذا الجواب خلاف ظاهر الروایة وکثیر من مشائخنا من قالوا بجواز هذا النکاح وافتوا بظاهر الروایة وقالوا لیس لها ان تمنع نفسها من زوجها.

”اگر (عاقلہ وبالغہ) عورت نے بدون اجازت ولی غیر کفو میں اپنا نکاح کرلیا تو اسے حق ہے کہ شوہر کو ملنے سے منع کرے اور شوہر کو مباشرت کا موقع نہ دے فتاویٰ ولوالجیہ میں ہے کہ جب تک ولی اجازت نہ دے تب تک روکتی رہے اور حاوی اللفتاویٰ میں ہے کہ شیخ ابوبکر رحمہ اللہ سے اس مسئلہ کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ نکاح منعقد ہوگیا ہے، جس کے بعد عورت کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ شوہر کو اپنے سے روکے اور ولی کو فسخ نکاح کے بارے میں عدالت میں مخاصمت کرنے کا اختیار ہے اور ہم اسی کو اختیار کرتے ہیں اور یہ روایت ظاہر الروایہ کے خلاف ہے اور ہمارے مشائخ میں سے بہت سوں نے ظاہر الروایۃ پر فتویٰ دیا ہے اور کہا ہے کہ عورت کو اس بات کا اختیار نہیں ہے کہ نکاح منعقد ہوجانے کے بعد شوہر کو ملنے سے منع کرے۔“

واضح رہے کہ غیر کفو میں عاقلہ وبالغہ بدون اجازت ولی اگر نکاح کرلیتی ہے تو اس کے جواز وعدم

جواز یعنی انعقاد نکاح وعدم انعقاد نکاح کے بارے میں ائمہ احناف کی دونوں قسم کی روایات کو آپ نے پڑھ لیا ہے اور یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ دونوں روایتوں پر اکابرین ومشائخ احناف کے فتاویٰ موجود ہیں۔

ظاہر روایت پر ہمارے برصغیر کے اکابر

فقہاء ومفتیین کے چند فتوے:

کتب فقہ وفتاویٰ میں متقدمین اکابر مشائخ کی تصریحات کے بعد اب متاخرین فقہائے احناف کے چند فتاویٰ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

۱: ابوحنیفہ وقت حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی کا فتویٰ:

غیر کفو میں نکاح کے سلسلہ میں ایک سوال کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا:

"صورت مندرجہ مسئلہ ہذا میں اولیاء کو حق فسخ نکاح ہے اور وہ کسی حاکم یا قاضی مسلمان سے رجوع کریں کہ وہ فسخ کرے، مفتی کو حنفیہ کے نزدیک بغیر تحکیم طرفین اختیار فسخ نکاح نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم"۔ کتبہ الاحقر بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ۔

الجواب صحیح
محمد عفی عنہ دیوبند

الجواب صحیح
منفعت علی مدرس اول

مدرسہ عالیہ عربیہ دیوبند

جواب مجیب اول صحیح ہے اولیاء کو اختیار فسخ نکاح ہے۔ عزیز الرحمٰن دیوبندی۔ (فتاویٰ رشیدیہ ص ۳۸۸)

۲: دار العلوم دیوبند کے مفتی اول حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کا جواب بھی اس میں آگیا ہے، دوسرا فتویٰ عدم انعقاد نکاح کا بھی ہے۔ (فتاویٰ دار العلوم۔ ج۸، ص ۱۸۱ و ۱۸۵)

۳: دار العلوم دیوبند کا دوسرا فتویٰ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جواب۔

سوال ۲۴۶: دختر نظام الدین نے خود جس کی عمر رجسٹرڈ تیس سال لکھی ہے اپنا نکاح ایک شخص سے کرلیا اس کے بعد لڑکی کے والدین نے جبراً نکاح لڑکی مذکورہ کا دوسری جگہ کردیا، پہلا نکاح صحیح ہوگا یا دوسرا؟

جواب: جب کہ لڑکی عاقلہ بالغہ ہے تو دوسرا نکاح جو والد نے جبراً کیا ہے قطعاً باطل ہے، کیونکہ بالغہ عاقلہ کا نکاح جبراً کرنے کا کسی کو اختیار نہیں (کذا فی الھدایہ وغیرہا) اور پہلا نکاح جو لڑکی نے خود بلا اجازت باپ کے کیا ہے وہ اگر اپنے کفو میں مہر مثل کے مطابق کیا ہے تو نافذ ومکمل ہوگیا، اب اس کو کوئی

فسخ نہیں کرا سکتا، البتہ اگر نکاح اپنے کفو میں نہیں کیا تھا یا مہر مثل سے کم میں نکاح کرلیا ہے تو باپ کو اس نکاح کے فسخ کرانے کا شرعاً اختیار حاصل ہے اور وہ بھی اس طرح کہ حاکم مسلمان کے یہاں درخواست دے کر کے فسخ نکاح کا حکم حاصل کرے؛ **لما قال فی الهداية ويشترط فيه القضاء.** اور پھر بھی دوسری جگہ نکاح کرنے کا کوئی حق بغیر لڑکی کی رضا کے نہیں۔

(فتاویٰ دارالعلوم کامل مبوب فقہی ترتیب جدید ایڈیشن ج ۲، ص ۵۳۲)

۴: حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ کا فتویٰ:

سوال: اگر لڑکی بالغہ کا نکاح فی الحقیقت اس کے کفو میں ہو لیکن اس کے اولیاء شرعی اپنے خیال میں اپنا کفو نہیں سمجھتے ہیں اور اس وجہ سے ایسے نکاح پر نارضامندی ظاہر کرتے ہیں تو یہ نکاح برخلاف رضامندی ان کے جائز ہوا یا نہیں؟

الجواب: **فی الدر المختار: وله ای للولی اذا كان عصبة الاعتراض فی غير الكفو فيفسخه القاضی. فی رد المحتار فلاتثبت هذه الفرقة الا بالقضاء لانه مجتهد فيه.**

اس سے معلوم ہوا کہ یہ نکاح تو جائز ہوگیا البتہ اگر ولی اس کو غیر کفو سمجھتا ہے تو قاضی یعنی حاکم مسلم کے اجلاس میں رجوع کرے اس کی تحقیق میں اگر وہ غیر کفو ہوگا اور وہ فسخ کردے گا تو فسخ ہوجائے گا ورنہ بدون حکم حاکم مسلم کے فسخ نہ ہوگا۔ فقط (امداد الفتاویٰ ج ۲، ص ۳۵۷، ۲۵۸)

اس کے علاوہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ سے عدم انعقاد کا فتویٰ بھی ہے اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن سے بھی عدم انعقاد کا فتویٰ منقول ہے، ہم نے حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب رحمہ اللہ کو بھی دیکھا ہے کہ حالات کو دیکھ کر دونوں طرح کا فتویٰ دیا کرتے تھے۔

اس وقت بندہ راقم الحروف اس بات کو بہتر خیال کرتا ہے کہ ایسے حالات میں مختلف فتویٰ دینے کی بجائے ظاہر روایت پر فتویٰ دینا چاہئے اور ہمارے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن سے اب اسی پر فتویٰ دیا جاتا ہے، اس کی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱: عاقلہ و بالغہ عورت نے جو نکاح بلا اجازت ولی کیا ہے وہ اپنے اختیار اور ولایت شرعیہ کے تحت کیا ہے، اس کو اپنے ذاتی امور اور معاملات و تصرفات کے بارے میں بحیثیت ایک انسان ہونے کے شرعی حق ہے۔

۲: شرعی اصول ہے کہ عاقل و بالغ کا ہر تصرف جو خلاف شرع نہ ہو وہ صحیح اور درست ہے، عاقلہ و بالغہ عورت کو اس اصول کے تحت اپنے تصرفات کا اختیار ہونا لازم ہے۔

۳: عاقلہ و بالغہ عورت کا تصرف عقد نکاح نصوص قرآن کے مطابق ہے، لہٰذا نکاح کو نافذ اور منعقد قرار دینے میں قرآن پر عمل ہوتا ہے ورنہ اس کی مخالفت ہوتی ہے، جیسا کہ شروع میں مفصلاً گزرا ہے۔

۴: انکا تصرف احادیث رسول اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے عین مطابق ہے، لہٰذا غیر کفو میں عاقلہ و بالغہ کے نکاح کو منعقد اور لازم قرار دینے سے احادیث پر عمل ہوتا ہے ورنہ احادیث کا ترک لازم آتا ہے۔

۵: جن نصوص سے عورتوں کے نکاح کا اختیار ولی کو ہونے کا ثبوت ملتا ہے وہ عاقلہ و بالغہ پر اختیار ولایت ندب و استحباب کے طور پر ہے نہ کہ ولایت اجبار، لہٰذا اصل ولایت نکاح عاقلہ و بالغہ کی خود اسی کو حاصل ہے، شریعت نے اسے بھی اپنے نکاح کا ولی گردانا ہے، کتب فقہ میں اس کی تصریح موجود ہے۔ (النتف فی الفتاویٰ ج ۱ ص ۲۷۵ دیکھئے فتح القدیر، شامی، عالمگیری، بدائع)

۶: کفو میں عاقلہ و بالغہ اگر بدون اجازت ولی نکاح کرتی ہے تو احناف کے نزدیک بالاتفاق نکاح منعقد اور لازم ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کو اپنے نکاح کا اختیار ہے اس نے خلاف اصول نکاح کر کے کوئی ایسا جرم نہیں کیا ہے جو انعقاد نکاح میں اثر انداز ہو، نہ ان نصوص کی مخالفت کی ہے جن میں ولی کو عورتوں کے نکاح انجام دینے کا حکم دیا ہے، کیونکہ ان نصوص میں اولیاء کو جو اختیار دیا گیا ہے وہ از روئے استحباب اور از روئے تکریم ولی اور تہذیب معاشرہ کے لئے ہے اس سے انعقاد نکاح میں کچھ فرق نہیں پڑے گا، البتہ عورت نے ولی کی بے قدری کی ہے اس کی تکریم کے خلاف کام کیا ہے، لہٰذا اس نے ایک گونہ معصیت کا ارتکاب کیا ہے بدتہذیبی کا مظاہرہ کیا ہے بے حیائی کا ارتکاب کیا ہے، بہر حال کفو میں عاقلہ و بالغہ عورت کا خود کیا ہوا نکاح منعقد اور لازم ہے، اسی طرح غیر کفو میں اس نے اگر نکاح کیا ہے تو نکاح منعقد اور لازم ہے، البتہ چونکہ اس میں ولی کا حق کفو ضائع ہوا ہے لہٰذا وہ اگر چاہے تو اسے بذریعہ عدالت فسخ کرا سکتا ہے۔

۷: ائمہ احناف امام اعظم ابو حنیفہؒ امام ابو یوسفؒ امام محمدؒ کی یہی ظاہر روایت ہے اور ہم امام اعظمؒ کے مقلد ہیں انہی کے متبع ہیں جب کہ نصوص و روایات اس کی مؤید ہیں۔

۸: احناف کے متون اربعہ میں اسی ظاہر روایت کو اختیار کیا گیا ہے۔

۹: شروح فقہ اور فتاویٰ میں ظاہر روایت اور نادر روایت کا اختلاف نقل کر کے اکثر مشائخ کا فتویٰ نادر الروایہ پر منقول ہے جب کہ بعض دوسرے مشائخ کا فتویٰ ظاہر الروایہ پر منقول ہے، کما ذکر

عن البحر والعالمگیریة والتا تارخانية.

۱۰: ہمارے اکابر علماء ومفتیان کرام نے بھی ظاہر روایت پر فتویٰ دیا ہے۔

۱۱: اور بندہ راقم الحروف کی رائے میں اکثر مشائخ نے تبدل زمان کی بناء پر جن وجوہ کو سامنے رکھ کر نادر الروایہ کو اختیار کیا تھا اور ظاہر الروایہ کے خلاف فتویٰ دیا تھا، اب موجودہ زمانے میں وہ وجوہ باقی نہیں رہیں، مثلاً پہلے زمانے میں عدالتی امور کے بارے میں لوگ ناواقف ہوتے تھے، اب نہ صرف والدین عدالتوں سے واقف ہیں بلکہ خود عاقلہ وبالغہ لڑکیاں بھی دنیوی تعلیم عام ہونے کی وجہ سے عدالت اور عدالتی امور سے واقف ہوگئی ہیں، حتی کہ بذریعہ عدالت کورٹ میرج کرنے لگی ہیں، یہ عدالت اور عدالتی امور سے ان کی واقفیت کا بین ثبوت ہے، نیز عدالتوں کے جج حضرات فیملی معاملات میں عموماً عورتوں کی رعایت کرتے ہیں، عورتوں کے بارے میں عدالتوں کے فیصلے اس کے لئے ثبوت موجود ہیں، لہٰذا عورتوں پر ظلم کا کوئی اندیشہ بھی نہیں ہے۔

۱۲: رہا یہ کہ فسخ نکاح کے لئے عدالت جانا ولی کے لئے مستقل ایک ضرر ہے تو نکاح کو باطل قرار دینے میں اس سے زیادہ ضرر ہیں۔

مثلاً غیر کفو میں جو عاقلہ وبالغہ عورتیں بدون اجازت ولی نکاح کرتی ہیں اکثر وبیشتر ان کے اپنے شوہروں سے خفیہ تعلقات قائم ہوجاتے ہیں ازدواجی تعلق ہوجاتا ہے، اگر نکاح کو باطل قرار دیا جائے تو اس کے نتیجے میں ان کے تعلقات کو ناجائز اور زنا کے تعلقات کہنا پڑے گا، اس میں زیادہ ضرر ہے اس سے کہ نکاح کو منعقد قرار دیا جائے، بعض دفعہ خفیہ نکاح اور تعلقات سے اولاد بھی پیدا ہوجاتی ہے پھر اس اولاد کو ناجائز اور حرامی کہنا پڑے گا، جبکہ زوجین نے شرعی ضابطے کے مطابق نکاح کیا تھا اور ان کا تعلق ازدواجی تعلق تھا اولاد جائز حلالی تھی، مزید ایسے تعلقات کے بعد عورت کو حق مہر ملتا ہے نکاح کو باطل قرار دینے کی صورت میں عورت کو مہر بھی نہ ملے گا، اس کی قیمتی زندگی کو ویسے ضائع کرنا لازم آئے گا، لہٰذا ولی کے ضرر کو اخف الضررین (کم درجے کا ضرر) قرار دیکر نکاح کو منعقد تسلیم کرنا پڑے گا اور اسی پر فتویٰ دینے کو انسب واسلم قول مانا جائے گا۔

۱۳: اسی وجہ سے صاحب بدائع نے کہا ہے:

وفی انفاذ النكاح و ان كان ضررا للاولياء وفی عدم الانفاذ اكبر ضررا.

(ج ۲، ص ۲۴۹)

ترجمہ: ”عاقلہ بالغہ کے نکاح کو نافذ کرنے میں اگر ولی کا ضرر ہوتا ہے مگر عدم انفاذ میں اس

سے زیادہ ضرر لازم آتا ہے"۔ (جس کی کچھ تفصیلات احقر نے وجہ نمبر ۱۲ میں تحریر کی ہیں)

خلاصہ جواب

سوال نمبر۱ اور سوال نمبر۲: کا خلاصہ یہ ہے کہ عام حالات میں ولی کی اجازت کے بغیر خود سے عاقلہ و بالغہ عورت کا نکاح مکروہ ہے لیکن سوال میں درج شدہ حالت میں جب لڑکا دین واخلاق، نسب، پیشہ، اور مال میں لڑکی کے برابر خاندان والوں میں سے ہے تو نکاح صحیح اور منعقد ہے اور اس صورت میں احکام نکاح زن وشوہر ہر دونوں پر عائد ہوں گے۔

سوال نمبر۳: عورت کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ولی کو راضی کرنے کی کوشش کرے، بالفرض اگر عورت کوشش کے باوجود ناکام ہوتی ہے تو اپنی پسند کے لڑکے کے ساتھ (جو کہ دین، اخلاق، نسب، پیشہ اور مال کے اعتبار سے برابر کے خاندان کا ہو) نکاح بدون اجازت ولی منعقد ہو جائے گا، اور زن و شوہر ہر ایک پر نکاح کے احکام عائد ہوں گے، ولی کو بعد نکاح اس میں کسی اعتراض کا حق نہ ہوگا، نہ فسخ نکاح کی اجازت ہوگی۔

البتہ لڑکا اگر مذکورہ امور یعنی نسب، دین واخلاق، پیشہ اور مال میں کم درجہ کا ہے اور اس صورت میں ولی کو وہ نکاح بالفرض نامنظور ہے تو بذریعہ عدالت لڑکے کے غیر کفو ہونے کو ثابت کر کے فسخ نکاح کا اختیار ہوگا۔

سوال نمبر۴: کے جواب میں مذکورہ اقوام ایک دوسرے کے کفو ہیں، لہٰذا قومیت کے اعتبار سے خاص ان میں فرق کا اعتبار نہیں ہوگا، لڑکا اگر دین واخلاق، پیشہ، مال میں لڑکی کے برابر ہیں تو بدون اجازت ولی اس کا نکاح جائز اور منعقد ہے بعد نکاح ان پر احکام نکاح عائد ہوں گے ولی کو اس نکاح کے فسخ کرنے کا اختیار ہی نہ ہوگا۔

البتہ کفو کے اعتبار سے مرد کا حال اگر عورت کے مقابلہ میں کم تر ہے تو اس میں بھی ظاہر روایت کے مطابق نکاح منعقد ہو جائے گا، بعد نکاح عورت کے ولی چاہیں تو اس نکاح کو برقرار رکھیں یا بذریعہ عدالت مرد کو غیر کفو ثابت کر کے نکاح کو فسخ کرالیں، کیونکہ شریعت نے نکاح میں خود عورت اور اس کے ولی کی عزت وآبرو کی حفاظت، اور دوسرے مصالح کی غرض سے کفو اور برابری کو ضروری قرار دیا ہے، لہٰذا ولی اگر اس نکاح سے متفق نہیں ہے تو اس کو بذریعہ عدالت فسخ نکاح کا اختیار ہوگا اور اگر عورت کی طرح ولی بھی غیر کفو میں نکاح پر رضامند ہیں تو شرع مانع نہیں بنے گی۔

سوال نمبر ۶: کا جواب مذکورہ جوابات کے ضمن میں آگیا ہے کہ ایسے حالات میں عورت بدون اجازت ولی نکاح کر سکتی ہے ولی کو فسخ نکاح کا اختیار نہ ہوگا۔ ھذا ماظھر لنا۔ واللہ اعلم۔

محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
خادم افتاء جامعہ علوم اسلامیہ
علامہ بنوری ٹاؤن کراچی نمبر ۵
۵ جمادی الثانی ۱۴۱۸ھ

الجواب صحیح
محمد عبد المجید عفی عنہ

الجواب صحیح
بندہ ابوبکر سعید الرحمٰن

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیق عارف

الجواب صحیح
بندہ محمد انعام الحق

الجواب صحیح
بندہ محمد عبد القادر

اسلام کیا ہے اور وہ عالم اسلام کے مسلم حکمران اور مسلمانوں سے کیا چاہتا ہے؟

تحریر: از بندہ محمد عبدالسلام چاٹگامی عفا اللہ عنہ

اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور نبی اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ پر صلوۃ وسلام کے بعد عرض یہ ہے کہ بحمد اللہ ہم اور آپ جملہ عالم اسلام کے مسلمانان جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں وہ کیسے؟ اسلام کیا ہے؟ وہ ہم اور آپ سے کیا چاہتا ہے؟ اس بارے میں محدث العصر الامام حضرت الاستاذ شیخ مولانا السید محمد یوسف بنوری قدس سرہ اپنے ایک بصیرت افروز مضمون میں تحریر فرماتے ہیں۔

''اسلام'' یا ''دین اسلام'' حق تعالیٰ شانہ اور حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک معاہدہ کا نام ہے، کلمہ طیبہ یعنی لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ اسی معاہدہ کا متن ہے۔ معاہدے کی تمام دفعات نہایت اجمال وخوبی کے ساتھ کلمہ طیبہ کے انہیں دو اجزاء میں سمیٹ دی گئی ہیں، کلمہ طیبہ کا پہلا جزء اللہ تعالیٰ کی الوہیت وخدائی کا دل وجان سے یقین واقرار ہے اس جزء میں حق تعالیٰ شانہ کی تمام صفات کمال وجلال وجمال کو سمیٹ دیا گیا، حق تعالیٰ ہمارا خالق ہے، حق تعالیٰ ہمارا رازق ہے، ہادی برحق ہے وہ ہر دور میں تمام مخلوقات کے لئے ہدایت وارشاد کے نظام نامے نازل فرماتا اور اپنے نمائندے بھیجتا رہا ہے، کسی قوم کو بغیر ہادی کے نہیں چھوڑا، ہر دور کے ہر پیغام پر ایمان لانا یقین کرنا ضروری ہے۔ الغرض یہ اور اس قسم کی تمام تفصیلات اسی جزء کی تشریحات ہوں گی۔

کلمہ کا دوسرا جزء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کا زبان سے اعتراف اور یقین قلبی کے ساتھ دل وجان سے اسے تسلیم کرنا ہے، وہ تمام صفات وکمالات جو حق تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی ہیں، علمی کمالات ہوں یا عملی، اب سب پر ایمان لانا ایک کلمہ گو مسلمان کے لئے ضروری اور لازم ہوتا ہے۔

بعثت انبیاء کا جو سلسلہ حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام سے شروع ہوا تھا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا اور آپ خاتم النبیین بنائے گئے ہیں، حق تعالیٰ کا آخری پیغام ہدایت ''قرآن کریم'' آپ ہی کے

ذریعہ رہتی دنیا تک تمام انسانیت کے لئے نازل فرمایا گیا اور اس کے تمام احکام تمام انسانوں کے لئے قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے لازمی وابدی ہیں اور ان میں کسی قسم کی ترمیم وتبدیلی کا امکان یا گنجائش بالکل نہیں ہے۔ انبیاء علیہم السلام پر وحی کی آمد بند ہوگئی اور یہ نظام ہدایت چونکہ تمام انسانیت کے لئے تھا، عرب کے لئے بھی تھا، عجم کے لئے بھی، ایشیاء کے لئے بھی تھا اور یورپ کے لئے بھی، افریقہ کے لئے بھی تھا، اور امریکہ کے لئے بھی تھا، اور ہر دور اور ہر علاقہ کے لئے تھا، تمام نسل انسانی جو تا قیامت تک آنے والی تھی سب کے لئے تھا۔ اس لئے کسی دور میں جو برائیاں اور خرابیاں پیدا ہونے والی تھیں ان سب کی اصلاح کے لئے تھا اور ایسا کرنے سے حق تعالیٰ عاجز نہ تھا کیونکہ اس کا علم وسیع ومحیط تھا، کامل اور تام تھا، ابدی وازلی تھا، کوئی چیز س سے مخفی نہ تھی اور قدرت بھی کامل ومکمل تھی کوئی چیز اس کے احاطہ علم وقدرت سے باہر نہ تھی، اس لیے تمام نسل انسانی کے لئے اور ان کے امراض روحانی کے لئے ایک جامع ترین نسخہ شفاء نازل کرنا اس کے علم محیط اور قدرت کاملہ سے باہر نہ تھا اور اسی آخری پیغام حیات وہدایت میں یہ واضح اعلان فرمادیا تھا کہ آپ خاتم النبین ہیں، نبوت کا سلسلہ آپ پر ختم ہوگیا اور نہایت شرح وبسط کے ساتھ اس کی تفصیلات قرآن وحدیث میں واضح کردی گئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ تمام تفصیلات کلمہ طیبہ کے اس دوسرے جزء کی شرح ہے، ان دوحرفوں کے یقین و اعتراف کر لینے سے تمام دین کے تسلیم کر لینے کا معاہدہ ہوجاتا ہے پھر بندہ کو اس دین کی ایک ایک بات کو ماننا اور اس پر ایمان لانا ضروری ہوجاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ زبان سے تو دین واسلام کا صرف اظہار واعتراف کرنا ہوتا ہے لیکن اصل چیز دین و اسلام کا دل سے یقین کرنا اور اسے تسلیم کرنا لازم ہوتا ہے، کوئی شخص بھی ایسے معاہدہ کو نہیں مان سکتا جو صرف زبان سے تو کہا جائے مگر دل میں نہو ہونہ عمل سے ہو، یہ جھوٹ اور نفاق ہوگا۔

دین اسلام کا سچا یقین واقرار تب ہی معتبر ہوگا کہ دل وجان سے، اسے تسلیم کیا جائے اور قلبی یقین و اذعان کا زبان سے اظہار واقرار کیا جائے اور اس پر عمل بھی کیا جائے۔

دیکھئے عقد نکاح کیا ہے، بظاہر تو صرف ایجاب وقبول کے دولفظ ہیں۔ ایک کی جانب سے کہا جاتا ہے کہ میں نے نفس آپ کے نکاح میں دے دیا، دوسرا کہتا ہے کہ میں نے قبول کیا انہیں دولفظوں کو بولنے کے بعد گویا وہ تمام احکام وہ تمام باتیں جو نکاح سے متعلق ہیں نکاح وازواج کے لوازم ہیں سب اسی ایجاب وقبول میں آگئیں۔ بیوی کا نفقہ، اس کی رہائش اس کے لئے لباس وپوشاک کا انتظام کرنا، اس کی راحت وآرام کا خیال کرنا، بیماری میں اس کی تیمارداری کرنا اغیار سے اس کی حفاظت کرنا، گرمی وسردی

سے اسے بچانا اس کے نفع وضرر کا لحاظ رکھنا غرض ہر وہ خدمت جس کی وہ محتاج ہے اور شریعت نے شوہر کے لئے ضروری قرار دی ہے ان دولفظوں کے اقرار سے واجب اور لازم ہوگئی ہیں۔ معاہدہ نکاح میں سب چیزیں آگئی ہیں، اس کے بعد کوئی جاہل بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے صرف نکاح کو قبول کیا ہے مگر اس کے لوازمات ودیگر احکام کا میں نے کب اقرار کیا ہے۔ بالفرض اگر کوئی ان پڑھ بھی ایسا دعویٰ کرے تو نہ قانون اسے تسلیم کرتا ہے نہ عرف ورواج اسے مانتا ہے اسی طرح تمام عقود ومعاملات کا دارومدار ہوتا ہے۔

مثلاً جب ایک حکومت نے دوسری حکومت کو تسلیم کرلیا اور اپنا سفیر بھیج دیا تو وہ تمام روابط جو آج کی بین الاقوامی سیاست میں دو دوست حکومتوں میں ہوا کرتے ہیں وہ سب قائم ہوجاتے ہیں۔

الغرض ''لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه'' کا یہ مختصر کلمہ تمام اسلامی معاہدے کا متن ہے جس نے بھی برضاورغبت اسے قبول کرتے ہوئے اس کا اقرار کیا اس پر دین اسلام کی تمام ہدایات واحکام کا ماننا ضروری ہوجاتا ہے، اس لئے تمام علمائے امت کا یہ اجتماعی عقیدہ ہے کہ ایمان یا اسلام، نام ہے اس عقد کا جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمان یا مومن کرتا ہے کہ جو کچھ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے وہ سب سچ ہے دل وجان سے قبول اور تسلیم ہے اس پر ایسا یقین کامل ہو کہ جس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہ ہو اور ہر قسم کے شک وشبہ سے یقین بالاتر ہو۔ اس قسم کی تصدیق وتسلیم کا نام ایمان ہے۔

چنانچہ کتب اسلام میں اس کی تصریح ہے۔

''هُوَ تَصْدِيْقُ النَّبِيّ فِيْ جَمِيْعِ مَا جَآءَ بِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ مِمَّا عِلْمَ كُوْنَهٗ مِنَ الدِّيْنِ ضَرُوْرَةً''

لغت میں اسلام کے معنیٰ

جہاں تک لغت کا تعلق ہے ''اسلام'' کا معنی تسلیم وانقیاد اور اطاعت وفرمانبرداری کے ہیں۔

اور قرآن کریم کی اصطلاح میں اسلام کا اطلاق اس آسمانی دین پر ہوتا ہے جو انبیاء کرام علیہم الصلوت والتسلیمات کے ذریعہ حق تعالیٰ کی طرف سے آیا، یہ سلسلہ حضرت آدم صفی اللہ علیہ السلام سے شروع ہوکر حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا۔ اسی لئے ہر نبی کے دور نبوت میں اس کے ذریعہ آئے ہوئے دین کو دین اسلام کہا جاتا تھا اور ہر وہ شخص جو اس دین کا متبع ہو مسلمان کہلانے کا

مستحق تھا، لیکن آخر میں جب یہ سلسلہ حضرت خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم پر آ کر ٹھہرا تو دین حق دین محمدی (علی صاحبہ الصلوۃ والسلام) کا نام ولقب، دین اسلام بن گیا۔

اور جو دین اللہ تعالیٰ نے حضرت رسول اللہ محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نازل فرمایا محض اسی کا لقب اسلام رکھ دیا گیا اب ''دین اسلام'' صرف اور صرف اسی مخصوص دین کا لقب اور نام ہے کسی دوسرے دین پر اس کا اطلاق نہ ہوگا نہ کسی قدیم یا جدید دین کے ماننے والے کو مسلمان کہنا ہی صحیح ہوگا اس لئے عرفات کے میدان میں عرفے کے دن جمعہ کی عصر کو ۹ ذی الحجہ ۱۰ھ میں تمام امت اسلامیہ کے سامنے یہ اعلان کر دیا گیا:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الاِسْلَامَ دِيْنًا

آج کے دن تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تمہارے اوپر پوری کر دی اور تمہارے دین اسلام کو میں نے تمہارے لئے پسند کیا۔

اس مقام پر بعض مشاہیر اہل قلم کو بڑی غلط فہمی ہوئی اور خطرناک قسم کی باتیں قلم سے نکل گئیں، حقیقت یہی ہے جو عرض کی گئی، کامل ترین صورت میں حق تعالیٰ نے دین اسلام کو نازل فرمایا اور اس آخری ہدایت کو آخری شکل دے دی گئی۔ جس میں کسی اضافے یا ترمیم کی گنجائش نہیں اور حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی اور ارشادات کے ذریعہ اس کی مکمل تشریح کر دی گئی اور قرآنی ونبوی ارشادات میں ایسے رموز ونکات واشارات کر دیئے گئے کہ صحیح طور پر سمجھ لینے کے بعد آئندہ کے تمام مسائل کا حل نکل سکے اور ان کی روشنی میں وہ تمام مسائل خود بخود واضح ہوتے رہیں گے جو نئے پیش آنے والے ہیں۔

نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ مدارکت وعقول کے مراتب میں قدرتی تفاوت واختلاف موجود ہے تو اجتہادی مسائل میں بھی اختلاف ناگزیر ہے اس لئے اس کو برداشت کیا گیا اور عہد نبوت میں جو طریقہ کار رہا اس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے البتہ غور وفکر کرنے والے حضرات کے لئے قرآن وحدیث کی روشنی میں اجتہاد کی اہلیت اور اس کی شرائط ضروری ہیں اور جن کو اہلیت نہ ہو ان کی مداخلت برداشت کے قابل نہیں یہ نہایت نازک مرحلہ ہے اور غامض ودقیق حکم واسرار ہیں اللہ ورسول کا کلام ہے ہر کس وناکس کے لئے دخل دینے کی گنجائش کا کیا امکان ہے۔

جب کہ دنیا کے علوم وفنون جو انسانی عقول وادارکات کے نتائج ہیں اور انسانی دائرہ عقل سے بالاتر نہیں ان کے لئے بھی اہلیت کو ضروری سمجھا جاتا ہے پھر کیسی عجیب بات ہے کہ اللہ ورسول کے کلام میں

اتنی آزادی وحریت کہ جس کا جی چاہے اور جو چاہے اس کے لئے وقف عام کر دیا جائے؟ کتنی حیرت کی بات ہے اور اس سے بڑھ کر حیرت کی بات یہ ہے کہ شرعی نصوص یعنی اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح ہدایات کو میزان عقل قاصر سے ناپا جائے اور جب اپنی فہم نارسا کے موافق نہ دیکھے انکار کیا جائے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد

محدث العصر شیخ مولانا السید بنوریؒ فرماتے ہیں:

تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا اصلی مرکزی نقطہ نہ صرف اصلاح معاشرہ ہے بلکہ مخلوق کا خالق سے ٹھیک ٹھاک رابطہ قائم کرنا ہے تاکہ انسانی نظریات انسانی معیشت، معاشرت، اخلاق واعمال میں جو بے قاعدگیاں اور خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کی اصلاح کی جائے اور اللہ تعالیٰ کی وہ مرضیات بتلائی جائیں جن کے ادراک سے انسانی عقلیں قاصر ہیں۔

اسی طرح توحید، صفات باری، جنت، دوزخ برزخ کے احوال، ملائکہ کا وجود، مرنے کے بعد کی زندگی، حساب وکتاب وغیرہ وغیرہ دینی حقائق جن کے فہم وادراک سے تمام عقلیں قاصر ہیں، ان کا بتلانا اور ان کے تمام غیبی حقائق پر یقین پیدا کرنا ان سب کا مقصد ہے۔ غرض جو خرابیاں اعتقاد وعمل، اخلاق وکردار میں پیدا ہوتی ہیں انبیاء علیہم السلام ان کی اصلاح کرتے ہیں۔ عقیدے کی خرابی شرک وکفر وفسق، ظلم جن کے مختلف نام ہیں اسی طرح بدعت رسم ورواج کی بعض خرابیاں ہیں ان کی بھی اصلاح فرماتے ہیں اور ان کی بے اعتدالیوں کو دور فرماتے ہیں اور ان تمام مراحل میں ان کو بے شمار مشکلات اور رکاوٹیں بھی پیش آتی ہیں جن سے انہیں عہدہ برآں ہونا پڑتا ہے۔ بسا اوقات جب اصلاح کی تمام ممکنہ صورتیں ختم ہوتی نظر آتی ہیں تو انہیں تلوار اٹھانے کی ضرورت بھی پڑتی ہے جہاد وقتال کی نوبت بھی آتی ہے اگر انبیاء علیہم السلام شرک وکفر کو برداشت کریں اور کوئی اصلاح کا قدم نہ اٹھائیں اور لوگوں کو اپنی حالت پر چھوڑ دیں اور عملی جدوجہد شرک وکفر اور مرضی الٰہی کے خلاف رسم ورواج کو مٹانے کے لئے جہاد وقتال نہ کریں تو بعثت انبیاء علیہم السلام کے تمام نظام بے کار اور تماشہ بن جاتے العیاذ باللہ۔ العیاذ باللہ۔

لہٰذا انبیاء علیہم السلام کے ذمہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآں ہونا اور تمام تر عملی جدوجہد کرنا ضروری ہوتا ہے ظاہری کامیابی وناکامی اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے نتائج کے اچھے یا برے ہونا اس کے اختیار میں ہے، اپنے عہدہ مسئولیت سے عہدہ برآں ہونے کے لئے تمام آسمانی ہدایات کی تعلیم وتبلیغ کی

سعی بلیغ ان کے ذمے ہیں، ایمان اور ایمانیات اور ان کے نتائج وعواقب سے آگاہ کرنا اور اس کے برخلاف کفر وشرک اور تمام رسم ورواج اور بدعات جو مرضی الٰہی اور مزاج شرع کے خلاف ہیں ان کے مضر اثرات ونقصانات اور ان کے برے انجام، سزا وعذاب سے آگاہ کرنا اور عملی جدوجہد کے تمام مراحل سے گزرنا انبیاء علیہم السلام اور ان کے پیروکاروں کے لئے ناگزیر ہیں۔

"لیکن بدبخت کفار ومشرک اور فاسق اگر اصلاح کی کسی صورت کو اختیار نہ کریں نہ خدا کی بڑائی اور خدائی احکام کے غلبہ کو تسلیم کریں بلکہ الٹا خدا کے نمائندے انبیاء علیہم السلام اور ان کے پیروکاروں سے مقابلہ کرنے پر اتر آئیں تو پھر رب ذوالجلال کا حکم ہوتا ہے۔

وَقَاتِلُوْا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً

لڑو کافروں سے جو تمہارے قریب آباد ہیں اور انہیں تم میں سختی محسوس کرنی چاہیے۔

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَ بِئْسَ الْمَصِيْر.

اے نبی کافروں اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان سے ذرا نرمی نہ کیجئے بلکہ ان پر سختی کیجئے ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ لوٹنے کی بہت ہی بری جگہ ہے۔"

اور کفار منافقین اگر بہانے تلاش کرنے کے لئے عذر ومعذرت کریں تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اعلان ہوتا ہے۔

"قُلْ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ"

آپ ان سے کہہ دیجئے بہانے نہ بناؤ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تم نے دعویٰ ایمان کے بعد کفر کیا ہے۔ (یا عہد پیمان کے بعد بدعہدی کی ہے)۔

ایسے لوگوں کے بارے میں مومنوں کو تنبیہ کی جاتی ہے۔

"فَمَالَكُمْ فِي الْمُنَافِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ط اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ"

"اے مسلماں! تمہیں کیا ہوا کہ منافقوں کے بارے میں اختلاف کرنے لگے (تم میں سے بعض ان کو مسلمان کہتے یا سمجھتے ہیں) باوجودیکہ اللہ نے ان کی بدعملی کے سبب ان کو الٹے پاؤں پھیر دیا کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جسے اللہ نے گمراہ کردیا ہے اسے بھی ہدایت یافتہ قرار دو؟"

بہرحال کفر وشرک کو مٹانا اور توحید کے جھنڈے گاڑنا انبیاء علیہم السلام کا پہلا کام ہوتا ہے اسی نظام

کے مختلف ادوار میں بے شمار انبیاء علیہم السلام آتے رہے۔

ان میں بعض انبیاء علیہم السلام کو نبوت کے ساتھ منصب حکومت بھی دی گئی جیسے حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام وغیرہ ہیں اسی طرح ہمارے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے جامع ترین شریعت جامع ترین نبوت اور جامع ترین حکومت بھی عطا فرمائی ہے تمام تر کمالات کا وارث آپ کو بنایا گیا ہے اور آپ کے دین وشریعت کو وہ جامعیت نصیب فرمائی ہے جس سے بالاتر کوئی جامعیت نہیں ہوسکتی تا کہ تمام مناصب اصلاح کے تحت اصلاح ہو سکے، عقائد و نظریات کی تعلیم وتبلیغ ہو، تا کہ عقائد ونظریات کی اصلاح ہو، عبادات ومعاملات کی تعلیم وتبلیغ ہوتا کہ عبادات اور معاملات میں پیدا ہونے والی خرابیاں دور ہو جائیں، معشیت ومعاشرت کے احکام ومسائل کی تعلیم وتبلیغ ہوتا کہ ان میں جو بے اعتدالیاں پیدا ہوئیں ان کی اصلاح ہو سکے۔ آداب واخلاق کی بھی تعلیم وتبلیغ ہو، تا کہ برے رسم ورواج اور اخلاق کی تباہ کاریاں ختم ہوں، علاوہ ازیں سیاست وحکومت کا منصب بھی اس لئے عطا کیا گیا تا کہ حکومتی نظام کی اصلاح اسی نہج کے طور پر ہو، نظام مملکت کو چلانے میں جتنی برائیاں اور نقائص آسکتے ہیں ان کی نشاندہی کر کے اس کے متبادل نظام مملکت کے لئے جتنے اچھے اصول وضوابط ہوسکیں ان کی تعلیم وتبلیغ ہو، تا کہ نظام مملکت کو انہیں اصول وضوابط کی روشنی میں چلایا جا سکے۔

اس جامعیت کو اگر دیکھا جائے تو آپ ایک طرف تو دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح ایک مکمل داعی الی اللہ تھے، حاکم اعلیٰ کے منصب کی رو سے آپ ایک بہترین حکمران بھی رہے، جیش مجاہدین کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے دنیا کے بہترین قائد جیوش ومجاہدین بھی رہے۔ غرض یہ کہ سید الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جو جامعیت بلحاظ نبوت وسلطنت عطا فرمائی تھی وہ کسی نبی کو نہیں عطا کی۔ انتہی، از بینات۔

خلاصہ یہ کہ آپ کے ''دین شریعت'' ''دین اسلام'' کو بھی آپ ہی کی وجہ سے جامعیت نصیب ہوئی تو اس جامعیت میں غور کرنے سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آپ کی جامعیت کی وجہ سے آپ کی شریعت جامع ترین شریعت ہے قرآن حکیم کے اندر اللہ تعالیٰ نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

تو جامع ترین دین، جس امت کو ملا وہ امت بھی جامع ترین امت ہے اور آپ کو جو صحابہ کرام ملے ہیں وہ جامع ترین صحابہ کرام ہیں تمام نبیوں کے صحابہ کرام سے جامع ومانع اور افضل ترین صحابہ کرام ہیں۔

اس واسطے آپ کے بعد آپ کے خلفائے کرام خلفائے راشدین بھی جامع ترین بلکہ آپ کے تمام صفات وکمالات کے وارث اور صحیح جانشین یہی خلفاء تھے اسی واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جملہ صحابہ کرام کی جامعیت کو اور ان میں اکثر کے انفرادی فضائل ومناقب بیان کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ خلفاء راشدین کی الگ جامعیت اور ان کے مقتداء ہونے کو واضح فرمایا۔

چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا۔

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ

کہ میرے بعد تمہارے لئے لازم اور ضروری ہے کہ میرے طریقوں پر عمل کرو اور میرے طریقوں میں تمہیں دقت یا مشکل پیش آوے تو میرے خلفاء کے طریقوں پر عمل کرو خبردار میرے اور خلفاء کے طریقے کو چھوڑ کر کسی اور طریقہ کو اختیار کرنا گمراہی ہے اور گمراہی جہنم میں لے جائے گی۔

چونکہ آپ کے خلفاء آپ کے واقعی اور صحیح جانشین اور وارث تھے تو جس طرح نبی علیہ السلام نے اپنا منصب نبوت وحکومت کو اپنی جامعیت سے انجام دیا اسی طرح آپ کے خلفاء نے آپ کے بعد اسی طرح کی جامعیت کے ساتھ اپنے اپنے منصب خلافت کو انجام دیا۔ دعوت الی اللہ اور اصلاح عقائد ونظریات کے ساتھ پوری طرح اصلاح معاشرہ فرماتے رہے۔ ایمان وکفر کی حدود بیان فرمائیں کہ ایمان کی سرحدیں کہاں تک ہیں جو ایمان کی سرحد میں ہے کافر نہ کہا جاوے نہ ہی کسی کافر کو جو کہ کفر کی سرحدوں میں ہے مسلمان جیسا عظیم مقام دیا جاوے۔

آپ کے خلفاء کے بعد منصب نبوت وحکومت کی یہ ذمہ داری علمائے امت کو سپرد کی جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت کے علماء کے بے شمار مناقب وفضائل بیان فرمائے ہیں۔

لیکن ان کی حیثیت ومقام کو جاننے کے لئے ان میں سے چند احادیث کا ذکر کردینا کافی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ عُلَمَاءُ اُمَّتِيْ كَاَنْبِيَاءِ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ

دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا کہ انبیائے سابقین میں حق تعالیٰ کا یہ دستور رہا کہ ایک نبی کے گزر جانے کے بعد اس کی جگہ دوسرا نبی یا رسول بھیجا جاتا رہا وہ دین اور دینی احکام کی تعلیم وتبلیغ کا فریضہ انجام دیتا تھا مگر میرے بعد چونکہ کوئی دوسرا نبی نہیں آئے گا، میں خاتم النبین ہوں میرے بعد انبیاء کی یہ ذمہ داری علمائے امت انجام دیں گے۔ بالآخر علماء امت نے اس منصب وذمہ داری کو اپنی سعی اور کوششوں سے انجام دینے کی سعی بلیغ فرمائی ہے اور اب تک فرماتے رہے اور تا قیامت انشاء اللہ اس

فریضہ کو انجام دیتے رہیں گے۔

علماء امت کا فرض منصبی

حدود اسلام کی حفاظت اور پاسبانی یہ اس امت کے علماء شریعت کا فرض منصبی ہے جیسا کہ اسلامی حکمرانوں کا فرض منصبی ہے کہ وہ مملکت اسلامی کی جغرافیائی حدود سرحدوں کی حفاظت کریں بعینہ اسی امت کے علمائے شریعت کے ذمہ لازم ہے کہ اسلامی قانون کی حدود اور اس کی تشریحات بیان کر کے احکام اسلام کی تنفیذ کا کام اسلامی حکمران کے سپرد کریں اور حکومت اجتماعی طور پر احکام اسلام کی تنفیذ کرے اور انفرادی احکام اسلام کے بارے میں عامۃ الناس کو پابندی کرنے کی ہدایات دے غرض یہ کہ احکام اسلامی اور حدود اسلامی کی سرحدوں کی حفاظت اسی امت کے علماء شریعت کے ذمہ ہے۔ اگر حکمران کے ذمہ ملک کے چپہ چپہ کی پاسبانی ضروری ہے تو اس سے زیادہ ضروری اسلامی قوانین اور حدود اسلامی کی حفاظت اور اس کی پاسبانی علماء امت کے ذمہ اہم اور لازم ہے۔

لہذا ان میں کوئی فریق اگر اپنی ذمہ داری میں کوتاہی کرتا ہے، لیت ولعل سے کام لیتا ہے تو وہ خدائے تعالیٰ کا بڑا مجرم ہے۔ جس طرح انفرادی احکام میں سستی اور کاہلی فسق اور جرم عظیم ہے اور ان میں سے کسی حکم کا انکار کفر وارتداد ہے جس کی سزا دنیا میں سزائے موت اور قتل اور آخرت میں جہنم ہے۔ اسی طرح اجتماعی احکام کے عدم اجراء وعدم تنفیذ سب سے بڑا فسق وکفر ہے اور ان میں سے کسی حکم شرعی کے اجراء و نفاذ سے انکار خدا کے ساتھ بغاوت اور قانون اسلام سے غداری ہے جس کی سزا سنگین سے سنگین تر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو اس سے بچادے۔

قرآن حکیم کی درج ذیل آیات ملاحظہ فرمائیں اور اپنے دین اسلام وایمان کا جائزہ لیں۔

حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

فَلاَ وَ رَبِّکَ لاَ یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لاَ یَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا. (نساء، آیات ۶۵)

ترجمہ: سو قسم ہے ترے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے یہاں تک کہ تجھ کو ہی منصف جانیں اس جھگڑے میں جو ان میں اٹھے پھر نہ پاویں اپنے جی میں تنگی ترے فیصلہ سے اور قبول کریں خوشی سے۔

آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن وسنت کے موافق فیصلے کو تسلیم کئے بغیر کسی ایماندار کا ایمان درست

نہیں ہوتا لہذا فیصلہ کرنے والے کے ذمہ فیصلہ قرآن وسنت کے موافق کرنا فرض ہے اور فیصلہ لینے والے فریقین کے ذمہ اس کا مان لینا بھی فرض وضروری ہے ورنہ وہ ایمان دار نہ ہوں گے۔

حق تعالیٰ شانہ، دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں۔

اِنَّـا اَنْـزَلْـنَـا اِلَيْـکَ الْـکِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرَاکَ اللّٰهُ. وَلَا تَکُنْ لِّلْخَائِنِيْنَ خَصِيمًا. (نساء، آیت ۱۰۵)

ترجمہ: بے شک ہم نے اتاری تیری طرف کتاب سچی کہ تو انصاف کرے لوگوں میں جو کچھ سمجھادے تجھ کو اللہ اور تو مت ہو دغا بازوں کی طرف سے جھگڑنے والا۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو کتاب نازل فرمائی ہے وہ حق و انصاف کے مطابق فیصلے کرنے کے لئے ہے کہ کتاب اللہ کی روشنی میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے نائبین خلفاء اور حکمران فیصلہ کریں اور یہ کہ کسی دغا باز اور فریب کار منافق کی باتوں میں آ کر ان کے حمایتی نہ بنیں۔

حق تعالیٰ شانہ، تیسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

وَاَنِ احْکُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَائَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْکَ عَنْ بَعْضِ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْکَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ط وَاِنَّ کَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفَاسِقُوْنَ. (مائدہ، آیت ۴۹)

ترجمہ: اور (یہ فرمایا کہ) حکم کر ان میں موافق اس کے جو کہ اتارا اللہ نے اور مت چل ان کی خوشی پر اور بچتا رہ ان سے کہ تجھ کو بہکا نہ دے کہ ایسے حکم سے جو اللہ نے اتارا تجھ پر، پھر اگر نہ مانے تو جان لے کہ اللہ نے یہی چاہا ہے کہ پہنچاوے ان کو کچھ سزا ان کے گناہوں کی اور لوگوں میں بہت ہیں نافرمان۔

یعنی تمام مسلمانوں کے لئے یہی ہدایت ہے کہ ہمیشہ ما انزل اللہ (قرآن واحادیث) کے مطابق احکام نافذ کرنے ہیں اور اس کے مطابق عمل کرنا ہے اور کسی کی خواہش ومرضی کا مطلق خیال نہیں کرنا۔ اگر مسلمانوں کے حکمران یا فیصلے کرنے والے ذمہ دار ایسا کریں گے تو نہ ماننے والے لوگ انہیں راہ راست سے ہٹادیں گے، گمراہی کی طرف لے جائیں گے۔

لہذا مسلمان حکمران اور ذمہ داران کے ذمہ ہر حال میں ضروری ہے کہ ما انزل اللہ یعنی کتاب وسنت کے مطابق فیصلے کریں، احکام اسلام نافذ کریں پھر اگر وہ نہ مانیں تو اللہ تعالیٰ نہ ماننے والوں کو سزا دے

گا۔ مسلمان حکمران کی مسئولیت ختم ہو جائے گی، قیامت کے دن ان پر مواخذہ نہ ہوگا لیکن مسلمان حکمران اور فیصلہ کرنے والے نے اگر قرآن وسنت کے موافق احکام نافذ نہ کئے اور فیصلے نہ کئے تو ان پر سخت عذاب ہوگا۔

اور حق تعالیٰ شانہ، کا چوتھی جگہ پر ارشاد ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ.

(مائدہ، آیت ۴۴)

ترجمہ: اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ تعالیٰ نے اتارا، سو وہی لوگ کافر ہیں۔

یعنی جو لوگ قرآن وسنت کے موافق احکام نافذ نہیں کرتے یا اسے نا قابل عمل تصور کرتے ہیں یا اسے ناقص سمجھتے ہیں یا اس پر اعتراض کرتے ہیں جس وجہ سے بھی ہو اختیار رکھتے ہوئے احکام شرع کو نافذ نہیں کرتے، یہ لوگ کافر ہیں۔ اگرچہ نام مسلمانوں کا رکھیں، ان کے احکام کافروں کی طرح ہیں، ان سے کافروں جیسا معاملہ کیا جائے گا۔

حق تعالیٰ شانہ، کا پانچویں جگہ ارشاد ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ.

(مائدہ، آیت ۴۵)

ترجمہ: اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے اتارا سو وہی لوگ ظالم ہیں۔

قانون قتل وقصاص کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی مذمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے پاس کتاب اللہ تورات میں قانون قصاص و دیت کے احکام ہوتے ہوئے بہانے کے طور پر وہ آپ کے پاس فیصلہ کے لئے آتے ہیں اور کتاب کے موافق فیصلہ نہیں کرتے جو کتاب اللہ کے موافق فیصلہ نہ کرے وہ بڑا ظالم ہے۔

حق تعالیٰ شانہ کا چھٹی جگہ پر ارشاد ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُلٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ. (مائدہ، آیت ۴۶)

ترجمہ: اور جو کوئی حکم نہ کرے موافق اس کے جو کہ اتارا اللہ نے سو، وہی لوگ ہیں نافرمان۔

ان آیات سے واضح ہوا کہ نصاریٰ ہو یا یہود یا مسلمان جب دین اور دینی حکم کو چھپائیں یا اس کو بیان نہ کریں یا اس پر عمل نہ کریں یا اس کو نا قابل عمل سمجھیں تو پھر فاسق، ظالم اور کافر ہو جاتے ہیں۔

اور اب سنئے جو لوگ فاسق اور ظالم اور کافر ہوتے ہیں ان کا انجام کیا ہے۔

حق جل شانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ.

(بقرۃ، آیت ۵۹)

ترجمہ: پھر اتارا ہم نے ان ظالموں پر عذاب آسمان سے ان کی عدول حکمی پر۔

حق تعالیٰ شانہ کا دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا وَاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ. (بقرۃ، آیت ۱۶۵)

ترجمہ: اگر دیکھ لیں یہ ظالم اس وقت کو جبکہ دیکھیں گے عذاب کہ قوت ساری اللہ کی ہے اور یہ کہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔

حق تعالیٰ شانہ کا تیسری جگہ ارشاد ہے:

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُو بِعَذَابٍ بَئِيْسٍ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ . فَلَمَّا عَتَوْا عَمَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ. (اعراف، آیت ۱۶۶)

ترجمہ: پھر جب یہ لوگ بھول گئے جو ہم نے سمجھایا، تو جو لوگ برائی سے رک گئے ہم نے ان کو نجات دی اور جو لوگ نافرمانی اور ظلم میں پڑے رہے پس ہم نے ان کا سخت عذاب سے مواخذہ کیا پھر جب اور آگے بڑھے تو ہم نے حکم دیا کہ اب تم بندر اور ذلیل ہو جاؤ۔ (سب بندر اور ذلیل ہو گئے)۔

مذکورہ بالا آیات اشارہ کے لئے کافی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کرنے والوں کے لئے دنیا میں عذاب کی وعید ہے اور آخرت میں اس سے زیادہ رسوائی اور ذلت کا عذاب ہوگا اس واسطے تمام عالم اسلام کے مسلمانوں کو چاہئے کہ توبہ اور تجدید توبہ کریں اور آئندہ نافرمانی اور فسق و فجور سے تائب ہو جائیں اور تمام احکام شرع پر عمل کرنا اور اس کی پابندی کرنا شروع کر دیں ورنہ دردناک عذاب کے لئے تیار رہیں۔ اعاذ نا اللہ تعالیٰ عن غضبہ و عذابہ فی الدنیا و الآخرۃ۔

دین اسلام کی بنیاد دو چیزوں پر ہے

دین اسلام اس دین و شریعت کا نام ہے جو حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

توسط سے امت محمدیہ کو دیا گیا ہے اور اس کی بنیاد دو چیزوں پر ہے ایک کتاب یعنی "قرآن کریم" دوسری سنت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰت والسلام پھر اجماع امت اور قیاس: یہ دونوں اصول پہلے دونوں اصولوں کے تابع ہیں لہذا پہلے دو بنیادی ماخذوں سے جو احکام ثابت ہیں خواہ وہ عقائد ونظریات ہوں یا عبادات ومعاملات۔ احکام معیشت ہوں یا احکام معاشرت، اخلاقیات ہوں یا آداب، احکام سیاست ہوں یا احکام نظام حکومت، اسلامی حدود ہوں یا جرائم کی دوسری سزائیں، جملہ احکام کا نام دین اسلام ہے۔

ان پر یقین وایمان کے بعد برضا ورغبت ان پر عمل پیرا ہونے سے آدمی مسلمان کہلانے کا مستحق ہوتا ہے ورنہ نہیں، جو حکومتیں ان کی تنفیذ کرتی ہیں وہ اسلامی حکومت کہلانے کی مستحق ہیں ورنہ نہیں۔ لہذا عالم اسلام کے تمام مسلمانوں کو چاہئے کہ ان پر عمل کریں اور حکومتیں، اسلامی احکام بزور حکومت نافذ کریں کیونکہ مسلمانوں کی فلاح وصلاح انہیں چیزوں پر ہے اور ان کی ضلالت وگمراہی احکام اسلام کے ترک کر دینے اور حکمرانوں کی بے اعتنائی کی وجہ سے ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تَرَكْتُ فِيْكُمْ اَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا، كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِيْ.

دین اسلام کا نظام ہر حیثیت سے جامع ترین اور کامل ترین نظام ہے اس سے زیادہ جامع تریں کوئی نظام روئے زمین میں نہ اللہ نے نازل کیا ہے نہ اس کا تصور ممکن ہے۔ اس میں نظام مملکت وحکومت سے لیکر امور خانہ داری تک، زندگی کے انفرادی واجتماعی، دینی وسیاسی، معاشی واقتصادی، ہر پہلو اور ہر گوشے کے لئے عام اصول وجزئیات موجود ہیں۔

اور اس میں اصلاح ظاہر وباطن کے جملہ احکام اصول وجزئیات بتمہا موجود ہیں۔ دین اسلام کا خزانہ عامرہ ان تمام جواہرات اور قیمتی لعل وگہر سے مالا مال ہے جو انسانیت کی فلاح وبہبود کے لئے درکار ہیں۔ جبکہ دنیا بھر کے تمام نظامہائے راہ کا دامن ان جواہرات سے عاری وخالی ہے۔

دین واسلام کے جامع ترین نظام کو جس طرح لینن، مارکس اور ہیگل وانیجلز کے نظامہائے باطلہ کی کوئی ضرورت نہیں اس طرح مغرب برطانیہ، فرانس، امریکہ وغیرہ کے گمراہ کن اور فاسد نظاموں کی بھیک مانگنے کے واسطے ان کے دروازوں کو کھٹکھٹانے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

کیونکہ دین واسلام اس رب العالمین اور رب انسانیت کا نظام ہے جو کہ حی وقیوم ہے اور علیم وخبیرہ وہ سمیع وبصیر اور قادر مطلق بھی، لہذا ایسی ذات کی جانب سے جو نظام محکم دیا جائے گا اس میں کسی قسم کے نقص یا سقم یا شک وتردد کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

کیونکہ خالق کائنات جو کہ خالق انسانیت بھی ہے انسان کے مبدا و معاش اور اس کے معاد کی جملہ ضروریات وحقائق سے آگاہ ہیں اور اس کا نظام احکام سب انسانوں کے لئے یکساں نافع ومفید ہے۔

اسلامی حکومت کا قیام اور اس کے مقاصد

حق جل مجدہ، اپنے رسولوں کو بھیج کر ہمیشہ اس جامع ترین نظام کو نافذ کر کے انسانوں کی فلاح و بہبود کا انتظام کرتا رہا اور آخری نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری کتاب قرآن دے کر اکثر روئے زمین میں اسی کے احکام نافذ کئے اور یہی قرآن وسنت کا نظام ایک بڑی مدت تک دنیا کے اکثر حصہ میں نافذ رہا اور دنیا کے اکثر حصہ میں دین اسلام کا غلبہ اور اس کا بول بالا رہا دوسرے جملہ کافروں کے نظام اور طاغوتی نظام کے جھنڈے سرنگوں رہے۔

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ.

اللہ کے رسول کو اللہ نے جس مقصد کے لئے بھیجا وہ پورا ہوا۔

مگر بد قسمتی اور ہماری شامت اعمال کی وجہ سے اسلامی حکومت اور اسلام کا نظام مملکت ختم ہو گیا جس کی سزا ہم اور پوری امت مسلمہ بھگت رہی ہے۔ لہذا اب بھی ہمیں ہوش میں آنا چاہیے تمام مسلم ممالک کو اسلامی حکومت کا اعلان کرنا چاہئے، احکام اسلام کو نافذ کر دینا چاہیے۔ کیونکہ کسی اسلامی مملکت کی شناخت یہ ہے کہ وہاں پر اسلامی نظام قائم ہو۔ قرآن وسنت کے قوانین نافذ ہوں اور مملکت کے حکمراں ورعایا سب کے سب اس کے پابند اور پیروکار رہیں پھر یہ حکومت اسلامی حکومت کہلانے کے لائق ہے وہاں کے حکمران مسلمانوں کے حکمران اور وہاں کی رعایا مسلمان رعایا کہلانے کی مستحق ہے۔

اگر مسلمانوں کے حکمران کی جانب سے مسلم ممالک میں اسلامی آئین نافذ نہیں کئے جاتے بلکہ کفر اور طاغوتی نظام رائج کی اجتا ہے اور اسی کو مزید ترقی دی جاتی ہے تو وہ ممالک اسلامی ممالک کہانے کے ہر گز ہرگز مستحق نہیں بلکہ غیر اسلامی حکومت کہلانے کے مستحق ہیں کیونکہ اسلامی مملکت کی شناخت آئین اسلام کے نفاذ سے ہوتی ہے مثلاً کفار کی مملکتوں کو دیکھئے:

۱۔ کہ جس ملک میں کمیونزم کا نظام رائج ہے اس کو کمیونسٹ ملک کہا جاتا ہے کیونکہ نظام مملکت کمیونزم ہے اور جمہوری مملکت میں جمہوری نظام رائج ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اسے جمہوری مملکت کہا جاتا ہے۔ سیکولر نظام جہاں پر موجود ہے اس کو سیکولر ملک کہا جاتا ہے۔ لہذا کسی اسلامی مملکت کے حکمران اگر نظام اسلام نافذ نہیں کرتے وہ اسلامی مملکت کہلانے کی مستحق نہیں۔ اسی طرح

کسی ملک کے مسلمان باشندے اگر اسلامی نظام کا نفاذ نہیں چاہتے نہ ہی وہ اسلامی نظام حکومت سے راضی اور خوش ہیں بلکہ وہ اس کے برعکس غیر اسلامی آئین ونظام کا نفاذ چاہتے ہیں اور غیر اسلامی آئین ونظام سے خوش ہیں تو وہ مسلمان کہلانے کے مستحق نہیں بلکہ ایسے لوگ کافر کہلانے کے مستحق ہیں۔اس سلسلہ میں:

گزشتہ صفحات میں جو قرآنی آیات درج کی گئی ہیں ان پر غور کرنا چاہئے۔یوں سمجھئے کہ کوئی مدعی اسلام کلمہ توحید پڑھتا ہے، نماز پڑھتا ہے، روزہ بھی رکھ لیتا ہے مگر اسلام کے دوسرے احکام پر یقین نہیں رکھتا، اسلامی نظام عدل اور نظام حکومت کو نہیں مانتا، نظام حدود وتعزیرات پر ایمان نہیں رکھتا، اسلام کے نظام قصاص ودیت کو نہیں مانتا، اسلام کے نظام حقوق وراثت کو نہیں تسلیم کرتا، اس کے نظام عدالت قضاء و شہادت کے قانون کو نہیں مانتا تو ایسا مدعی اسلام از روئے قرآن وحدیث مسلمان نہیں رہتا بلکہ ایسا آدمی پکا کافر ومنافق ہے کیونکہ دین اسلام میں مسلمان وہی ہوتا ہے جو کہ اسلام کے تمام ضروری اور قطعی احکام کو مانے اور تسلیم کرے پھر اس پر اعتراض نہ کرے۔اللہ کے یہاں عملی کوتاہی قابل معافی ہے لیکن عقیدے و یقین کے احکام اسلام کا انکار نا قابل معافی جرم ہے۔

''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه'' کا کلمہ توحید اسلام کے جملہ احکام پر حاوی ہوتا ہے۔ دیکھنے میں اس کے صرف دو اجزاء ہیں لیکن اس عنوان کے تحت اس کے جملہ احکام آجاتے ہیں۔تفصیلات گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہیں۔اہل انصاف کے لئے یہ چند ارشادات کافی ہیں حق جل مجدہ، ہم کو اور تمام حکمرانوں کو اور عالم اسلام کے سب مسلمانوں کو فہم صحیح نصیب فرمائے۔اسلامی آئین قرآن وسنت کے قانون کو نافذ کرنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ہر قسم کے عذاب اور سزا سے بچنے کی توفیق دے۔

وصلی اللہ علی البنی الامی و آلہٖ و اصحابہ اجمعین الیٰ یوم الدین.

اسلام کا طریق انتخاب اور مغربی جمہوریت

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم!

امابعد یہ کہ اسلام ایک جامع ترین دین اور کامل ترین مذہب ہے اس میں جیسے امور مملکت سے متعلق جملہ احکامات کی تفصیلات موجود ہیں ایسے ہی اس میں انتخابات کے لئے بہترین انتخابی ڈھانچہ موجود ہے جسے اپنا کر مسلمانان عالم اپنے امور مملکت کو انتہائی خوبی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں۔

۱۔ انتخابات میں امیدواروں کی اہلیت اوران کے لئے شرائط۔

۲۔ انتخابات میں رائے دہندگان کی اہلیت وشرائط۔

۳۔ کامیاب امیدوار کتنی اکثریت سے کامیاب ہوا شکست خوردہ امیدوار ووٹوں کی کتنی مقدار سے شکست کھایا۔

۴۔ کامیاب امیدوار نے کوئی دجل وفریب سے کام لیا ہے یانہیں یارشوت یادباؤ سے انتخابات لڑایا صاف وشفاف انتخاب سے کامیاب ہوا۔

۵۔ کامیاب امیدوار مملکت کے قانون کی وفاداری پر حلف اٹھائے کہ امور مملکت کو قانون کے مطابق چلائے گا،اس میں کسی قسم کی کمی وزیادتی نہیں کرے گا۔

٦۔ وہ امور جن کی وجہ سے منتخب نمائندہ اپنے منصب سے معزول قرار پاکر اپنے منصب کو چھوڑ دے گا۔

باقی اموراس کے تابع ہوتے ہیں بنیادی ڈھانچہ میں یہی چیزیں قابل ذکر ہوتی ہیں۔آپ دیکھئے اسلامی طرز انتخابات کے لئے ہمارادین واسلام کیا کہتا ہے۔

انتخابی ڈھانچہ میں ہمارے مذہب اسلام کے اندر بھی انہیں چیزوں کو ذکر کیا جاتا ہے اور کچھ زائد چیزیں بھی ہیں اوروہ یہ کہ:

۱۔ انتخابات کی ضرورت اوراس کی شرعی حیثیت کیا ہے۔

۲۔ انتخابی طریق کار کیا ہونا چاہیے۔

۳۔ جسے امیر مملکت یاوزیر منتخب کیا جائے اس کی اہلیت وشرائط۔

۴۔ رائے دہندگان کی اہلیت وشرائط۔

۵۔ مقصد انتخاب اوراس کی غرض۔

٦۔ امیر کے لئے مجلس شوریٰ۔

۷۔ جن امور سے امارت سے وہ سبکدوش ہو جاتا ہے ان کا ذکر۔
باقی چیزیں اس کے توابع میں آجاتی ہیں۔

اسلامی انتخاب کی ضرورت اور اس کی شرعی حیثیت

دفعہ نمبر ا۔ اسلام میں انتخاب امیر کا ضروری ہونا اور اس کی شرعی حیثیت کے بارے میں گزارش ہے۔

ا۔ کہ اسلام میں انتخاب امیر مسلمانوں پر واجب ہے، کیونکہ بے شمار امور اور واجبات شرعیہ کے قیام اور تنفیذ احکام کا دارومدار منتخب امیر پر موقوف ہوتا ہے۔

کتب شرع اور کتب فقہ وفتاویٰ میں بصراحت موجود ہے۔

کہ تقرری امیر، واجبات میں سے اہم واجب اور اولین واجب ہے۔ یہی وجہ تھی کہ صاحب شریعت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی تدفین سے قبل خلیفہ اور امیر مملکت کے مسئلہ کو اٹھایا گیا تا کہ در پیش روکی تجہیز وتدفین بھی خلیفہ میں ذرا بھی خلل واقع نہ ہو۔

اور من جملہ واجبات میں سے اہم واجب اس لئے بھی ہے کہ جو امور امیر مملکت کے انتخاب پر موقوف ہیں ان میں ذرا برابر تاخیر نہ ہو، اس واسطے کہ کتب شرع وفتاویٰ میں لکھا ہے۔

اَلْمُسْلِمُوْنَ لاَ بُدَّلَهُمْ اِمَامٌ يَقُوْمُ تَنفِيْذُ اَحْكَامِهِمْ وَ اِقَامَةِ حُدُوْدِهِمْ وَ سَدِّ ثُغُوْرِهِمْ وَ تَجْهِيْزِ جُيُوْشِهِمْ وَقَهْرِ الْمُتَغَلِّبَةِ وَالْمُتَلَصِّصَةِ وَ قُطَّاعِ الطَّرِيْقِ وَاِقَامَةِ الْجُمَعِ وَالاَعْيَادِ وَقُبُوْلِ الشَّهَادَةِ الْقَائِمَةِ عَلَى الْحُدُوْدِ وَالْحُقُوْقِ وَغَيْرِ ذَالِكَ مِنَ الاَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ.

جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے ضروری اور واجب ہے کہ وہ اپنے امور مملکت کو انجام دینے کے لئے اپنا امام مقرر کریں تا کہ وہ احکام شرع کی تنفیذ کرے، حدود وتعزیر کو جاری کرے، حقوق المسلمین کی حفاظت کے انتظامات کرے، باہمی نزاعات اور جھگڑوں کو نمٹانے مملکت میں عدل وانصاف قائم کرنے کے لئے قاضیوں کا تقرر کرے اور مسلمانوں کے خلاف اٹھنے والے ہر فتنہ کی سرکوبی کرے، ڈاکو، چور شر پسند، دہشت پھیلانے والوں کو ضروری سزا دے کر مملکت کو فساد سے بچائے، نماز جمعہ وعیدین اور عام نمازوں کے واسطے ضروری مساجد اور میدانوں کے انتظامات کرے اور نمازوں کے اہتمام کرنے کی ہدایت دے، لاوارث بچوں

کی متروکہ جائیداد کی حفاظت کرے، نادار اور یتیم بچوں کی ضروریات زندگی کا انتظام کرے۔

دشمن اسلام سے جہاد ہو تو جیش اسلام کی قیادت کرے جنگ میں کامیابی ہو تو غنیمت کا انتظام کرے عارضی شکست ہو تو اس کے اسباب دور کرے اور شہیدوں کے ورثاء کا خیال رکھے۔

سید الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں یہ سب امور آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود انجام دیا کرتے تھے، آپ کے خلفاء، آپ کے وزراء و مشیران ہوتے تھے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ و دیگر اولین سابقین مہاجرین صحابہ و انصار رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین آپ کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اول فرصت میں آپ کے جانشین اور قائم مقام و خلیفہ مقرر کرنے کا اہتمام کیا گیا کیونکہ یہ واجبات میں سے اہم واجب تھا۔ اولین و سابقین مہاجرین و انصاری صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے مل کر بالاتفاق رائے مشورہ کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو (جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق الدنیا والقبر والحشر والآخرہ ہیں) خلیفہ مقرر کیا یہ بحث طویل ہے کتب سیر و تاریخ میں تفصیلات ہیں۔

بہر حال افضل الصحابہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر ہوئے انہی کی نگرانی میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین اور تدفین عمل میں لائی۔

آپ نے اپنے عہد خلافت میں علی منہاج النبوۃ خلافت کی ذمہ داریاں پوری کیں پھر جب آپ مرض وفات میں تھے اولین و سابقین مہاجرین و انصار سے مشورہ کیا کہ خلیفہ ثانی کس کو بنایا جائے، آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں سب کے سب صحابہ نے آپ کی رائے سے اتفاق کیا، صرف ایک صحابی نے صرف اتنا فرمایا کہ حضرت عمر بہت سخت مزاج ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ابو بکر نرم تھا اس لئے وہ سخت مزاج تھا اب وہ نرم ہو جائے گا۔

بہر حال مہاجر و انصار میں سے اہل علم و تقویٰ کے مشورہ سے آپ نے خلیفہ ثانی اور آپ کی جانشینی کے لئے حضرت عمر کا نام لکھ دیا اور تمام صحابہ کرام بشمول حضرت عثمان رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ، تمام صحابہ نے بالا جماع اسے منظور کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے شروع سے یہی تھی کہ انہیں خلیفہ بنایا جائے۔ کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دینی حیثیت اور ان کے مقام عالی سے سب کے سب صحابہ واقف تھے اور سب جانتے تھے کہ اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بہتر اور موزوں شخص نظام مملکت کے لئے دوسری کوئی نہ تھی۔

غرض آپ نے بھی اپنے عہد خلافت میں خلافت کی ذمہ داریاں باحسن وجوہ پوری کیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ

کے نظام خلافت سنبھالنے کے بعد اسلام کو بڑی ترقی ہوئی فتوحات میں اضافہ ہوا، اسلام کا جھنڈا آدھی دنیا میں بلند ہوا۔

پھر جب حضرت عمر بن الخطابؓ کا واقعہ شہادت پیش آیا تو آپ نے بستر شہادت میں اہل علم واہل تقویٰ میں سے چھ صحابہ کی مجلس شوریٰ بنادی کہ انہی میں سے یہ لوگ جس کو مناسب سمجھیں خلیفہ ثالث مقرر کریں۔

ان سب نے مشورے کے بعد حضرت عثمان بن عفان ذی النورینؓ کو خلیفہ ثالث مقرر کیا، باقی تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اسے منظور کیا، آپ نے بھی اپنے عہد خلافت میں اپنی خلافت کی ذمہ داریاں باحسن وجوہ انجام دیں۔ اسلامی حکومت میں بڑی وسعت ہوئی۔ لیکن آخر میں فتنہ پردازوں نے آپ کی نرم دلی سے فائدہ اٹھا کر آپ کو شہید کر دیا آپ کے بعد صحابہ کرام کے اہل حل و عقد نے حضرت علیؓ کو خلیفہ مقرر کیا، بقیہ تمام صحابہ کرام نے بالاتفاق اسے منظور کیا غرض یہ کہ امور مملکت کو چلانے کے لئے امیر اور خلیفہ کا ہونا مسلمانوں کے لئے واجب وضروری ہے۔ خیر القرون کے اولین سابقین نے اس واجب کو اپنے اپنے دور میں باحسن وجوہ انجام دیا اور ہمارے لئے نمونہ چھوڑ کر گئے۔

۲۔ اسلام کا طریق انتخاب کیسا ہوگا؟ کیسے لوگ انتخاب میں رائے دہی کا حق استعمال کریں گے، کن صفات وشرائط والے کو منتخب کریں گے اور حق رائے دہی کا استعمال یعنی ووٹرون کا ووٹ دینا کیا حکم رکھتا ہے۔ ان دفعات کے لئے گزشتہ دفعہ نمبر ایک کی تفصیلات میں غور کرنے سے سب امور واضح ہو جاتے ہیں کہ اسلام میں جو شخص اہل شہادت میں سے ہوسکتا ہے وہ اہل امارت کے لئے بھی موزوں ہوسکتا ہے جس کی بقیہ تفصیلات آگے آرہی ہیں۔

کتب شرع اور فقہ وفتاویٰ میں اس کی تفصیلات موجود ہیں کہ انتخاب کرنے والے حضرات یعنی رائے دہندگان ایسے افراد ہوں گے جو اہلیت وشرائط کے موافق اترتے ہوں یعنی وہ علوم شرعیہ کے ماہرین ہونے کے ساتھ ساتھ اہل تقویٰ اور اہل رائے بھی ہوں۔ ایسے حضرات رائے دہی کا حق استعمال کریں یہ حضرات اس میں مشورہ کر کے سب سے زیادہ علم وعمل والا، تقویٰ والے اور امور مملکت کیلئے موزوں اور ماہر شخص کا انتخاب کریں۔

خلاصہ یہ کہ رائے دہندگان میں یہ صفات ہوں۔

۱۔ وہ عاقل بالغ ہو مجنون اور نابالغ نہ ہو، آزاد ہو، غلام نہ ہو۔

۲۔ احکام شرع کا عالم ہو، اور اس سے بے خبر جاہل نہ ہو۔

۵۔ شریعت کے نزدیک کامل العقل والرائے ہو، کمزور ناقص العقل نہ ہو۔

۶۔ اسلامی حدود وقصاص اور حقوق کے مقدمات میں شہادت دینے کی اہلیت رکھتا ہو یعنی ناقص العقل والدین عورت اور فاسق وفاجر مردود الشہادت نہ ہو۔

۷۔ ضروریات دین کا مکمل پابند ہو، بے دین اور بے شرع نہ ہو۔

۸۔ تقویٰ اور خوف خدا والا ہو۔

۹۔ خاص کر امانت دار ہو، خائن نہ ہو۔

۱۰۔ اور تمام صفات مطلوبہ میں وہ شہرت بھی رکھتا ہو۔

خیر القرون کے عہد مبارک میں طریق انتخاب کو سامنے رکھنے سے سارے امور واضح طور سے سمجھ میں آجاتے ہیں مزید کسی دلیل کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

انہیں صفات کے مالک وحامل افراد کو اسلامی اصطلاح میں اہل حل وعقد کہتے ہیں یعنی یہ گرہ باندھنا اور کھولنا اچھی طرح جانتے ہوں یعنی شرعی اصول وفروع کے تحت یہ حضرات مشکلات کی گرہوں کو کھولنا اور باندھنا جانتے ہوں اور اس کے پیچ وخم کو سمجھتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب اس اہلیت وشرائط کے حامل افراد کی رائے دہی سے جو فرد یا افراد منتخب ہوں گے وہ ان سے بہتر نہیں ہوں گے تو کم از کم ان کے برابر تو ضرور ہوں گے تو امور مملکت کو انجام دینے میں کوئی پریشانی نہ ہوگی دین ودنیا کے تمام امور باحسن وجوہ انجام پائیں گے لیکن دنیا کی دوسری قوموں میں چونکہ اسلام کے انہی اصولوں کی پابندی نہیں ہوتی، انتخابات کے بنیادی شرائط کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا، اس لئے مادر پدر آزاد لوگ رائے دہی میں حصہ لے سکتے ہیں ان کے یہاں رائے دہندہ کے لئے یا امیدوار کے لئے ایمان اور ایمانداری کا ہونا ان میں سے کوئی چیز ضروری نہیں ہوتی نہ امانت اور امانت داری کا کوئی خیال ہوتا ہے ان کے پاس علوم شرعیہ تو ہوتے ہی نہیں، دنیا کی جو تعلیم دیتے ہیں، وہ دیانتداری وامانتداری کا درس نہیں دیتی۔ غرض یہ کہ ان کے یہاں دنیاوی تعلیم کی شرط ہوتی بھی ہے لیکن اس سے نہ دین آتا ہے نہ دین داری نہ امانت ہوتی ہے نہ امانتداری ،جس کی وجہ سے بد سے بدکردار آدمی، زانی، شرابی لٹیرے، ڈاکو، چور، خائن تر، بدنام سے بدنام تر آدمی رائے دہی میں حصہ لیتا ہے اور لے سکتا ہے۔ صدارت وزارت کا امیدوار ہوسکتا ہے۔ جس کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو آج دنیا دیکھ رہی، بدنام زمانہ شخص دنیا کی سپر طاقت کا مالک بن سکتا ہے۔

ان انتخابات میں کثرت رائے سے آدمی کامیاب ہوجاتا ہے، صدر مملکت بن جاتا ہے خواہ وہ کسے باشد۔

کیونکہ رائے دہندگان میں اکثریت عوام کی ہوتی ہے تعلیم یافتہ کم ہوتے ہیں اور جو ہوتے بھی ہیں لیکن ان کے اندر دینی علوم نہیں ہوتے، جبکہ دین اور دینی علوم کے بغیر آدمی نہ حقوق اللہ کی پابندی کرتا ہے ، نہ حقوق العباد کی۔ لہذا ایسے رائے دہندگان کے چناؤ سے جو آدمی منتخب ہوکر آتا ہے وہ ووٹروں سے اچھا نہیں ہوتا زیادہ سے زیادہ انہیں کی طرح ہوتا ہے۔ تو ایسا شخص مملکت کے امور کو دیانتداری سے ، امانتداری سے عدل وانصاف سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی رعایت کر کے کیسے انجام دے سکے گا، ایسے آدمی سے نہ مملکت کی فلاح وصلاح ہو سکے گی نہ مملکت کے افراد اور رعایا کو امن وسکون نصیب ہوگا۔ یہ سب نقائص ان غیر اقوام کے طریق انتخاب میں اور مغربی جمہوریت میں موجود ہیں۔ اس کے برخلاف اسلامی انتخاب میں رائے دہندہ افراد اور منتخب افراد کے لئے کڑی شرائط ہیں کہ ایماندار ہو، امانتدار ہو، اہل شہادت ہو، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پابندی کرنے والا ہو، اہل علم ہونے کے ساتھ ساتھ اہل تقویٰ ہو اور ان صفات میں وہ شہرت بھی رکھتا ہو۔

تو ایسی شرائط وصفات کے تحت انتخاب، رائے دہی سے، مشورے سے جو بھی شخص کرسی صدارت یا وزارت پر فائز ہوگا وہ ان سے بہتر ہوگا یا کم از کم انہیں کی طرح ایماندار، دیانتدار، حقوق اللہ وحقوق العباد کو ادا کرنے والا ہوگا، صاحب علم وعمل ہوگا، صاحب تقویٰ وطہارت ہوگا، تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ جملہ امور مملکت صحیح انجام پائیں گے۔ عدل وانصاف قائم ہوگا، حقوق اللہ کی حفاظت ہوگی، حقوق العباد کی ادائیگی ہوگی۔ نظام مملکت نظام الٰہی کے تحت چلے گا کسی کو کسی سے شکایت نہ ہوگی، دنیا میں نظام بہشت کا نظارہ دیکھنے میں آئے گا۔

کسے را با کسے کارے نباشد
بہشت انجا کہ ازارے نباشد

افسوس صد افسوس کہ آج کل اسلامی ممالک کے مسلمانوں نے بھی غیر اقوام کی نقل اتارتے ہوئے انہیں کے طریق انتخاب کو اپنایا ہوا ہے، انہیں کی طرح نہ ووٹروں کے لئے اہلیت وشرائط کو ضروری قرار دیتے ہیں، نہ امیدواروں کے لئے کسی اہلیت اور شرائط کو ضروری قرار دیتے ہیں، جبکہ انتخابات کے لئے اسلام نے انہیں چیزوں کو لازم وضروری قرار دیا ہے۔

عجیب بات ہے کہ ہمارے یہاں ووٹ دینے کو رسم ورواج کی طرح ایک غیر ذمہ دارانہ فعل سمجھتے ہوئے اس کا استعمال کرتے ہیں جبکہ بعض دنیادار اسے اپنی وجاہت ووقار بڑائی کا سامان سمجھتے ہیں۔ حالانکہ احکام شرع کے تحت اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مذکورہ سارے خیالات غلط اور باطل ہیں،

درست بات یہ ہے کہ امیر یا وزیر وغیرہ کا انتخاب اور اس کے لئے ووٹ دینا ایک اہم ذمہ داری اور بہت بڑے واجبات شرعیہ میں سے اہم ترین واجب ہے۔

حضرت مفتی اعظم مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی نے اپنی تفسیر معارف القرآن اور جواہر الفقہ میں لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ کہ شرعی اعتبار سے ووٹ دینا دراصل اس بات کی شہادت دینا ہوتا ہے کہ جس کو ووٹ دیا جارہا ہے وہ اس کی نمائندگی کے لئے اہل ہے اس کے اندر تمام صفات واہلیت کی تمام شرائط لازمی موجود ہیں۔

۲۔ نیز ووٹ دینا ایک شرعی امانتداری ذمہ داری کو ادا کرنا ہوتا ہے ووٹ دینے والا ووٹ دے کر قومی امانت کے بار امانت کو منتخب نمائندہ کے سپرد کرتا ہے۔

۳۔ تیسرے اس میں وکالت بھی ہوتی ہے کہ ووٹ دینے والا شخص، نمائندہ کو اپنا وکیل بنا دیتا ہے کہ وہ جو کچھ کرے گا اس کے گناہ وثواب میں ووٹ دینے والا بھی شریک ہوگا۔ تو گویا ووٹ دینے کی تین حیثیتیں ہیں یہ امانت کی ادائیگی ہے کہ یہ شخص اس کا اہل ہے اسکے حق میں رائے دینا ہے شہادت دینا ہے کہ یہ شخص امور مملکت کا نظام چلانے کے لائق اور اہل ہے اس کی گواہی دینا ہے اور یہ کہ منتخب نمائندہ کو وکیل بنانا ہوتا ہے کہ اس کے جملہ امور بابت نظام مملکت کے بارے میں ہر چیز سیاہ وسفید میں ووٹ دینے والا بھی اس کا شریک ہے۔

غرض یہ کہ دین اسلام میں انتخاب امیر مملکت امر واجب ہے اور انتخاب اور ووٹنگ کی حیثیت ادائے امانت وادائے شہادت اور منتخب نمائندہ کو اپنا وکیل بنانا ہے لہذا انتخاب میں رائے دہندگان کا اور امیدواروں کا شرعی اصول کے مطابق اہلیت اور قابلیت والے ہونا بھی ضروری اور واجب ہے۔

ان سب امور کے واسطے بطور دلیل قرآن حکیم کی جامع اور مختصر آیت ذیل کا مفہوم اور تشریح کافی ہے۔

حق جلّ مجدہ، تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الاَمَانَاتِ اِلٰی اَھْلِھَا. (الآیہ)

ترجمہ: اے ایمان والو! بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم لوگ جملہ امانات کو ان کے حقدار کو ادا کرو۔

آیت مذکورہ کے مخاطب صحابہ کرام سے لے کر قیامت تک آنے والے جملہ مسلمان وایمان والے

ہیں۔ پھران میں اولین مخاطبین صحابہ کرام ہیں جو افضل الامۃ ہیں اس کے بعد تابعین و تبع تابعین درجہ بدرجہ بعد کے جملہ اہل ایمان اس کے مخاطب ہیں، شرع نصوص کا مخاطب وہ مکلف ہر عاقل و بالغ ہوتا ہے۔ مجنون و نابالغ نہیں ہوتا پھر جو ایمان والے ہیں وہ مخاطب ہیں، بے ایمان کافر اس کے مخاطب نہیں ہیں اور جو اہل شہادت ہیں وہ اس کے مخاطب ہیں۔

ووٹ کی حیثیت جیسے امانت کی ہے ایسے شہادت کی بھی ہے

اوپر کی تحریر سے معلوم ہوا کہ ووٹ کی حیثیت امانت کی ہے اور اس کی دلیل بھی قارئین کرام نے پڑھ لی اب اس کی دوسری حیثیت شہادت کی ہے اس کی دلیل پڑھئے۔

یعنی آدمی کسی کو ووٹ دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کے حق میں شہادت دے رہا ہے کہ یہ امیدوار واقعی ووٹ کا اہل ہے، امیدوار کے لئے جتنے امور کی شرطیں ہیں وہ تمام صفات اس کے اندر موجود ہیں، ایماندار ہے، امانتدار ہے، کامل العقل والرائے ہے، دیندار ہے، پابند شرع ہے، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی رعایت کرنے والا ہے، عادل و منصف ہے، تمام ووٹ دینے والوں کی امنگوں کے مطابق ہے۔ لہذا ووٹ دینے والے نے جیسے اس کے حق میں شہادت دی ہے کہ اگر امیدوار واقعی ایسا ہی ہے، تمام صفات لازمہ اس میں موجود ہے تو گویا اس نے شہادت کا حق ادا کیا، صحیح شہادت دی جس کا اجر اس کو ملے گا اس کے ثمرات سے وہ مستفید ہوگا۔ لیکن اتفاق سے ووٹ دینے والے نے اگر غلط بیانی کی، ووٹ دینے والا جانتا ہے کہ امیدوار آدمی بے ایمان ہے، بے دین ہے، شرع کا پابند نہیں ہے، خائن ہے، عادل نہیں ظالم ہے، پھر قومیت کی وجہ سے، پارٹی اور جماعت عصبیت کی وجہ سے یا رشوت لے کر اس نے اسے ووٹ دیا ہے اور اس کی اہلیت کی شہادت دی ہے تو حقیقۃ اس نے جھوٹی شہادت دی ہے، جس کا وبال گناہ کبیرہ کا اس پر پڑے گا اور اس نے خیانت کی خیانت کا وبال اس پر پڑے گا، مستحق جہنم بنے گا اور ایسے آدمی کے بارے میں ووٹ دینے والے نے اگر کسی دوسرے سے کہا کہ یہ آدمی صحیح ہے تم اسی کو ووٹ دو جبکہ آدمی صحیح نہیں ہے تو گویا اس نے ناجائز سفارش کی ہے۔ یہ بھی گناہ کبیرہ ہے اس کی سزا بھی اسے بھگتنی پڑے گی۔

قرآن میں:

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا.

یعنی جو شخص اچھی سفارش کرتا ہے اس کے ثواب میں سفارش کرنے کا ثواب ملتا ہے اور جو کوئی بری سفارش کرتا ہے تو سفارش کرنے والے کو اس برائی کا گناہ میں سے حصہ ملتا ہے۔

انتخابات میں اچھی سفارش یہ ہے کہ امانتدار دیانتدار، عدل وانصاف کرنے والے، شرع کے پابند، حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرنے والے، کے لئے سفارش کرے ایسی صورت میں نمائندہ اختیار کے تحت جتنی اچھائیاں کرے گا ان میں رائے دہندہ کو بھی ثواب ملے گا۔ اس لئے ہر مسلمان کو چاہئے کہ ایسے آدمی کے حق میں رائے دے دوسروں سے اس کی سفارش کرے، اس کے برعکس اس میں بری سفارش یہ ہے کہ نا اہل، بے دین، بے ایمان، خائن، لٹیرے، ظالم کے حق میں ووٹ دے اور دوسرے سے ووٹ دینے کی سفارش کرے لہذا یہ نمائندہ جتنے برے کام اختیار کرے گا ان کے گناہوں میں ووٹ دینے والا بھی شامل ہوگا۔ لہذا ووٹ کو کوئی غیر اہم اور معمولی چیز نہ سمجھنا چاہئے کیونکہ یہ ایک بہت بڑی امانت اور ذمہ داری اور شرعی شہادت ہے۔

اسی واسطے قرآن حکیم کے اندر حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ

دوسری جگہ فرمایا:

كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ

دونوں آیات میں حق تعالیٰ نے تاکید فرمائی ہے کہ شہادت سے جان نہ چراؤ بلکہ ہر آدمی شہادت کو پوری طرح صحیح عدل وانصاف اور امانتداری کے ساتھ ادا کرے یہ شرعی حکم ہے۔ چنانچہ ارشار ربانی ہے:

وَلَا تَكْتُمُوْا الشَّهَادَةَ

اور اس میں کسی قسم کی غلط بیانی دھوکہ، خیانت کجی، جھوٹ اختیار کرنے سے بچے اگر ایسا کرے گا تو وہ گناہ کا ارتکاب کرے گا۔

خواہ یہ غلط بیانی جماعتی اصول کے تحت کرے یا برادری تعلق کی بنیاد پر کرے یا پیسے کے بدلہ پیسے کی طمع اور لالچ میں کرے، یا دنیا کے کسی فائدہ کے پیش نظر، تمام صورتوں میں ووٹ دینے والا، جھوٹ، خیانت اور جھوٹی شہادت کے جرم کا مرتکب ہوگا، اس واسطے رائے دہندہ یعنی ووٹر یہ نہ سمجھیں کہ یہ کوئی معمولی چیز ہے بلکہ شرع میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے لہذا:

۱۔ اگر امیدوار واقعی ایماندار اور امانتدار ہے، شرع کا پابند ہے، حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ادا کرنے والا ہے، وہ قوم اور عوام کی صحیح نمائندگی کر سکتا ہے اور کرے گا تو اس کو ووٹ دینا واجب ہے، شرعی حکم

ہے امانت دار کو امانت کا حق ادا کرنا ہے، سچی شہادت دینا ہے اور اچھی سفارش کرنا ہے، ووٹ دینے والے کو ووٹ دینے سے مذکورہ تمام چیزوں کا اجر ملے گا اور منتخب نمائندہ آگے جتنے اچھے کام کرے گا ان میں ہر کام میں اس کو کم از کم دس دس نیکیاں ملیں گی ایسا ہی ووٹر کو بھی ملے گا کیونکہ اس نے اس کو امانتداری کا ووٹ دیا اور سچی شہادت دی تھی!

لیکن معاملہ اگر اس کے برعکس ہو تو ووٹر کو خلاف امانت ووٹ دینے کا گناہ ہوگا جھوٹی شہادت کا گناہ ملے گا، ناجائز سفارش کرنے کا گناہ ملے گا۔ یہ سب کام کبائر میں داخل ہیں اور منتخب نمائندہ جتنے برے کام اس ووٹ کی بنیاد پر کرے گا سب میں ایک گناہ ووٹر کو بھی ملے گا، بدنامی، ذلت ورسوائی الگ۔ دیکھئے کتنے نقصانات ہیں۔

اس لئے مسلمان ووٹ دینے کو کوئی معمولی چیز نہ سمجھیں۔

۲۔ البتہ ہمارے یہاں اسلامی طرز انتخابات نہ ہونے کی وجہ سے پریشانی ہوتی ہے اکثر و بیشتر اوقات پورے طور سے نہ ایماندار ملتا ہے نہ امانتدار، نہ پورے طور سے حقوق اللہ کو ادا کرنے والا ملتا ہے نہ حقوق العباد کو ادا کرنے والا ہوتا ہے تو اس میں ووٹر کو یہ دیکھنا ہوگا کہ مختلف نمائندوں میں سے کس کے عقائد ونظریات زیادہ صحیح ہیں پھر کس کے اعمال زیادہ شریعت کے مطابق ہیں تو اسی کے حق میں ووٹ دینا رائے دینا واجب ہوگا۔ کیونکہ اگر ووٹر اس کو ووٹ نہیں دے گا تو غلط عقائد اور نظریئے والے غلط اعمال والے منتخب ہو جائیں گے پھر اس کا وبال اس ووٹر پر بھی پڑے گا جس کے ووٹ نہ دینے سے وہ آدمی آ سکتا تھا جس کے صحیح عقائد ہونے کے ساتھ بیشتر اعمال صحیح ہیں مگر وہ نہ آسکا۔

۳۔ بعض دفعہ حلقہ انتخاب میں ایک بھی صحیح عقائد واعمال والے نہیں ہوتے، عقائد واعمال میں تقریباً برابر ہوتے ہیں یا معمولی فرق ہوتا ہے تو پوری طرح اس میں دیکھا جائے گا کہ ان امیدواروں میں دینی دنیاوی لحاظ سے زیادہ ضرر کس سے ممکن ہے اور کم ضرر کس سے، پھر کم ضرر والے کو ووٹ دینا چاہئے، زیادہ ضرر والے کو ووٹ دینا ناجائز وحرام ہے۔ ایسی صورت میں اگر ووٹ نہ دے تو کوئی گناہ بھی نہیں ہے۔

گزشتہ تحریر سے یہ معلوم ہوا کہ انتخاب اور ووٹنگ کی حیثیت من جملہ امانات میں سے ایک امانت ہے اور شہادت بھی ہے اور وکالت بھی۔

تو مذکورہ بالا امانت کے مفہوم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ عاقل وبالغ ہیں اور ایمان والے

بھی، ان کے پاس سی کی امانات ہیں خواہ کسی قسم کی ہوں، وہی لوگ امانات کو اپنے اپنے حقداروں کو ادا کریں، حقدار یعنی اس کے وارث اور اہلیت والے ہیں ان کو ادا کریں۔

صحابہ کرام جو آیت مذکورہ کے اولین مخاطب ہیں اور اعلیٰ ترین ایمان والے ہیں، انہوں نے امانات کو کیسے ادا کیا تھا اس امانت انتخاب اور ووٹنگ کو اپنے حقداروں کو کیسے پہنچایا تھا، صحابہ کرام کے طرز انتخاب میں غور کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے، کہ انہوں نے انتخاب میں رائے دہی کا حق کس کو دیا تھا، کن صحابہ کرامؓ نے رائے دہی میں حصہ لیا تھا، خواص صحابہ تھے یا عوام بھی تھے، اہل علم کے تھے یا بے علم بھی تھے، اہل تقویٰ میں اعلیٰ معیار کے صحابہ تھے یا سب کے سب صحابہ شامل تھے، جبکہ صحابہ کرام سب کے سب عدول تھے، معلوم ہوا کہ قرآنی آیات اور صحابہ کرام کے طرز عمل سے ابوبکر صدیقؓ کو خلیفہ مقرر کرنے والے اعلیٰ ترین اہل علم، اہل تقویٰ تھے، اولین مہاجرین، سابقین انصارؓ تھے۔ مدینہ اور مکہ شام وبصریٰ وکوفہ تک پھیلے ہوئے سارے صحابہ کرام وہاں موجود نہ تھے، پھر جس کا انتخاب کیا ہے وہ اعلیٰ ترین شخص افضل الصحابہ بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم تھا، پھر ان کے بعد جس کا انتخاب کیا گیا، یعنی خلیفہ ثانی عمر فاروقؓ بھی ایسے ہی تھے انہیں میں اعلیٰ ترین انسان تھے اور صحابہ کرام میں اعلیٰ ترین علم وعمل والے اور تقویٰ طہارت والوں نے انتخاب کیا تھا۔ گویا ان حضرات نے آیت مذکورہ کے واقعی معنیٰ ومفہوم کی رعایت کرتے ہوئے امانت انتخاب کو واقعی حقداروں کو سپرد کیا تھا۔ ان کا طرز عمل طریقہ انتخاب ہمارے لیئے بہترین نمونہ ہے۔ انہوں نے رائے دہندہ کے لئے جن شرائط کو ملحوظ رکھا ہے ہمارے لئے بھی انہیں شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی فرمان پوری امت کے لئے لازم ہے۔

لہذا آیت امانت اور آیت شہادت کی روح سے مسلمانوں کے لئے اسلامی مملکت میں مغربی جمہوریت کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ جس میں رائے دہندہ کے لئے نہ ایمان کی شرط ہے نہ ایماندار کی، نہ امانت کی شرط ہے نہ ایمانداری، نہ شہادت کی اہلیت شرط ہے نہ اس کی قابلیت کی۔ رائے دہندگان جن کے لئے حق رائے دہی دیتے ہیں، وہ ووٹ دیتے ہیں ان کے اندر بنا ایمان کی شرط ہے نہ ایمانداری کی، نہ امانت کی شرط ہے نہ ایمانداری کی، نہ پابند شرع ہونا ضروری ہے نہ تقویٰ، طہارت کی، تو ایسے مادر وپدر آزاد لوگوں کے انتخاب اور چناؤ سے جو لوگ منتخب ہوتے ہیں، ظاہر ہے وہ بھی ایسے بے ایمان کافر خائن فحاش بدکردار بداطوار ہی ہونگے۔

حدیث شریف میں:

"لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَةَ لَهٗ"

جس کے پاس ایمان نہیں اس کے پاس امانت اور ایمانداری بھی نہیں۔

دوسری حدیث میں ہے کہ جس کے پاس امانت اور ایمانداری نہیں وہ خائن ہے، منافق ہے۔

سیاسی اور مذہبی مناصب اور عہدے امانات ہیں

واضح ہو کہ اسلام میں تمام عہدے اور مناصب امانات ہیں۔ لہذا کسی سیاسی عہدہ یا مذہبی عہدہ کے لئے رائے دہندہ کا ایماندار ہونا اور امانت دار ہونا شرط ہے۔

جو شخص حقوق اللہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، جہاد و دیگر فرائض شریعہ کا پابند نہیں وہ خائن ہے، وہ عملاً منافق ہے۔ اگر کسی امر شرعی ضروری کا وہ انکار کرے وہ کافر و مرتد ہے، اسلامی اصول انتخاب کی رو سے ایسے لوگ انتخاب میں ووٹ دینے کے اہل ہیں نہ امیدوار ہونے کے اہل ہیں۔

اس لئے انہوں نے اگر رائے دہی کا حق استعمال کیا تو اس کا اعتبار نہیں ہے ان کے ووٹوں سے جو امیدوار منتخب ہو کر آئے گا اس کا بھی اعتبار نہیں۔

حدیث شریف میں ہے:

اِذَا وُسِّدَ الأَمْرُ اِلیٰ غَیْرِ اَهْلِهَا فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ:

اگر کسی نااہل کو کوئی سیاسی یا مذہبی منصب یا عہدہ سپرد کیا گیا تو سمجھو کہ قیامت قریب ہے، پھر اس کے لئے انتظار کرو، کیونکہ اب کسی خیر کی امید نہیں ہے۔

کیونکہ جب بے ایمان بے دین خائن بے شرع لوگ ووٹ دیں گے تو انہی کی قسم کے لوگ منتخب ہوں گے۔ یہ لوگ نہ حقوق اللہ کو ادا کریں گے نہ حقوق العباد کو ادا کریں گے، نہ احکام شرعی کے خود پابند ہیں نہ دوسروں سے پابندی کرائیں گے۔

پھر صوبائیت، علاقائیت، قومیت، عصبیت جاہلیت، مادی منفعت مالی فوائد کے لئے حکمرانی ہوگی، نہ عدل و انصاف قائم ہوگا نہ حقوق والوں کو حقوق ملیں گے، نہ مظلوموں کی دادرسی ہوگی، پوری مملکت میں فتنے و فساد کا دور دورہ ہوگا، ہر طرف سے بے چینی اور بدامنی نظر آئے گی ایک دوسرے کے دست و گریباں ہوں گے، قتل و غارتگری عام ہوگی، جس کے پاس مادی قوت اور افرادی طاقت ہوگی وہ اپنی منفعت، مالی فوائد کے لئے وہی سب کچھ کرے گا جو اس کے جی میں آوے گا۔

جبکہ دین اسلام چاہتا ہے کہ ایمان والے اور عمل وتقویٰ والے لوگ انتخاب، چناؤ کریں اور ایماندار اور امانتدار علوم شرع کے حامل اور شرع کے پابند لوگوں کا چناؤ کریں تا کہ اللہ کی زمین میں اللہ جل جلالہ

اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مطابق نظام چلے، حقوق اللہ کی ادائیگی ہو اور حقوق العباد کی بھی حفاظت ہو۔ عدل و انصاف قائم ہو، ظلم و زیادتی بند ہو، مملکت میں امن و سکون قائم ہو، ہر قسم کے فتنے و فساد دور ہوں۔

لیکن مغرب زدہ عناصر اور طاغوتی طاقتیں یہ نہیں چاہتی کہ اللہ کی سر زمین میں اللہ کے احکام نافذ ہوں، وہ چاہتے ہیں کہ ان کی خواہشات حکمرانی ہو، من مانی کی حکمرانی ہو، لہذا ان کو انتخاب کے لئے اسلام کے زرین اصول پسند نہیں نہ اللہ جل جلالہ کی کتاب کی حکمرانی انہیں پسند ہے۔ اہل اسلام اور ان کے علماء کہتے ہیں یہ طاغوتی طاقتیں اسلام کی دشمن ہیں، خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہیں۔ مسلمانوں کے بدخواہ ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ دشمنوں کے دھوکے میں نہ آئیں ان کی باتوں کو نہ مانیں اور ان سے اور ان کے نظریے و افکار سے اپنے آپ کو بچائیں، ان کے طرز زندگی، طرز انتخابات کو نہ اپنائیں بلکہ اسلامی نظریئے اور افکار کو اپنائیں۔ اسلامی طرز زندگی اور اسلامی طرز کے انتخابات کو اختیار کریں۔ اس میں ہی ان کے لئے بہتری ہے۔ ورنہ حقوق اللہ ضائع ہوں گے حقوق العباد برباد ہوں گے، فتنے و فسادات کا بازار گرم ہوگا۔ ملک سے چین و سکون ختم ہو جائے گا، پوری زمین میں فساد ہی فساد نظر آئے گا۔ جیسا کہ عرصۂ دراز سے ہم انہیں چیزوں کو دیکھ رہے ہیں۔

عجیب بات ہے یہ مغربی طاقتیں اور مغرب زدہ مرد و خواتین اس منطق کو بھی نہیں سوچتے۔

کہ کسی یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ کے انتخاب کے لئے عوام کی رائے دہی اور ووٹنگ کا اعتبار نہیں کرتے، کسی انجینئرنگ کالج کی سربراہی کے لئے عوام اور ہر کس و ناکس کی رائے دہی اور ووٹنگ کو نہیں مانتے۔

کسی ہسپتال کے سرجنوں کے انتخاب کے لئے عوام کی رائے اور ووٹنگ کو ضروری نہیں سمجھتے۔ مگر جس صدر مملکت کے ذمہ ان تمام سربراہوں کا انتخاب اور منظوری ضروری ہوتی ہے اس سربراہ کے انتخاب کے لئے عوام کی رائے کا اعتبار کرتے ہیں، ان کی ووٹنگ کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان عقل کے اندھوں کو چاہئے کہ ان امور کو غور کریں کہ اس منطق کا ان کے پاس کیا عذر ہے۔ جبکہ سربراہ مملکت کے ذمہ ہوتا ہے کہ ججوں کا انتخاب کرے، یونیورسٹیوں کے سربراہوں کا انتخاب کرے، افواج کے سربراہوں کا انتخاب کرے، بڑے بڑے اہم ادارے اور اہم شعبوں کے سربراہوں کا انتخاب کرے اور اس کی منظوری دے۔

کیا سربراہ مملکت کا انتخاب اب سب سے زیادہ اہلیت والوں کے ذریعہ نہیں ہونا چاہئے؟ لیکن اہل

مغرب اگر ایسے زریں اصولوں کو نہ مانیں، ہم ان کو جانے دیں کہ وہ جدھر جانا چاہیں جائیں مگر ہمارے مسلمانوں کو کیا ہو گیا وہ اسلام کے زریں اصولوں کو انتخاب کے لئے کیوں نہیں اپناتے۔ جبکہ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ مسلمان ہیں، خدا کی کتاب کو مانتے ہیں، رسول اور رسول کی حدیث کو مانتے ہیں تو کتاب اللہ اور سنت رسول کے اصولوں کو تسلیم کئے بغیر ایمان و اسلام کا دعویٰ کیسے درست ہے؟

حالانکہ اسلام کے احکام میں سے کسی ضروری حکم پر عمل کرنا جو لوگ چھوڑ دیں تو وہ فاسق اور نافرمان ہوتے ہیں اور کسی ضروری حکم کا اگر کوئی انکار کرے تو ایسا آدمی کافر اور مرتد بن جاتا ہے، واجب القتل اور جہنمی قرار پاتا ہے الا یہ کہ توبہ کرے۔

تو کیا انتخابات کے اسلامی اصولوں کے نہ ماننے سے کفر نہیں آتا، ارتداد نہیں آتا، یہ خدا اور اس کی کتاب کے ساتھ مذاق نہیں ہے؟

دین اسلام نے مسلمانوں کو جو اصول دیئے ہیں ہم نے ان کو فراموش کر دیا ہے کبھی سوشلزم کا نظام اپنانے کی سعی کرتے ہیں کبھی سیکولرازم کی، کبھی مغربی جمہوریت کے دروازے کھٹکھٹاتے ہیں، کبھی سرمایہ داری نظام کی طرف بھاگتے ہیں۔

ہم اپنے گھر کی چیزوں کو نظر انداز کرتے ہیں، ضائع کرتے ہیں، دوسروں سے بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ رسوائی اور ذلت اٹھاتے ہیں، غیر مسلم قوم خواہ امریکہ والے ہوں یا برطانیہ اور فرانس والے یہ بے چارے بے دین بے اصول ہیں، خود اندھے ہیں، بے راہ اور گمراہ ہیں، یہ دوسروں کی کیا رہنمائی کریں گے سوائے فساد و فتنہ کے۔

مسلمانوں کے تمام اجتماعی امور مشورے سے طے ہونا واجب ہیں

یہ بھی حقیقت ہے کہ امیر مملکت ہو یا امیر بلدیا امیر جماعت، باوجود امیر ہونے کہ ایماندار اور امانتدار ہے۔ پابند شرع اور تقویٰ دار ہے لیکن گناہوں سے معصوم نہیں ہوتا، شیطان کے تسلط سے آزاد نہیں ہوتا لہذا ہر اجتماعی امر میں مشورہ ضروری ہے۔ اللہ جل جلالہ نے اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ امت کو یہی ہدایت دی ہے۔

"وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ"

ہر اجتماعی معاملہ میں مشورہ کر لیا کرو۔

پھر اتفاق رائے یا کم از کم اکثریت کی رائے سے مختلف آراء میں سے جو رائے صحیح اور دلیل سے قوی

معلوم ہو اس پر عمل کیا کرو۔

اس واسطے امیر مملکت اپنے منصب پر فائز ہونے کے لئے جیسا کہ شوریٰ کی رائے سے فائز ہوتا ہے۔اسی طرح اس کو اپنے امور مملکت کو چلانے کے لئے اہل شوریٰ کی رائے کی ضرورت ہے اور یہ اہل ایمان کی خصوصی شان ہے۔

حق تعالیٰ جل مجدہ، نے ارشاد فرمایا:

وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا وَ ھُمْ یَغْفِرُوْنَ، وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّھِمْ وَ اَقَامُوْا الصَّلٰوۃَ وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ.

(شوریٰ آیت ۳۸)

اور ایمانداروں میں جو لوگ بچتے ہیں بڑے گناہوں سے اور بے حیائی سے اور جب غصہ آئے تو وہ معاف بھی کر دیتے ہیں اور جنہوں نے اپنے رب کے تمام حکموں کو مان لیا اور نماز کو قائم کیا اور ان کے باہمی کام مشورہ سے ہوتے ہیں اور ہمارے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اہل ایمان کی صفات بیان کرتے ہوئے حق جل مجدہ نے فرمایا کہ جو لوگ ایمان والے ہیں وہ تمام کبیرہ گناہوں سے بچتے ہیں مثلاً شرک، کفر، ماں باپ کی نافرمانی، جھوٹ فریب، خیانت، دھوکہ، سود ،رشوت ،شراب زنا، فرائض وواجبات میں کوتاہی وغیرہ نہیں کرتے کیونکہ ان میں کوتاہی کرنا بھی کبیرہ گناہ ہے اور خاص کر ہر قسم کی بے حیائی اور حیا سوز گناہوں سے بھی پرہیز کرتے ہیں یعنی مکمل شرع کے پیروکار ہیں اور جب کسی پر غصہ ہوا سے معاف کرتے ہیں اور اللہ کے تمام حکموں کے پابند ہیں خاص کر نمازوں کا بہت اہتمام کرنے والے ہین اور ان کے تمام اجتماعی کام آپس میں مشورہ سے ہوتے ہیں اور ہمارے دیئے ہوئے مال میں صدقات وخیرات کے مواقع میں خرچ کرتے ہیں وہ واقعی ایمان والے ہیں، لائق ستائش ہیں۔

آیت مذکورہ میں ہر فقرہ تو تفسیر طلب ہے مگر یہاں پر مقصد مشورہ والا فقرہ ہے"وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ "اللہ تعالیٰ ایمانداروں کی صفات اور شان بیان فرماتا ہے کہ ان کے تمام اجتماعی امور مشورہ سے ہوتے ہیں، تو امیر مملکت کا تقرر جیسا اہم کام، اور تقرری کے بعد امور مملکت کے بارے میں مشورے کی اہمیت تو عام معاملات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم باجود یکہ صاحب شریعت اور صاحب وحی تھے، صحابہ کرام سے مشورہ کیا

کرتے تھے۔ کتب حدیث میں بے شمار واقعات ہیں کہ آپ نے ان میں مشورہ کیا اور مشورہ کے بعد جو بات زیادہ قابل عمل سمجھتے اسی کے مطابق عمل کرتے تھے۔ دراصل یہ سب کچھ امت کے لئے تعلیم دینے کے لئے کرتے تھے کیونکہ آپ تو نبی معلم تھے، ان کے بعد خلیفہ اول ابوبکر صدیق ؓ اپنے رفقاء میں سے بعض خواص اہل علم وتقویٰ صحابہ سے مشورہ کرتے تھے اسی طرح حضرت عمر فاروق ؓ حضرت عثمان غنی ؓ، حضرت علیؓ اور آپ کے بعد امراء بھی سب کے سب مشورے سے امور مملکت انجام دیا کرتے تھے، یہی ہمارے لئے بہترین نمونہ ہے۔

اس واسطے اسلامی مملکت میں امیر مملکت کے لئے یہ کام واجب اور ضروری ہے کہ امور مملکت کو مشورے سے انجام دے۔ وشاورھم فی الامر میں اس کا وجوبی حکم دیا گیا ہے۔ مفسرین کرام نے بھی اسے واجب کہا ہے کمافی ابن کثیر۔ امام ابوبکر جصاص نے فرمایا آیت سے واضح ہے کہ تمام مسلمان اجتماعی امور میں مشورہ کے پابند ہیں نہ جلد بازی کریں نہ خودرائے سے کام لیں، بلکہ اہل عقل وبصیرت سے مشورہ لے کر اجتماعی امور میں قدم اٹھائیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ کے بعد اگر ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس میں قرآن میں کوئی واضح صریح فیصلہ نہیں کیا آپ نے بھی کوئی واضح حکم نہیں دیا ہم کو واضح حکم نہ ملا تو ہم کیسے عمل کریں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

شَاوِرُوْ الْفُقَهَاءَ وَالْعَابِدِيْنَ مِنْ اُمَّتِيْ
وَلَا تَقْضُوْا بِرَأْيِ وَاحِدٍ اَوْ بِرَاىِ خَاصَّةٍ

یعنی میری امت میں سے اہل فقہ وعلم اور عبادت گزاروں سے مشورہ کرلو اور آپس میں مشورہ کر کے معاملہ طے کرلو، کسی ایک کی رائے پر فیصلہ نہ کرو کسی رائے خاص پر فیصلہ نہ کرو۔

جس سے یہ بھی واضح ہوا کہ اہل شوریٰ وہی لوگ ہوں گے جو اہل فقہ وعلم ہوں اور ساتھ ساتھ اہل عمل اور بڑے عبادت گزار بھی ہوں۔ اسی واسطے صاحب روح المعانی نے فرمایا کہ جو مشورہ اہل فقہ وعلم اور اہل عمل وعبادت گزاروں سے نہیں بلکہ بے علم اور بے عمل اور بے شرع لوگوں سے مشورہ کیا جاوے تو اس میں صلاح وفلاح کے مقابلہ میں فتنہ وفساد کا غلبہ رہے گا۔

ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک تمہارے بہتر لوگ امراء و حکام ہوں گے اور تمہارے مالدار سخی اور خرچ کرنے والے ہوں گے اور تمہارے امور مشورہ سے طے ہوا کریں گے اس وقت تک تمہارا زمین کے اوپر رہنا بہتر ہے اور جب تمہارے برے لوگ ''امرا اور حکمران'' ہوں گے، اور تمہارے مالدار لوگ بخیل ہوں گے اور تمہارے کام عورتوں کے سپرد ہو جائیں گے، اس وقت تمہارے لئے زمین کی پیٹھ کی بجائے زمین کا پیٹ بہتر ہوگا''۔ (روح المعانی)

شوریٰ کے لئے کیسے لوگ ہونے چاہئیں

اوپر بیان ہوا ہے کہ رائے دہندگان کے لئے پکے اور سچے مسلمان ہونا ضروری ہے۔ سچے مسلمان کون لوگ ہیں ان کی صفات ذیل میں بیان کی گئی ہے کہ وہ ایمان وعمل اور تقویٰ وغیرہ امور سے آراستہ ہوں اور باہمی معاملات میں مشورے کے پابند ہوں۔ پوری شریعت کے پابند ہوں، خاص طور سے نمازوں میں ذرا بھی کوتاہی کرنے والے نہ ہوں، خلاف شرع امور سے اجتناب کرتے ہوں، اور اپنی ایمانداری اور دیانتداری کے اندر لوگوں میں شہرت بھی رکھتے ہوں، ایسے لوگ مجلس شوریٰ کے لئے اہل ہیں۔

اس کی مزید کچھ شرائط یہ بھی ہیں جو کہ ان کے لئے لازم اور ضروری ہیں۔

۷۔ کہ مشورہ میں خاص طور سے امانتداری سے مشورہ دیتا ہو۔

۸۔ اور وہی مشورہ دے جو اپنے لئے پسند کرے۔

حدیث شریف میں:

اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمِنٌ اِذَا اُسْتُشِيْرَ فَلْيُشِرْهُ بِمَا هُوَ صَانِعٌ لِنَفْسِهٖ.

یعنی جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ پورا پورا امانتدار ہو اور جو اپنے لئے تجویز کرتا ہو وہی مشورہ دیتا ہو۔ یہ نہ ہو کہ مشورہ میں کسی قسم کی خیانت، دھوکہ دہی ضرر پہنچانے کی سعی کرے۔

۹۔ نیز مشورہ میں ایسے لوگوں کو لینا چاہئے جو فیصلہ واحکام کے عالم بلکہ ماہر اور سمجھدار ہوں۔

۱۰۔ خداترس اور عبادت گزار ہو۔ یعنی جو شخص فرائض شرعیہ اور واجبات کے بعد سنن ونوافل راتبہ وغیرہ راتبہ کی بھی پابندی کرتا ہو۔

خطیب بغدادی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِسْتَرْشِدُوْا الْعَاقِلَ وَلَا تَعْصُوْهُ فَتَنْدِمُوْا.

یعنی علقمند اور سمجھدار آدمی سے مشورہ لو اور اس کے خلاف نہ کرو ورنہ ندامت اٹھانی پڑے گی۔

شریعت کے نزدیک علقمند وہی لوگ ہیں جو شرع کے جاننے اور ماننے والے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت پہلے گزر چکی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا

فقہاء اور عابدین سے مشورہ کیا جائے یعنی جو پوری طرح دین وشرع کو جاننے والے ہوں اور وہ عبادت گزار بھی ہوں، ان سے مشورہ کیا کرو۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام جب مشورہ فرماتے تو فقہاء صحابہ اور کبار صحابہؓ سے مشورہ کیا کرتے۔ خاص طور سے حضرت ابوبکر صدیقؓ وعمرؓ جیسے حضرات سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

نیز مشورہ ایسے لوگوں سے کیا جائے جو مسلمانوں اور مملکت اسلامیہ کے خیر خواہ ہوں۔

۱۱۔ امیر مملکت مشورے کے پابند ہیں اس کے لئے اصحاب شوریٰ کا ہونا واجب اور ضروری ہے جن سے امیر مملکت امور مملکت کی انجام دہی میں مشورہ کریں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

لَا خِلَافَةَ اِلَّاعَنْ مَشْوَرَةٍ

مشورہ کے بغیر خلافت اور امارت کی جانشینی کا تصور نہیں ہے۔ (کنزل العمال)

لہذا امیر مملکت اگر مشورے کے بغیر فیصلے کرنے لگے یا ایسے لوگوں سے مشورے کرنے لگے جو اصول شرع کی رو سے مشورے کے اہل نہیں ہیں ایسے امیر قابل عزل ہیں۔

ذَكَرَ ابْنُ عَطِيَّةَ اَنَّ الشُّوْرٰى مِنْ قَوَاعِدِ الشَّرْعِ وَ عَزَائِمِ الْاَحْكَامِ وَمَنْ لَّا يَسْتَشِيْرُ اَهْلَ الْعِلْمِ وَالدِّيْنِ فَعَزْلُهٗ وَاجِبٌ هٰذَا مَالَا خِلَافَ لَهٗ .

(البحر المحیط، المحیط لا بی حیان)

ابن عطیہ نے فرمایا کہ شورائیت شریعت کے قواعد اور بنیادی اصولوں میں سے ہے لہذا جو امیر اہل علم اور اہل دین سے مشورہ نہ لے اس کا عزل کرنا واجب ہے اور یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

ظاہر بات ہے کہ جب اہل شوریٰ ایسی صفات وشراء کے مالک ہوں گے جن کا تذکرہ اوپر گزرا ہے تو ان کے مشورے سے جو امیر یا وزیر منتخب ہوں گے وہ انہی صفات وشرائط کے مالک ہوں گے یا اتنے نہیں ہوں گے تو کم از کم انہی سے قریب قریب صفات وشرائط کے مالک ہوں گے تو ایسی صورت میں امور مملکت اور امور ناس میں کچھ خلل واقع نہ ہوگا، سارے کام بہتر سے بہتر طریقے سے انجام پائیں گے۔

ملک اندرونی و بیرونی تمام فتنوں سے محفوظ ہو جائے گا، نہ کوئی ملحد و بے دین سر اٹھانے کی کوشش کرے گا نہ کوئی دشمن اسلام یا دشمن ملک اسلامی مملکت کی طرف میلی آنکھوں سے دیکھنے کی جرأت کرے گا۔

پورا ملک اور ملک کی عوام امن وسکون سے رہیں گے، بدامنی اور انتشار سے ملک بھی بچ جائے گا او
ملک کے عوام بھی۔

اسلام میں امیر کا انتخاب اور اس کے مقاصد

اوپر تحریر کیا گیا ہے کہ امیر مملکت کا انتخاب کیسے ہونا چاہیے امیر کے اندر اور امیر کی مجلس شوریٰ میں کیا صفات ہونا ضروری ہیں، اب ایک اور مسئلہ بھی پڑھ لیجئے۔

کہ اسلام میں امیر کا انتخاب اور مجلس شوریٰ کے بعد اس کے مقاصد کیا ہونا چاہئے اور مقاصد انتخاب اور اس کے ثبوت کے لئے حق تعالیٰ شانہ، کا ارشاد گرامی ملاحظہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم کے اندر فرماتے ہیں:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِيْ ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًاط يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَالِكَ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ. وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ. (نور، آیت ۵۶)

یعنی وعدہ کیا ہے اللہ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور (برے اعمال کو چھوڑ کر) نیک اعمال کئے ہیں کہ ان کو زمین میں حاکم بنائیں گے جیسا کہ حاکم بنایا تھا ان سے اگلوں کو اور جما دیں گے ان کے لئے ان کے دین کو جس کو اللہ نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے اور ان کو خوف کی جگہ امن دیں گے تا کہ وہ صرف میری بندگی اور عبادت کریں کسی چیز کو میرا شریک نہ ٹھہرائیں اور اس کے بعد جو کوئی نافرمانی کرے گا سو وہی لوگ حکم عدولی کرنے والے ہیں اور جن کو ہم حکومت دیں گے وہ اس لئے کہ وہ نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ دیتے رہیں اور رسول کے حکموں پر چلیں تا کہ ان پر رحم ہو۔

آیات مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں اعلان فرمادیا کہ جو لوگ ایمان والے اور ایماندار ہوں گے نیک عمل والے اور شرع کے پابند ہوں گے اور پوری طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کریں گے انہیں اللہ تعالیٰ اپنی زمین پر خلیفہ اور حاکم مقرر کری دیں گے اور جس دین اسلام کو اللہ نے ان کے لئے پسند کیا ہے انہی کے ذریعہ ان کے ہاتھوں سے اس دنیا میں اس کو قائم کریں گے۔

آیات استخلاف میں اس بات کی طرف واضح اشارہ پایا جاتا ہے کہ یہ مسلمان حاکم دنیا کے دوسرے بادشاہوں کی طرح نہ ہوں گے بلکہ یہ مسلمان حاکم، زمین میں اللہ کے خلیفہ اور پیغمبر علیہ السلام کے جانشین ہوں گے، آسمانی دستور قرآن کے احکام کو نافذ کریں گے، دین حق کو مضبوط سے مضبوط تر بنائیں گے یوں اللہ تعالیٰ ان کے دین کو جما دیں گے اور کفار کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب بٹھا دیں گے۔ غرض پوری دنیا میں ان کا سکہ جمے گا غلبہ ہوگا، کفر اور طاغوتی طاقتیں مغلوب ہوں گی تاکہ یہ لوگ خالص اللہ تعالیٰ کی بندگی وعبادت کرتے رہیں اور ہر قسم کے شرک وکفر سے بچتے رہیں نہ کسی سے ڈریں نہ کسی سے امید رکھیں۔ پورا کا پورا اللہ کی ذات پر بھروسہ کریں اسی کی رضا ان کا جینا اور مرنا ہو۔

آیات استخلاف کی تشریح سے یہ بھی واضح ہوا کہ امیر اور حاکم کے لئے ایمان خالص اور اعمال صالحہ بنیادی شرطوں میں سے ہیں۔

اس کے علاوہ دینی علوم اور احکام شرع کی مکمل پابندی تیسری اور چوتھی شرط ہے، پھر صحت وشجاعت جسامت، بہادری پانچویں اور چھٹی شرط ہے۔ اس کے سوا دینی فہم وفراست، سیاسی مہارت وبصیرت ساتویں وآٹھویں شرط بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لئے جس بادشاہ یعنی طالوت کو چنا تھا اس کے اندر یہ ساری صفات و شرائط مکمل طور پر تھیں مگر دنیائے دنی کے مال ومتاع، دنیا کی شہرت وعزت والی اشیاء اس کے پاس نہ تھی۔ جس وجہ سے بنی اسرائیل نے طالوت پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

اَنّٰی یَکُوْنُ لَہُ الْمُلْکُ عَلَیْنَا.

یعنی ہم امیر اور دولت مند ہیں دنیاوی عزت وشہرت کے اسباب وسامان ہمارے پاس موجود ہیں۔ ہمارے اوپر اس کو بادشاہت کیسے ملے گی۔ طالوت کے پاس کچھ بھی ان میں سے نہیں ہیں وہ ہمارے حاکم اور بادشاہ کیسے بنیں گے؟

اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اے بنی اسرائیل! تمہارے خیالات شیطانی خیالات ہیں، امور مملکت کو انجام دینے کے لئے نہ امیر آدمی ہونا ضروری ہے، نہ دولت مند نہ دنیاوی عزت وشہرت کی ضرورت ہے نہ اس کے ساز وسامان کی حاجت بلکہ صرف اور صرف ایمان وعمل کے بعد علم وعمل، عقل وفہم اور شجاعت وبہادری کی ضرورت ہے اور طالوت کے اندر یہ تمام صفات بتمامہا و اکملہا موجود ہیں۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ نے تمہارے واسطے اسی کو بادشاہ مقرر کر دیا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰہُ عَلَیْکُمْ وَزَادَہٗ بَسْطَۃً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ

غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے واسطے حضرت طالوت کو جو بادشاہ منتخب کیا
تھا وہ صرف دینی علم وعمل اور عقل وفہم وفراست اور ظاہری جسامت وشجاعت کی بنیاد
پر تھا نہ کہ دنیا والوں کے معیار پر۔
وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَاءُ
لہذا کسی دینی علم سے جاہل اور دینی عقل وفراست سے کورے کو اس پر اعتراض
کرنے کا کچھ حق نہیں ہے۔

رہی یہ بات کہ دنیا کے علوم کے بغیر وہ سیاست کیسے چلاسکیں گے، اس کا جواب بالکل آسان ہے کہ ہماری سیاست جو کہ مغربی سیاست کے نمونہ پر ہے درحقیقت شیطانی سیاست ہے، ایسی سیاست کا جاننا کسی اسلامی حاکم کے لئے بالکل ضروری نہیں ہے ہاں دینی علوم کے ماہرین، دینی ذہن وعقل والے، اسلامی سیاست سے واقف ہوتے ہیں وہ اس سے خالی نہیں ہوتے جبکہ مغربی سیاست کا جاننا امریکہ و برطانیہ کی سیاست کا جاننا اسلامی امارت کے لئے اس کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔

زمیں اللہ کی ہے سب انسان اللہ کی مخلوق ہیں اس کے بندے ہیں لہذا اس کی زمین میں اسی کے بندوں میں اسی کی حکومت چلنی ضروری ہے اسی کا دستور چلنا چاہئے، اسی کے حکموں کی حکمرانی ہونی چاہئے، عقل وبصیرت بھی کہتی ہے قرآن وحدیث ہمیں اور تمام انسانوں کو یہی درس دیتا ہے۔

کیونکہ اسلامی حکومت کا امیر جب ایمان وعمل والا ہوگا، ایماندار وامانت داری کے ساتھ اسلامی آئین کے مطابق حکومت چلائے گا، اسلام کی جڑیں مضبوط ہوں گی۔ اسلامی حکومت میں جس قدر اسلام کی جڑیں مضبوط ہوں گی اس قدر حکومت مضبوط ہوگی، ہمارے سامنے تازہ مثال افغانستان کی امارت اسلامیہ کی حکومت موجود ہے۔ وہاں پر یہی اسلامی آئین نافذ ہے، مسلمان سب چین وسکون سے زندگی بسر کر رہے ہیں، جو اندرونی خلفشار پاکستان اور دوسرے ملکوں میں ہے وہ امارت اسلامیہ میں نہیں ہے کفر اور طاغوتی طاقتیں طالبان اور اسلامی حکومت اور وہاں پر قرآن وسنت کے نظام سے خائف ہیں اور اس سے ناراض ہیں، آئے دن وہ اس کو ختم کرنے کیلئے نت نئی کوششوں میں لگی ہوئی ہیں۔ لیکن انشاء اللہ مسلمانان امارت اسلامیہ جب تک اپنے دین اسلام پر قائم رہیں گے تب تک کفر اور طاغوتی طاقتیں کچھ نہ کرسکیں گی اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی طاقتور ہے اس کا مقابلہ کون کرسکے گا۔

خلاصہ یہ کہ اسلامی سیاست اور اسلامی طرز حکمرانی کے لئے امیر کے واسطے جدید علوم کی ضرورت نہیں، ہاں بوقت ضرورت جدید علوم والے سے وہ کام لے سکتا ہے۔ جدید علوم والے بھی تو اسلامی

ریاست کے تحت ہوتے ہیں ان سے اسی قسم کے کام لینے میں کیا حرج ہے۔ لیکن ملک سے بدامنی و بے چینی قتل وغارتگری، چوری ڈکیتی، رہزنی، سودخوری رشوت ستانی جیسی تمام برائیوں کا خاتمہ اسلامی آئین کے نفاذ سے ممکن ہے۔ قرآن وسنت کی حکمرانی سے ممکن ہے، جدید علوم والے سائنس ٹیکنالوجی والوں سے ممکن نہیں ہے۔ دیکھئے ہمارے یہاں سائنسی علوم والوں کی کمی نہیں چالاکوں کی کمی نہیں، جدید علوم والے، امریکہ والے، برطانیہ والے، انہیں کے ذہن کے بے شمار لوگ موجود ہیں، عرصہ پچاس سال سے حکمرانی کررہے ہیں۔ مسلمانوں کو سوائے قتل وغاری تگری، چوری ڈکیتی، سودخوری اور رشوت ستانی ظلم و تشدد و دھوکہ دہی، منافقت کے کیا دیا ہے، جہاں دیکھو جس طرح دیکھو کرپشن دھوکہ وخیانت، جبر وتشدد یہ سب کچھ اس لئے ہیں کہ ہم نے خدائی احکام، قرآن وسنت کے نظام کو اپنانے کی جگہ اسے پامال کیا۔ اس کو سینے سے لگانے کے بجائے اسے پس پشت ڈال دیا تو اسی کا عذاب اسی کا وبال تو آنا تھا!

اگر آج اسلامی انتخاب کے تحت آئین اسلام کا نفاذ ہو جاتا ہے اور مسلمانان پاکستان دل و جان سے اسے قبول کر لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت شامل حال ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے واسطے دینی حالت کو مضبوط بنادیں گے اور ہماری ساری پریشانیوں کو دور کردیں گے، بے چینی و بدامنی ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ تو اللہ کا وعدہ ہے:

وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا.

اگر ہمارا دین اور دینی رشتہ مضبوط ہوگا اور ہماری حکومت دین اسلام کے آئین واحکام کے مطابق ہوتی تو ملک سے ہر قسم کی کرپشن ہر قسم کے فتنے وفسادات ختم ہو جائیں گے۔

اگر کوئی کچے ذہن کا آدمی یہ سوال کرے، دینی علوم کے ماہرین کے پاس عصری علوم نہیں ہوتے اور اس زمانے میں عصری علوم کے بغیر حکمرانی کیسے ممکن ہے۔

اس کا جواب بھی کچھ مشکل نہیں ہے وہ یہ کہ علوم اسلامیہ کے ماہرین کے پاس دینی علوم ہیں، دینی فہم وفراست بھی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے ضرورت کی ہر چیز کا انتظام وہ خود کریں گے۔ اصل چیز تو ملک میں اللہ اور اس کے رسول کے دین وشریعت کی حکمرانی ہے باقی چیزیں اس کے تابع ہیں۔ جب اصل چیز آجائے گی تو اس کے توابع جملہ اشیاء خود بخود آجائیں گی اس کو سمجھنے کے لئے ایک مثال دیتا ہوں۔

حافظ ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ سے وقت کے امیر المؤمنین نے پوچھا تھا کہ اسلام کے آئین کی رو سے ہم فوجی سربراہ کیسے انتخاب کریں کیونکہ بعض فوجی، علوم دینیہ سے واقف دینی فہم و

فراست مالک فرائض وواجبات کے بالکل پابند ہیں مگر بعض دفعہ سنن ومستحبات کی رعایت نہیں کر پاتے اس کے مقابل بعض دوسرے فوجی، علوم شرعیہ کے ماہر دینی فراست وعقل میں پہلے والے کے مقابلہ میں کم مگر فرائض وواجبات اور سنن ومستحبات کے بالکل پابند مگر فوجی بصارت پہلے والے کے مقابلہ میں کم ہو تو ہم فوج کا سربراہ کس کو مقرر کریں۔

تو امام احمد بن حنبلؒ نے جواب دیا جو فوجی علوم دینیہ کو جاننے والا، فرائض وواجبات کا پابند دینی فراست وعقل کے ساتھ فوجی بصارت زیادہ رکھتا ہے اسے سربراہ بنایا جائے۔ کیونکہ جس شعبہ کا سربراہ بنایا جارہا اس میں ضروری دینی علم وعمل کے ساتھ فوجی بصارت وفراست عقل کی زیادہ ضرورت ہے لہٰذا وہ زیادہ حقدار اور مستحق ہے۔

امیر وقت نے اس کا جواب کو سراہا اور کہا آپ نے دین اور دنیا کے علوم کے ماہرین کا جواب دیا ہے۔

راقم عرض کرتا ہے کہ دینی علوم کے ماہرین واقعی ایسے ہوتے ہیں امام احمد بن حنبلؒ تو مذہب اربعہ حقہ کے چار اماموں میں سے ایک امام اور ماہر فقہ فتویٰ بھی تھے تو وہ اپنی بصیرت وفراست سے کیسا عجیب جواب دیتے ہیں، اور کیسا اصول بیان کرتے ہیں تو ایسے ماہرین علوم مملکت کا اسلامی نظام کیسے اور کیوں نہیں چلا سکتے، بشرطیکہ ہم دین اور دینی نظام کو قبول کرنے کے رضا مند ہو جائیں، دین اور اسلام اور آئین کے تحت زندگی گزارنے کے لئے تیار ہو جائیں۔

جب ہم دین اسلام کے عادلانہ نظام اور قرآن وسنت کے منصفانہ نظام کو لانا چاہیں گے تو ہمیں طرز انتخاب بدلنا ہوگا، اسلامی انتخاب کا طرز اپنانا پڑے گا، انتخاب امیر کے لئے شورائی نظام کو اپنانا پڑے گا، مغرب اور مغرب کے طرز انتخاب کو چھوڑنا پڑے گا۔

اہل شوریٰ کے لئے ایمان اور ایمانداری، امانت اور امانت داری، دینی علوم کی مہارت عمل بالشرع، تقویٰ وطہارت اور ان میں ہر شہرت جیسے امور کی شرائط ضروری ہوں گی، ایسی مجلس شوریٰ جو امیر منتخب کرے گی، وہ بھی ایمان وعمل والا ہوگا۔ شرع کا مکمل پابند ہوگا، دین دار اور تقویٰ دار ہوگا، پھر وہ اسلامی نظام اسلامی آئین کے تحت امور مملکت انجام دیں گے تو اس کے سامنے مقصد امارت اسلامیہ اللہ کے دین، دین اسلام کی سربلندی پیش نظر رہے گی۔ حقوق اللہ کی حفاظت کرے گا، حقوق العباد کی رعایت کرے گا، عدالتوں میں اسلامی آئین کے تحت فیصلے ہوں گے، کسی پر ظلم نہ ہوگا، عدل وانصاف پر مبنی فیصلے ہوں گے، رشوت نہیں چلے گی، ناجائز سفارشات نہیں چلیں گی۔ ساری خرابیاں آہستہ آہستہ ختم ہو جائیں گی۔

دین اسلام کے آئین کے نفاذ کے ثمرات وفوائد اس وقت ظاہر ہوں گے مسلمانان پاکستان بلکہ مسلمانان عالم اسلام اس سے مستفیذ ہوں گے۔

تو راقم کا کہنا یہ ہے کہ اسلامی انتخاب کے مقاصد سے ہم بہت دور ہو گئے ہیں، مغرب اور مغربی طاقتوں نے ہمیں اسلام اور اسلامی نظام سے برگشتہ کر کے ہمیں دین اسلام سے محروم کر دیں۔ اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْ عَزَائِهِمِ الْبَاطِلَةِ.

لہذا مسلمانان عالم کو یہ سوچنا ہے کہ اللہ نے ہمیں کس لئے پیدا کیا ہے اس کی سرزمین میں کس کی حکمرانی کے لئے وہ حکم دیتا ہے۔

اگر ہمارے انتخابات کا مقصد کفار کی طرح ہے کہ سرداری مل جائے دنیا کی جاہت وشہرت مل جائے یا دولت مل جائے تو یہ چیزیں دنیا ہیں مچھر کے پر کے برابر نہیں ہیں اور اگر ہمارے انتخابات کا مقصد دین اسلام کو قائم کرنا ہے ار اللہ کے کلمہ کو بلند کرنا ہے، ملک میں اللہ ورسول کے حکموں کے مطابق نظام کو چلانا ہے، تو کفر اور طاغوتی نظامہائے سیاست وانتخاب کو خیر باد کہنا پڑے گا اور سنت رسول اور سنت خلفائے راشدین کے مطابق انتخابات کرانے ہوں گے۔

ہمیں غور وفکر کرنا چاہئے، اس لئے کہ ہم زبان سے تو کہتے ہیں کہ خدا اور رسول کو مانتے ہیں مگر خدا اور رسول کی شریعت ودین کو نہیں مانتے۔ شریعت اور دین کو مانے بغیر تسلیم کئے بغیر اس پر عمل کیئے بغیر ہم کیسے مسلمان ہیں کیونکر مسلمان ہیں، ایسا نہ ہو کہ ہم خواب غفلت میں پڑے رہیں کسی بھی وقت دن کو یا رات کو اللہ تعالیٰ کا ناگہانی عذاب نازل ہو جائے اور ہم کف افسوس ملتے رہیں ہمیں عذاب کا انتظار نہیں کرنا چاہئے بلا تاخیر ایمان وعمل کا راستہ اختیار کرنا چاہئے دین اور دین کی راہیں تلاش کرنا چاہئے اللہ تعالیٰ مجھے اور سب مسلمانوں کو ہدایت کی توفیق دے۔ وصلی اللہ علیہ وسلم۔

اسلامی انتخاب کے بنیادی اصولوں کی پابندی کرنے کے فوائد

دین اسلام، اللہ تعالیٰ کا سچا اور پکا دین ہے، اس کے ہر حکم میں سچائی اور استحکام ہے، دیکھئے دین اسلام نے انتخابی ڈھانچہ میں طریق انتخاب میں شورائی نظام رکھا ہے۔

اور شوریٰ بھی اہل علم وعمل اور اہل تقویٰ کی رکھی ہے اور کامل العقل وَالدِّیْن کو شرط قرار دیا جس کے فوائد بے شمار ہیں۔

۱۔ انتخاب میں کسی قسم کی بدعنوانی اور بے ایمانی خیانت، رشوت کا احتمال نہیں رہتا، وہاں ایمان و

ایمانداری امانت وامانت داری کی شرط ہے، اس کے برعکس مغربی جمہوریت کے انتخابی ڈھانچہ میں چونکہ انتخاب کنندہ اور امیدوار کے لئے ان شرائط کی ضرورت نہیں ہے لہذا اس میں انتخابات کے اندر بے شمار بدعنوانی، بے ایمانی، خیانت، رشوت خوری کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

۲ اسلامی طرز انتخاب میں اچھے سے اچھے ایماندار، امانتدار، ذی اخلاق، مملکت کے خیر خواہ منتخب ہونے کا یقین غالب ہوتا ہے۔ جبکہ مغربی طرز اور مغربی جمہوریت کے انتخاب میں اچھے کے بدلے برے سے برے لوگ منتخب ہونے کا یقین غالب ہوتا ہے کیونکہ بے ایمان، غیر دیانتدار، خائن، بدکردار، بداخلاق لوگ بھی انتخاب اور ووٹنگ میں حصہ لیں گے اور اکثریت انہیں لوگوں کی ہوتی ہے تو کامیابی بھی ایسے ہی لوگوں کی ہوگی۔

۳۔ اسلامی طرز انتخاب میں کسی قسم کا اختلاف وانتشار نہ امیدواروں میں ہونے کا امکان رہتا ہے نہ ووٹروں میں۔

جبکہ مغربی جمہوریت میں امیدواروں کے درمیان بڑے اختلافات اور انتشار پیدا ہوتے ہیں، ایک دوسرے کے عیوب ونقائص کو بیان کرتے ہیں اور بہتان طرازی سے باز نہیں آتے، نتیجۃً فریقین اور ان کے ووٹروں میں بڑے اختلافات ہوتے ہیں، مار پٹائی قتل وغارتگری تک ہوتی ہے لیکن اسلامی انتخاب، ان تمام نقائص سے پاک اور شفاف ہوتا ہے۔

۴۔ اسلامی طرز انتخاب میں چونکہ اہلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر چناؤ اور انتخاب ہوتا ہے لہذا اس میں طبقاتی، گروپ بندی، پارٹی بازی کی جو خرابیاں ہیں وہ نہیں ہوں گی۔ نمائندے تمام افراد کے یکساں ہوتے ہیں کسی سے نہ اختلاف نہ جھگڑا نہ بغض وعداوت نہ کسی قسم کی نفرت اس میں ہوتی ہے۔ جبکہ مغربی جمہوریت میں یہ تمام چیزیں ہوتی ہیں۔

۵۔ اسلامی طرز انتخاب میں ہر رائے دہندہ چونکہ امانتداری اور شہادت کے اصول پر رائے دیتا ہے، ووٹ دیتا ہے لہذا انہیں کسی قسم کے طمع ولالچ کا اندیشہ نہیں ہوتا مگر اس کے برخلاف مغربی جمہوریت میں رائے دہندہ کے لئے چونکہ امانتداری، دینداری، علم وفہم کسی صفات کا مالک ہونا ضروری نہیں ہے تو اکثر ووٹروں میں مالی منفعت، مادی منفعت اولین مقصد ہوتا ہے وہ کسی امیدوار کے حق میں ووٹ اس لئے دیتا ہے کہ اس میں اس کی مادی منفعت ہے مالی فوائد ہیں۔

۶۔ اسلامی انتخاب میں نمائندہ کے لئے اہلیت ایمان وایماندار امانت وامانتداری، تقویٰ وخوف خدا کی شرط ہوتی ہے۔ لہذا نہ وہ خود کسی قسم کا زر کثیر خرچ کر کے منتخب ہوتا ہے نہ رائے دہندہ کو کسی قسم کی رقم

خرچ کرنی پڑتی ہے لہذا کسی کو یہ طمع اور لالچ نہیں ہوتی کہ منتخب ہونے کے بعد اپنے پیسے وصول کریں گے، اتنے پیسے کمائیں گے، مالدار بنیں گے۔

جبکہ مغربی جمہوریت میں یہ سب نقائص ہوتے ہیں، امیدوار کے اندر دینی شعور اخلاق و کردار تو نہیں ہوتا اس لئے وہ زر کثیر خرچ کر کے انتخاب لڑتا ہے اور اندر سے اس بات کا قطعی فیصلہ کر لیتا ہے کہ کامیابی کے بعد اپنے پیسے بھی وصول کریں گے اور اس پر جو کچھ کمانا ہے جائیداد بنانی ہے بنائیں گے جس کے نتیجے میں انتخاب کا مقصد بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

۷۔ اسلامی طرز انتخاب میں نمائندہ کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ منتخب نمائندہ منتخب ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مطابق نظام چلانے کی کوشش کریں گے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے قیام کی ذمہ داری پوری کریں گے۔ عدل و انصاف قائم کریں گے، حقوق والے کے حقوق دلائیں گے، ظالم کو ظلم سے روکیں گے، اس لئے وہ انتخاب کے بعد کسی دنیاوی و مادی منفعت کے لحاظ کئے بغیر انہیں چیزوں کی فکر کرتے ہیں۔

جبکہ مغربی طرز انتخاب میں امیدوار کا مقصد محض وقتی اعزاز و شہرت اور مالی و مادی منفعت ہوتا ہے۔ لہذا وہ اللہ کے احکام رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی پروا کئے بغیر اپنا مقصد اور ہدف حاصل کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔

۸۔ اسلامی طرز انتخاب کی نمائندگی کسی فرد یا افراد پر ظلم و زیادتی روا نہیں رکھتا اس کو بدترین ظلم اور حکم شرعی کے خلاف جانتا ہے۔

جبکہ مغربی طرز انتخاب کا منتخب نمائندہ اپنے مقاصد و اہداف اور مادی چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے دوسروں پر ظلم و زیادتی کرتا ہے، رکاوٹ پیش آئے تو ایسے افراد مخالف کی بے عزتی و بے آبرو کرتے ہیں کام نہ بنے تو جان سے بھی ختم کر دیتے ہیں کیونکہ اس میں دین تو ہے نہیں، اس بنا پر نہ دینداری ہے نہ خوف خدا تو ظلم و زیادتی کے لئے مانع کیا چیز بن سکتی ہے۔

۹۔ اسلامی انتخاب کے ذریعہ جو امیر مملکت منتخب ہوتا ہے وہ ظِلُّ اللّٰہ فی الارض ہوتا ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق الناس کو ادا کرنے والا ہوتا ہے اس لئے عامۃ الناس کو اس سے عدل و انصاف کی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں ہر فرد کو امن و سکون کا سانس لینے کی توقع ہوتی ہے۔

مگر مغربی جمہوریت کے نمائندے شیطان کے آلہ کار ہوتے ہیں، حقوق اللہ کو ضائع کرتے ہیں اس کا وبال تو الگ ہے مگر حقوق الناس کو بھی پامال کرتے ہیں۔ جس بناء پر پوری انسانیت پر وہ لوگ

عذاب بن جاتے ہیں، ہر فرد کو ان سے جان چھڑانے کی فکر ہوتی ہے آئے دن ہمارے اکثر سربراہان مملکت اور حکمران کا حال مطالعہ کیا جائے تو سارے حقائق سامنے آجائیں گے یہ ہی مغربی جمہوریت کے برکات وثمرات ہیں۔

۱۰۔ یہ تو عام نقائص اور خرابیاں تھیں، مگر سب سے بڑی خرابی اس مغربی جمہوریت میں یہ ہوتی ہے کہ اس میں چونکہ عوام الناس کی کثرت رائے سے امیدوار امیر منتخب ہوتا ہے اور عوام کی اکثریت ان پڑھ بے علم، بے دین اور بے ایمان لوگوں کی ہوتی ہے لہذا ان کے انتخاب اور ووٹوں سے جو فرد یا افراد منتخب ہوتے ہین ان میں دین نہیں ہوتا، ایمان اور ایمان داری نہیں ہوتی، اس لئے وہ احکام شرع اور احکام خداوندی کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس کو ضائع کرتے ہیں بعض تو ان کا انکار تک کر دیتے ہیں۔ چنانچہ

۱) ہمارے یہاں بعض مغرب زدہ مغرب سے متاثر تعلیم یافتہ مرد اور بعض خواتین، اسلامی احکام، حدود زنا کا انکار کرتے ہیں، قانون شہادت کا انکار کرتے ہیں۔

۲) انہیں خلاف تہذیب سمجھتے ہیں۔

۳) قانون قصاص ودیت پر اعتراض کرتے ہیں بعض انکار کرتے ہیں۔

۴) قانون وراثت کے قطعی احکام مثلاً عورت کو مرد سے نصف وراثت ملتی ہے، کا انکار کرتے ہین وغیرہ وغیرہ۔

۵) قانون شہادت میں عورتوں کی شہادت کو مرد کے برابر قرار دیتے ہیں جو کہ قرآنی حکم کا انکار ہے۔ جبکہ قرآن وحدیث کی رو سے حدود میں ان کی شہادت معتبر نہیں۔ اور مقدمہ میں ان کی شہادت مرد کے مقابلہ میں نصف ہے جس وجہ سے یک مرد کے ساتھ دو عورت کی شہادت کی ضرورت ہے، لیکن یہ لوگ نہیں مانتے۔

۶) بعض غیر مسلم خواتین کی صحبت سے متاثرہ خواتین پردہ وحجاب کی آیات کو نہیں مانتی یہ سب کفریات ہیں جن کا وہ ارتکاب کرتی ہیں۔

۷) بعض لوگ ان میں قرآن وحدیث کے احکام کا مذاق اڑاتے ہیں، تمسخر کرتے ہیں جیسا کہ پچھلی امتوں کے کفار مذاق اڑاتے تھے، یہ خرابیاں اس مغربی انتخاب کے ذریعہ آنے والے نمائندوں سے پیدا ہوتی ہیں اگر اسلامی طرز انتخاب کے ذریعہ علوم شرعیہ کے عالم یا پھر پابند شرع تقویٰ وطہارت والے نمائندے آئیں، تو اسلامی

مملکت میں ان کفریات کے بکنے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

۱۱۔ اسلامی انتخابات میں ایمانداروں کے ایمان و دین ضائع ہونے کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا لیکن مغربی طرز انتخاب کے دوران دیکھنے میں آیا ہے بے شمار ایمانداروں کے ایمان میں اور دین میں تزلزل آ جاتا ہے۔

کیونکہ جب امیدوار دیکھتا ہے کہ اگر دین و شرع کی حمایت کرتا ہے تو اکثریت جو کہ جاہلوں کی بے دین اور بے ایمانوں کی ہوتی ہے وہ ووٹ نہیں دیں گے تو وہ دین کے خلاف کام کرنے اور کفر کی حمایت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، حالانکہ اس کا دل نہیں چاہتا کہ کفر اور کفریات کی حمایت کرے مگر انتخابی پروگرام کے نقصانات کو دیکھ کر دین اور دینی احکام کی حمایت کرنے کی بجائے کفر اور کفریات کی حمایت کر دیتے ہیں، دیکھئے یہ کتنا بڑا دینی نقصان ہے۔

۱۲۔ اسلامی طرز انتخاب میں جلسے جلوسوں کی کوئی ضرورت نہیں لہذا جلسے اور جلوسوں کے نقصانات کا خطرہ نہیں جبکہ مغربی جمہوریت کے انتخابات میں جلسے اور جلوس بھی نکالے جاتے ہیں۔ پھر اس میں ہنگامے توڑ پھوڑ بھی لوگ کرتے ہیں۔ اس میں ہر فریق دوسرے فریق کے خلاف نعرے لگاتے ہیں، اشتعال پیدا کر کے توڑ پھوڑ، ہنگامے کراتے ہیں۔ جانی و مالی نقصان تک جاتا ہے۔

۱۳۔ اسلامی انتخاب میں عورتوں کی کوئی رائے اور ووٹ نہیں ہوتا کیونکہ یہ ناقصات العقل والدین ہوتی ہیں (کما فی البخاری) بلکہ اسلامی انتخاب تو کامل الرائے والعقل ماہر علوم شرع اور اصحاب تقویٰ جو کہ اہل حل وعقد ہوتے ہیں ان کے شوریٰ سے امیر یا وزیر منتخب ہوتا ہے لہذا اس میں کسی قسم کی خرابی پیش نہیں آتی۔

جبکہ مغربی جمہوریت میں عورتوں کو نمائندگی کرنے اور ووٹ دینے کا اختیار ہوتا ہے۔ گنتی میں عورتوں اور مردوں کے ووٹوں سے جو اکثریت سے جیتے گا اسے کامیاب قرار دیا جاتا ہے۔ جبکہ قرآن وحدیث کی رو سے عورتیں ناقصات العقل والدین ہوتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ساری دھوکہ بازی عورتوں کے ذریعہ کرائی جاتی ہیں، جعلی ووٹ عورتوں کے ذریعہ ڈلوائے جاتے ہیں، پردہ دار عورتوں کی بے پردگی ہوتی ہے۔

پھر عورتیں عموماً اپنے سرپرستوں کے تابع ہوتی ہیں خود کوئی رائے رکھتی نہیں، شوہر کے کہنے پر یا پھر اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں کے کہنے پر ووٹ دیتی ہیں اور اس میں غلط بیان اور جھوٹ رشوت بے شمار چلتی ہے۔ دھوکہ اور عیاری سے وہ جدھر چاہتے ہیں عورتوں کو لے جاتے ہیں یہ سب

خرابیاں عورتوں کو رائے دہی کی حقدار قرار دینے کی وجہ سے ہیں۔

۱۴۔ اسلامی انتخاب بالکل سادہ وشفاف ہوتا ہے بغیر کسی ہنگامے مالی وجانی نقصان کے انجام پذیر ہوتا ہے۔

مگر مغربی جمہوریت میں آج کل تو نئی خرابی یہ نظر آنے لگی ہے کہ بعض دفعہ ووٹ کے سینٹر میں جانے کی نوبت ہی نہیں آتی پہلے سے راتوں رات بااختیار نمائندہ یا طاقتور نمائندہ اپنے حق میں ووٹ ڈالوا لیتے ہیں۔ بلیٹ بکس بھر دیتے ہیں، صبح کو ووٹ کے سینٹر میں مسلح افراد کے ذریعہ خوف اور دہشت پھیلا کر کسی کو جانے ہی نہیں دیتے، اگر جائے تو اس کو جانی نقصان کا خطرہ غالب ہوتا ہے۔ یہی تو ہوتے ہیں مغربی جمہوریت کے نتائج واثرات جو ہم اور آپ دیکھ رہے ہیں۔

۱۵۔ اسلامی انتخاب میں چونکہ سارے مسائل کا دارومدار ایمان اور ایمانداری دین اور دیانتداری پر ہوتا ہے لہذا اس میں رشوت ستانی اور امیر کی طرف سے کسی ممبر شوریٰ کو خریدنے کا اندیشہ نہیں ہوتا بلکہ مغربی جمہوریت میں رشوت اور خرید وفروخت خوب چلتی ہے۔ ظاہر ہے جس کے پاس مال ہوگا وہ امیر ہے وہی وزیر ہے، پھر بعد میں حکومت اور عوام کو خوب لوٹے گا۔ تو بالآخر ایسے نمائندوں کے ذریعہ سے ملک کے عوام کو کیا فائدہ پہنچے گا۔

بلکہ ان سے ملک کو اور عوام کو شدید نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ موجودہ حالات کو اگر ہم دیکھیں تو سب باتیں واضح طور سے سمجھ میں آسکتی ہیں اس واسطے ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے ایمان ودین کو بچانے اور خود کو نقصان سے بچانے کے لئے دین کی طرف رجوع کریں شریعت کی طرف لوٹیں۔ وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ وَهُوَ وَلِيُّ التَّوفِيْقِ۔

كِتَابُ الْبُيُوْعِ

ٹیلفون پر بیع وفروخت کرنے کے متعلق چند سوالات

(۱۶۹) سوال:-جناب مفتی صاحب! میں چاول کا تاجر ہوں، بذریعۂ فون لوگوں سے خرید وفروخت کرتا ہوں اور خرید وفروخت کا طریقہ یہ ہوتا ہے مثلاً کسی نے مجھے اطلاع دی کہ اس کو پانچ سو من چاول کی ضرورت ہے، تو میں ان سے بذریعۂ فون چاولوں کے اوصاف اور کیفیت معلوم کر کے خرید وفروخت کی بات طے کر لیتا ہوں، درمیان میں وہ اپنے آدمی کے ذریعہ یا خود آ کر چاول کا نمونہ دیکھ کر جاتا ہے، اسطرح فریقین میں بات طے ہونے کے بعد خریدار بمعرفت بینک میرے اکاؤنٹ نمبر پر پیسے ڈال دیتے ہیں پھر میں ان کے نام پر ایک پرچہ اپنے گودام میں بھیج دیتا ہوں اور وہ اسی پرچہ کے مطابق چاول لے جاتے ہیں، کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ میرے گودام میں چاول موجود نہیں رہتا مگر اس کے باوجود خرید وفروخت کی بات طے کر لیتا ہوں، اس خیال سے کہ بازار میں میرے کچھ احباب چاول والے ہوتے ہیں، ان کے پاس اسطرح چاول جمع رہتے ہیں، ان سے چاول خرید کر دیدونگا، پھر اس سے بات طے کرنے کے بعد دوسرے تاجر سے چاول خرید لیتا ہوں اور اس کو کہہ دیتا ہوں کہ فلاں گودام سے چاول اٹھا کر لے جاؤ۔

گزشتہ جمعرات تبلیغی مرکز کی تقریر میں ایک عالم صاحب نے کہا کہ اس قسم کا لین دین درست نہیں ہے اور مزید علت یہ بھی بتائی کہ بذریعۂ فون خرید وفروخت درست نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ایجاب وقبول کی مجلس مختلف ہوتی ہے جبکہ اتحاد مجلس شرط ہے اور قبضہ کرنے سے قبل دوسروں سے خرید وفروخت درست نہیں ہے۔

اب سوال یہ کہ جناب عالم صاحب کی باتیں کس قدر درست ہیں اور ہماری خرید وفروخت کہاں تک درست ہے اور ہمیں خرید وفروخت کی صحیح صورت بتا دیجئے، واضح رہے کہ آجکل کی اکثر بیشتر خرید و فروخت اسی طریقہ پر ہو رہی ہیں اور قبضہ کا معنی اگر یہی ہو کہ فروخت شدہ مبیع کو اپنے گودام میں لانا ضروری ہے اس سے قبل خرید وفروخت کرنا ناجائز ہے، تو اس صورت میں ہم پر حرجِ عظیم ہوگا کیونکہ کبھی کبھار ہمارے گودام میں جگہ نہیں رہتی ہے اس لئے دوسرے کے گوداموں میں مال رکھ کر خرید وفرخت کرنی ہوتی ہے، اب مندرجہ ذیل مسائل کا حل کیا ہے؟

(۱) ایجاب وقبول ایک ہی مجلس میں ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ نیز ٹیلفون پر خرید وفروخت درست ہے یا نہیں؟

(۲) قبضہ سے کیا مراد ہے؟

(۳) مبیع دیکھنے کے بغیر صرف اس کے اوصاف ذکر کرنے کے ساتھ خرید وفروخت درست ہے یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب(۱):- کہ بیع صحیح ہونے کے لئے چند شرائط ہیں ان میں سے بائع اور مشتری کے ایجاب وقبول ایک ہی مجلس میں ہونا ضروری ہیں ورنہ بیع درست نہیں ہوگی مثلا دونوں کی حاضری میں خرید وفروخت کی بات ہو چکی تو ایجاب وقبول مکمل کر کے جاوے اور اگر خرید وفروخت کی بات مکمل ہونے سے قبل دوسرا کام شروع کیا جاوے یا دوسری بات کرنے لگ گئے تو پہلی والی بیع کینسل ہو جائے گی۔

كماذكره الشامية .في ظاهر الرواية حتى لوتبايعا وهما يمشيان اويسيران ولوعلى دابة واحدة لم يصح اختار غيرواحد كالطحاوى انه ان أجاب على فور كلامه متصلاً جاز وصححه المحيط وقال في الخلاصة لوقبل بعد مامشى خطوة وخطوتين جاز الخ (ج ۴ ص ۵۲۷)

ٹیلفون پر بیع ہو سکتی ہے جبکہ ایجاب وقبول اور مبیع کے قبضہ کے بارے میں ایک ہی فون پر بیع مکمل ہو جاوے۔

جواب(۲):- مبیع کو قبضہ میں لانے سے قبل اس کی خرید وفروخت کرنا درست ہے، یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے، مگر قبض کا معنی یہ نہیں کہ مبیع کو خواہ مخواہ بائع کے گودام سے لیکر مشتری کے گودام میں رکھنا ضروری ہے، ورنہ قبضہ تمام نہیں ہوگا، بلکہ قبضہ کا معنی یہ ہے: کہ مبیع کو مشتری کے اختیار میں اسطرح دیدینا کہ وہ جب چاہے اس کو اٹھا کر لے جاسکے اور کسی سے فروخت کر سکے، یعنی مبیع میں مشتری کو ہر قسم کا تصرف کرنے کی قدرت خریدار کو حاصل ہو۔

قال في "الشامية "(قوله على وجه يتمكن من القبض) فلواشترى حنطة في بيت ودفع البائع المفتاح اليه قال خليت بينك وبينها ، فهو قبض وان رفعه ولم يقل شيئا لايكون قبضًا الخ (درمختار مع شامیۃ کتاب البیوع :ج۴ص ۵۶۱)

فلہٰذا صورت مسئولہ میں مشتری اگر گودام سے جب چاہے چاول لینے اور دوسرے کو دینے پر قادر ہو

توبائع کی اجازت سے ان کے گودام میں چاول رکھ کر بھی دوسرے کو بیچ سکتا ہے درست ہے۔
جواب (۳): - مبیع دیکھنے کے بغیر بھی تعیینِ اوصاف وشرائط اور تعیینِ قیمت کے ساتھ خرید وفروخت درست ہے، البتہ اوصاف یا شرائط اور قیمت میں فرق ہونے کی صورت میں بیع موقوف ہوگی، ہاں فرق کے ساتھ بھی بائع ومشتری کے منظوری دیدینے سے بیع درست ہوجائیگی ورنہ نہیں۔

فقط اللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۲۳/ ذیقعدہ ۱۴۲۶ھ	۲۳/ ذیقعدہ ۱۴۲۶ھ

خیار رؤیت کے بارے میں چند مسائل اور ان کے جوابات

(۱۷۰) سوال: - جناب مفتی صاحب! میں چاول کی بیوپاری کرتا ہوں، میری دکان میں بطور نمونہ برتن میں قسم بقسم کے چاول تھوڑے تھوڑے رکھے ہوئے ہوتے ہیں، خریداران کو دیکھ کر خرید وفروخت کی بات پکی کرلیتے ہیں اور گودام سے پسند کردہ چاول لے جاتے ہیں، گزشتہ ہفتہ میں ایک دوست نے مجھ سے پچاس من چاول خریدے ہیں اس شرط پر کہ وہ چاول پہلے دیکھیں گے پھر بات طے ہوگی، لیکن وہ خود نہیں آیا، بلکہ اپنے ملازم کو بھیجا، ملازم نے نمونہ والا چاول دیکھ کر خرید وفروخت کی بات مکمل کی اور دس من چاول کی قیمت دیکر اسی مقدار چاول لے گیا اور بقیہ چاول کی قیمت آئندہ ۳۰/ دسمبر ۲۰۰۶ء کو دینے کا وعدہ کیا ہے۔

آج صبح میرے دوست نے مجھے بذریعۂ فون اطلاع دی کہ وہ چاول واپس بھیجنے والا ہے، یعنی خریدا ہوا چاول نہیں لے گا اس کا کہنا ہے کہ اس نے خود سے چاول نہیں دیکھا ملازم کے دیکھنے میں غلطی ہوئی، فلہٰذا میرے حق میں خیار رؤیت کا حق باقی ہے، میرے ملازم نے بھی صرف نمونہ والے چاول کو دیکھا، نہ کہ تمام چاول کو دیکھا وغیرہ وغیرہ اب مذکورۃ الذیل سوالوں کا شرعی حل معلوم کرنا ضروری ہوا۔

(۱) صورت حال میں اُسے خیار رؤیت کا حق باقی ہے یا نہیں؟ اور ملازم کی رؤیت سے مالک کی خیار رؤیت کا حق باطل ہوگا یا نہیں؟ نیز نمونہ والا چاول کی رؤیت سے مابقیہ چاول کی رؤیت کا حق ساقط ہوگا یا نہیں؟

واضح رہے کہ فی الحال بازار میں چاول کی قیمت نسبۃً کم ہوگئی ہے، اب اگر میں چاول واپس لاؤں تو مجھے فی من ۱۰۰/ سو روپے کا نقصان اٹھانا ہوگا جس کی کل مقدار ایک ہزار روپے ہوں گے۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب۔

خیار رؤیت کے مسئلہ میں مشتری کا خود مبیع دیکھنے سے جس طرح رؤیت کا حق باطل وساقط ہوجاتا ہے اسی طرح اس کے وکیل کی رؤیت سے بھی خیار رؤیت کا حق باطل وساقط ہوجاتا ہے، یعنی وکیل کی رؤیت کے بعد موکل کو خیار رؤیت کا حق باقی نہیں رہے گا اسلئے خریدار کے لئے جائز نہ ہوگا کہ عدم رؤیت کی بنا پر بیع فسخ کردیوے، بشرطیکہ اس نے یہ کہد یا ہو کہ وکیل کی رؤیت کافی ہے میرے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن مؤکل نے اگر یہ کہد یا تھا کہ وکیل کو بھیجوں گا وہ جب چاول لائیگا تو میں دیکھ لوں گا اگر چاول پسند ہوگا تو بیع تمام ہوگی ورنہ واپس دے دوں گا، تو دوسری صورت میں وکیل کی رؤیت سے مالک کا خیار رؤیت کا حق باطل نہیں ہوگا، نیز مؤکل کا یہ کہنا کہ چاول کی سب بوریوں کو نہیں دیکھا، یہ کہنا اس کے لئے درست نہیں ہے۔

قال فی "الشامیة" (قوله وكفى رؤية مايؤذن بالمقصود) لأن رؤية جميع المبيع غير شروط لتعذره فيكتفى برؤية مايدل على العلم بالمقصود هداية والمراد أن رؤية ذلك قبل الشراء كافية فى سقوط خياره بعده لأنه قد اشترى مارأى فلا خيارله الخ: (ج ۴ص ۵۹۶)

خیار رؤیت ساقط ہونے کیلئے تمام مبیع کو دیکھنا شرط نہیں ہے بلکہ بطور نمونہ بعض مبیع کی رؤیت سے کل مبیع کی خیارِ رؤیت کا حق ساقط ہوجاتا ہے یعنی بعض مبیع کی رویت سے کل مبیع (جس قدر خریدنا چاہے) کے اندر بیع منعقد ہوجائے گی البتہ مابقیہ مبیع میں اگر کوئی معقول عیوب نظر آویں تو اس وقت حکم اور ہوگا۔

فلہٰذا معاملہ کی اگر پہلی صورت ہے تو صورت مسئولہ میں مشتری کو خیار رویت کا حق باقی نہیں رہیگا اور اس کے وکیل کی رویت سے اس کی خیار رویت کا حق ساقط ہوجائے گا اور نمونہ کے بعض چاول کی رویت سے مابقیہ چاول کے اندر بیع منعقد ہوجائے گی۔

پس اس کے ذمہ میں مابقیہ چاول کی قیمت واجب الأداء ہے اگر ادانہ کرے تو وہ وعدہ خلافی کا

مرتکب ہو کر گنہگار ہوگا اور بائع پر ظلم کرنے والا ہوگا، لیکن معاملہ اگر دوسری صورت کا ہے تو مالک کو اختیار ہوگا: کہ چاول دیکھنے کے بعد اگر پسند نہ ہوں تو سب چاول کی بیع کو ختم کردے" والناس علی شروطھم،، پر عمل ہوگا پھر وکیل کا دیکھنا اور لیجانا کافی نہیں، بلکہ اس کے لیجانے کے بعد مالک کا پسند کرنا اور پسندیدگی کی اطلاع دینا ضروری ہے اگر ناپسندیدگی کی اطلاع دی تو بیع ختم ہوجائے گی مشتری پر بیع لازم نہ ہوگی ورنہ بیع لازم ہوجائے گی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب .

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۱۶/ذیقعدہ ۱۴۲۶ھ	۱۶/ذیقعدہ ۱۴۲۶ھ

تالاب میں مچھلی کی خرید وفروخت کرنے کا حکم

(۱۷۱) سوال:- مچھلی پکڑنے سے قبل تالاب میں اس کی خرید وفروخت درست ہے یا نہیں؟

الجواب ومنه الصدق والصواب

مچھلی پکڑنے سے قبل تالاب میں اسکی خرید وفروخت ناجائز ہے۔

قال فی الهداية لايجوز بيع السمک قبل أن يصطاد لأنه باع مالايملكه ولافی خطيرة إذا كان لايؤخذ إلا بصيد لأنه غير مقدور التسليم ومعناه إذا أخذه ثم ألقاه فيها ولو كان يوخذ من غير حيلة جاز إلا إذا اجتمعت فيهابأنفسها ولم يسد عليها المدخل لعدم الملک. (ج۴ص۳۴)

تالاب میں اگر مچھلیاں ہیں تو کیزی کے حساب فی کیزی مثلاً ۸۰ روپیہ قیمت طے کر کے وعدۂ بیع کرسکتے ہیں پھر جب مچھلیاں نکالی جائیں گی تو جتنی کیزی ہونگی ان کی قیمت ادا کی جائے اسطرح بیچنا جائز ہے مگر اس صورت میں بھی عندالشراء مچھلی کی نوعیت اور قیمت واضح ہونا ضروری ہے تاکہ بعد میں بائع اور مشتری کے درمیان نزاع واختلاف پیدا نہ ہو، مثلاً روح مچھلی فی کیزی ۸۰ روپیہ ہے، سول مچھلی ۷۰ روپیہ اس سے چھوٹی مچھلی ۶۰ روپیہ علی ہذا القیاس۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح — کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ

محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ — معاون مفتی دارالافتاء

۱۳/ذی الحجہ ۱۴۲۴ھ — ۱۳/ذی الحجہ ۱۴۲۴ھ

ادارہ میں طلبہ کے کھانے، قیامگاہ حقوقِ مجروہ کے تحت داخل ہیں

(۱۷۲)سوال :-جناب مفتی صاحب! ہماری یونیورسٹی میں امدادی نمبر پر طلبہ کو کھانا اور سیٹ (کمرے) ملتے ہیں الحمدللہ مجھے دونوں ملے ہیں مگر میرا گھر یونیورسٹی سے قریب ہے، میں گھر میں رہتا ہوں، اب میں اپنا کھانا اور سیٹ دوسرے کسی طالب علم کو فروخت کرنا چاہتا ہوں یہ درست ہوگا یانہیں؟

الجواب بعون اللہ تعالیٰ وتوفیقہ

حقوقِ مجردہ کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے چنانچہ جواہر الفتاویٰ میں ہے کہ طلبہ کے رہائش، قیام وطعام اور دوسری سہولتوں کے حقوق جو دینی مدارس اور جامعات اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کی جانب سے حاصل ہیں ان کی خرید وفروخت کرنا یہ سب بیوع ناجائز ہیں۔ جواہر الفتاویٰ: (۲۸۳/۳)

واضح رہے کہ اگر ادارہ کی طرف سے اجازت ہو تو خرید وفروخت جائز ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب،

الجواب صحیح — کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ

محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ — معاون مفتی دارالافتاء

۱۳/ذی الحجہ ۱۴۲۴ھ — ۱۳/ذی الحجہ ۱۴۲۴ھ

موبائیل کارڈ کی خرید وفروخت درست ہے

(۱۷۳)سوال :-: موبائیل کارڈ کی خرید وفروخت درست ہے یانہیں؟ نیز یہ حقوقِ مجردہ کے تحت داخل ہے یانہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

درست ہے، درحقیقت کمپنی سے نیٹ ورک کی اجازت لینی ہے مثلاً تین سو روپے کا کارڈ خرید لیا جائے تو چھ مہینہ تک نیٹ ورک بحال رہے گا اس کے بعد ختم ہو جائے گا اور یہ حقوقِ مجردہ کے تحت داخل نہیں ہیں چونکہ یہ چیز قدرتی نہیں بلکہ لوگوں کی مصنوعی ہیں لہٰذا کارڈ کی خرید وفروخت جائز ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۱۲ ربیع الاوّل ۱۴۲۳ھ	یکم ربیع الاوّل ۱۴۲۳ھ

چڑھاوے کے جانور کے کھانے اور خرید وفروخت کے احکام

(۱۷۴) سوال:-(۱) جناب مفتی صاحب بعض جاہل مسلمان اولیاء کرام کے مزارات پر جو مرغا، بکرا، گائے، بھینس وغیرہ جانوروں کی منت مانتے ہیں یا ان کے نام پر تبرعات لے جاتے ہیں اور مجاورین مزار بعض جانوروں کو ذبح کر کے خود کھاتے ہیں اور لوگوں کو بھی کھلاتے ہیں اور لوگ تبرّک سمجھ کر گوشت خود کھاتے اور گھروں میں لے جاتے ہیں، اب سوال یہ کہ ان جانوروں کا گوشت کھانا حلال ہے یا نہیں ویسا ہی مزاروں میں لیجانے والی مٹھائیاں کھانا، پھل، دودھ موم بتی وغیرہ چیزوں کا حکم کیا ہے؟

(۲) نیز مزارات کے مجاورین سے مزار کے جانوروں کی خرید وفروخت درست ہے یا نہیں؟ حضرت مفتی شفیع صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے ''معارف القرآن'' میں انکی خرید وفروخت کو جائز کہا چنانچہ اسی طرح بعض جاہل مسلمان بھی بعض مزارات پر ایسا ہی عمل کرتے ہیں کہ بکرا یا مرغا چھوڑ دیتے ہیں اور مزارات کے مجاورین کو اختیار دیتے ہیں وہ ان کو فروخت کر دیتے ہیں تو جو لوگ ان جانوروں کو ان لوگوں سے خرید لیں جن کو اصل مالک نے اختیار دیا ہے ان کے لئے ان کا خریدنا اور ذبح کرنا سب حلال ہے (بقرۃ:۱۷۷۔معارف القرآن:۱/۴۲۴)

اور فتاویٰ رشیدیہ میں ان کی خرید وفروخت کو ناجائز لکھا ہے چنانچہ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں ''جو جانور مالک نے کسی بت خانہ وقبر کے نام پر چھوڑا وہ ملک چھوڑنے والے سے نہیں نکلتا پھر اس کو اگر کوئی پکڑ کر بیع کر دیوے اور مالک منع نہ کرے اس کا خریدنا مباح ہے اور وہ حلال ہے۔

اور جانور کا قبضہ کرا دیا اور تملیک مجاور کی کر دی وہ حرام ہے اس کو خریدنا نہ چاہئے کہ وہ معصیت کی

نیت سے مجاور کی پاس آیا ہے اس میں بسببِ معصیت کے حرمت عقد ہبہ کی ہوگئی ہے الخ"۔
(فتاوی رشیدیہ)

اور ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ:
جواب:۔"جو مرغا یا بکرا اور کھانا کفارا اپنے معابد پر چڑھاتے ہیں اور کافر مجاور لیتا ہے اس کا خرید نا درست ہے کہ کافر مالک ہو جاتا ہے اور جو مسلمان مجاور ایسی چیز لیتا ہے وہ مالک نہیں ہوتا اس کا خرید نا درست نہیں اور یہ سب جواب اس حالت میں ہے کہ علم ہو اس کے چڑھاوا ہونے کا اور بدون علم کے تو مباح ہوتا ہی ہے۔ واللہ اعلم"۔ (فتاوی رشیدیہ کتاب خرید وفروخت کے مسائل ۴۷۵۔۴۷۶) ان سب معارض عبارات کا حل کیا ہے آپ سے جواب مطلوب ہے۔

الجواب باسمہ تعالیٰ وھو الھادی للحق والصواب

جواب(۱):۔صورت مسئولہ میں جو جانور مسلمان اپنے مسلمان بزرگوں کے نام پر لاتے ہیں ان کی چند اقسام ہیں پہلی اور دوسری صورتوں میں بزرگ کے نام پر منت کیا ہوا جانور یا بزرگ سے تقرب کے لئے ان کے نام کیا ہوا جانور، یہ دونوں قسم کے جانور "مـا أهـل بـه لغير الله" کے تحت داخل ہونے کی وجہ سے حرام ہیں، یہ صورتیں باجماع امت حرام ہیں اور یہ جانور میتۃ کے حکم میں ہیں، ان کے کسی جز سے انتفاع حاصل کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ سب آیت "مـا اهل به لغير الله" کے تحت داخل ہیں، ایسا کرنے والا آدمی جان بوجھ کر کرے تو وہ مرتد و کافر ہو جاتا ہے ایسے لوگوں پر تجدیدِ ایمان اور تجدید نکاح لازم ہے۔

✵ چنانچہ حواشی بیضاوی میں ہے:

فـكـل مـا نـودي عـلـيـه بـغير اسم الله فهو حرام وإن ذبح باسم الله تعالىٰ حيث اجـمـع الـعـلماء ولو ان مسلمًا ذبح ذبيحة وقصد بذبحه التقرب الى غير الله صار مرتدًا و ذبيحته ذبيحة مرتد.

✵ نیز درمختار کی کتاب الذبائح میں ہے:

(ذبح لقدوم الأمير) نحوه كواحد من العظماء(يحرم) لأ نه أهل به لغير الله ولو ذكر اسم الله (واقره الشامي:۶/۳۰۹)

یعنی کسی بزرگ کی مہمانداری اور دعوت کے لئے نہیں بلکہ ان کا تقرب حاصل کرنے کے لئے

کردیوے تو جانور نا جائز اور حرام ہے۔

تیسری صورت: وہ جانور ہیں کہ صاحبِ قبر کے عرس کے موقع پر مہمانوں کے لئے یا مجاورین اور خدام کے لئے لاتے ہیں اور ان میں بزرگ کے تقرب کی نیت نہیں ہوتی یہ جانور حلال ہیں انکا گوشت بھی حلال ہے ایسے جانوروں کی خرید وفروخت سب جائز ہے، لیکن تحقیق نہ ہو تو نہ کھانے میں احتیاط ہے نیز حیوانات کے علاوہ دوسری چیز جیسے مٹھائی، پھل وغیرہ کو بے علم مسلمان بزرگوں کے مزارات پر چڑھاتے ہیں، حضراتِ فقہائے کرام نے ان کو بھی اشتراکِ علت یعنی تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے "ما أهل به لغير الله" کے حکم میں قرار دے کر حرام قرار دیا ہے اور ان کے کھانے پینے اور دوسروں کو کھلانے اور بیچنے خریدنے سب کو حرام کہا ہے۔ چنانچہ درمختار میں ہے۔

واعلم أن النذر الذی یقع للأموات من أكثر العوام مايؤخذمن الدراهم والشمع والزيت ونحوها إلى ضرائح الأولياء الكرام تقربًا إليهم فهو بالإجماع باطل حرام مالم يقصد واصرفهالفقراء الأنام وقد ابتلى الناس بذلک ولاسيما فی هذه الأعصارواقره الشامی.

(درمختار مع شامية قبيل باب الاعتكاف: ج ۲/ص ۴۳۹، بحر: ۲/۲۹۸)

جواب (۲):- جو جانور غیر اللہ کے نام پر نذر (منت) کے طور پر بزرگوں کے مزارات پر چڑھاتے ہیں وہ حرام ہے، مجاور مزاران کا مالک نہیں، اس لئے ان سے ان کی خرید وفروخت نا جائز وحرام ہے۔

✸ چنانچہ فتاوی رشیدیہ میں ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

جواب:- جو جانور مالک نے ...... مجاور کو قبضہ کرا دیا اور تملیک مجاور کی کردی وہ حرام ہے اس کو خریدنا نہ چاہیئے کہ وہ معصیت کی نیت سے مجاور کے پاس آیا ہے اس میں بسبب معصیت کے حرمت عقد ہبہ کی ہوگی نیز ایک اور سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

جواب:- جو مرغا یا بکرا اور کھانا کفار اپنے معابد پر چڑھاتے ہیں اور کافر مجاور لیتا ہے تو اس کا خرید نادرست ہے کہ کافر مالک ہو جاتا ہے اور جو مسلمان مجاور ایسی چیز لیتا ہے وہ مالک نہیں ہوتا اس کا خرید نادرست نہیں اور یہ سب جواب اس حالت میں کہ علم ہو الخ (فتاوی رشیدیه: ۴۷۶)

✸ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

(قوله باطل وحرام) لوجوه: منها انه نذر لمخلوق والنذر للمخلوق لايجوز لأنه عبادة والعبادة لاتكون لمخلوق ومنها أن المنذورله ميت والميت

لایملک منها أنه إن ظن أن المیت یتصرف فی الأمور دون الله تعالیٰ واعتقاده ذلک کفر الخ (شامیة مطلب فی النذر الذی للأموات من أکثر العوام من شمع أوزیت اونحوه : ۲/ ۴۲۹) من قبیل باب الاعتکاف .

✸ علامہ ابن نجیم بحر میں فرماتے ہیں:

ولایجوز لخادم الشیخ أخذه ولا أکله ولا التصرف فیه بوجه من الوجوه الخ
(البحر الرائق من قبیل باب الإعتکاف ۲/ ۲۶۸)

مذکورہ بالا دلائل سے معلوم ہوا کہ جو جانور غیر اللہ کے نام پر نذر کے طریقہ سے بزرگوں کے مزارات میں آتے ہیں، مجاورین مزاران کے مالک نہیں ہوتے اس لئے ان سے انکو خرید نا درست نہیں ہے، یہ بات کتب فقہ اور فتاویٰ میں مذکور ہے پس فتاویٰ رشیدیہ کا فتویٰ ہی درست اور قابل عمل ہے اور حضرت مفتی شفیع رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ قابل غور ہے چونکہ یہ فتویٰ دیگر کتب فقہ وفتاویٰ کے خلاف ہے، شاید طبع کی غلطی سے ایسا ہوا، یا حضرت سے تسامح ہوگیا کیونکہ حضرت خود نذر لغیر اللہ کے مسئلہ میں لکھتے ہیں:

یہاں ایک چوتھی صورت اور ہے جس کا تعلق حیوانات کے علاوہ دوسری چیزوں سے ہے مثلاً مٹھائی کھانا وغیرہ جن کو غیر اللہ کے نام پر نذر ونیاز (منت) کے طور پر ہندولوگ اور جاہل مسلمان بزرگوں کے مزارات پر چڑھاتے ہیں حضرات فقہاء نے اس کو بھی...... اشتراک علت یعنی تقرب الی غیر اللہ کی وجہ سے "مَا أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ" کے حکم میں قرار دے کر حرام کہا ہے اور اس کے کھانے پینے اور دوسروں کو کھلانے اور بیچنے خرید وفروخت کرنے سب کو حرام کہا ہے کتب فقہ کی کتاب. بحر الرائق میں اس کی تفصیلات مذکور ہیں یہ مسئلہ قیاسی ہے جس کو نص قرآنی متعلقہ حیوانات پر قیاس کیا گیا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔
(معارف القرآن قول تعالیٰ: وما أهل به لغیر الله بقرة: ۱/ ۴۲۲)

اس حوالے سے معلوم ہوا کہ حضرت کے نزدیک بھی انکی خرید وفروخت نادرست ہے پس پہلا مسئلہ میں طبع کی غلطی سے غلط بات شائع ہوئی ہے۔ واللہ اعلم بمرادہ۔

نوٹ: مذکورہ منذورہ جانوروں کو حلال کرنے کا طریقہ یہ کہ ناذر مجاور مزارات سے جانور واپس لیگا اور خالص دل سے توبہ واستغفار کرے تو پھر جانور کی خرید وفروخت ہبہ وغیرہ سب درست ہوگا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب .

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی دار الافتاء	محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۲۵/ صفر ۱۴۲۶ھ	۲۵/ صفر ۱۴۲۶ھ

شیئرز بیچنے کا حکم

(۱۷۵) سوال:- جناب مفتی صاحب! میں نے ۳۰/۴ سال قبل شیئرز خریدے تھے، پھر مجھے جب دو تین سال کے بعد معلوم ہوا کہ یہ لین دین شریعت کے موافق نہیں تو شیئرز کو فروخت کر دیا، مگر دو تین سال میں رأس المال سے پانچ سات گنا منافع حاصل ہوا، اس منافع کے ساتھ اپنی حلال رقم ملا کر مختلف فنڈ میں خرچ کی، مثلاً زمین خرید لی اس میں دو عمارتیں تعمیر کیں اور کچھ جگہ ایک عمارت کا ایک چوتھائی حصہ وقف للہ کیا اور حج اور مختلف ممالک میں تبلیغی سفر کیا اب سوال یہ کہ میں نے مذکورہ بالا کاموں میں جو رقم خرچ کی وہ از روئے شرع درست ہوا یا نہیں نیز میرا حج، وقف، سفر وغیرہ امور درست ہوئے ہیں یا نہیں؟ نیز اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔

نوٹ:- مالِ حرام سے میرا حلال مال زیادہ تھا۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

صورت مسئولہ میں حج، وقف اور تبلیغی سفر وغیرہ امور حلال وحرام مخلوط مال سے ہوئے ہیں، لہٰذا ان کو جائز ہونے کا حکم دیا جاوے گا، جبکہ مال حرام سے مال حلال زیادہ تھا، باقی مال حرام سے چھٹکارا پانے کا راستہ یہ ہے کہ جس قدر مال حرام حاصل کیا گیا ہے اگر اس کے مالکان معلوم ہیں اور وہ زندہ ہیں، تو ان کو ورنہ ان کے ورثاء کو ان کا مال پہنچایا جائے البتہ مالک زندہ نہیں یا اس کے ورثاء تک پہنچانا ممکن نہیں ہے تو اصل مالک کی جانب سے اس کیلئے ثواب کی نیت سے صدقہ کر دے اور یہ حرام مال ایسے لوگوں کو دیدے جو کہ مستحقِ زکوٰۃ ہیں اور خالص دل سے حرام کمائی کے گناہ سے توبہ کرے اگر اللہ چاہے گا تو معاف کر دے گا۔

کمافی الشامية: والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم وإلافان علم عين الحرام لايحل له ويتصد ق به بنية صاحبه.

فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۶/ربیع الاوّل ۱۴۲۳ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۶/ربیع الاوّل ۱۴۲۳ھ

کِتَابُ الْاِجَارَاتِ

(۱۷۶) سوال:- جناب مفتی صاحب! اجارہ کے بارے میں چند مسائل معروض ہیں امید ہے کہ جوابات سے نوازیں گے۔

(۱) میں نے پیشگی پچاس ہزار روپے دیکر ایک مکان اجارہ پر لیا اور اس مکان کا کرایہ فی مہینہ ۱۵۰۰/- روپے معین کیا گیا ہے، پھر میں نے تجارت کی غرض سے اس گھر میں مزید سامان وغیرہ خرید کر لگادیا ہے، مثلاً الماری، طاق، فریج، ترازو وغیرہ وغیرہ تقریباً پچاس ہزار روپے کا سامان ہے اور اس مکان میں رنگ اور الیکٹرک وائرنگ بھی اپنی طرف سے کی ہے لیکن میں مختلف وجوہ سے تجارت سے عاجز ہوں، اس لئے مکان ایک اور شخص کو اجارہ پر دے دیا ہے، واضح رہے کہ میں نے ان سے بھی پیشگی -/۲۰,۰۰۰ روپے لیے ہیں اور فی مہینہ -/۳۰۰۰ ہزار روپے کرایہ متعین کیا گیا ہے اب سوال یہ ہے کہ ہمارا یہ لین دین درست ہوا ہے یا نہیں؟

(۲) میں نے ایک شخص سے دو لاکھ روپے کے پیشگی کرایہ پر پانچ سال کیلئے ایک مکان اجارہ پر لیا ہے اب سوال یہ کہ اس مکان کو دوسرے کسی کے پاس پھر اجارہ پر دینا جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب ومنه الصدق والصواب

جواب (۱):- شئ مستاجرہ کے اجارہ کے متعلق درمختار میں ہے:

(وله السكنى بنفسه أو إسكان غيره بإجارة وغيرها) و كذا كل مالايختلف بالمستعمل يبطل التقييد لانه غير مفيد بخلاف مايختلف به كما سيجئى ولو آجر بأكثر تصدق بالفضل الإ فى مسألتين إذاآجرها بخلاف الجنس أوأصلح شيأً ولو آجرهامن المؤجر لا تصح وتنفسخ الإجارة والأصح بحر معزيًا للجوهرة وسيجى تصحيح خلافةفتنبه .(ج٦/٢٨) وفى موضع اخر (للمستأجر (أن يؤجر المؤاجر بعد قبضه قيل وقبله (من غير مؤجره)) وأمامن مؤجره فلا يجوزإن تحلل ثالث به يفتى للزوم تمليك المالك وهل تبطل والأولىٰ بالإجارة للمالك ؟ الصحيح لاوهبانيه (ج٦/ ٩١) وفى الشامية (قوله كما سيجئ) ان بعد نحو ورقة (قوله بخلاف الجنس) أى

جنس ماا ستأجر به و كذا إذا آجر مع استجار شيئًا من ماله يجوز أن تقعد عليه الإجارة فإنه تطيب له الزيادة كمافي الخلاصة (قوله أو اصلح شيئا فيها) بأن جصصها أو فعل مسناة و كذا كل عمل قائم كان الزيادة بمقابلة ما زاد من عنده حملا لأمره على الصلاح كمافي المبسوط آلكنس ليس باصلاح إن كرى النهر قال الخصاف تطيب الخ

(كتاب الإجارة لاالاجازة ج٦/ص ٢٩)

عباراتِ بالا سے شیٔ مستاجرہ کے اجارہ کے جائز وناجائز کی چند صورتیں معلوم ہوتی ہیں اوروہ یہ ہیں:

(۱) شیٔ مستاجرہ کو مالک مکان کے پاس اجارہ پر دینامطلقًا ناجائز ہے۔

(۲) مالک مکان کے علاوہ کسی دوسرے کواجارہ پر دینا جائز ہے، بشرطیکہ دوسرے اجرہ کا کرایہ اجارۂ اولیٰ (یعنی پہلا اجارہ کے کرایہ) کے برابر ہو ورنہ اجارۂ ثانیہ جائز نہیں ہوگا، یعنی جتنے کرایہ پر لیا ہے اتنے پر دوسرے کو دے سکتا ہے اس سے زائد پر نا جائز ہے۔

(۳) مستأجر نے اگر شیٔ مستأجرہ میں کچھ اضافہ وغیرہ کیا ہے مثلاً مکان میں پاخانے، غسل خانے وغیر بنائے، یا مکان میں رنگ کروایا ہے تو زائد کرایہ کے ساتھ اجارہ پر دینا بھی جائز ہے۔

(۴) اجارۂ ثانیہ کا کرایہ اگر اجارۂ اولیٰ کے کرایہ کی جنس سے نہ ہو یعنی دوسری جنس کے بدلہ میں اجارہ دیا ہے مثلاً اجارۂ اولیٰ کا کرایہ روپے تھے اور اجارۂ ثانیہ کا کرایہ ایک گائے وغیرہ متعین کی ہے تو بھی زائد کرایہ کے ساتھ اجارہ پر دینا جائز ہوگا۔

فلہٰذا صورت مسئولہ میں مستأجر نے جبکہ مکان میں کچھ کام وغیرہ کیا ہے اس لئے زائد رقم پر اجارۂ ثانیہ کا لین دین درست ہوا ہے۔

جواب (۲): -صورتِ مسئولہ میں دولاکھ روپے کو ساٹھ مہینوں میں تقسیم کر کے حساب لگایا جائیگا کہ فی مہینہ مکان کا کرایہ کتنا روپیہ بنتا ہے اسی حساب سے مثلاً صورتِ مسئولہ میں مکان کا کرایہ فی مہینہ ۳۳۳۳/ روپے پڑتا ہے تو دوسرے کو اتنی مقدار میں کرایہ پر دے سکتا ہے البتہ مکان میں اضافہ واصلاح کرنے کے بعد کرایہ پر دیگا تو زائد کرایہ بھی لے سکے گا جیسا کہ ماقبل میں گزر چکا ہے۔ (کما مر فی الشامیۃ فی کتاب الاجارات: ج٦ ص٢٩)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
یکم شعبان ۱۴۲۴ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
یکم شعبان ۱۴۲۴ھ

بَابُ بَیْعِ السَّلَمْ

بیع سلم اور اس کی شرائط

(جنگل سے شہد لینے کے متعلق ایک اہم استفتاء)

(۱۷۷) سوال :- ہمارے یہاں شہد کے عام تاجرین براہ راست جنگل سے شہد نہیں لا سکتے ہیں بلکہ دوسرے لوگوں کے ذریعہ لاتے ہیں (جو لوگ جنگل سے شہد لاتے ہیں ان کو موالی کہا جاتا ہے) یعنی تاجر لوگ موالیوں کو سرمایہ دیتے ہیں اور موالی لوگ جنگل سے شہد لاتے ہیں تو گویا کہ یہ معاملہ بیع مضاربہ کے مشابہ ہے کہ تاجرین سرمایہ والے ہوتے ہیں اور موالی لوگ محنت کار ہوتے ہیں۔

معاملہ کی تفصیل: یہ کہ کوئی تاجر چند موالیوں کو مثلاً ۵۰,۰۰۰/ ہزار روپے بطور سرمایہ دیتے ہیں پھر موالی روپوں میں سے ۳۰,۰۰۰/ ہزار بطور قرض اپنے گھر والوں کے خرچہ کی بابت لے لیتے ہیں تاکہ ان لوگوں کی جنگل سے واپسی تک گھر والوں کا خرچہ چل سکے، اور باقی ۲۰,۰۰۰/ ہزار رقم جنگل کے خرچہ کی بابت لے جاتے ہیں (یعنی جنگل میں موالیوں کے کھانے پینے وغیرہ اور شہد لینے کے متعلق خرچہ کی بابت) جیسے جنگل میں داخل ہونے کیلئے فرسٹ افسر سے ایک اجازت نامہ لینا ہوتا ہے، اس کے بغیر دخول ممنوع ہے اس بابت ۵۰۰/ روپے دینے پڑتے ہیں اور ہر ایک موالی اسی اجازت نامہ سے صرف دو من شہد لے سکتا ہے، اس سے زائد لانے کی اجازت نہیں اس طریقہ پر موالی تقریباً ایک لاکھ روپے کا شہد لاتے ہیں اور اسکی تقسیم اس طرح ہوتی ہے کہ پہلے منافع میں سے اصل سرمایہ کی مقدار کو منہا کیا جاتا ہے، پھر مابقیہ کو ان کے درمیان برابر سرابر کر کے تقسیم کیا جاتا ہے مثلاً۔

جنگل سے حاصل شدہ شہد کی قیمت	=	۱۰۰۰۰۰/ ہیں
تاجر کا سرمایہ وضع کرنے کی بابت	=	۲۰,۰۰۰/ ہیں
کل منافع	=	۸۰,۰۰۰/ ہیں

منافع کی تقسیم

ایک سرمایہ دینے والا اور ۹ موالی لوگ ہوتے ہیں اور کل منافع جو بچا ہوا ہے ۸۰,۰۰۰ ہزار ان کو ۱۰ (دس) افراد میں تقسیم کیا جائے گا، ہر ایک کا جو حصّہ ہے وہ اس کا حقدار ہوگا۔

نوٹ:-(۱) موالیوں پر تاجر کا جو قرض (۳۰,۰۰۰) تھا، وہ تقسیم کے وقت منافع سے ادا کر دیتے ہیں۔

(۲) تاجر موالیوں کو سرمایہ دیتے وقت ایک شرط یہ لگاتے ہیں کہ موالیوں کو منافع میں سے جو حصہ حاصل ہوگا وہ تاجر کے پاس ہی بیچنا ہوگا اور کسی کے پاس نہیں بیچ سکیں گے۔

(۳) خدانخواستہ موالیوں کو جنگل میں کچھ شہد حاصل نہیں ہوسکا یا حاصل نہیں کر سکتے تو تاجر کے کل سرمایہ کا ضمان دینا ہوگا اور ادائے ضمان کی صورت یہ ہوگی کہ آئندہ سال جبکہ دوبارہ موالی لوگ جنگل میں جائیں گے اور ان کو منافع حاصل ہوں گے تو ان منافع سے اوّلاً سال ماضیہ کے سرمایہ کو منہا کیا جائے گا پھر جو باقی رہیں گے وہ ان کے درمیان ماقبل کے ذکر کردہ طریقہ کے مطابق تقسیم کریں گے۔

اب دریافت یہ ہے کہ مذکورہ بالا طریقہ سے شہد کا معاملہ کرنا ازروئے شرع جائز ہوگا یا نہیں، ہزاروں مسلمان اس میں مبتلا ہیں اگر ناجائز ہے تو اس کے جواز کی کوئی صورت ہے، تو براہِ کرم بتا دینا۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

واضح رہے کہ بیع مضاربہ کی حقیقت یہ کہ ایک فریق کی جانب سے سرمایہ ہوتا ہے، اور دوسرے فریق کی جانب سے عمل اور محنت ہوتی ہے اور جو کچھ منافع ملتا ہے ان میں ہر فریق اپنے طے شدہ اصول کے مطابق نصف یا ثلث یا ثلثین کے اعتبار سے شریک ہوتا ہے اور ہر ایک فریق منافع کے تناسب سے نقصان کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے اس کے علاوہ کسی فریق کے لئے کسی مخصوص رقم کی شرط نہیں ہوتی اور بیع مضاربہ میں اگر نقصان ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس نقصان کی تلافی نفع میں سے وضع کی جائیگی اور اگر نقصان نفع کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے تو نفع کے بعد بقیہ نقصان اصل سرمایہ میں سے برداشت کیا جائے گا، مثلاً دس ہزار رقم سے مضارب نے کام شروع کیا پہلی دفعہ خرید وفروخت میں دو ہزار روپے منافع ہوئے پھر مال خریدا اور اس میں ڈھائی ہزار روپے کا نقصان ہوا تو ڈھائی ہزار روپے کے نقصان کو یوں تقسیم کیا جائے گا کہ دو ہزار روپے تو منافع میں سے جائیں گے اور پانچ سو روپے اصل سرمایہ میں سے جائیں گے، اس پانچ سو میں مضارب شریک نہیں ہوگا کیونکہ اس کی محنت کا ضائع ہونا، یہ اس کا

نقصان ہوا پھر وہ دہرے نقصان میں شریک نہیں ہوگا، پس رب المال نے اگر یہ شرط لگائی کہ وہ نقصان میں شریک نہیں ہوگا بلکہ نقصان صرف مضارب پر ہوگا، یا نقصان کی صورت میں بھی مضارب کو اپنی جانب سے اس کا سرمایہ ادا کرنا ہوگا یا مضارب کے حصہ منافع کو رب المال کے پاس ہی بیچنا ہوگا وغیرہ وغیرہ تو اس قسم کی شرائط سے بیع مضاربہ فاسد ہو جاتی ہے۔

فلہٰذا صورت مسئولہ کا معاملہ درست نہیں ہے کیونکہ اس میں شرائطِ فاسدہ ہیں البتہ اس کے جواز کی بہتر صورت یہ ہے کہ بیع سلم کی جاوے یعنی تاجر لوگ موالیوں کو شہد کی پیشگی قیمت دیدیں گے اور موالی لوگ شہد کٹنے کے موسم پر ان کو شہد دیدیں گے مگر اس میں بھی مذکورۃ الذیل شرطیں ملحوظ ہوں گی۔

بیع سلم کی شرائط

* شہد کی جنس کا بیان ہونا ضروری ہے یعنی شہد اگر مختلف پھولوں کے ہوں، تو ان میں سے جس پھول کا شہد لینا چاہے اس کا نام متعین کر دینا۔
* شہد کی نوع کا بیان ہونا ضروری ہے جیسا کہ شہد پتلا ہوتا ہے گاڑھا ہوتا ہے۔
* شہد کی صفت کا بیان ہونا ضرروی ہے جیسا کہ عمدہ قسم کا شہد ہوگا یا گھٹیا؟
* شہد کی مقدار کا بیان ہونا جیسا کہ شہد دس من ہوگا یا بیس من کیونکہ ان چیزوں کے اختلاف سے مسلم فیہ کی قیمت مختلف ہوتی ہے اس لئے جسطرح عہد ہوگا بیان کر دینا ضروری ہے تا کہ بعد میں جھگڑا نہ ہو۔
* مدت کا بیان ہونا جیسا کہ ایک ماہ یا دو ماہ کے بعد شہد دینگے البتہ کمتر مدت ایک ماہ ہے اس سے کم ہو تو بیع سلم صحیح نہیں ہوگی۔
* مسلم فیہ (یعنی شہد) کی قیمت کا بیان ہونا جیسا کہ فی کلو دوسو روپے وغیرہ ہے۔
* شہد کی ادائیگی کی جگہ کا بیان ہونا یعنی کس جگہ پر موالی لوگ تاجروں کو شہد دیں گے
* قبل از افتراق راس المال (روپے) مقبوض ہونا یعنی جس مجلس میں بیع سلم منعقد ہوگی اسی مجلس میں رأس المال رب السلم کو سپرد کرنا ضروری ہے۔

ان تمام شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے شہد کی بیع سلم کر سکتے ہیں واضح رہے کہ موالی لوگ اگر جنگل سے شہد نہیں لا سکے یا اور کسی جگہ سے بھی نہیں دے سکے تو اس صورت میں تاجروں کو صرف راس المال ہی ملے گا اس کے بدلہ اور کچھ لینا دینا حرام اور سود ہے۔

فقط اللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح | کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ | معاون مفتی دارالافتاء
۲۲ر جمادی الاولی ۱۴۲۶ھ | ۲۲ر جمادی الاولی ۱۴۲۶ھ

فصلٌ فی الرِّبوٰ والقِمار

ایک جدید کمپنی کے لین دین کا طریقہ

(۱۷۸) سوال:- بندہ ایک کمپنی میں "۵۱۲۰" روپے جمع کروا کر اسکا ممبر بنا اور کمپنی کے لین دین کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مجھے "۱۶۰۰" روپے کا سامان خریدنا ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ اور دو شخصوں کو اس کا ممبر بنانا ہے، کمپنی نے اپنے اصول کے مطابق پہلے مجھے "۱۵۰۰" روپے کا ایک چیک دیا، اس طرح میری طرف سے تقرر کئے ہوئے دو ممبر جب خود "۵۱۲۰" جمع کروا کر ممبر بنے اور انہوں نے بھی دو دو کر کے اور چار آدمیوں کو ممبر بنایا، تو کمپنی نے مجھے "۲۱۰۰" سو روپے کا اور ایک چیک دیا اور کمپنی نے میری طرف سے تقرر ہوئے دونوں آدمیوں کو بھی "۱۵۰۰" روپے کر کے ایک ایک چیک دیا، وہ لوگ بھی میری طرح ممبر بنے اور ہر ایک کا یہی کام ہے کہ خود "۵۱۲۰" روپے جمع کروا کر ممبر بنے گا اور ساتھ ساتھ اور شخصوں کو بھی ممبر بنائیگا، خلاصہ بات یہ کہ میری طرف سے بنے ہوئے ممبر جتنے بھی ممبر بنائیں گے ہر ایک ممبر کے بدلہ میں مجھے ایک ایک چیک ملتا رہیگا، میری طرح دوسروں کو بھی چیک ملے گا، مثلاً میرے دو ممبروں نے اور چار ممبر بنائے پھر ان کے چار ممبروں نے دو دو کر کے آٹھ ممبر بنائے تو کمپنی مجھے "۳۳۰۰" روپے کا چیک دیگی، اسطرح روپوں میں اضافہ ہوتا رہے گا، اب سوال یہ کہ مذکورہ تجارت شرعاً حلال ہے یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

صورت مسئولہ کی تجارت ناجائز ہے اور ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہی ساتھ دو معاہدوں کو جمع کیا گیا کہ سامان بیچنا پھر ساتھ ساتھ دو ممبر سامان خریدنے والے بنانا اور خرید وفروخت میں اس طرح کے دو معاملہ کو ایک ساتھ جمع کرنا جائز نہیں ہے، حدیث شریف میں اس کی نہی وارد ہوئی ہے:

(۱) عن ابی هريرة رضى الله عنه قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيعتين في بيعة (ترمذی: ج۲ ص۲۲۳)

ترجمہ: حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ علی اللہ علیہ وسلم نے ایک بیع میں دوسری بیع کرنے سے منع فرمایا۔

(۲) عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم أنه نهى عن بيع عن شرط.

(عن اعلاء السنن.)

فلہذا صورتِ مسئولہ کی تجارت ناجائز ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۱۲ ربیع الاوّل ۱۴۲۳ھ	۱۲ ربیع الاوّل ۱۴۲۳ھ

مالی جرمانہ کرنا حرام وناجائز ہے

(۱۷۹) سوال:- ایک شادی شدہ مرد نے ایک شادی شدہ عورت سے زنا کیا اسی جرم پر پنچائت والوں نے ان دونوں پر دس ہزار روپے جرمانہ کیا اوران پیسوں سے سماجی ضرورت کے لئے تین بڑی بڑی ہانڈیاں خریدی اوران ہانڈیوں کو کرایہ پر دیکر لوگوں سے پیسے لیتے ہیں، فی الحال دس ہزار کے قریب کرایہ کی رقم سماجی سردار کے پاس جمع ہے، اب سوال یہ ہے کہ جرمانہ کا یہ معاملہ شرعاً درست ہوا ہے یا نہیں؟۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

شادی شدہ زانی اورزانیہ کی شرعی سزا رجم یعنی سنگسار ہے مگر ہمارے ملک میں چونکہ اسلامی حکومت نہیں ہے اس لئے یہ سزا نافذ نہیں ہوگی مگر تعزیری طور سے کچھ سزا دینا چاہئیے لیکن اس کی جگہ مالی جرمانہ کرنا جائز نہیں۔

قال في شرح التنوير. (لابأخذمال في المذهب (بحر : وفيه عن البزازية وقيل يجوز ومعناه أن يمسكه مدة لينزجرثم يعيده له، فان أيس من توبته صرفه إلى مايرى، وفي المجتبىٰ أنه كان في إبتداء الإسلام ثم نسخ وقال في الشامية

والحاصل أن المذهب عدم التعزير بأخذ المال.

(کتاب الحدود وباب التعزیر تحت مطلب فی التعزیر باخذ المال ۴/۶۱)

فلہٰذا صورتِ مسئولہ کا معاملہ نادرست ہوا، اس لئے کل رقم مع منافع واجب الرد ہے، یعنی جن پر زنا کا الزام ہے ان کو واپس کر دینا ضروری ہے، واضح رہے کہ اس قسم کے واقعہ میں جب اقرار یا گواہ سے زنا کا ثبوت ہو تو پنچائت زجراً ان سے قطع تعلقات کر سکتے ہیں تا کہ وہ لوگ خالص دل سے توبہ کریں اور دیگر لوگوں کو بھی اس سے عبرت حاصل ہو جاوے بہر حال زانی اور زانیہ پر توبہ واستغفار لازم ہے ورنہ بروز قیامت سخت مؤاخذہ ہوگا۔

فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب.

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی دار الافتاء	محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۱۲ر ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ	۱۲ر ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ

قرضدار کا قرض خواہ کو ہدیہ تحفہ دینا

(۱۸۰) سوال:- جناب مفتی صاحب! میں نے ایک آدمی سے ۵۰۰۰/ پانچ ہزار روپے قرض لیا، قرض ادا کرتے وقت بخوشی میں نے اُسے اور ۵۰۰/ پانچسو روپے زائد دئے، اب سوال یہ ہے کہ یہ ۵۰۰/ سو روپے سود میں شمار ہوں گے یا نہیں؟ قرآن اور حدیث کی روشنی میں جواب مطلوب ہے۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

قرض خواہ قرضدار سے ادائے قرض تک کوئی ہدیہ تحفہ قبول نہ کرے چنانچہ حدیث شریف میں ہے۔

عن انس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا أقرض احدكم قرضًا فأهدى إليه أو حمله على الدابة فلا يركب ولا يقبلها إلا أن يكون أجرى بينه قبل ذلك رواه ابن ماجة والبيهقي في شعب الايمان.

(مشکوٰۃ: ۱/۲۴۶، کتاب البیوع باب الربو)

مطلب یہ ہے کہ قرض خواہ اپنے قرض دار سے ادائے قرض سے قبل کوئی تحفہ وہدیہ کے طور پر کوئی بھی چیز قبول نہ کرے ایسا کرنا ناجائز ہے، ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں سود کا اشتباہ ہو سکتا ہے، کیونکہ قرض خواہ کو قرض کے ذریعہ جو منفعت حاصل ہوتی ہے وہ سود کے حکم میں ہے ہاں اگر قرض کے

لین دین سے پہلے ہی دونوں کے تعلقات کی نوعیت یہ ہو کہ ان کی آپس میں تحفہ تحائف لینے دینے کی عادت تھی، تو پھر اس صورت میں قرض لینے کے بعد بھی قرضدار کوئی ہدیہ قرض خواہ کے پاس بھیجے تو قرض خواہ اُسے قبول کر سکتا ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں قرضدار اگر کوئی چیز بطور تحفہ وہدیہ قرض خواہ کو دے گا تو اسکا وہ دینا قرض کے دباؤ کی وجہ سے نہیں ہوگا بلکہ اپنے سابقہ تعلقات اور پہلے سے جاری عادت کی بنیاد پر ہوگا ہاں قرض کیوجہ سے ہدیہ کی مقدار میں اضافہ ہوا تو اس کا لینا ناجائز ہوگا، البتہ ادائے قرض کے وقت بلا عرف وشرط اگر قرضدار نے پانچ سو روپے زیادہ دیئے ہیں تو یہ جائز ہے، یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے بلکہ یہ حسن ادا میں شمار ہوگا جو کہ مستحب اور سنت ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دار الافتاء
۱۳ ربیع الاوّل ۱۴۲۴ھ	۱۳ ربیع الاوّل ۱۴۲۴ھ

كتابُ الرَّهن

چند مسائل کے بارے میں سوالات کے جوابات

(۱۸۱) سوال:- میں نے اپنے والدین کی اطلاع کے بغیر خفیہ طور پر گھر سے کچھ دھان فروخت کر کے تین سو روپے جمع کئے اور ایک آدمی سے دو من دھان پر بیع سلم کی، تو مسلم الیہ نے مجھے دو من دھان کی قیمت آٹھ سو روپے دی اور میں نے آٹھ سو روپے سے کچھ زمین رہن رکھی، ایک سال میں زمین سے تقریباً دو ہزار روپے کا دھان ہوا ہے اب مندرجہ ذیل باتوں کا کیا جواب ہے؟

(۱) والدین کو اطلاع کئے بغیر میں نے جو معاملہ کیا وہ درست ہوا ہے یا نہیں؟ اگر نادرست ہوا، تو اس کی اصلاح کی صورت کیا ہے؟ اور میرا معاملہ چوری میں داخل ہوتا ہے یا نہیں؟

(۲) مسلم فیہ کے عوض میں اس کی قیمت لینا درست ہے یا نہیں؟

(۳) رہن والی زمین سے جو منافع حاصل ہوا وہ حلال ہے یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب (۱):- آپ نے والدین کو اطلاع کئے بغیر جو معاملہ کیا وہ نادرست کیا، یہ خیانت ہوئی، البتہ اس

میں چوری کے احکام جاری نہیں ہوں گے چونکہ اولاد اپنے والدین یا ذی رحم کے مال سے ضرورت کے وقت خفیہ طور پر جو کچھ لے لیتا ہے اس میں سرقہ کے احکام لاگو نہیں ہوتے، لیکن بلا ضرورت لیا ہے تو لینے والا گنہگار ہوگا۔

من سرق من أبويه أوولده اوذى رحم محرم منه لم يقطع فالاوّل وهو اولاد للبسوطة فى المال وفى الدخول فى الحرز والثانى للمغنى الثانى.

(هداية كتاب السرقة فصل فى الحرز والاخذ منه. (ج۲ ص ۵۴۳)

اب اصلاح کی صورت یہ ہے کہ والد صاحب کو اس بارے میں اطلاع دیوے پھر انکی مرضی کے مطابق فیصلہ کرے۔

جواب (۲):- بیع سلم میں مسلم فیہ کے عوض میں قیمت یا اور کچھ لینا دینا نادرست ہے البتہ مسلم فیہ اگر بازار میں موجود نہیں تو رب السلم کو صرف راس المال ملے گا، اس کے عوض میں اور کچھ لینا دینا سود ہے، یا پھر کسی صورت سے مسلم فیہ کو فراہم کرنا پڑے گا۔

كمافى "بدائع الصنائع"، واماا ستبدال بالمسلم فيه بجنس آخر . فلايجوز أيضًا لكن بناء على اصل آخر ذكرنا ه فيما تقدم وهوأن المسلم فيه بيع منقول وبيع المنقول قبل القبض لايجوز وإن أعطى أجوداً و أرداً فحكمه حكم رأس المال وقد ذكرناه. (بدائع الصنائع : ج۵ ص۲۰۳.)

فلہٰذا صورتِ مسئولہ میں مسلم فیہ اگر بالکل ناپید ہے تو آپ صرف رأس المال تین سو روپے رکھ سکتے ہیں اور باقی پانچ سو مسلم الیہ کو واپس دینا ضروری ہے ورنہ یہ رقم لینا سود ہوگا۔

جواب (۳):- دورِ حاضر کے مروّجہ رہن کا طریقہ درست نہیں ہے فلہٰذا صورت مسئولہ میں رہن والی زمین سے جو منافع ملے اس کا لینا اور اس میں تصرف کرنا ناجائز اور سود ہے جس سے لیا اس کو واپس کردے ورنہ واجب التصدق ہے۔

كمافى الهداية : ليس للمرتهن أن ينتفع بالرهن لاباستخدام ولاسكنٰى ولبس إلا أن ياذن له المالك لأن له من حق الحبس دون الانتفاع .الهداية

(كتاب الرهن ۵۰٦/٦)

نوٹ: بہر صورت آپ صرف والد صاحب کی اجازت سے تین سو روپے کے مالک ہونگے اور مابقیہ رقموں کو اپنے اپنے مالکوں کو واپس دینا ضروری ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفااللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۴۲/محرم الحرام ۱۴۲۳ھ	۴۲/محرم الحرام ۱۴۲۳ھ

مروّجہ رہن سے بچنے کا شرعی حیلہ

(۱۸۲) سوال:-: ہمارے علاقہ میں زمین رہن دینے کا عام رواج ہے اور رہن کی صورت یہ ہے کہ راہن کسی کے پاس اپنی زمین کو رہن رکھ کر مرتہن سے پیسے لیتے ہیں اور مرتہن اس زمین سے منافع حاصل کرتے رہتے ہیں پھر جب راہن مرتہن کو پورے پیسے واپس دیدیتے ہیں تو مرتہن راہن کو زمین واپس دے دیتے ہیں اور بعض لوگ اس کے جواز کیلئے یہ حیلہ بھی اختیار کرتے ہیں کہ مرتہن زمین کے منافع میں سے خود استعمال کرتے ہیں اور اخیر میں سالانہ دو تین سو روپے قرضہ سے کم وصول کرتے ہیں اب سوال یہ کہ اس قسم کے حیلہ سے مروّجہ رہن کا طریقہ درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

شئ مرہونہ مرتہن کے پاس قرض کے عوض میں بطور امانت رہتی ہے اور قرض خواہ کو قرضدار سے قرض کے عوض میں کچھ زائد لینا دینا حرام اور سود ہے اسلئے مرتہن کو شئ مرہونہ سے فائدہ حاصل کرنا ناجائز وحرام ہے۔

پس بصورت مسئولہ کے رہن کا طریقہ ناجائز ہے نیز جن حیلوں کا ذکر کیا گیا ہے عندالشرع وہ معتبر نہیں البتہ فقہائے کرام نے مروّجہ رہن کے گناہ سے بچنے کے لئے بعض حیلوں کو جائز لکھا ہے اور وہ یہ ہیں۔

(۱) بیع بالوفاء یعنی راہن اپنی زمین مرتہن کے پاس زبانی طور پر دو گواہوں کے سامنے اس شرط کے ساتھ فروخت کردے کہ جب میں زمین کی قیمت آپ کو واپس کردوں گا تو آپ مجھے زمین واپس دیدیں گے۔

قال فی شرح التنویر: وقیل بیع یفید الانتفاع به وقال فی إقالة شرط المجمع عن النهاية وعلیه الفتویٰ وقیل ان بلفظ البیع لم یکن رهنا ثم ان ذکر الفسخ فیه اوقبله زعماً غیرلازم کان بیعًا فاسدًا ولوبعده وعلی وجه المیعاد جاز الوفاء به.

(درمختار مع شامية)

(۲) مزارعۃً معاملہ کرنا بھی درست ہے یعنی مرتہن راہن سے کہے گا کہ آپ اپنی زمین مجھے کھیتی کرنے کے لئے دیدو، میں اس میں کھیتی کروں گا اور جو کچھ زمین میں پیدا ہوگا، اس کا ایک یا دو تہائی آپ کو دوں گا بقیہ میں لے لوں گا پھر یہ معاملہ جائز ہوگا۔

قال في البزازية على هامش الهندية . وإن أخذ المرتهن الأرض مزارعة بطل الرهن أن البذر من المرتهن وأن من الراهن لايبطل.

(نوع في حق المرتهن ۶/۷۴)

(۳) سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ زمین کرایہ پر دی جائے مثلاً زمین دس سال کیلئے دس ہزار روپے کے عوض میں دی جاوے جب دس سال پورے ہو جائیں گے تو مالک کو زمین ملے گی اور اگر مدت ختم ہونے سے قبل مالک زمین واپس لینا چاہے تو فی سال ایک ہزار کا کرایہ حساب کر کے مابقیہ سال کا کرایہ مرتہن کو واپس دیکر زمین واپس لے لیں۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۸ ربیع الاول ۱۴۲۵ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۸ ربیع الاول ۱۴۲۵ھ

بَابُ الْمُضَارَبَةِ

مضاربت کی تعریف اوراس کی شرائط

(۱۸۳)سوال :- جناب مفتی صاحب! میں نے ایک شخص سے ۴۰۰۰/ چار ہزارروپے تجارت کیلئے لئے اس شرط پر کہ میں صرف محنت کروں گا اور جو منافع حاصل ہوگا وہ ہمارے درمیان کسی معین حصہ مثلا نصف یا ثلث پر تقسیم ہوگا اب سوال یہ ہے کہ اس طرح لین دین کرنا جائز ہوگا یانہیں؟ اگر جائز ہے تو اس کے جواز کیلئے شرائط وغیرہ ہیں یانہیں؟ بالتفصیل جواب مطلوب ہے۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

شریعت کی اصطلاح میں اس قسم کے لین دین کو بیع مضاربہ کہتے ہیں یعنی ایک فریق کی طرف سے مال اور دوسرے کی طرف سے محنت، مضاربت میں مندرجہ ذیل شرائط لازم ہیں ورنہ مضاربت صحیح نہیں ہوگی۔

مضاربت کی شرائط

(۱) مال مضارب کو حوالہ کرنا شرط ہے اوراس کو مکمل تصرف کی اجازت بھی ہو البتہ رب المال نگرانی کرسکتا ہے اور مضارب کی اجازت سے کچھ کام بھی کرسکتا ہے۔
(۲) تمام باتوں کی صراحت ہونا ضروری ہے، کس چیز کی تجارت ہوگی اوراس کی نوعیت کیا ہوگی اور معاملہ آپس میں کیسا رہے گا یعنی نفع کی تقسیم کس طرح عمل میں آئے گی۔
(۳) مضارب کو مکمل اختیار دے دینا بھی جائز ہے کہ جس مال کی چاہو جس شہر میں چاہو تجارت کرو۔
(۴) اگر کسی عقد کے وقت کسی بات کی صراحت نہ ہو تو تاجروں کے عرف پر عمل کرنا ہوگا۔
(۵) نفع کی مقدار بوقت عقد طے ہوجائے۔
(۶) اگر کچھ نقصان ہوجائے وہ صرف مضارب پر نہ ہوگا بلکہ دونوں پر ہوگا۔
(۷) جب تک حساب نہ ہوجائے یا مضاربت کا معاملہ ختم نہ ہوجائے مضارب نفع کا مالک نہ ہوگا ہاں جملہ بطور خرچ ضرورت کے تحت منافع میں سے رب المال اور مضارب اپنے حصے کے مطابق رقم لے سکیں گے مثلاً نفع نصف طے ہوا تو خرچ میں ایک ہزار لے گا تو دوسرا بھی ہزار لے گا۔

(۸) مضارب جب مال مضاربت پر قبضہ کرے تو اسکے بارے میں وہ امین ہوگا اور تصرف میں وکیل ہوگا، نفع ہو تو اس میں شریک ہوگا اور نقصان ہوا تو اولاً منافع سے جائیگا منافع سے نقصان پورا نہیں ہوتا تو رأس المال سے جائیگا اور اگر مضاربت فاسد ہوجائے تو اجیر (مزدوری کا مستحق ہوگا) اگر شرط یا عرف کے خلاف کام کرے تو ضامن ہوگا۔

(۹) تجارت کے سلسلہ میں وہ سفر جس میں رات گھر نہ لوٹ سکے اس کا خرچہ تجارت میں سے جائے گا: یعنی کھانا پینا اور کرایہ وغیرہ تجارت سے نکالا جائے گا۔

(۱۰) مزدوروں اور ملازموں کا خرچہ بھی کار تجارت میں سے جائے گا، مگر جو کام مضارب اپنے ہاتھ سے انجام دیدے تو اس کی الگ اجرت نہ ہوگی۔

(۱۱) رب المال کو کسی مال کی خرید و فروخت کی اجازت نہ ہوگی نہ ہی کسی معاملہ کا اختیار ہوگا ہاں مضارب کے مشورہ سے کوئی کام کر سکے گا۔

(۱۲) مضاربت فاسدہ وہ مضاربت ہے جس میں ایسی شرائط ہوں جو اصول تجارت کے خلاف ہوں یا جن سے نزاع پیدا ہونے کا احتمال ہے۔

کما في "البحر": وشرطها أن يكون رأس المال من الأثمان وهو معلوم والثالث: أن يكون رأس المال مسلما إلى المضارب بخلاف الشركة الرابع أن يكون الربح بينهما شائعًا كالنصف والثلث لا سهما معينا يقطع الشركة كمأة درهم أو مع النصف عشر الخامس أن يكون نصيب كل منها معلومًا فكل شرط يؤدي إلى جهالة الربح فهي فاسدة السادس أن يكون المشروط للمضارب مشروطًا من الربح حتى لو شرطا له شيئا من رأس المال أو منه و من الربح فسدت وحكمها أنه أمين بعد دفع المال إليه وكيل عند العمل وشريك عند الربح وأجير عندالفساد فله أجر مثله (البحر الرائق: كتاب المضارب: ۷/۲۶۴)

فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۴ر صفر المظفر ۱۴۲۳ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۴ر صفر المظفر ۱۴۲۳ھ

کِتَابُ الأُضْحِيَّةِ وَالذَّبَائِحِ

اضحیہ منذور سے کھانا صاحب نذر کے لئے جائز ہے یا نہیں

(۱۸۴) سوال:- بخدمت جناب مفتی صاحب مدظلہ العالی،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج گرامی خیریت سے ہوں گے ایک مسئلہ درپیش ہے چونکہ اس بارے میں علماء کرام مختلف الرائے ہیں، اسلئے ہمیں تحقیق کی ضرورت ہوئی۔

مسئلہ یہ ہے کہ فقیہ العصر مفتی اعظم مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (صاحب احسن الفتاویٰ) نے احسن الفتاویٰ: ج ۷ ص ۵۲۵، میں ''اضحیۂ منذور سے جواز اکل کی تحقیق'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا ہے، اس میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

''مراجعۂ کتب سے ثابت ہوا کہ اضحیہ منذور سے ناذر کیلئے کھانا حلال ہے اور نذر ذبح میں حلال نہیں'' اور جواز کی تائید میں تین کتابوں کی عبارتیں نقل فرمائی ہیں اور عقلی دلائل بھی پیش کیے ہیں، اب سوال یہ کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بات کہاں تک درست ہے، اس کا تفصیلی اور مدلل جواب چاہئے ساتھ ساتھ اگر جواب عدم جواز کے بارے میں ہے تو حضرت مفتی صاحب کے پیش کردہ دلائل کے جوابات دینے کی بھی درخواست ہے۔

مستفتی
مفتی محمد عبدالحق قاسمی

الجواب ومنہ الصدق والصواب

حَامِدًا وَّمُصَلِّيًا وَّمُسَلِّماً أَمَّابَعْدُ!

جواب سے قبل نذر کی حقیقت اور اس کے بارے میں چند اصول اگر لکھدئے جائیں تو امید ہے کہ جواب سمجھنے میں آسانی پیدا ہوگی اور تمام تر شبہات دور ہو جائیں گے۔

(۱) اصول:- نذر کی حقیقت اور اس کے مقاصد۔

نذر کی تعریف: قال عبدالرحمن الجزیری: النذر هو أن يوجب المكلّف على

نفسه أمرًا لم يلزمه الشارع. (كتاب الفقه على مذاهب الأربعة: ج٢ ص ١٣٩)

*وقال وهبة الزحيلي : والنذر نوع من العهد من الناذر مع الله عزوجل والعقو والعهود. (الفقه الإسلامي وادلته: ج٣ص ٤٧٦)

یعنی شریعت نے جس امر کو لازم نہیں کیا ایسے امر کو اپنے نفس پر لازم اور ضروری کر لینا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ غیر واجب امر کو ادا کرنیکا وعدہ اور معاہدہ کرنا ہے۔

نذر کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ارشادات ملاحظہ فرمائیں:

(١) ياايها الذين آمنوا أوفوا بالعقود. (سورة المائدة: آيت ١)

ترجمہ: اے ایمان والو پورا کرو عہدوں کو۔ (تفسير عثمانی)

(٢) وليوفوا نذورهم. (سورة الحج: آيت ٢٩)

ترجمہ: اور پورا کریں اپنی منتیں۔ (تفسير عثمانی)

(٣) يوفون بالنذر ويخافون يومًا كان شره مستطيرًا (سورة الدهر: آيت ٧)

ترجمہ: پورا کرتے ہیں منت کو اور ڈرتے ہیں اس دن سے کہ اس کی برائی پھیل پڑے گی۔ (تفسير عثمانی)

(٤) وأوفوا بعهد الله إذا عاهدتم ولا تنقضوا الأيمان بعد توكيدها (النحل: آيت ١٠٩)

ترجمہ: اور پورا کرو عہد اللہ کا جب آپس میں عہد کرو اور نہ توڑو قسموں کو پکا کرنے کے بعد۔ (تفسير عثمانی)

(٥) وأوفوا بالعهد إن العهد كان مسؤلاً. (بنی اسرائیل : آیت ٣٤)

ترجمہ: اور پورا کرو عہد کو بیشک عہد کی پوچھ ہوگی۔ (تفسير عثمانی)

ان آیات کے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنے ایمان دار بندہ کو اپنی نذور کو پورے اہتمام کے ساتھ ادا کرنے کا حکم فرمایا ہے، اور ظاہر نص کے تحت یہ حکم قطعی اور وجوبی ہے، اس کی خلاف ورزی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہ کبیرہ ہے۔

ایفاء نذور کے بارے میں ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ملاحظہ فرمائیں

(١) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من نذر أن يطيع الله فليطعه ومن نذر أن يعصيه فلا يعصه.

رواه البخاری، مشکوة باب فی النذور ج٢ ص ٢٩٧)

ترجمہ: جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی نذر کی ہے اس پر لازم ہے کہ اپنی نذر کو پورا کرے

اور جس نے معصیت کی نذر کی، اس کے لئے حکم یہ کہ اس کو پورا نہ کرے (کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوگی اور ترک ایفاء کی وجہ سے کفارۂ قسم ادا کرے)۔

(۲) عن عمران بن حصين رضى الله عنه قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول النذر نذران فمن كان نذر فى طاعة ذلك لله فيه الوفاء ومن كان نذر فى معصية فذلك للشيطان ولا وفاء فيه ويكفر مايكفر اليمين رواه النسائى. (مشکوۃ: ج ۲ ص ۲۹۹)

ترجمہ: حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ نے ارشاد فرمایا کہ نذر دو قسم کی ہے پس جو شخص کسی نیکی کے بارے میں نذر کرے تو وہ اللہ کے لئے ہے، اس کو پورا کرنا ضروری اور لازم ہے اور جس نے کسی معصیت کی نذر کی وہ شیطان کے لئے ہے، اس کو پورا کرنا نہیں ہے اور اس ناجائز نذر کو توڑ کر کفارۂ یمین دینا واجب ہے۔

تذکرہ نصوص سے معلوم ہوا کہ قربت اور نیکی کی نذر عبادت ہے اسکا ایفاء واجب ہے (مثلاً نماز، روزہ، صدقہ، وغیرہ کی نذر) لیکن معصیت کی نذر میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے اس کا ایفاء جائز نہیں ہے، اس کے بدلہ میں کفارۂ یمین واجب ہوتا ہے اور یہ کفارہ ناجائز نذر کرنے اور اس کی عدم ایفاء کی وجہ سے ہے گو اس میں نفس کو سزا دینا بھی ہے۔

واضح رہے کہ نذر تین قسم کی ہوتی ہے (۱) صرف مالی نذر جیسے پیسے یا کسی جانور کو صدقہ کرنے کی نذ (۲) یا بدنی عبادت کی نذر جیسے نماز، روزہ، وغیرہ کی نذر اس میں صرف جانی مشقت ہوتی ہے (۳) جاد اور مالی دونوں سے مخلوط عبادت کی نذر جیسے حج کی نذر یہ سب نذریں جائز ہیں اور ان کا ایفاء بھی لازم ہے۔

(۳) حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لاتنذروا فإن النذر لايغنى شيئاً وإنما يستخرج به من البخيل متفق عليه. (مشکوۃ: ج ۲ ص ۲۹۷)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ تم اس اعتقاد سے نذر مت مانو کہ نذر کی بناء پر تمہاری تقدیر بدل جائے گی کیونکہ نذر تقدیری فیصلوں پر کچھ اثر نہیں ڈالے گی یعنی ردوبدل نہیں کرسکتی، (ہاں عبادت بدنی کی نذر سے تمہاری غفلت دور ہو جائے گی) اور عبادت مالی کی نذر سے تمہارا مال تمہارے ملک سے نکل کر فقراء کی ملک میں چلا جائیگا اس سے ان کو

فائدہ ہوگا تمہارا بخل دور ہو جائیگا۔

تو نذر کی حقیقت یہ کہ سخی آدمی تو سخاوت اور صدقہ وخیرات کر کے ثواب کماتے ہیں اور اس سے اپنی طرف آنے والے مصائب اور بلیات کو دور کرتے ہیں، لیکن بخیل آدمی صدقہ وخیرات تو کرتے نہیں یا کم کرتے ہیں جس وجہ سے ان پر طرح طرح کی بلیات ومصائب آتی رہتی ہیں پھر وہ نذریں مانتے ہیں اور مال خرچ کرتے ہیں، آفات وبلیات سے خلاصی کا قصد کرتے ہیں بعض دفعہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل ومہربانی سے آفات کو دور کر دیتے ہیں اور بعض دفعہ دور نہیں کرتے۔

غرض یہ کہ نذر سے تقدیری فیصلوں پر اثر نہیں پڑتا، ہاں مال دینا پڑتا ہے اور نذرِ طاعت عبادت ہے اس کا پورا کرنا واجب ہے ثواب کی نیت کی جاوے تو اجر ہے اور نذرِ مالی سے مقصد تقرب الی اللہ اور فقراء کو فائدہ پہنچانا ہے نیز اس سے صاحب نذر کا بخل دور ہوتا ہے۔

(۲) اصول:- عبادتِ مالی کی نذر کے مصارف کیا ہیں؟

نذر کا مصرف صدقہ واجب (جیسے زکوٰۃ صدقۂ فطرہ) کا مصرف ہے یعنی جہاں پر زکوٰۃ اور دیگر صدقات واجبہ خرچ کرنا جائز ہے وہاں پر نذر کا مال صرف کرنا بھی جائز ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنَ الخ"

✸ بیہقیٔ وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وأما الصدقات الواجبة كالفطرة والكفارات والنذور فحكمها حكم المفروضة. (تفسیر مظہری: ج۴ ص ۲۳۲)

یعنی صدقات سے مراد صدقہ واجبہ ہے جیسے صدقۂ فطرہ، کفارہ، نذور وغیرہ سب اشیاء لفظ صدقات کے ماتحت داخل ہیں۔

اب اس بارے میں فقہائے کرام کے اقوال ملاحظہ فرمائیں۔ چنانچہ: (۱) صاحب بدائع فرماتے ہیں:

كالزكاة والنذور والكفارات نحوها: (ج۲ ص ۶۹)

یعنی زکوٰۃ اور نذور اور کفارات کا مصرف ایک ہی ہے (فقراء ومساکین)

۲) صاحب عنایہ اکمل الدین محمد بن محمود بابرتی متوفی ۷۸۶ھ فرماتے ہیں:

من الصدقات الواجبة كصدقة الفطرة والصدقة المنذورة الكفارات.

(العناية على هامش فتح القدير: ج ۲ ص ۲۰۷)

۳) صاحب بحر علامہ ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۹۷۰ھ فرماتے ہیں:

لایجوز دفعها لهم کأحد الزوجین کالکفارات وصدقة الفطرة والنذور.

(البحر الرائق: ج۲ ص۲۴۳ وکذا فی تبیین الحقائق: ج ۲ ص ۱۲۲ وکذا فی حاشیة الشلبی علی هامش تبیین الحقائق: ج۲ ص ۱۲۲)

(۴) بحر کی دوسری جگہ میں ہے:

وفی البحر أیضا وفی القنیة نذر أن یتصدق بدینار علی الأغنیاء ینبغی أن لایصح قلت وینبغی أن یصح إذانوی أبناء السبیل لأنهم محل الزکوٰة ولوقال إن قدم غائبی لله علی أن أضیف هؤلاء الأقوام وهم الأغنیاء لایصح .

(ج۴ص۲۹۷ وکذا فی الشامیة ج۳ص۷۳۸)

ان تصریحات سے بات واضح ہوگئی کہ نذور کا حکم زکوٰۃ وکفارات کی طرح ہے اوراس کا مصرف بھی مصرفِ زکوٰۃ ہے اوراس کوفقراء کی تملیک میں دیناضروری ہے، ناذرخوداستعمال نہیں کرسکتے اگرچہ ناذر فقیرہوویساہی اغنیاء کوبھی نہیں دے سکتے۔

(۳)اصول:-کس قسم کی قربانی سے صاحب قربانی کے لئے کھانادرست ہے؟س اس کی تفصیل فقہائے کرام نےلکھی ہے: کہ پانچ قسم کی قربانی کا گوشت کھاناصاحب قربانی کے لئے درست ہے۔چنانچہ:

نمبرایک:- صاحبِ نصاب کے لئے اپنی قربانی کا گوشت کھاناجائزہے۔

نمبردوم وسوم:-حج تمتع اورقران کرنے والاتمتع اورقران کی وجہ سےشکراجوقربانی کرتے ہیں اس کا گوشت کھاناحاجی کے لئے جائزہے۔

نمبرچہارم:-نفل قربانی خواہ حج میں ہویااپنے گھرمیں،اس کا گوشت صاحب قربانی کے لئے کھانادرست ہے۔

نمبرپنجم:-مالدارآدمی نے اگرایامِ نحرمیں نذرمانی کہ وہ قربانی کریگااوراس کاقصدبھی یہی ہوکہ اپنے ذمہ واجب قربانی وہ دے گا، الگ قربانی کی نیت نہ ہو،تو ایسا مالداراپنی واجب قربانی کا گوشت خودکھا سکتاہے۔دلائل ملاحظہ فرمائیں:

(۱) شارح ہدایہ صاحبِ ''فتح القدیر'' فرماتے ہیں:

إن الدماء نوعان مایجوز له الأکل منه وهودم المتعة والقران والأضحیة وهدی التطوع إذابلغ محله. (ج۳ص۸۰،)

وکذا فی البنایة شرح الهدایة: ج۱۲ ص۱۵۱. وکذافی تبیین الحقائق: (ج۳ص۷۱)

(۲) شیخ الاسلام قاضی القضاۃ ابوالحسن علی بن الحسین بن محمد متوفی ۴۶۱ھ فرماتے ہیں:

والهدی ستة: یجوز الأکل من ثلاثة منها ولایجوز الأکل من الثلاثة الأخر أما

التی یجوز الأکل منها : الأضحیة وهدی القران وهدی المتعة.
(کتاب المناسک والهدی النتف فی الفتاوی: ص۱۴۵)

(۳) علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھا ہے: کہ بعض قربانی ایسی ہیں کہ ان کا گوشت کھانا صاحبِ قربانی کیلئے درست ہے، چنانچہ:

إن الدماء أنواع...... إلی قوله نوع یجوز لصاحبها أن یأکل بالإجماع. پھر لکھتے ہیں: کدم المتعة والقِران.

یعنی صاحبِ نصاب کی قربانی کا گوشت اور حج تمتع اور حج قران والے کی قربانی کا گوشت ان کیلئے حلال ہے، اسی طرح نفل قربانی کا گوشت بھی حلال ہے۔ چوتھی قربانی وہ نذر ہے جو صاحبِ نصاب نے ایام اضحیہ میں واجب قربانی ادا کرنے کی نذر کی ہو اور صاحبِ بدائع دوسری جگہ میں نذر کی قربانی کس صورت میں کھانا جائز اور کس صورت میں ناجائز اس کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ولو نذر أن یضحی بشاة هو ذلک فی أیام النحر وهو موسر فعلیه أن یضحی بشاتین عند نا شاة لأجل النذر وشاة بإیجاب الشرع ابتداء إلا إذا عنی به الإخبار عن الواجب بإیجاب الشرع ابتداء فلا تلزمه إلا التضحیة بشاة واحدة.

(۵/۶۳ وکذا فی تبیین الحقائق ج ۶ ص ۴۷۸ وکذا فی البحر الرائق ۸/۱۷۵ وکذا فی البنایة شرح الهدایة: ج۱۲ ص ۳۶ وکذا فی الشامی)

(۴) اصول:۔ کس قسم کی قربانی سے صاحبِ قربانی کے لئے کھانا جائز نہیں ہے، اس بارے میں فقہاء کرام نے لکھا: کہ تین قسم کی قربانی کا گوشت صاحب قربانی کے لئے کھانا جائز نہیں ہے، چنانچہ:

(۱) دم نذر کا گوشت یعنی غیر واجب قربانی جس کو نذر کر کے صاحب نذر نے اپنے نفس پر لازم کیا ہے۔

(۲) دم کفارات یعنی جنایات۔

(۳) دم احصار کا گوشت یعنی جو حاجی محصر ہو گیا کسی شرعی وجہ سے حج پر نہ جا سکا، وہ دم ذبح کر حلال ہو گیا ہے، اس دم کا گوشت حاجی محصر کیلئے کھانا ناجائز ہے، چنانچہ دلائل ملاحظہ فرمائیں:

(۱) محقق ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فتح القدیر میں فرماتے ہیں:

مالا یجوز (له الأکل منه) وهو دم النذر والکفارات والاحصار الخ. باب الهدی
(فتح القدیر: ج۳ ص ۸۰)

(۲) علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ بنایہ شرح ہدایہ میں فرماتے ہیں:

(قوله لايجوز الأكل من بقية الهدايا لأنها دماء كفارات) مثل دماء الكفارت والنذور وهدى الإحصار وهدى التطوع إذا لم يبلغ محله......

(البناية شرح الهداية: ج ۴ ص ۳۸۵ وكذا في موضع اخر: ج ۲ ص ۵۱)

(۳) شیخ الاسلام قاضی القضاۃ ابوالحسن علی بن الحسن النتف فی الفتاویٰ میں فرماتے ہیں:

التى لايجوز الأكل منها : هدى الجزاء وهدى الكفارة وهدى النذر. (النتف فى الفتاوىٰ :

(ص ۱۴۵ وكذا فى تبيين الحقائق . ج ۳ ص ۷۱ وكذا فى الدرالمختار مع الشامية : ج ۲ ص ۶۱۶)

غنی اور خود ناذر کے لئے نذر کی قربانی کا گوشت کھانا۔

ناجائز ہے اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔

چنانچہ کتب فقہ اربعہ کی عبارات ملاحظہ فرمائے:

فقہ مالکی: شرح صغیر میں ہیں :

إن صاحب الهدايا ياكل منها كلها إلا من أربعة جزاء الصيد ونسك الأذى و نذر المساكين أى (النذر المعين للمساكين وهدى التطوع للمساكين) وهدى التطوع إذا عطب قبل محله (منى أومكة) بأن عطب فنحره لأنه يتهم بأنه تسبب فى عطبه ليأكل منه وليس عليه بدله فإن أكل من هذه الأربعة فعليه بدل البهيمة إلا النذر المعين للمساكين يضمن فقط بقدر أكله منه .

(ج ۲ ص ۱۲۵ . ۱۲۸ وكذا فى القوانين الفقهية: ص ۱۴۰ وكذا فى الشرح الكبير: ج ۲/۸۹ بحواله الفقه الإسلامى وأدلته: كتاب الحج رابعاً الأكل من الهدى ج ۳ ص ۳۰۳)

فقہ شافعی: حاوی کبیر میں ہے:

وهو قول أبى إسحاق المروزى لايجوز أن يأكل منها لأنها خرجت بالنذر عن حكم التطوع إلى الواجب فلايجوز أن ياكل من الدماء الواجبة.

كتاب الضحايا فصل وأما الضحايا والهدايا المنذورة ففى جواز أكله منها وجهان (الحاوى الكبير: ج ۱۵ ص ۱۱۹)

فقہ حنبلی:- مغنی میں ہے:

لايأكل الإنسان من كل واجب كالواجب بنذر أوبتعيين الخ. ج ۳ ص ۵۳، ۵۴۱ – ۵۴۸ أيضاً ج ۱۱ ص ۱۱۹ وكذا فى غاية المنتصى: ج ۱ ص ۳۸۸

بحوالہ الفقہ الإسلامی وادلتہ: ج ۳ص ۳۰۵)

فقہ حنفی:- ہدایہ میں ہے: قال یأکل من لحم الأضحیة الخ کتاب الأضحیة

✷ اس کی شرح میں صاحب بنایہ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں:

(قال وقوله یأکل من لحم الأضحیة) قال القدوری : هذا فی غیر المنذورة امافی المنذورة فلایأکل الناذرسواء کان معسرًاأو موسرًاوبه قالت الثلاثة وعن أحمد فی روایة یجوز الأکل من المنذورة أیضاًوفی الزخیرة ولایجوزأن یأکل الغنی فی المنذور لأن سبیلهاالتصدق ولیس للمتصدق أن یأکل من صدقته حتی لو أکل یجب علیه قیمة ماأکل. (البنایة شرح الهدایة: ج ۱۲ ص ۵۱)

پس عبارات بالا سے معلوم ہوا کہ ائمہ اربعہ اس پر متفق ہیں کہ ناذر کیلئے اضحیہ منذورہ سے کھانا جائز نہیں، نہ ہی اس کے اصول وفروع کیلئے جائز ہے، نہ غنی کیلئے نذر کے جانور کا گوشت کھانا جائز ہے، خواہ صاحب نذر فقیر ہو یا غنی، بلکہ ائمہ اربعہ کا یہی مذہب اور فتویٰ ہے کہ: سَبِیْلُهَا التَّصَدُّقُ وَلَیْسَ لِلْمُتَصَدِّقِ أَنْ یَأْکُلَ مِنْ صَدَقَتِهِ حَتّٰی لَوْأَکَلَ یَجِبُ عَلَیْهِ قِیْمَةُ مَاأَکَلَ" یعنی نذر کی قربانی کے گوشت کا مصرف فقراء اور مساکین ہیں خود ناذر نہیں کھا سکتا ہے، اگر ناذر نے خود کھالیا یا کسی غنی کو دیا تو اسی مقدار نذر ساقط نہیں ہوگی اور اس کی قیمت فقراء میں صدقہ کرنی ہوگی۔

خلاصۂ بحث اور جوابِ استفتاءْ

قرآن وحدیث اور فقہی حوالہ جات سے یہ بات بصراحت معلوم ہوئی کہ شئی منذورہ کا کھانا اور اس کا استعمال کرنا صاحب نذر کے لئے جائز نہیں ہے چاہے ناذر فقیر ہو یا غنی، بلکہ شئی منذورہ ہر حال میں واجب التصدق علی الفقراء والمساکین ہے اسی بنا پر اضحیۂ منذورہ سے کھانا ناذر کے لئے جائز نہیں ہے۔

اب اس بارے میں فقہائے کرام کے مزید اقوال ملاحظہ فرمائیں:

(۱) صاحبِ کفایہ فرماتے ہیں:

(قوله ویأکل من لحم الأضحیة) وفی الذخیرة إذانذر ذبح شاة لایأکل منها الناذر ولوأکل فعلیه قیمة ماأکل . (الکفایة علی هامش الفتح : ج۸ص ۴۳۶)

(۲) صاحب عنایۃ علامہ اکمل الدین محمد بن محمود بابرتی متوفی ۷۸۶ھ فرماتے ہیں :

(قوله يأكل من لحم الأضحية الخ) الأضحية اماأن تكون منذورة أولافإن كان الثانى فالحكم ماذكره فى الكتاب وإن كان الأول فليس لصاحبها أن يأكل من لحمها ولايطعم الأغنياء لأن سبيلها التصدق وليس للمتصدق أن يأكل من صدقته ولوأكل فعليه قيمة ماأكل الخ (العناية على هامش فتح القدير: ج۸ص۴۳۶)

(۳) صاحب بحر علامہ زین الدین ابن نجیم متوفی ۹۷۰ھ فرماتے ہیں:

(وقوله يأكل من لحم الأضحية ويؤكل ويدخر) إذالم تكن واجبة وإنما وجبت بالنذر فليس لصاحبهاأن يأكل منها شيئاولايطعم الأغنياء سواء كان الناذر غنياأوفقيرًا لأن سبيلها التصدق وليس للمتصدق أن يأكل من صدقته ولاأن يطعم الاغنياء. (كتاب الأضحية البحر الرائق: ج ۸ص۱۷۸)

(۴) صاحب تبیین الحقائق علامہ ابوالبرکات حافظ الدین عبداللہ بن احمد النسفیؒ متوفی ۷۱۰ھ فرماتے ہیں:

وهذا فى الأضحية الواجبة والسنّة سواء إذالم تكن واجبة بالنذر فليس لصاحبها أن يأكل منها شيئًاولايطعم غيره من الأغنياء سواء كان الناذر غنيا أو فقيرا لأن سبيلها التصدق وليس للمتصدق أن يأكل من صدقته ولا يطعم الأغنياء. (كتاب الأضحية تبيين الحقائق : ج۶ ص۴۸۶)

(۵) ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں:

(و)ندب(تركه)التصدق (لذى) أى لصاحب(عيال توسعة عليهم)هذا كله فى الأضحية السنة و الواجبة فليس لصاحبها أن يأكل شيئا منها ولايطعم الأغنياء سواء كان الناذرغنيا أو فقيرًا لأن سبيلها التصدق وليس للمتصدق أن يأكل من صدقته ولايطعم منهاغنيًا. (كتاب الأضحية (شرح النقاية : ج۲ص۳۷۲)

(۶)صاحب کشف الحقائق علامہ عبدالحکیمؒ فرماتے ہیں:

(ويأكل من لحم الأضيحة) إذالم تكن منذورة وذكر أبوالمسعود أن شراء الفقير لها بمنزلة النذر فعليه التصدق بها أن أقول التعليل بأنها بمنزلة النذرمصرح به فى كلامهم ومفاده ماذكره فى تاتارخانية سئل القاضى بديع الدين عن الفقيرإذااشترى شاة لها يحل له الأكل؟ قال نعم وقال القاضى برهان الدين يحل أن أمين. (كتاب الأضحية كشف الحقائق: ج ۲ ص۲۲۷)

(۷) الدر المنتقیٰ فی شرح المنتقیٰ میں ہے:

ولو نذر أن یضحی ولم یسم شیًاء یقع علی الشاۃ ولا یأکل الناذر منها ولو أکل فعلیه قیمة ما أکل لان سبیلها التصدق ولیس للمتصدق أن یأکل الناذر منها.

(درمنتقی: ج۴ ص۱۷۰)

(۸) علامہ عبدالرحمٰن جزیریؒ فرماتے ہیں:

هذا إذا لم تکن منذورة وإلا فلا یحل الأکل منها مطلقًا یتصدق بها جمیعها.

(الفقه علی مذاهب الأربعة: ج۱ ص۷۲۳)

(۹) علامہ طاہر بن عبدالرشید بخاریؒ متوفی ۵۴۲ھ فرماتے ہیں:

ولو نذر أن یضحی ولم یسم شیئا یقع علی الشاۃ ولا یأکل الناذر منها لو أکل منها فعلیه قیمتها فی الاجناس والله أعلم. (خلاصة الفتاوی: ج۴ ص۳۲۰)

(۱۰) علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

(قوله یاکل من لحم الأضحیة) هذا فی الأضحیة الواجبة والسنة سواء إذا لم تکن واجبة بالنذر وإن وجبت به فلا یأکل منها شیئا ولا یطعم غنیًا سواء کان الناذر غنیًا أو فقیرا لأن سبیلها التصدق ولیس للمتصدق ذلک لو أکل فعلیه قیمة ما أکل: (درمختار مع شامیة: ج۶ ص۳۲۷)

پس فقہائے کرام کی ان تصریحات سے صاف معلوم ہوا کہ اضحیۂ منذور سے کھانا ناذر اور اغنیاء کیلئے جائز نہیں، اگر کھالیا تو اس قدر صدقہ کرنا واجب اور ضروری ہے، ورنہ نذر اس کے ذمہ میں رہ جائے گا، اور عدم ایفاء کی وجہ سے وہ گنہگار ہوگا۔

اب صاحب احسن الفتاوی کا جواب ملاحظہ فرمائیں:

فقیہ العصر مفتی اعظم مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اضحیۂ منذور سے جواز اکل کے بارے میں جو دلائل پیش کیے ہیں، ان میں پہلی تین کتابوں کی عبارتیں نقل کی ہیں اور باقی سب اپنے نظریات کی باتیں کی ہیں، لہٰذا ہم صرف تین کتابوں کی عبارات کا جواب دیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قوله: قال الإمام أبوبکر الجصاص" المتوفیٰ ۳۷۰ھ روی نافع عن ابن عمر رضی اللّٰه عنهما کان یفتی فی النسک والأضحیة ثلث لک ولأهلک ثلث فی جیرانک وثلث للمساکین وقال عبدالملک عن عطاء رحمة اللّٰه علیه مثله قال

وكل شيئ من البدن واجباً كان أوتطوعًا فهو بهذه المنزلة إلاماكان من جزاء صيد أوفدية من صيام أونسک أونذر مسمى للمساكين. (احکام القرآن : ج۳ص ۲۴۰)

اس میں اضحیہ سے علی الاطلاق جواز اکل کے بعد اضحیۂ منذور سے عدم جواز کیلئے ''مسمّی للمساکین،، کی قید ہے جس سے ثابت ہوا کہ اضحیۂ منذورہ میں اگر تصدق کی نیت کی ہو تو اسکا تصدق واجب ہوگا ورنہ نہیں۔

(۲) قال الامام قاضی خانؒ المتوفی ۵۹۴ھ فرماتے ہیں:

ولايبيع لحم الأضحية ليتصدق بل ياكله أويطعم أوولدت الأضحية يضحىٰ بالأم والولد إلاأنه لايأكل من الولد بل ليتصدق به فإن أكل منه يتصدق بقيمة ماأكل والمستحب أن يتصدق بولدها حياً ولوحلب اللبن من الأضحية قبل الذبح أوجز صوفها يتصدق بها ولاينتفع بها عن محمدرحمة الله عليه إذانذر ذبح شاة لايأكل منها النا ذرإن أكل كان عليه قيمته. (خانية بهامش الهندية : ج۳ص ۳۵۴)

اس میں پہلے علی الاطلاق جواز اکل تحریر فرمایا، پھر واجب التصدق کی صورتوں کی تفصیل بیان فرمائی اور آخر میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے نذر میں تصدق کا وجوب نقل فرمایا اگر اضحیۂ منذورہ ''لايبيع الأضحية ليتصدق بهابل يأكله أويطعم'' کے اطلاق میں داخل نہیں بلکہ اس کا تصدق واجب ہے تو اس کا حکم کیوں نہیں لکھا؟ جبکہ واجب التصدق کی صورتوں کی تفصیل اور بالخصوص نذر بالذبح کا حکم بیان فرمایا ہے امام جصاص اتنے بڑے امام سے ایسی فروگذاشت ہرگز قرین قیاس نہیں۔ انتہی قولہ:

يقول العبد الضعيف :- واضح رہے کہ ان دونوں عبارتوں کے اندر اضحیۂ منذورہ سے جواز اکل کے بارے میں کوئی صریح دلیل نہیں ہے، بلکہ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان عبارات کے مفہوم سے جواز اکل پر استدلال کیا ہے، اب اگر ''مفہوم جو شریعت میں حجت ہے'' اس کی تحقیق ذہن میں آجائے تو مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے استدلال کی حقیقت کھل جائیگی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مفہوم کی شرعی حیثیت

✹ علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

واعمل بمفهوم روايا ت اتى مالم يخالف لصر يح ثبتا .

ترجمہ: آپ ان روایتوں کے مفہوم پر عمل کریں جو وارد ہوئی ہیں جب تک وہ کسی صریح ثابت

شدہ بات کے خلاف نہ ہوں۔

* نیز اس کی شرح میں فرماتے ہیں :

(وقولی) "مالم یخالف لصریح ثبتا" ای أن المفهوم حجة علی ماقررناه إذالم یخالف صریحًا فإن الصریح مقدم علی المفهوم کماصرح به الطرسوسی وغیره وذکر الأصولیون فی ترجیح الأدلة فإن القائلین باعتبار المفهوم فی الأدلة الشرعیة إنما یعتبرونه إذ لم یات صریح بخلافه فیقدم الصریح ویلغی المفهوم واللّٰه تعالیٰ أعلم. (عقود رسم المفتی)

یعنی جب کوئی ؟ صریح عبارت مفہوم کے خلاف نہ ہوتو وہ مفہوم حجت بنے گا ورنہ صریح عبارت کو مقدم کیا جائے گا اور مفہوم کو لغو قرار دیا جائیگا۔

اب عبارتوں کا جواب ملاحظہ فرمائیں

نصوص قرآن اور احادیث نبوی ﷺ اس بارے میں واضح ہیں کہ ایفاء نذور واجب ہے کیونکہ نذور کے مقاصد یہ ہوتے ہیں کہ نفس کو مشقت ومحنت کا عادی بنانا اور غفلت اور سستی کو دور کرنا اور یہ دونوں امر ایفاء نذر اور شئ منذورہ کے تصدق کرنے سے حاصل ہوتے ہیں، نہ کہ اکل اضحیۂ منذورہ سے، نیز اضحیۂ منذورہ سے ناذر کیلئے کھانا جائز نہیں، اس پر فقہی تصریحات موجود ہیں (کما مرت الأن) لہٰذا ان تصریحات کے خلاف مفہوم معتبر نہیں ہوگا، اسی بنا پر مذکورہ بالا عبارتوں کے مفہوم سے جوازِ اکل اضحیۂ منذورہ پر استدلال کرنا صحیح اور درست نہ ہوگا۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی پیش کردہ تیسری عبارت کا جواب

قولہ (۳) قال الامام الکاسانی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۵۸۷ھ:

إن الدماء أنواع ثلاثة نوع یجوز لصاحبها أن یاکل منه بالإجماع ونوع لایجوز له أن یأکل منه بالإجماع ونوع اختلف فیه فالأول دم الأضحیة نفلا کان أو واجبًا منذورًا کان أو واجبا مبتدأ والثانی دم الإحصار وجزاء الصید ودم الکفارة الواجبة بسبب الجنایة علی الإحرام کحلق الرأس ولبس المخیط والجماع بعد الوقوف بعرفة وغیر ذلک من الجنایات ودم النذر بالذبح والثالث دم المتعة والقران فعند نا یوکل وعند الشافعی لایوکل. (ج ۵ ص ۸۰)

عبارت بالا نقل کرنے کے بعد حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ یہ ناقابل تاویل

نص ہے کہ اضحیۂ منذورہ سے جواز اکل اور نذر ذبح سے عدم جواز پر اجماع ہے، انتہی قولہ۔

یقول العبد الضعیف :"بدائع" میں جو بالا جماع اکل جواز کی بات کا ذکر ہے اس سے مراد وہ نذر جو کسی غنی نے ایامِ نحر کے اندر اندر مانی ہو اور اس کا قصد بھی اخبار ہو کہ جو اضحیہ اس پر غنا کیوجہ سے واجب ہے، وہ بذریعہ نذر مؤکد کرتا ہے نئی کوئی نذر نہیں کی ہے، لہٰذا اس اضحیہ کے گوشت کا کھانا اس کیلئے اور اس کے اصول وفروع اور دوسرے اغنیاء کے لئے کھانا جائز ہے۔ چنانچہ:

(۱) خود صاحب بدائع فرماتے ہیں:

ولو نذر أن يضحى بشاة وذلك فى أيام النحر وهو موسر فعليه أن يضحى بشاتين عندنا شاة لأجل النذر وشاة بإيجاب الشرع ابتداء إلاإذا أعنى به الإخبار عن الواجب بإيجاب الشرع ابتداء فلايلزمه إلاالتضحية بشاة واحدة.
(بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع: ج ۵ ص ۶۳)

(۲) صاحبِ بحر علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

قال الفقيه وبه نأخذ فى الأصل الناذر لايأكل ممانذر ولوأكل فعليه قيمة ماأكل وفى أضاحى الزعفرانى إن قال لله علىّ أن أضحى بشاة فى أيام النحر فإن كان موسرا فعليه أن يضحى بشاتين إلا أن يعين بالإيجاب مايجب عليه فإن كان فقيرًا فعليه شاة. (ج۸ ص ۱۷۵ وکذا فی تبیین الحقائق: ج ۶ ص ۴۷۸)

(۳) صاحب بنایہ شارح ہدایہ علامہ بدرالدین عینیؒ فرماتے ہیں:

من نذ رأن يضحى شاة بأن قال لله علىّ أن أضحى شاة فإن كان موسرًا فعليه يضحى بشاتين إلا أن يعين مايجب عليه . (البناية شرح الهداية : ج۲ ص ۳۲)

(۴) علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

أن الموسر إذا نذر فى أيام النحر وقصد الإخبار لم يكن ذلك منه نذرًا حقيقة وأن الشاة عليه بإيجاب الشرع.

اگر اضحیۂ منذورہ سے جواز اکل مطلقاً ان کی مراد ہوتی تو خود صاحبِ بدائع دوسری جگہ عدم جواز اکل کی صورت نقل نہیں کرتے، نہ دوسرے شراح ان کے خلاف کچھ تصریح فرماتے، پس ثابت ہوا کہ اگر نذر سے مراد "اخبار عن الواجب بسبب الشرع" والی قربانی ہے، تو اس نذر سے دو قربانیاں واجب نہ ہوں گی بلکہ صرف ایک قربانی دینی ہوگی اور اس کا گوشت ناذر کھا سکتا ہے، اس میں کچھ اشکال نہیں، لیکن اضحیۂ منذورہ بسبب آخر کو بھی اس میں شامل کرنا درست نہیں۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا چوتھا دعویٰ:

قولہ: تمام متون میں علی الاطلاق اضحیہ سے جواز اکل تحریر ہے جو اضحیۂ منذورہ کو بھی شامل ہے اگر اضحیۂ منذورہ کا حکم مختلف ہوتا تو اس کی تصریح لازم تھی، حالانکہ متون میں سے کسی میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا بلکہ ہدایہ، فتح القدیر جیسی جلیل القدر شروح میں بھی کوئی ذکر نہیں، شرح وقایہ، مجمع الانہر اور شرح التنویر میں بھی نہیں، انتہی قولہ۔

یقول العبد الضعیف :۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اضحیہ سے جواز اکل کا جو متن "یأکل من لحم الأضحیة" کو عام قرار دیکر اس میں اضحیۂ منذورہ کو بھی شامل کیا ہے، یہ بالکل درست نہیں ہے، یہ حضرت سے تسامح ہوگیا کیونکہ یہ متن عام نہیں بلکہ خاص ہے یعنی اس سے اضحیۂ منذورہ مستثنیٰ ہے۔ چنانچہ فقہائے کرام کے اقوال ملاحظہ فرمائیں:

(۱) وفی البنایة شرح الهدایة (یأکل من لحم الأضحیة) قال القدوری هذافی غیر المنذورة اما فی المنذورة فلا یأکل الناذر.

(۲) وفی "العنایة" (ویأکل من لحم الأضحیة) الأضحیة اماأن تکون من منذور ة أولا فإن الثانی فالحکم ماذکر فی الکتاب وإن کان الأول فلیس لصاحبها أن یأکل من لحمهاالخ.

(العنایة علی هامش الفتح: ج۸ص ۴۳۶ وکذافی الکفایة علی هامش الفتح: ج۸ص ۴۳۶ وکذا فی البحر : ج۸ص ۱۷۸ وکذا فی شرح النقایة: ج۲ص ۲۷۲ وکذا فی الشامیة : ج۶ص ۳۲۷)

(۴) کمافی "خلاصة الفتاوی" ولو نذر أن یضحی ولم یسم شیأیقع علی الشاة ولایأکل الناذر منهاولوأکل منها فعلیه قیمتها فی الأجناس واللّٰه أعلم . (ج۴ص ۳۲۰)

ان عبارتوں میں بصراحت موجود ہے کہ اضحیہ سے کھانا جو مستحب ہے وہ اس صورت میں ہے جبکہ اضحیۂ منذورہ نہ ہو، یا منذورہ ہو لیکن اس سے مراد واجب قربانی کی خبر دینی ہو، پھر حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کس طرح تحریر فرمایا: کہ "تمام متون میں علی الاطلاق اضحیہ سے جوازِ اکل تحریر ہے جو اضحیۂ منذورہ کو بھی شامل ہے اگر اضحیۂ منذورہ کا حکم مختلف ہوتا تو اس کی تصریح لازم تھی"

پس حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ نظریہ بھی درست نہیں ہے کیونکہ جو اضحیۂ منذورہ

بسبب آخر ہواور بغرضِ اخبار عن الواجب بسبب الغناء نہ ہو، تو اس بارے میں تمام فقہاء کی تصریحات موجود ہیں کہ اضحیہ اگر نذر کا ہے ایام اضحیہ سے قبل نذر کی ہے تو اس پر دو قربانیاں واجب ہیں ایک بسبب الشرع والغناء اور دوسری بسبب نذر ہے، بسبب غنا کی قربانی اور اس کا گوشت صاحبِ قربانی کھا سکتا ہے، مگر نذر کی قربانی کا گوشت وہ خود اور اغنیاء نہیں کھا سکتے ہیں۔ کما ذکرت أدلتھامن الکتب الفقھیة والفتاویٰ۔

باقی رہا حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کہنا کہ ”ہدایہ اور فتح القدیر جیسی جلیل القدر شروح میں بھی کوئی ذکر نہیں شرح وقایہ مجمع الانھر اور شرح التنویر میں بھی نہیں“ اس عبارت میں بھی حضرت مفتی صاحبؒ سے تسامح ہوگیا کیونکہ ھدایہ ،فتح القدیر اور دوسری کتب فقہ کی شروح میں ”باب الھدی“ کے بیان میں عدم جواز کی تصریح موجود ہے، چنانچہ:

(۱) قال فی ”الھدایة“: یجوز الأکل من ھدی التطوع، المتعة، والقران لایجوز الأکل من بقیة الھدایا.

(۲) وفی ”فتح القدیر“: إن الدماء نوعان مایجوز له الأکل منه وھو دم المتعة، القران والأضحیة وھدی التطوع إذابلغ محله ومالایجوز وھو النذر والکفارات والإحصار الخ

(ج۳ص ۸۰ وکذا فی البنایة شرح الھدایة: ج ۱۲ ص ۱۵ وکذافی تبیین الحقائق: ج۳ص ۷۱ وکذافی الدرالمختار مع رد (ردالمحتار: ج ۲ ص ۶۱۶)

ھذا ماظھرلی ولشیوخنا واللہ تعالیٰ أعلم وعلمه أتم وأحکم،

الجواب صحیح — کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ

محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ — معاون مفتی دارالافتاء

۱۹/ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ — ۱۹/ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ

گائے سے عقیقہ کرنے پر غیر مقلدین کا ایک اشکال اور اسکا جواب

(۱۸۵) سوال:- جناب مفتی صاحب! ہمارے سراج گنج اکثر لوگ اہل حدیث غیر مقلدین ہیں، کچھ دن سے قبل مولانا اقبال حسین سلفی (فاضل مدینہ یونیورسٹی سعودی عرب) نے ایک فتویٰ شائع کیا کہ گائے سے عقیقہ کرنا درست نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم

اجمعین سے اس کا ثبوت نہیں، نیز سلف صالحین کی کتابوں میں بھی اسکا ذکر نہیں، کتب حدیث اور معتبر کتب فقہ وفتاویٰ میں صرف بکری کا ذکر ہے، چنانچہ سنن اربعہ میں روایتیں موجود ہیں۔

(۱) أخبرنا أبوعبدالله محمّد بن يعقوب الشيباني ثنا إبراهيم بن عبدالله انبأنا يزيد بن هارون، انبأنا عبدالملك بن أبي سليمان، عن عطاء عن أم كرز وأبي كرز قالا : نذرت امرأة من آل عبدالرحمن بن أبي بكر إن ولدت امرأة عبدالرحمن نحرنا جزورًا فقالت عائشة رضي الله عنها : لابل السنة أفضل عن الغلام شاتان مكافئتان وعن الجارية شاة تقطع جدولاً ولا يكسر لها عظم فيأكل ويطعم ويتصدق ولكن ذلك يوم السابع فإن لم يكن ففي أربعة عشر فإن لم يكن ففي إحدى وعشرين هذاحديث صحيح الإسناد ولم يخرجاه (المستدرك على الصحيحن كتاب الذبائح . طريقة العقيقة و أيامها، ۷۵۹۵/۲۷)

حدیث بالا میں حضرت ام المؤمنین عائشۃ رضی اللہ عنہا نے گائے سے عقیقہ کرنے کو خلاف سنت کہا ہے۔

(۲) وذكر ابن حجر في الفتح . وبه ترجم أبو الشيخ الأصبهاني ونقله ابن المنذر عن حفصة بنت عبدالرحمن ابن أبي بكر وقال البندنجي من الشافعية لانص للشافعي في ذلك وعندي لايجزئي غيرها . (فتح الباري شرح البخاري، كتاب العقيقة، باب إماطة الأذى عن الصبي في العقيقة (ج۹ ص۵۹۳)

پس مذکورہ بالا دلائل سے روزِ روشن کی طرح معلوم ہوا کہ گائے سے عقیقہ کرنا بدعت ہے، نادرست ہے۔ فقط واللہ اعلم، کتبہ: شیخ اقبال حسین سلفی۔

اب ہمارے علاقہ میں یہ مسئلہ موضوع بحث بنا کہ گائے سے عقیقہ کرنا درست ہے یا نہیں؟ بعض مقلدین احباب نے مجھے کہا کہ آپ اس موضوع پر ایک فتویٰ لکھو، تو میں نے جواز پر "امداد المفتین" کے حوالہ سے ایک فتویٰ لکھا اور یہ فتویٰ جب کہ غیر مقلد عالم صاحب کو موصول ہوا تو وہ لوگوں سے مذاقاً کہنے لگا کہ دیکھو میں نے صحیح حدیث سے مسئلہ بیان کیا اور حدیث سے استدلال کیا اور یہ مولوی صاحب نے ایک چھوٹی موٹی کتاب کے حوالہ سے کیسا فتویٰ لکھا ہے، نہ اس میں حدیث کا ذکر ہے، نہ کسی معتبر فقہ اور فتاویٰ کی عبارتوں کا ذکر ہے، نیز کہتے ہیں کہ یاد رکھو! یہ لوگ اسطرح لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں دینی مسئلہ۔ مسائل کا جواب نہیں دیتے بلکہ اپنی ذاتی آراء اور قیاس کی روشنی میں

جواب دیتے ہیں، حالانکہ دینی مسئلہ میں اٹکل سے بات کرنا حرام وناجائز ہے وغیرہ وغیرہ۔

تو ہمارے بعض دوست واحباب بھی اس کی بات سے متاثر ہور ہے ہیں، مسجد کے متولی صاحب نے مجھے کہا کہ آپ نے جو فتویٰ لکھا ہے وہ تو بدنامی کا سبب بنانہ لکھتے تو بہت اچھا تھا، کیا قرآن وحدیث اور کتب فقہ وفتاویٰ میں اس کے جواز پر کوئی دلائل نہیں، اگر نہیں تو خاموش رہو، ورنہ دوبارہ ادلۂ اربعہ کی روشنی میں محقق ومدلل فتویٰ لکھو، تاکہ وہ لوگ خاموش ہو جائیں، اب آپ لوگوں سے گزارش یہ ہے کہ اس موضوع پر محقق ومدلل ایک فتویٰ تحریر فرماویں، نیز جمہور علماء امت کے اقوال بھی ذکر کریں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کا صحیح جواب دیا جاوے۔

مستفتی

(مولانا) اصغر حسین قاسمی غفرلہ۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ. اَمَّابَعْدُ!

جواب سے قبل ایک بات یاد رکھئے، جو احکام حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں مذکور نہیں لیکن اقوال صحابۂ کرام میں مذکور ہیں وہ بھی حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح واجب العمل ہیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

فإنه من يعش منكم بعدی فسيری اختلافًا كثيرًا فعليكم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدين المهديين تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ (عن العرباض ازمشكوٰة، باب الاعتصام بالكتاب والسنّة)

یعنی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال وافعال بھی شریعت میں حجت ہیں اور اس کا انکار ضلالت اور گمراہی ہے اور انکار کرنے والے لوگ راہ حق سے ہٹے ہوئے ہیں فلہٰذا ضروری ہے کہ اس بارے میں حدیث رسول اگر نہیں ملتی تو اقوال صحابۂ کرام کیا ہیں ان کو دیکھا جاوے تاکہ مسئلہ کا صحیح جواب نکل آوے۔

اونٹ، گائے اور بکری سے عقیقہ کرنے کے متعلق

ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم:

(۱) اس بارے میں ایک مرفوع حدیث ہے، چنانچہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

فیه حدیث عند الطبرانی وأبی الشیخ عن أنس رفعه: یعق عنه من الإبل والبقر والغنم و نص أحمد علی اشتراط کاملة وذکر الرافعی بحثًا أنها تتأدی بالسبع کما فی الأضحیة واللّٰهأعلم (فتح الباری شرح البخاری، کتاب العقیقة، باب إماطةالاذی عن الصبی فی العقیقة: ج ۹ ص ۵۹۰)

(۲) قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم . من ولد له فأحب أن ینسک عن ولده فلیفعل" رواه أبوداود والنسائی من طریق عمروبن شعب عن أبیه عن جده.

(۳) یہی حدیث موطا امام مالک اور مسند احمد بن حنبل نے بھی نقل کی ہے:

عن أم سلمة رضی اللّٰه عنها عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم فی العقیقة قال من ولد له فأحب أن ینسک عنه فلیفعل" رواه الطبرانی فی الاوسط وفیه اسماعیل بن مسلم المکلی هو ضعیف-

(کتاب الصید والذبائح باب العقیقة، مجمع الزوائد . ج۴ص ۹۰)

(۴) علامہ ظفر احمد عثمانیؒ اعلاء السنن میں فرماتے ہیں:

قلت هو مختلف فیه حسن الحدیث وفیه أنه صلی اللّٰه علیه وسلم سماه نسیکة ونسکًا وهو یعم الإبل والبقر والغنم اجماعًا . الخ

(کتاب الذبائح، باب فضیلة ذبح الشاة فی العقیقة ج۹ص۱۱۷)

طبرانی اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایتوں سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقیقہ کو نسک سے تعبیر فرمایا ہے اور نسک عام ہے اس میں اونٹ، گائے بکری سب شامل ہیں یہ اجماعی مسئلہ ہے۔

پس حدیث کی روشنی میں ثابت ہوگیا کہ بکری، اونٹ، گائے ان سب جانوروں سے عقیقہ کرنا درست ہے اور ثابت بالسنۃ ہے۔

حدیثِ رسول اللہ ﷺ کے بعد اس بارے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا تعامل ملاحظہ فرمائیں

(۱) عن قتادةأن أنس بن مالک کان یعق عن بنیه الجزور .رواه الطبرانی فی الکبیر ورجاله رجال الصحیح. (مجمع الزوائد، کتاب الصید والذبائح، باب العقیقة : ج۴ص ۹۴)

یعنی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اپنے بچوں کے عقیقہ میں اونٹ ذبح کرتے تھے۔

(۲) حدثنا أبوبكر قال حدثنا وكيع عن حديث بن السائب عن الحسن أن أنس بن مالك يعق عن ولده بالجزور. (المصنف ابن أبي شيبة، كتاب العقيقة: ج۵ ص ۵۳۴)

(۳) موطأ امام مالک کی شرح ''أوجز المسالک'' میں ہے:

الآثار فی ذلک من الصحابة رضی الله عنهم فإنهم ذبحوا ماتيسير لهم.

(کتاب العقیقة باب العمل فی العقیقة ۹ ص ۲۲۰)

مذکورہ بالا روایتوں سے معلوم ہوا کہ اونٹ اور گائے سے عقیقہ کرنے کا عام رواج ودستور صحابۂ کرام کے دور میں تھا اور انہیں جو میسر ہوتا اونٹ، گائے، بکری میں سے، اس سے وہ حضرات عقیقہ فرماتے تھے۔

ائمۂ اربعہ (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) کے اقوال ومسالک

(۱) فی ''المبسوط'' ثم المعز أحب إلی من الإبل والبقر.

(بحواله أوجز المسالک ج۹ ص ۲۱۸)

ترجمہ: مبسوط میں ہے: بکرے وغیرہ سے عقیقہ کرنا سنت ہے اور ان میں سے بکرا سب سے بہتر ہے جب کہ اونٹ اور گائے سے بھی عقیقہ کرنا جائز ہے

(۲) امام شافعیؒ کے مذہب پر مشہور کتاب مہذب کی شرح ''المجموع'' میں ہے:

مذهبنا جواز العقيقة بما تجوز به الأضحية من الإبل و البقر والغنم الخ.

(باب العقيقة: ج ۸ ص ۳۴۰)

ترجمہ: ہمارے مذہب میں عقیقہ ان سب جانوروں سے درست ہے جن سے قربانی درست ہے یعنی اونٹ، گائے، بکرے، دنبے وغیرہ سے۔

(۳) فقہ شافعی کی دوسری مشہور کتاب ''البیان'' میں ہے:

ولايجزئی إلا الجذعة من الضأن أو الثنية من الإبل والبقرة والمعز سليمة من العيوب لأنها إراقة بالشرع فاعتبر فيه ماذكرنا كالأضحية.

(کتاب الحج، باب العقیقة: ج۴ ص ۴۴۵)

(۴) فقہ مالکی کی مشہور کتاب ''ذخیرہ'' میں ہے:

قال مالک: وهی جنسها جنس الأضاحی: الغنم والبقر والإبل.

(الذخيرة فی فروع المالكية، كتاب العقيقة ج۳ ص ۴۴۷)

(۵) موفق حنبلیؒ فرماتے ہیں:

إن حكم العقيقة حكم الأضحية فی سنها وأنه يمنع فيهامن العيب بمايمنع فيها الخ.

(بحواله أوجز المسالک، كتاب العقيقة، باب العمل فی العقيقة. ج ۹ ص ۲۲۰)

(۶) امام دردیرؒ فرماتے ہیں:

ندب ذبح واحد فمن بهيمة الانعام تجزئى صحية. (بحواله اوجز المسالک: ۹/۲۱۸)

(۷) مسند احمد کی مشہور شرح ''فتح الربانی'' میں ہے:

اختلفوا أيضاً فيما تجوزبه العقيقة فذهب ائمة الثلاثة مالک والشافعي وأحمد والجمهور إلى تخصيصها ببهيمة الأنعام كالأضحية وهي الإبل والبقر والغنم وسواء في ذلک في الذكور والأناث ،الخ. (فتح الربانی: ج۱۳ ص۱۲۵)

مذکورہ بالا سب حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ گائے سے قربانی اور عقیقہ کرنا چاروں مذاہب میں معروف ومشہور ہے کسی امام نے اس میں اختلاف نہیں کیا۔

اجماع امت اور جمہور علماء کے اقوال پر مزید حوالے لیجئے

(۱) ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

والجمهور على إجزاء الإبل والبقر والغنم.

(فتح الباری شرح البخاری ،کتاب العقیقة ، باب إماطة الأذى إلخ: (ص۹ ص۵۹۳)

(۲) ابن رشد مالکیؒ فرماتے ہیں:

جمهور العلماء على أنه لايجوز فيها إلا مايجوزفي الضحايا من الأزواج الثمانية (من أوجزالمسالک : ج۹ ص ۲۷۱)

(۳) مسند احمد کی مشہور شرح ''فتح الربانی'' میں ہے:

والجمهور كالأضحية وهي الإبل والبقر والغنم.

(الفتح الربانی مع شرح بلوغ الأمانی : ج۱۳ ص۱۲۳۵)

مذکورہ بالا کتب فقہ اور شروح حدیث کی عبارتوں سے واضح ہوا کہ جمہور علماء امت کا اجماع واتفاق ہے کہ بکری کی طرح گائے اور اونٹ سے بھی عقیقہ کرنا درست ہے۔

پس گائے سے قربانی اور عقیقہ دونوں چیزوں کا انجام دینا درست ہے بدعت نہیں، البتہ گائے کے مقابلہ میں چھوٹے جانوروں سے جیسے بکری، دنبہ، مینڈھا سے عقیقہ کرنا افضل ہے، لمافعلہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

خلاصہ یہ کہ حدیث وآثار صحابۂ کرام اور چاروں مذاہب کی کتب فقہ وفتاویٰ کی روشنی میں ثابت ہوا کہ گائے، اونٹ سے جیسے قربانی درست ہے اسی طرح عقیقہ بھی درست ہے، فلہٰذا جناب مولوی اقبال صاحب کا فتویٰ غلط اور باطل ہے، کیونکہ نہ اُسے حدیث کا علم ہے، نہ فقہ وفتاویٰ کا اور اکثر غیر مقلد علماء

کا حال ایسا ہی ہوتا ہے، وہ لوگ قرآن وحدیث کے عنوان سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں، وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم صرف قرآن وحدیث کی تقلید کرتے ہیں، کسی امام اور مذہب کی تقلید نہیں کرتے، حالانکہ وہ نہ قرآن وفقہ سمجھتے ہیں نہ حدیث، بوجہ اٹکل سے کہتے ہیں اور حوالہ قرآن وحدیث کا دیتے ہیں، اس واسطے صورت مسئولہ میں جناب مولانا اصغر حسین صاحب کا فتویٰ جو ''امداد المفتین'' کے حوالہ سے دیا گیا ہے وہ درست ہے ادلہٴ اربعہ کے مطابق ہے ہم اس کی تائید کرتے ہیں۔

ملاحظہ:- ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے، وہ یہ کہ ہمارے اکابر کی بعض کتابیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ مجرد عن الدلائل ہوتی ہیں پھر بھی وہ کتابیں معتبر ہیں۔

چنانچہ یہ حضرات مسائل اور فتاویٰ لکھتے وقت دلائل کو سامنے رکھ کر لکھتے ہیں پھر مختلف مصالح کے تحت دلائل کو حذف کر دیتے ہیں اور اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ان مسئلوں پر دلائل نہیں ہوتے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کا جواب

واضح رہے کہ جن جانوروں سے عقیقہ کرنا درست ہے ان میں افضل یہ ہے کہ بکری سے عقیقہ کیا جاوے، کیونکہ خود حدیث کے الفاظ یہ ہے'' بَلِ السُّنَّةُ اَفْضَلُ عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ مُكَافِئَتَانِ الخ ''اس واسطے ہمارے فقہاء کرام بھی قربانی اور عقیقہ کے بارے میں بکرے سے کرنے کو افضل کہتے ہیں، چنانچہ:

قال في "الشامية" الشاة أفضل من سبع البقر إذا استويا في القيمة واللحم والكبش أفضل من النعجة إذا استويا فيها. (درمختار مع شامية: ج۶ ص ۳۲۲)

(۱) تو حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں جواز وعدم جواز کی بحث نہیں ہو رہی بلکہ افضلیت اور مفضولیت کی بحث ہو رہی ہے کہ بکری کا عقیقہ گائے سے افضل ہے یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے گائے کے عقیقہ کو بکری کے مقابلہ میں خلافِ افضل بتلایا ہے۔

(۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضراتِ حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کی جانب سے دو مینڈھے عقیقہ میں ذبح کئے تھے، اس لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عین اتباع کرتے ہوئے لڑکے کے لئے دو بکریاں اور لڑکی کیلئے ایک بکری کی ترغیب دی۔

(۳) یا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھتیجے کے عقیقہ میں بھی حضراتِ حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کے عقیقہ کی عین مطابقت کرنا چاہتی تھی اسلئے فرمایا کہ دو بکریوں سے عقیقہ ہونا چاہئے۔

(۴) اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شاید حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کا علم

نہیں تھا جس میں گائے، اونٹ سے بھی عقیقہ کرنے کا ذکر ہے، جبکہ جمہور امت نے اُسے قبول کیا ہے اور اسی بنیاد پر ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام سفیان ثوری وغیرہم نے اسکو قبول کیا اور جواز کا فتویٰ دیا ہے، لہٰذا یہی حق اور صواب ہے اس کے خلاف جاننا غلط اور گمراہی ہے۔

هذا ماظهر ليشوخنا والله تعالى اعلم بالصواب وعلمه احكم واتم.

الجواب صحیح — کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ

محمد عبدالسلام عفااللہ عنہ — معاون مفتی دارالافتاء

۲۹/ذیقعدہ ۱۴۲۷ھ — ۲۹/ذیقعدہ ۱۴۲۷ھ

نفلی قربانی میں چند آدمی ایک بکرا یا سات گائیوں میں شریک ہو کر قربانی کریں، درست نہیں

(۱۸۶) سوال:- کیا فرماتے علماءِ دین ومفتیانِ شرع متین مسئلۂ درجہ ذیل میں: کہ نفلی قربانی یا ایصال ثواب کی قربانی میں چند آدمی ایک بکرا یا سات گائیوں میں شریک ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی دوسرے کے نام پر قربانی کریں تو یہ قربانی درست اور صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہو تو اس کا ثبوت اور معتبر دلیلِ شرعی کیا ہے؟ اور اس تقدیر پر:

(۱) ''کفایت المفتی'' میں ہے: کہ بکرا اگر بنیت قربانی دو شخصوں کی طرف سے کیا جائے تو خواہ فرض قربانی ادا کرنا مقصد ہو یا نفلی، ناجائز ہے، اور وہ قربانی نہ ہوگی، (ج ۸ ص ۲۶۵)

(۲) ''فتاویٰ محمودیہ'' میں ہے: ایک بکری میں شرکت جائز نہیں۔ (ج ۴ ص ۲۹۲)

ان فتاویٰ کا جواب کیا ہوگا اور اگر صحیح نہ ہو، تو ''نظام الفتاویٰ'' ج ا ص ۱۲۵، ۱۲۸ اور فتاویٰ محمودیہ: ج ۱۴ ص ۳۳۷، والی عبارت فتویٰ مصرحہ بالجواز کا مطلب کیا ہوگا؟

الجواب ومن اللہ تعالیٰ التوفیق والسداد

جواب سے پہلے یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ قربات میں سے بعض ایسی ہیں جو تجزی کو بالکل قبول نہیں کرتیں جیسا کہ نماز، روزہ وغیرہ مثلاً دو یا چند آدمی ملکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایصال ثواب یا اور کسی کے لئے ایک ایک رکعت کر کے مجموعی طور پر دو رکعت نماز پڑھیں یا دو آدمی ملکر، آدھے آدھے دن ایک

روزہ رکھیں تو کسی کی نماز یا روزہ صحیح نہیں ہوگا چہ جائیکہ ثواب ملے۔

شریعت کی نظر میں اراقۂ دم بھی ایک قسم کی قربت ہے

یعنی قربانی کے ایام میں قربانی کرنا وہ بھی مخصوص جانوروں سے مخصوص طریقہ پر یہ قربت ہے اور یہ قربت ایسی ہے کہ ایک آدمی صرف ایک ہی جانور میں سے ایک ہی حصّہ کر سکتا ہے دو تین آدمی ملکر ایک چھوٹا جانور یا بڑے جانور میں سے ایک حصہ میں شرکۃً قربانی نہیں کر سکتے۔

قال فی " الهداية" (ويذبح عن كل واحد منهم شاة أويذبح بقرة أوبدنة من سبعة) والقياس أن لايجوز إلاعن واحد لأن الإرقة واحدة وهى القربة إلاإنا تركناه بالأثروهو ماروى عن جابر رضى الله عنه قال نحرنامع رسول الله صلّى اللّه وعليه وسلم البقرة عن سبعة والبدنة عن سبعة ولانص فى الشاة فبقىٰ على أصل القياس. وكذافى بدائع الصنائع: ج۵ ص ۷۰ وكذافى حاشية رد المحتار: (ج۶ ص ۳۲۶)

مذکورہ بالا عبارتوں سے صاف معلوم ہوا کہ اراقۂ دم یعنی قربانی کے ایام میں قربانی کرنا یہ بھی ایک قسم کی قربت ہے وہ بھی تجزی کو قبول نہیں کرتی اب ضرور یہ کہنا پڑے گا کہ دو یا چند آدمی ملکر ایک بکرا یا سات گائیوں میں شریک ہوکر قربانی کریں تو وہ قربانی درست نہیں ہوگی، چاہے قربانی نافلہ ہو یا واجبہ، خواہ اپنے لئے کریں یا دوسرے کو ثواب پہنچانے کے لئے کریں۔

ایک حصّہ قربانی میں صرف ایک ہی آدمی شریک ہوسکتا ہے

چنانچہ:

(۱) عن جابر رضى الله عنه أن النّبى صلّى الله عليه وسلم قال البقرة عن سبعة والجزورعن سبعة رواه المسلم. (مشكوة شريف: ج ۱ ص ۱۱۷)

(۲) فى "إعلاء السنن": أن البدنة عن سبعة بقرة أو بعيرًا والشاة عن واحد.
(إعلاء السنن: ج ۱۷ ص ۲۱۷)

(۳) وفى "الهندية" : يجب أن يعلم أن الشاة لاتجزئى إلاعن واحدوإن كانت عظيمة والبقرة والبعيرعن سبعة إذاكانوا يريدون به وجه الله تعالىٰ والتقدير بالسبع يمنع الزيادة ولايمنع النقصان كذافى الخلاصة.
(ج ۵ ص ۳۰۴، وكذا فى بدائع الصنائع : ج ۵ ص ۷۰)

احادیث اور کتب فقہ سے معلوم ہوا کہ بکرا، دنبہ، بھیڑ جیسے جانوروں میں ایک ہی آدمی کی طرف سے قربانی کیجا سکتی ہے اور گائے، بیل، بھینس، اونٹ میں سات آدمیوں کی طرف سے قربانی ہو سکتی ہے۔

اگر کسی کا حصّہ ساتویں حصہّ سے کم ہو تو شرعاً وہ قربانی صحیح نہیں ہوگی

(۱) فی " الشرح الصغیر " (السلامة من الشرک) أی الاشتراک فیها فإن اشترکوا فیها بالثمن أو کانت بینهم فیذبحوا أضحیة عنهم لم تجزعن واحدٍ کثیرًا ماوقع فی الاریاف أن یکون جماعة کأخوة شرکاء فی المال فیذبحوا أضحیة عن الجمیع فهذه لاتجزی عن واحد منهم إلاأن یفعلهاواحد منهم لنفسه ویغرم لهم ماعلیه من ثمنها ویذبحها عن نفسه: (الشرح الصغیر: ج۲ ص ۱۴۲)

(۲) فی "العنایة": (قوله و کذاإذاکان نصیب أحدهم أقل من السبع) حتی أن الرجل إذا مات وترک امرأة وابنًا وبقرة فضحیابها یوم العید لم یجز لأن المرأة أقل من السبع فلم یجز نصیبها ولم یجز نصیب الابن.

(العنایة علی هامش الفتح: ج۸ ص ۴۲۹)

"شرح صغیر" اور "عنایہ" کی عبارتوں سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوگئی کہ گائے، بھینس، اونٹ میں اگر سات آدمی شریک ہو کر قربانی کریں تو درست ہے لیکن شرط یہ ہے کسی کا حصّہ ساتویں حصّہ سے کم نہ ہو، ورنہ کسی کی قربانی صحیح نہیں ہوگی۔

اب ایک حصّہ میں چند آدمیوں کے شریک ہونے کی صورت میں کسی کا حصّہ اس میں تمام نہیں ہوتا اور فقہائے کرام کے اقوال سے یہ بات واضح ہے کہ ناقص حصّہ (یعنی ساتویں حصّہ سے کم) سے قربانی درست نہیں ہوتی۔

پس متذکرہ مسئلہ میں بھی کسی کا حصّہ کامل نہیں ہے، اس لئے وہ قربانی درست نہیں ہے جیسا کہ "کفایت المفتی"، اور "امداد المفتیین" میں مذکور ہے، ہاں صحت کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ سب ملکر اپنا اپنا حصّۂ ناقص کسی ایک کو ہبہ کر کے اس کا مالک بنادیں اور اس حصّۂ واحدہ کو جس کیلئے چاہے وہ قربانی کر کے ایصال ثواب کر سکتا ہے یہاں قربانی تو ایک شخص کی طرف سے ہوگی لیکن پیسے دینے والوں کو پیسوں میں شرکت کرنے اور ہبہ کرنے کی وجہ سے سب کو ثواب ملے گا۔

مجوزین حضرات دوطریقوں سے استدلال کرتے ہیں

(ا) حدیث ابی رافع اور جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں:

فی "نیل الأوطار" :عن عطاء بن یسار قال : سألت أباأیوب الأنصاری کیف کانت الضحایافیکم علي عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم قال کان الرجل فی عهد النبی صلی الله علیه وسلم یضحی بالشاة عنه وعن أهل بیته فیأکلون ویطعمون حتی تباهی الناس فصار کما تری رواه ابن ماجة والترمذی وصححه الخ وقال : والعمل علی هذا عند بعض أهل العلم قول أحمد وإسحاق واحتجا بحدیث أن النّبی صلّی الله علیه وسلّم ضحی بکبش فقال هذا عمن لم یضح من أمتی وقال بعض أهل العلم لاتجزی الشاة إلاعن نفس واحد وهو قول عبدالله بن المبارک وغیره من أهل العلم. (نیل الأوطار: ج ۵ ص ۱۹۵)

وجہ الاستدلال :- حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوجانوروں کی قربانی کی، ایک اپنی طرف سے اور دوسری امت کی طرف سے، اس روایت سے ثابت ہوا کہ ایک حصہ قربانی کرکے متعدد آدمیوں کو ثواب پہنچانا جائز ہے۔ چنانچہ: امداد الفتاویٰ :ج ۳ ص ۵۷۳، نظام الفتاویٰ: ج ۱ ص ۱۲۸ اورفتاویٰ محمودیہ: ج ۱۴ ص ۳۳۷، میں مذکور ہے۔

حدیثِ بالا کا جواب

(ا) حضرت رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے جو جانور اپنی تمام امت کی طرف سے قربان کیا تھا اس کے مالک خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے تھے، اس کی ملکیت میں اور کوئی شریک نہیں تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ثواب میں امت کو شریک فرمایا تھا، حالانکہ صورت متذکرہ میں ایک حصّہ میں کئی آدمی شریک ہورہے ہیں تو اس حدیث پر قیاس کرنا غلط ہے۔

چنانچہ ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں:

(ا) فی "التهذیب" لابن جریر الطبری ملخصه ظن أهل الغباوة أن ذالک أی قوله صلی الله علیه وسلم هذاعن محمد وعمن لم یضح من أمتی کان بإشراکه لهم فی ملک أضحیته فزعم أن الجماعة أن یشترکوافی الشاة

ویجزیهم عن التضحیة ولو کان کذالک لم یحتج من الأمة إلی التضحیة.

(من الجوهرة النقی: ۹/ ۲۱۹ ۱۳۲، اعلاء السنن: ج۱۷ ص۲۱۳)

توحدیث کا صحیح مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفس اضحیہ میں کسی کو شریک نہیں بنایا تھا بلکہ اجر وثواب میں تمام امت کو شامل کیا، اسی پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔

چنانچہ صاحب بدائع فرماتے ہیں:

(۱) فی "بدائع الصنائع": أنه علیه الصلوة والسّلام إنما فعل ذلک لأجل الثواب وهو أنه جعل ثواب تضحیته بشاة واحدة لأمته لاللاجزاء وسقوط التعبد عنهم.

(ج۵ص۷۰، وکذا فی الاقناع ج۲ص۶۶۰، وکذافی المغنی لابن قدامة ج۱۱ ص۹۷، وکذا فی الشرح الصغیر: ج۲ص۱۴۲، وکذافی مختصر خلیل: ج۳ص۳۴، وکذافی الانصاف: ج۴ص۷۵. وکذا فی إعلاء السنن: ج۱۷ ص۲۱۴)

مجوزین حضرات کا عبارتِ شامیہ سے استدلال کرنا

فی "درالمختار مع رد المختار": إن مات أحد السبعة المشترکین فی البدنة وقال الورثة اذبحوا عنه وعنکم صح عن الکل لقصد القربة ولو ذبحوها بلاإذن الورثة لم یجز.

یعنی جب ساتواں حصہ دار فوت ہوگیا تو اس کا حصہ ورثاء کی طرف منتقل ہوگیا اس حصہ کے وارثین مالک بن گئے اورانہوں نے اس ساتویں حصہ کے مالک ہونے کی حیثیت سے قربانی کی اجازت دی تو سب کی قربانی درست ہوجاتی ہے۔

ظاہری عبارت سے مفہوم ہوتا ہے کہ میت کے حصہ میں مالک بن کر اس کی طرف سے قربانی کرنے کی اجازت دے رہے ہیں تو گویا کہ اس صورت میں ایک حصہ کے اندر چند آدمی شریک ہوکر میت کی طرف سے قربانی کررہے ہیں۔

جواب:- حصہ دار بندہ فوت ہونے کے بعد اس کے حصہ کا اس کے ورثاء کی طرف منتقل ہونا اوران کا مالک بننا یہ بات بالکل درست اورعینِ صواب ہے، لیکن عبارتِ بالا کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے حصہ میں تمام ورثاء شریک ہوکر اس کی طرف سے قربانی کررہے ہیں، کیونکہ ورثاء کے قول سے میت کی ملکیت کو توثیق کرنا مراد ہے یعنی ورثاء یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم اس کے حقدار تو بن چکے ہیں

مگر مورِث نے جب قربانی کی نیت سے اس کو خریدا تھا تو اس میں اس کا حق بھی ہے لہٰذا اس کے حق میں ہم اپنی وراثت کے حق کو چھوڑ دیتے ہیں آپ لوگ اس کے حصّہ کی بھی قربانی کرلیں۔

تو عبارت بالا کا مطلب یہ ہوا کہ ورثاء صرف میت کی ملکیت اور تصرف کو اپنے حقِ وراثت پر ترجیح دے رہے ہیں، ایسا نہیں کہ انہوں نے اپنی طرف سے پیسے جمع کئے ہیں اور اس سے جانور خرید کر میت کے لئے قربانی کی ہے۔

چنانچہ صاحب مغنی فرماتے ہیں:

(۱) وفی "المغنی" قال: لاتباع أضحية الميت فی دينه ويأكلها ورثته يعنی إذاأوجب أضحية ثم مات لم يجز بيعها وإن كان علی الميت دين لاوفاء له و بهذا قال أبوثوروبشبه مذهب الشافعي وقال الأوزاعی إن ترك دينا ولاوفاء له إلامنها بيعت فيه وقال مالك أن نستأجر الورثة فيها باعوها ولنا أنه تعين ذبحها فلم يصح بيعها فی دينه كمالو كان حياً. إذا ثبت هذا فإن ورثته يقومون مقامه فی الأكل والصدقة والهدية لأنهم يقومون مقام مورثهم فی ماله وعليه.

(ج ۱۱ ص ۱۰۷)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ حصّۂ میت کے ساتھ ورثاء کا حق لاحق ہو چکا ہے لیکن بلا اجازت دیگر ورثاء تقسیم سے قبل اس کو فروخت یا کسی کو ہبہ وصدقہ کرنے کا حق نہیں رکھتے ہیں تو گویا کہ یہ کہا جائے گا کہ ابتک وہ ساتواں حصّہ میت کی ملکیت میں ایک گونہ باقی رہا جیسا کہ وصیت میں رہتا ہے یعنی اگر کوئی شخص وصیت کرکے انتقال کر گیا تو قربانی اسی کی ملک سے ادا ہوتی ہے کیونکہ ثلث مال میں انتقال کے بعد بھی اس کا ملک باقی رہتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ عبارتِ شامیہ سے ایک حصّہ میں چند آدمیوں کی مشترکہ قربانی کے جواز پر استدلال کرنا صحیح نہیں دوسری بات یہ ہے کہ یہ حضرات صرف نفل قربانی میں جواز کے قائل ہیں واجب قربانی کے اندر نہیں حالانکہ نفل قربانی بھی اضحیہ میں سے ہے، اس میں بھی اضحیہ کے تمام احکام جاری ہوتے ہیں مثلاً اگر کسی نے نفل قربانی میں ایک سال سے کم عمر کا بکرے کی قربانی کی تو اس کی قربانی درست نہیں ہوگی کیونکہ جانور میں عمر کی شرط مفقود ہے تو کم عمر کے جانور سے نہ واجب قربانی ہوتی ہے، نہ نفلی قربانی، اسی طرح سات آدمی شریک ہو کر ایک حصہ میں نہ واجب قربانی کرسکتے ہیں، نہ نفلی قربانی، نیز یہ مسئلہ بھی شامی وغیرہ میں خلافِ قیاس نقل کیا گیا ہے، استحساناً میت کے حق کی

رعایت کر کے جائز کہا گیا لیکن اس پر دوسروں کے لئے قربانی کے واسطے ایک جانور میں ایک آدمی کے شریک ہونے کو قیاس کرنا درست نہیں۔

کتب فقہ وفتاویٰ کی عبارتوں میں غور کرنے سے نظام الفتاویٰ اور فتاویٰ محمودیہ کے جوابات صحیح معلوم نہیں ہوتے ان میں تسامح ہوا ہے بلکہ کفایت المفتی اور امداد المفتین کے جوابات درست ہیں اور اصول فقہ کے مطابق معلوم ہوتے ہیں۔

هذا ما ظهر لي ولشيوخنا الأن والله تعالیٰ اعلم وعلمه أحكم وا تم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ	کفایت اللہ عفی عنہ	معاون مفتی دار الافتاء
۲۳/ ذیعقدہ ۱۴۲۳ھ	مفتی دار العلوم ہاٹہزاری چاٹگام	۲۳/ ذیعقدہ ۱۴۲۳ھ

منت کی قربانی میں عقیقہ کا حصہ لینا درست نہیں

(۱۸۷) سوال:- ایک صاحب نے منت مانی کہ فلاں کام ہوجائے تو ایک گائے کی قربانی کریگا، اب اس گائے میں عقیقہ کا حصہ لینا درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب ومنه الصدق والصواب

اگر اس کی مراد پوری ہوئی تو پوری گائے کی قربانی کرنے کی نیت سے جو جانور خریدا ہے وہ پوری گائے نذر کی رو سے قربانی کرنی واجب ہوگی اور اس میں عقیقہ یا اور کسی قسم کا حصہ لینا درست نہیں ہوگا، ناذر خود اس کا گوشت نہیں کھا سکتا اور غنی کو بھی نہیں کھلا سکتا ہے، بلکہ پوری گائے کا گوشت فقراء میں تقسیم کر دینا واجب ہے۔

قال في "شرح التنوير": (ثم إن) المعلق فيه تفصيل فإن (علقه بشرط يريده كأن قدم غائبي) أوشفى مريضي (يوفي) وجوبًا (إن وجد) الشرط (كتاب الأيمان، درمختار مع شامية: ج۳ص ۷۳۸.) قال أيضا (ولو تركت التضحية مضت أيامها تصدق بها حية ناذر) فاعل تصدق ولوفقيرا ولو ذبحها تصدق بلحها ولو نقصها تصدق بقيمة النقصان أيضاً ولا ياكل الناذر منها فان أكل تصدق قيمة ماأكل. (درمختار مع شامية: ج٦ ص ۳۲۰)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب،

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۱۲ر محرم ۱۴۲۵ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۱۲ر محرم ۱۴۲۵ھ

قربانی کے جانوروں کے بچے کے احکام

(۱۸۸) سوال:- قربانی کے جانور کے پیٹ میں بچہ ظاہر ہوا اب بچے کا کیا حکم ہے؟ یعنی اس کو بھی اس کی ماں کے ساتھ ذبح کرنا واجب ہے یا نہیں؟ اور اس سے گوشت کھانا درست ہے یا نہیں۔؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

غلطی سے اگر حاملہ جانور قربانی کے لئے خریدا اور ایام کے اندر قربانی سے قبل بچہ پیدا ہوا تو بعض فقہائے کرام نے کہا کہ اس کو بھی ذبح کر کے گوشت صدقہ کر دینا چاہئے اور بعض نے کہا کہ زندہ صدقہ دینا چاہئے، زندہ صدقہ کر دینا ہی بہتر ہے۔

✹قال فی "شرح التنویر": ولدت الأضحية ولدًا قبل الذبح يذبح معها وعند بعضهم يتصدق به بلاذبح .وفي الشامية (قوله يذبح الولد معها) إلاأنه يأكل منه بل يتصدق به فان أكل منه تصدق بقيمة ماأكل : والمستحب أن يتصدق به خانية : (درمختار مع شامية : ج٦ ص ٣٢٢)

✹ قال في "بدائع الصنائع": وقال بعضهم أنه بالخيار إن شاء ذبحه أيام النحر وأكل منه كالأم وإن شاء تصدق به (ج ۵ ص ۷۹)

یعنی اگر ذبح کے بعد بچہ زندہ نکلا ہے تو اس کو ذبح کر کے کھا سکتا ہے اور صدقہ بھی کر سکتا ہے اور اگر مردہ ملا تو اس کا کھانا درست نہیں کیونکہ وہ مردہ ہے اور مردہ بچہ کا کھانا اس طرح ناجائز و حرام ہے جس طرح مردہ جانور کا کھانا ناجائز و حرام ہے۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب .

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۱۲/ محرم الحرام ۱۴۲۵ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۱۲/ محرم الحرام ۱۴۲۵ھ

حرام مغز کے بارے میں امام طحطاویؒ سمیت دیگر فقہائے کرام کے اقوال اور ہماری رائے۔

(۱۸۹) سوال:- کیا فرماتے ہیں حضراتِ علماء کرام ومفتیانِ عظام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ حلال جانور میں نخاع الصلب یعنی جو حرام مغز سے مشہور ہے اس کا کیا حکم ہے؟ کیا وہ ان چیزوں میں داخل ہے جن کا کھانا ناجائز ہے، اگر داخل ہے تو وہ حرام ہے یا مکروہ؟ پاک ہے یا ناپاک؟ پھر اگر اس حرام مغز سمیت کوئی شخص گوشت پکالے تو اس گوشت کا کھانا درست ہے یا نہیں؟ کیا وہ سالن ناپاک ہو جائیگا یا نہیں۔ فتاوی محمودیہ: (ج ۱۶ص ۳۵۸) میں بحوالہ طحطاوی علی الدرر ج ۴ص ۳۶۰) اس کو ان ممنوعات میں شمار کیا ہے جن کا کھانا مکروہ تحریمی ہے جیسا کہ طحطاوی علی الدرر میں ہے'' وزید نخاع الصلب الخ'' اور بعد میں لکھا ہے کہ جس سالن کے ساتھ ناجائز عضو کو ملا کر پکایا ہے وہ سالن بھی ناپاک ہو جائے گا اور فتاوی محمودیہ (ج ۴ص ۳۱۷) میں بھی اس کے کھانے کو منع کیا ہے۔

'' تالیفاتِ رشیدیہ'' میں اس کو اشیاء ممنوعہ میں شمار کیا گیا ہے اگر چہ قطعی حرام نہیں کہا گیا ہے، فرمایا کہ سات چیزیں حلال جانور کی کھانا ممنوع ہیں ذکر، فرج، مادہ، مثانہ، غدود، حرام مغز جو پشت کے مہرہ میں ہوتا ہے، خصّہ، پتہ، مرارہ جو کلیجی کے پاس تلخ پانی کا ظرف ہے خون سائل قطعی حرام ہے (ص ۴۵۱)، فتاوی رحیمیہ (ج ۹ص ۳۲۱) میں ایسا ہی ہے، امداد المفتیین میں اسکی حرمت کے بارے میں تامّل ظاہر کیا ہے، لیکن اس کے حاشیہ میں حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورۃ الصدر تصریح مل جانے کی بنا پر حرمت کا رجحان ظاہر کیا ہے چنانچہ مفتی صاحب فرماتے ہیں'' چونکہ اب تصریح مل گئی (و زید نخاع الصلب) لہذا حرمت کا ذکر کرنا چاہئے'' : (ج ۲ص ۹۷۰) اور'' فتاوی عبد الحی'' میں لکھا ہے'' نصب الاحتساب'' اور'' مطالب المؤمنین'' میں لکھا ہے'' ظواہر کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ کراہت تنزیہی ہے: (ص ۵۴۶) اور کفایت المفتی میں ہے'' حرام مغز نہ حرام ہے نہ مکروہ یوں ہی بچارہ بدنام ہو گیا''۔
(ج ۸ص ۲۸۷)

اب حضرات مفتیان کرام کی خدمت میں سوال یہ ہے کہ صرف طحطاوی علی الدرر کی عبارت پر بنا کر کے حرام مغز کو حرام یا مکروہ کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اگر حرام مغز کے ساتھ گوشت پکایا جاوے تو سالن ناپاک ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب باسمہ تعالیٰ ومنہ الصدق والصواب

حَامِدًا وَّمُصَلِّيًا وَّمُسَلِّماً

نخاع الصلب کی حلت وحرمت پر بحث کرنے سے قبل اس بارے میں چند اصول لکھدئے جاتے ہیں تاکہ مسئلہ سمجھنے میں آسانی پیدا ہو۔

(۱) اصول:- حلت وحرمت کا حکم نصوص شرعیہ سے دیا جاتا ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قل أرأيتم ماأنزل الله لكم من رزق فجعلتم منه حرامًا وحلالًا قل آلله أذن لكم أم على الله تفترون (سورۂ یونس: آیت ۵۹)

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے کہ تم لوگ بتاؤ اور سوچو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے جو رزق نازل فرمایا تم اس میں بعض کو حرام اور بعض کو حلال ٹھراتے ہو ان سے پوچھئے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے اس کا تمہیں حکم یا اختیار دیا ہے یا تم اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہو (بیان القرآن)

✷ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن السمن والجبن والفراء فقال الحلال ماأحل الله فى كتابه والحرام ماحرم الله فى كتابه وما سكت عنه فهو مما عفا عنه رواه ابن ماجة والترمذى وقال هذا حديث غريب وموقوف على الأصح، (مشكوة: كتاب الأطعمة)

ترجمہ: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گھی پنیر اور گورخر کے بارے میں پوچھا گیا (کہ یہ چیزیں حلال ہیں یا حرام ہیں) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (حلت وحرمت کے سلسلے میں اصول مدنظر رکھو کہ) حلال وہی چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال قرار دیا ہے، یعنی جس کا حلال ہونا قرآن کریم میں بیان فرمایا ہے اور حرام وہی چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہے اور جس چیز سے سکوت فرمایا ہے (یعنی جس چیز کو نہ حلال فرمایا نہ حرام) وہ اس قسم سے ہے جس کو معاف رکھا ہے (یعنی اس کے استعمال کرنے کو مباح رکھا ہے)

حدیث شریف کا آخری جملہ ''وَمَاسَکَتَ عَنْهُ فَهُوَ مِمَّا عَفَا عَنْهُ'' اس بات کی دلیل ہے کہ تمام چیزیں اصل کے اعتبار سے مباح ہیں فلہٰذا جن چیزوں کو شریعت نے حرام قرار نہیں دیا ہے وہ مباح ہوں گی۔

پس نخاع الصلب کے بارے میں بھی ہمیں تحقیق کرنا پڑے گی کہ جن چیزوں کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے، ان کے تحت یہ داخل ہے یا نہیں؟ اگر داخل ہے تو حرام ہے یا مکروہ ہے۔

(۲) اصول:- جو اشیاء حلال ہیں وہ طیبات میں سے ہیں اور جو حرام ہیں وہ خبیثات میں سے ہیں اور درمیان میں بعض اشیاء مشتبہات میں سے ہیں جن کو بعض نے مکروہ اور بعض نے حرام کہا ہے اور ان سے بچنا بھی تقویٰ میں داخل ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

✵ مَاذَا أُحِلَّ لَكُمْ قُلْ أُحِلَّ لَهُمُ الطَّيِّبَات (سورة مائدة)

ترجمہ: یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے واسطے کیا چیزیں حلال ہیں آپ ان کو بتادیں کہ تمہارے واسطے پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیا ہے۔

✵ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ (سورة الاعراف ایت ۱۷۵)

ترجمہ: اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال بتلاتے ہیں اور گندی چیزوں کو (بدستور) ان پر حرام فرماتے ہیں (بیان قرآن)

تو ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے کسی مخصوص اشیاء کو حلال نہیں کہا اور حرام بھی نہیں فرمایا بلکہ عمومی طور پر ایک قاعدہ کلیہ بیان کردیا: کہ

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ .

یعنی پاکیزہ چیزیں حلال ہیں اور گندی چیزیں حرام ہیں۔

اب طیبات اور خبائث کی تفسیر ملاحظہ فرمائے۔

طیبات اور خبائث کی تفسیر

✵ امام ابوبکر جصاصؒ ''احکام القرآن'' میں طیبات کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

الطيبات اسم يقع على مايستلذ ويشتهي ويميل إليه القلب.

(احکام القرآن: ج ا ص ۴۵۲)

ترجمہ: طیبات کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو لذیذ ہو، ذوق سلیم اس کو چاہتا ہے اور طبیعت

اسکی طرف مائل ہو۔

✸ صاحب روح المعانی طیبات اور خبائث کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

(ویحل لهم الطيبات ويحرم عليهم الخبائث) فسّر الأوّل بالأشياء التی يستطيبها الطبع كالشحوم والثانی بالأشياء التی يستخبثها (الطبع) كالدم فتكون الأية دالةعلى أن الأصل فی كل مايستطيبه النفس وتستلذه الطبع الحل وفی كل مايستخبثه النفس ويكره الطبع الحرمة لدليل منفصل وفسر بعضهم الطيب بما طاب فی حكم الشرع والخبيث بما خبث فيه كالرباوالرشوة. تحت قوله تعالىٰ ويحل لهم الطيبات و يحرم عليهم الخبائث سورة الاعراف ۱۵۷

ترجمہ: طیبات سے مراد یہ کہ طبیعت سلیمہ جن چیزوں کو اچھا پائے گی وہی چیزیں طیب اور حلال ہوں گی اور جن اشیاء کو بُرا پائے گی وہی اشیاء خبیث اور حرام ہوں گی، تو یہ آیت کریمہ ایک اصول کی طرف نشاندہی کرتی ہے اور وہ یہ کہ جن چیزوں کو پاکیزہ نفس، (سلیم الطبع) طیب اور لذیذ سمجھے گا، وہی چیزیں حلال ہوں گی اور جن چیزوں کو پاکیزہ نفس، خبیث ومکروہ سمجھے گا وہی حرام ہوں گی۔

(۳) اصول:- اب رہی یہ تحقیق کہ شریعت نے حلال جانوروں کے جن اجزا واشیاء کو حرام قرار دیا ہے ان میں ”نخاع الصلب داخل“ ہے یا نہیں؟

شریعت نے حلال جانوروں کے جن اجزاء کو حرام قرار دیا ہے وہ یہ ہیں:

(۱) بہتا ہوا خون (۲) مادہ جانور کا فرج (۳) خصیتین (۴) غدود (۵) ذکر یعنی نر جانور کا آلہ تناسل اور مادہ کا فرج (۶) مثانہ یعنی پیشاب کی تھیلی (۷) پتہ۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

✸ حافظ نورالدین علی ابن ابی بکر الھیثمی المتوفی ۸۰۷ھ نے ”مجمع الزوائد“ میں ” باب ماجاء فی اللحم “ کے تحت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

قال كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يكره من الشاة سبعاً المرارة والمثانة والحياء والذكر والانثين والغدة والدم وكان أحب من الشاة الى رسول الله صلى الله عليه وسلم مقدمها. (كتاب الأطعمه: ج۵ ص۴۴)

✸ حافظ ابوبکر عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے بھی مصنف عبدالرزاق میں ”باب مایکره من

الشاۃ" کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے اور مذکورہ روایت کو نقل کیا ہے۔
(حدیث نمبر: ۱۸۷۷۱. ج ۴ ص ۵۳۵)

مذکورہ روایتوں سے ثابت ہوا کہ حلال جانوروں کے جن اجزاء کا کھانا مکروہ ہے، وہ یہ ہیں: بہتا ہوا خون، مادہ کا فرج، خصیتین، غدود، ذکر، مثانہ، پتہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ان سات چیزوں کو مکروہ کہا ہے اور مکروہات کی فہارس میں "نخاع الصلب" کو شمار نہیں فرمایا، پس حدیث کی روشنی میں ثابت ہو گیا کہ "نخاع الصلب" مکروہ تحریمی نہیں ہے، اب کتب فقہ اور فتاویٰ کی عبارتیں ملاحظہ فرمائیں۔

فقہ وفتاویٰ کی روشنی میں حلال جانوروں کے حرام اجزاء

(۱) ملک العلماء علامہ کاسانیؒ اپنی مایہ ناز کتاب "بدائع الصنائع" میں لکھتے ہیں۔

وأما بيان مايحرم أكله من أجزاء الحيوان المأكول فالذى يحرم أكله منه سبعة الدم المسفوح والذكر والأنثين والقبل والغدة والمثانة والمرارة لقوله عزّشانه ويحل لهم الطيبات ويحرم عليهم الخبائث وهذه الأشياء السبعة مما تستخبثه الطباع السليمة فكانت محرمة وروى عن مجاهد رضى الله عنه أنه قال كره رسول اللّه صلّى الله عليه وسلم من الشاة الذكر والأنثين والقبل والغدة والمرارة والمثانة والدم فالمراد منه كراهة التحريم بدليل أنه جمع بين الأشياء الستة وبين الدم فى الكراهة والدم المسفوح محرم والمروى عن أبى حنيفة رحمة اللّه عليه قال تعالىٰ أنه قال الدم حرام وأكره الستة أطلق اسم الحرام على الدم المسفوح وسمى ماسواه مكروهًا لأن الحرام المطلق ماتثبت حرمته بدليل مقطوع به وحرمة الدم المسفوح قد تثبت بدليل مقطوع به وهو النص المفسر من الكتاب العزيز قال اللّه تعالىٰ عن شانه "قل لاأجد فيما أوحى إلىّ محرمًا " إلى قوله عن شانه أو دمًا مسفوحاً أولحم لحنزير. وانعقاد الإجماع أيضا على حرمته فأما حرمة ماسواه من الأشياء الستة فما تثبت بدليل مقطوع بل الإجتهاد أو بظاهر الكتاب العزيز المحتمل للتأويل أوالحديث لذلك فصل بينهما فى الإسم فسمىّ ذلک حرامًا وذامكروهًا

واللہ عزاسمہ أعلم. (فی اخر کتاب الذبائح والصیود: ج ۵ ص ۶۱)

یعنی علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ نے صرف مذکورہ سات چیزوں کو حرام کہا اور حرمت پر آیت قرآنی "یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبَائِثَ" اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ سات چیزیں ایسی ہیں کہ ان کو طبیعت سلیمہ بُرا سمجھتی ہے، پھر ایک اشکال کا جواب دیا کہ کراہت سے کراہت تحریمی مراد ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث شریف میں اشیاء ستہ اور دم مسفوح کو ایک ساتھ مکروہ کے تحت ذکر فرمایا، حالانکہ دم مسفوح نص قطعی سے حرام ہے تو دوسری اشیاء کو اس کے ساتھ ذکر کرنا دلیل ہے اس بات کی کہ یہ اشیاء بھی حرام کے قریب ہیں پس کراہت سے کراہت تحریمی مراد ہے جو کہ حرام قطعی کے قریب ہے اور عملاً حرام ہوگی، تو ان سب کو ایک ساتھ ذکر کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

(۲) شیخ الاسلام قاضی القضاۃ ابوالحسن علی بن الحسین بن محمد السغدی المتوفی ۴۶۱ھ فرماتے ہیں:

ویکرہ من الشاۃ المذبوحۃ سبعۃ اشیاء . ۱-الذکر. ۲- والحیاء ۳- والغدۃ. ۴- والمرارۃ. ۵- والمثانۃ . ۶- والانثیین. ۷-والدم الذی یخرج من اللحم أو الکبد أو الطحال واما الدم المسفوح فإنہ حرام وھو من المحرمات الأصلیۃ. (النتف فی الفتاویٰ: کتاب الذبائح والصید. ص ۱۵۱)

(۳) ابوحنیفۂ ثانی علامہ ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

کرہ من الشاۃ الحیاء والخصیۃ والغدۃ والمثانۃ والمرارۃ والدم المسفوح والذکر لماروی الأوزاعی عن واصل بن مجاھد قال کرہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم من الشاۃ الذکر والأنثیین والقبل والغدۃ والمرارۃ والمثانۃ قال أبوحنیفۃ الدم حرام کرہ الستۃ ذلک لقولہ تعالیٰ:" حرمت علیکم المیتۃ" وکرہ ماسواہ لأنہ مما تستخبثہ النفس وتکرھہ وھذا المعنی لسبب الکراھۃ لقولہ تعالیٰ:" ویحرم علیکم الخبائث" الخ

(البحر الرائق: ج ۸ ص ۴۸۵ وکذافی الدر المختار مع الشامیۃ: ج ۷ ص ۷۴۹ وکذافی الفتاویٰ الحامدیۃ: ج ۲ ص ۲۳۲)

مذکورہ عبارتوں سے معلوم ہوا کہ جمہور فقہاء اور اہل فتویٰ نے حلال جانوروں کے صرف سات اجزاء کو حرام یا مکروہ تحریمی کہا ان کے علاوہ اور کسی چیز کو حرام یا مکروہ تحریمی نہیں کہا، نیز انہوں نے "نخاع الصلب" کو ان مکروہات کی فہارس میں شمار نہیں کیا اور حرام یا مکروہ نہیں کہا نہیں لکھا۔

خلاصۂ بحث اور جوابِ استفتاء

جب اصول متذکرہ ذہن میں آگئے تو اب سوال کے جواب سمجھنے میں بحمد اللہ تعالیٰ بڑی آسانی پیدا ہوگی کہ حلال وحرام کا ثبوت ادلۂ اربعہ سے قائم ہوتا ہے، کسی کے ذاتی اجتہاد سے نہیں ہوتا، شریعت نے جن چیزوں کو حلال کہا ہے وہی حلال ہیں انکے علاوہ حلال نہیں ہیں اور جن کو حرام کہا ہے وہی حرام ہیں، ان کے علاوہ حرام نہیں ہیں اور جن چیزوں سے سکوت اختیار کیا (یعنی جن کے بارے میں حلال یا حرام کچھ نہیں بتایا وہ مباح ہیں یعنی مباح ہونا چاہیے اور قرآن وحدیث اور فقہ وفتاویٰ میں حلال جانوروں کے جن اجزاء کو حرام کہا گیا ان میں ''نخاع الصلب'' شامل نہیں ہے۔ جمہور فقہائے کرام نے اس کو مکروہ نہیں کہا اور مکروہات کی فہارس میں شمار نہیں کیا۔

فلہٰذا ''نخاع الصلب'' نہ حرام ہے نہ مکروہ، سالن وغیرہ کے ساتھ اگر اس کو ملا کر پکایا جاوے تو سالن ناپاک نہیں ہوگا کسی کو طبعی کراہت ہو تو اور بات ہے۔

پس ہمارے نزدیک مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ درست ہے اور قابل ترجیح ہے، البتہ بعض اکابر نے طحطاوی علی الدرر کی عبارت ''زید نخاع الصلب'' پر بنا کر کے نخاع الصلب کو مکروہ کہا ہے اس اعتبار سے مکروہ تنزیہی کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔ هذا ماظهر لي ولشيوخنا

فقط واللّٰہ تعالی أعلم بالصواب

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دار الافتاء
۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ	۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ

كِتَابُ التَّدَاوِیْ

علاج وتداوی کے بارے میں چند مسائل کی تحقیق

(۱۲۰) سوال: - ایک عورت کے مستور حصہ میں ٹیومر پیدا ہونے کی علامت ظاہر ہوئی جو کہ ایکسرے سے معلوم ہوا اب ڈاکٹروں نے کہا اس عورت کا آپریشن کرنا ضروری ہے ورنہ عورت کے فوت ہو جانے کا خوف ہے، عورت مدرسۂ بنات سے فارغ شدہ اور پردہ نشین اور دیندار ہے، وہ ڈاکٹروں کے پاس جا کر آپریشن کرانے میں راضی نہیں ہے وہ کہتی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرتی ہوں آپ لوگ چاہیں تو آپریشن کے سوا دوسری دوا استعمال کرتی ہوں اللہ میاں چاہے گا تو اس میں شفاء عطا فرمائے گا ورنہ اس کا جو فیصلہ ہوگا اس پر میں راضی ہوں اگر اللہ کی ذات پر بھروسہ کر کے صبر کرتی ہوں تو توکل علی اللہ کے سبب بلا حساب جنت میں داخل ہو جانے کا وعدہ ہے چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم يدخل الجنّة من أمتي سبعون ألفا بغير حساب هم الذين لا يسترقون ولا يتطيرون وعلى ربهم يتوكلون متفق عليه)

نیز عورت کا کہنا ہے کہ آپریشن کا رواج عہد رسالت میں نہیں تھا، دوسری بات اس میں ستر کھولنا ہے، جو ممنوع اور ناجائز ہے ڈاکٹر لوگ شریعت کے پابند نہیں ہوتے جس قدر کھولنے کی ضرورت ہوتی ہے اس سے زیادہ کھولتے ہیں اور بہت سے غیر محرم اور غیر ضروری لوگ دیکھتے ہیں پھر ضرورت سے زائد مدت بیہوش رہنا ہوتا ہے جب جسم کو کاٹتے ہیں زیادہ کاٹتے ہیں اور مکشوف حصے کو جو چاہے ہاتھ لگاتا ہیں، تیسری بات یہ کہ دورِ حاضر میں اکثر دوا حرام چیزوں سے بنائی جاتی ہیں اور حرام دوا کا استعمال بھی ناجائز ہے جیسا کہ حدیث میں ہے "لاتداووا بحرام": (مشکوٰۃ)

خلاصہ یہ کہ عورت آپریشن کرانے میں راضی نہیں ہے حتی کہ اصرار کی صورت میں شوہر سے چھٹی (طلاق) مانگتی ہے، لیکن اس کا شوہر (بھی عالم ہے) اور اولاد بھی اسکو علاج اور آپریشن کرانے میں مصر ہیں، شوہر کہتے ہیں کہ علاج کرنا سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور صحابۂ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے علاج کیا ہے، تم اگر بدون علاج مرجاؤ گی تو تارکِ سنت کی گنہگار ہوگی اور اپنے آپ کو ہلاکت میں

ڈالنے کے مترادف ہوگی، جو کہ ناجائز اور حرام ہے، باری تعالیٰ کا ارشاد ہے''**ولا تلقوا بایدیکم إلی التهلکة**''۔ اگر آپریشن نہیں کروگی تو نان نفقہ بھی نہیں ملے گا۔

اب ہمیں ان شکوک وشبہات کے جوابات کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہیں:

(۱) علاج اور تداوی کا شرعی حکم کیا ہے؟

(۲) بدون علاج اور تداوی کے صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا، ازروئے شرع کیسا ہے؟ کیا ایسا کرنا ہر ایک کیلئے جائز ہے؟

(۳) اللہ نہ کرے عورت اگر اسی حالت میں مرجاوے تو وہ گنہگار ہوگی یا نہیں؟ اور ''**ولا تلقوا بایدیکم الی التهلکة**'' کے تحت داخل ہوگی یا نہیں؟

(۴) توکّل اور دوا کی حدیث کے مابین تعارض معلوم ہوتا ہے کہ توکّل کی حدیث میں علاج نہ کرنے کی فضیلت کا بیان ہے اور دوا کی حدیث میں تداوی کا امر ہے، اب دونوں حدیث شریف کا تطابق اور صحیح مطلب ومراد کیا ہے؟

الجواب ومنه الصدق والصواب

جواب(۱): - علاج کرنا اور دوا پینا سنت سے ثابت ہے لہٰذا شفاء کی امید ہے تو دوا پینا اور علاج کرنا چاہئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم علاج کرتے تھے اور بیماری کو دور کرنے کے لیے ذرائع اختیار فرماتے تھے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

(۱) **عن أسامة بن شريك قال قالوا يارسول الله اَفَنَتَدَاوىٰ قال نعم ياعباد الله تَدَاوَوْا إن الله لم يضع داءً إلا وضع له شفاء غير داء واحد الهرم رواه أحمد و الترمذی وأبو داؤد.** (مشکوٰۃ ۲/۳۸۸)

ترجمہ: حضرت اسامہ بن شریک کہتے ہیں کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا ہم بیماری میں دوا وعلاج کریں؟ آپ نے فرمایا ہاں اے اللہ کے بندو دوا و علاج کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی بیماری پیدا نہیں کی ہے جس کی شفا نہ رکھی ہو، علاوہ ایک بیماری کی اور وہ بڑھاپا ہے۔

(۲) محدث کبیر علامہ خلیل احمد سہانپوریؒ ''تَدَاوَوْا'' کی شرح میں لکھتے ہیں

قوله تداووا الظاهر ان الأمر للاباحة والرخصة وهو الذی يقتضيه المقام فان

السوال كان عن الإباحة قطعًا فالمتبادر فی جوابه أنه بيان للإباحة ويفهم من كلام بعضهم أن الأمر للمندوب وهو بعيد نعم قد تداوی رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم بيانًا للجواز فمن نوی موافقته صلی اللّٰه عليه وسلم يؤجر علی ذلک كذا فی فتح الودود وفی الحاشية واليه مال الحافظ فی الفتح ١٠/١٦٥) والعينی وكذا يظهر عن العالم غيريه وبه جزم الغزالی فی الأربعين وحكی مجمع البحار عن المجهور الاستحباب واليه مال ابن القيوم، بذل المجهود: ٥/١)

پس جمہور محدثین اور فقہائے کرام کے اقوال سے ثابت ہوگیا کہ علاج کرنا دوا پینا دوا کا استعمال کرنا جائز و مستحب ہے بشرطیکہ خلافِ شرع امر کا مرتکب نہ ہو ورنہ تداوی سنت نہ رہے گی۔

جواب (۲):- مریض کیلئے بلا تداوی کے صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا بھی جائز ہے حدیث شریف میں اس کی فضیلت کا ذکر ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

عن ابن عباس رضی اللّٰه عنه قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم يدخل الجنة من أمتی سبعون الفًا بغير حساب. هم الذين لايسترقون ولايتطيرون وعلی ربهم يتوكلون متفق عليه. (مشكوٰة)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت میں سے ستّر ہزار لوگ بغیر حساب جنت میں داخل ہوں گے جو منتر نہیں کراتے، شگونِ بد نہیں لیتے اور اپنے تمام امور میں جن کا تعلق خواہ کسی چیز کو اختیار کرنے سے ہو یا اسکو چھوڑنے سے صرف اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں

لیکن ہرکس وناکس کی یہ ہمت نہیں بلکہ خواص ہی کا یہ درجہ ہے چنانچہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

هذا من صفة الأولياء المعرضين عن أسباب الدنيا وعوائقها الذين لايلتفتون الی شئ عن علائقها وتلک درجة الخواص لايبلغها غيرهم وأمّا العوام فرخص لهم فی التداوی والمعالجات ومن صبر علی البلاء وانتظر من اللّٰه سبحانه بالدعاء كان من جملة الخواص والأولياء ومن لا يصبر رخص له فی الرقية

والعلاج والدواء الأثری أن الصدیق رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ لماتصدق بجمیع مالہ لم ینکر علیہ صلی اللّٰہ علمًا منہ بیقینہ وصبرہ ولما اتاہ الرجل بمثل بیضۃ الحمام من الذھب وقال :لاأملک غیرہ فضرب بحیث لوأصابہ عقرہ.

(مرقاۃ :۶/۱۴۹)

فلہٰذا جس کوتوکل وصبر کا کامل درجہ حاصل ہوا ہو، اس کیلئے بدون تداوی توکل کرنا جائز ہوگا اور اس کوتوکّل وصبر کا اجر بھی ملے گا، البتہ جس کو یہ درجہ حاصل نہ ہو، وہ اوراب تک دیگر علاج ومعالجہ کرتا رہا ہے اس کے لئے بدونِ علاج تداوی توکل کرنا جبکہ تداوی سے شفاء غالب گمان ہو جائز نہیں ہاں شفاء کے بارے میں اگر مبتلا بہ کوتردّد ہوتو تداوی کوترک کرسکتا ہے۔

جواب (۳):-عورت کواگر مذکورہ بالاتوکّل وصبر کا کامل درجہ حاصل ہوا، اور وہ پہلے بھی توکل کرتی رہی ہے اور اب بھی کرنا چاہتی ہے اور دعا کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کشائش وراحت کی منتظرو متمنّی ہے پھر اسی حالت میں اس کا انتقال ہوجائے تووہ گنہگار نہ ہوگی، بلکہ وہ حدیث مذکور کی فضیلت کی مستحق ہوگی۔

چنانچہ استاذ محترم علامہ مفتی عبدالسلام صاحب چاٹگامی مدظلہ العالی کی مایۂ ناز کتاب (انسانی اعضاء کی پیوندکاری) میں ہے۔

اگر چہ چیر پھاڑ کے ذریعہ علاج نہ کرنے کی وجہ سے کوئی مریض ہلاک ہوگیا ہے تووہ گنہگار نہ ہوگا۔

(انسانی اعضاء کی پیوند کاری : ص ۴۲)

جواب (۴):-توکّل اور تداوی کی حدیثوں کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ توکّل کی حدیث میں علاج وتداوی کرنے کے بارے میں کوئی ممانعت وارد نہیں ہوئی اور یہ ممکن ہے کہ علاج کرے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرے دوا پر یقین نہ کرے بلکہ شفاء کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے کا یقین کرے، تواس صورت میں توکّل بھی رہے گا اور تداوی پر عمل بھی ہوجائیگا، حدیث شریف میں صرف اس بات کا ذکر ہے کہ جن کوتوکّل کا کامل درجہ حاصل ہے وہ لوگ اگر بدونِ منتر کرائے صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کریں تووہ بلاحساب جنت میں داخل ہوں گے اور دوا کی حدیث میں علاج کی اجازت ہے یعنی جس کو یہ درجہ حاصل نہیں ان کے لئے علاج وتداوی کی اجازت ہے کہ علاج بھی کرے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ بھی کرے۔

فلہٰذا دونوں حدیثوں کے مابین کوئی تعارض نہیں ہے، جواب مذکور سے یہ بھی واضح ہوا کہ عورت اگر

خلاف شرع کام میں مبتلا ہوکر علاج نہیں کرانا چاہتی تو دوسرے لوگوں کو اس پر اصرار نہیں کرنا چاہئے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
جمادی الاخری ۱۴۲۶ھ

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
جمادی الاخری ۱۴۲۶ھ

(۲۰۱) سوال :- آپریشن کے بارے میں چند مسائل کی تحقیق مطلوب ہیں:

(۱) طبِ جدید اور آپریشن کا رواج عہد رسالت میں نہیں تھا اس لئے کیا وہ بدعت ہے؟

(۲) آپریشن کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

(۳) آپریش کے وقت ستر کھولنا اور ڈاکٹروں کو دیکھنا اور دکھانا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو حدیث "لعن اللّٰہ الناظر والمنظور إلیه وکلاهما فی النار" کا کیا معنیٰ ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب (۱):- عہدِ رسالت اور سلفِ صالحین کے زمانہ میں بھی مختلف علاج ودوا پینے کا تعامل تھا اور ضرورت کے موقع پر خود مریض کے اعضاء وجوارح کی قطع وبرید کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

(۱) عن جابر رضی اللّٰہ عنه قال رمی سعید بن معاذ فی اکحلة فحسمه النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم بیده بمشقص ثم رمت فحسمه الثانیة رواه مسلم:
(مشکوٰۃ کتاب الطب والرقی ۲/۳۸۷)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت سعد ابن معاذ کی رگ ہفت اندام پر تیر آکر لگا جس سے خون جاری ہوگیا چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے تیر کے پیکان کے ذریعہ زخم کو داغ دیا پھر جب ان کے ہاتھ پر آگیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ داغا۔

(۲) وعنه قال بعث رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم إلی أُبی بن کعب طبیبًا فقطع منه عرقًا ثم کواه علیه رواه مسلم. (مشکوٰۃ، کتاب الطب والرقی: ۲/۳۸۷)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی ابن کعب کے پاس ایک طبیب بھیجا طبیب نے ان کی ایک رگ کاٹ ڈالی اور اس زخم پر داغ دیا۔

پس مذکورہ بالا حدیثوں سے معلوم ہوا کہ عہدِ رسالت ﷺ اور سلفِ صالحین کے زمانہ میں بھی علاج وتداوی اور ضرورت کے موقع پر مریض کو داغ دیا جاتا تھا اس سے خون نکالا جاتا تھا، البتہ دورِ حاضر کے چند علاج ومعالجہ کے جدید طریقے نہیں تھے۔ عورت کا یہ کہنا کہ آپریشن کرنا بدعت ہے اگر اس سے مراد خلاف شرع طریقے پر علاج کا عدم جواز ہے تو اس کا کہنا درست ہے۔

جواب (۲):- کسی شخص کے بدن میں بعض اعضاء کی اصلاح کیلئے آپریشن کرنا اور چیر پھاڑ کرنا چند شرائط کے ساتھ جائز ہے چنانچہ حضرت استاد جی علامہ مفتی محمد عبد السلام چاٹگامی مدظلہ العالی کی کتاب ''انسانی اعضاء کی پیوند کاری،، میں ان شرائط کا تذکرہ ہے:

(۱) کوئی ماہر طبیب یا دیندار ڈاکٹر آپریشن کے ذریعہ قطعی رائے دیدے یا ظن غالب کا اظہار کردے کہ اس سے مریض صحیح ہو جائے گا تو آپریشن جائز ہے۔

(۲) علاج کے لئے آپریشن کے علاوہ کوئی اس سے آسان طریقہ نہ ہو۔

(۳) مریض عاقل وبالغ ہو اور اس کی رضامندی بھی ہو اگر عاقل وبالغ نہیں تو ولی کی اجازت ہو۔

(۴) ڈاکٹر چیر پھاڑ کے وقت قدرِ ضرورت سے زائد کشفِ عورت کا ارتکاب نہ کرے، نہ ہی قطع وبرید کرے۔

ان شرائط کے ساتھ مریض کے بعض اعضاء کی اصلاح کے لئے آپریشن کرنا جائز ہے۔

(۱) چنانچہ بدائع الصنائع میں ہے:

ولوسقط سنه يكره أن ياخذ سن ميت فيشدها مكان الأولىٰ بالإجماع وكذا يكره أن يشد تلك السن الساقط مكانها عند أبى حنيفة ومحمد ولكن ياخذمن شاة زكية فيشد ها مكانها وقال أبويوسف لاباس بسنه ويكره سن غيره (ج۵ ص ۱۳۲)

(۲) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الف ل م میں ہے:

والوجه الثانى الذى يسقط فيه العقل أن يامر الرجل به الداء الطبيب أن يبط جرحه أوالاكلة أن يقطع عضوًا يخاف مشيها إليه أويفحرله عرقًا أوالحجام بحجمه أوالكاوى أن يكويه أويامر أبوالصبى أوسيد المملوك الحجام أن

یختنه فیموت من شئ من هذا ولم یتعد المامور ماأمره به فلاعقل ولاماخوذیة ان حسنت نیته ان شاء الله وذلک أن الطبیب والحجام إنما فعلا للإصلاح بأمر المفعول به أووالدالصبی أوسید المملوک الذی یجوز علیها ماأمره فی نظر لها کمایجوز أمرنفسهمالو کانا بالغین . (ج۶ ص ۱۷۵)

بدائع اور کتاب الام کے مذکوہ بالا حوالہ جات سے مندرجہ ذیل امور معلوم ہوئے۔
کہ انسان کے جسم اوراس کے اعضاء کی اصلاح وحفاظت کے لئے اسکے بدن کا چیر پھاڑ کے ذریعہ علاج کرنے کی ضرورت ہو، تو وہ اپنے بدن کا چیر پھاڑ کے ذریعہ علاج کرسکتا ہے، لیکن علاج کا یہ طریقہ اپنانا لازم اورواجب نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اگر چیڑ پھاڑ کے ذریعہ علاج نہ کرنے کی وجہ سے کوئی مریض ہلاک ہوجاتا ہے تو وہ گنہگار نہیں ہوگا۔
غرض یہ ہے کہ علاج ومعالجہ جائز اور مستحب ہے اوراس کے لئے مریض کی رضامندی شرط ہے اس کی اجازت کے بغیر علاج وآپریشن درست نہیں، خاص کرجبکہ صورتِ مسئولہ میں آپریشن کے بعد مریضہ کا صحیح ہونا یقینی نہیں ہے اگر اللہ چاہے گا تو شفاء دیگا تردد ہے کہ شفا ہو یا اس آپریشن کی وجہ سے مقررہ اجل سے قبل موت آجاوے تو ایسی صورت میں علاج مناسب نہیں ہے۔

جواب (۳): -مرض اگر مقام مستور میں ہو اور ڈاکٹر بھی دیکھے بغیر علاج نہیں کرسکتا ہے تو ڈاکٹروں کے سامنے علاج کی غرض سے ستر کھولنا بقدرِ ضرورت جائز ہے البتہ مریض عورت ہونے کی صورت میں عورت کا علاج عورت ڈاکٹر سے کرانا بہتر ہے لیکن عورت ڈاکٹروں میں ماہر ڈاکٹر موجود نہیں ہے تو ضرورت کے تحت مرد ڈاکٹروں سے علاج کرانا درست ہے جبکہ عورت مریضہ اس پر راضی ہو۔

چنانچہ علامہ شامی فرماتے ہیں:

قال فی الجوهرة إذا کان المرض فی سائربدنها غیر الفرج: یجوز النظر إلیه عند الدواء لأنه موضع ضرورة وإن کان فی موضع الفرج ینبغی أن یعلم امرأة تداویها فإن لم توجد وخافوا علیها أن تهلک أویصیبها وجع لاتحتملها یستروا منها کل شئ إلاموضع العلة یداویها الرجل ویغض بصره مااستطاع إلاعن موضع الحرج فتأمل وللظاهرأن ینبغی هنا للوجوب: (ج ۶ ص ۳۷۱)

پس مذکورہ بالا حوالہ سے واضح ہوگیا کہ ضرورت کے موقع پر ستر کھولنا جائز ہے رہا یہ کہ حدیث " لعن

اللّٰہ الناظر والمنظور الیھا کلاھما فی النار " کی وعید میں یہ شامل ہے یا نہیں تو اسکا جواب یہ ہے کہ شامل نہیں ہے کیونکہ حدیث میں جو وعید کا ذکر ہے وہ عدم ضرورت کے ساتھ مقید ہے، اسکی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قابلہ کے لئے عند الولادہ کشف عورت کی اجازت دی ہے ضرورۃً وہ دیکھ بھی سکتی ہے اسی طرح شادی سے پہلے شوہر عورتِ مخطوبہ کو نگاہ سے دیکھ سکتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی اجازت دی ہے معلوم ہوا کہ ضرورت کے تحت بقدرِ ضرورت کشفِ عورت جائز ہے گناہ نہیں ہے۔ فقط واللہ اعلم۔

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۱۷ جمادی الاخری ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین ومومنشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۱۷ جمادی الاخری ۱۴۲۶ھ

(۲۰۲) سوال:- تدوای بالحرام کے بارے میں چند سوالات کے جوابات مطلوب ہیں

(۱) حدیث شریف میں جب تداوی بالحرام کے بارے میں نہی وارد ہے تو تداوی بالحرام کس طرح جائز ہوگا؟

(۲) شوہر عورت کا زبردستی آپریشن کراسکتا ہے یا نہیں؟ یہ اس کے لئے جائز ہوگا یا نہیں۔ اس کی مزید وضاحت کی ضرورت ہے۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب۔

(جواب (۱):- حدیث شریف میں ہے کہ "وَلَا تَدَاوَوْا بِحَرَامٍ "یعنی تداوی بالحرام شرعاً ناجائز اور ممنوع ہے یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے کیونکہ حلال دوا ہوتے ہوئے حرام دوا سے علاج کرنا جائز نہیں ہے، لیکن حلال دوا سے کسی طرح علاج بھی نہ ہوسکے تو شریعت کا اور ایک اصول ہے کہ "الضرورۃ تبیح المحظورات" (ترجمہ: ضرورت حرام چیز کو مباح کردیتی ہے۔ الاشباہ ونظائر)

جس کا مطلب یہ کہ حلال اور جائز دوا موجود ہونا معلوم نہ ہو، یا موجود تو ہو لیکن مریض کے لئے وہ دوا مفید نہ ہو یا مضر ہو، صرف حرام دوا سے اس کا علاج ہونا مسلمان ڈاکٹر کہیں تو ایسے حالات میں مریض کا علاج حرام دوا سے بھی جائز ہے،

چنانچہ فتاوی عالمگیریہ میں ہے:

ویجوز للعلیل شرب الدم والبول واکل المیتة للتداوی وإذا أخبرہ طبیب مسلم

ان شفاءه فيه ولم يجد من المباح مايقوم مقامه ان قال الطبيب شفاء ك فيه وجهان .

ترجمہ: مریض کے لئے بطورِ علاج پیشاب اور خون کا پینا اور مردار کھانا ضرورت کے تحت جائز ہے بشرطیکہ مسلمان ماہر طبیب کی رائے یہ ہو کہ مریض کی شفایابی اور علاج صرف ان ہی چیزوں سے ممکن ہے اور اس کے قائم مقام کوئی حلال دوا موجود نہ ہو، البتہ یہ اگر طبیب کا کہنا یہ ہو کہ ان حرام چیزوں کے استعمال سے شفا جلدی ہوگی تو اس میں دو قول ہیں ایک قول عدمِ جواز کا دوسرا قول جواز کا ہے لیکن احتیاط عدمِ جواز پر ہے۔

مذکور بالا حوالہ سے معلوم ہوا کہ تداوی بالحرام عام حالت میں جائز نہیں البتہ حالت اضطراری میں مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ تداوی بالحرام جائز ہے، شرائط یہ ہیں کہ حالت اضطرار میں ہو اور وہ حالت ہے کہ حلال دواؤں میں کوئی دوا مفید ثابت نہ ہو اور مسلمان طبیب حاذق حرام دوا کو تجویز کردے اور اس صورت میں اگر مریض تداوی بالحرام نہ کرے تو ہلاکتِ نفس یا ہلاکتِ عضو یا قریب الھلال ہو جائیگا ایسی نازک حالت میں حرام و ناپاک اشیاء سے علاج کرنا جائز ہے بلکہ مستحب ہے۔

جواب (۲): -اگر عورت آپریشن کیلئے راضی نہیں ہوتی تو آپریشن اسکی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے اگر عزیز و اقارب سمجھا کر راضی کر سکیں تو جائز ہے پھر بھی راضی نہ ہو تو آپریشن کے علاوہ اور کوئی دوا ہو جیسے ہومیو پیتھک یا یونانی دوا سے علاج کیا جائے اس سے فائدہ ہو تو اچھا ہے ورنہ اس کو اپنی حالت پر چھوڑ دیوے، بہرحال زبردستی سے آپریشن کرانا جائز نہیں ہوگا کیونکہ مریض کی اجازت کے بغیر چیر پھاڑ جائز نہیں ہے۔

(كمافي كتاب الام: وذلك أن الطبيب والحجام انما فعلا للإصلاح بامر المفعول به والد الصبي اوسيد المملوك الذي يجوز عليهماأمره في نظر لهما كما يجوز عليهاامر انفسهما لو كان بالغين.) (۶/ ۱۷۵)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح — کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ

محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ — معاون مفتی دار الافتاء

۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ — ۸/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ

(۲۰۴) سوال: -عورت کے علاج کے بارے میں بعض سوالات کے جوابات مطلوب ہیں

(۱) صورتِ مسئولہ میں عورت کو شوہر کی اطاعت کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر اطاعت نہ کرے تو عورت

کا نان نفقہ شوہر کے ذمہ واجب ہوگا یا نہیں؟ اور آپریشن نہ کرنے کی صورت میں شوہر عورت کو طلاق دے سکتا ہے یا نہیں؟ اور عورت شوہر سے طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے یا نہیں؟

(۲) کوئی شوہر اگر عورت کا آپریشن کرانے میں راضی نہ ہو تو عورت اس کی اجازت کے بغیر آپریشن کرا سکتی ہے یا نہیں؟

(۳) شوہر کے ذمہ عورت کے آپریشن کا خرچہ دینا واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب (۱):- عورت پر شوہر کی اطاعت کرنا ضروری ہے، لیکن جہاں حرام و ناجائز اور گناہ کا معاملہ سامنے آتا ہے، تو وہاں شوہر کی اطاعت لازم نہ ہوگی صورتِ بالا میں بہت سے غیر ضروری لوگوں کے سامنے کشف عورت کا مسئلہ ہے جس میں ڈاکٹر لوگ احتیاط نہیں کرتے۔

فلہٰذا صورتِ مسئولہ میں عورت اگر آپریشن کرنے میں راضی نہ ہو اور شوہر کے پاس رہنا بھی چاہے تو شوہر پر اسکا نان نفقہ واجب ہوگا معذوری کی حالت کا لحاظ کرنا شوہر پر لازم ہے۔ چنانچہ فتاویٰ شامی میں ہے:

اعلم أن المذهب المصحح الذی علیه الفتویٰ وجوب النفقة للمریضة قبل النقلة أو بعدها أمکنه جماعها أو لا معها زوجها أو لا حیث لم تمنع نفسها إذا طلب نقلتها فلا فرق حینئذ بینهما وبین الصحیحة لوجود التمکین من الاستمتاع کما فی الحائض والنفساء فلاینبغی إدخالها فیمن لانفقة لهن. (ج ۳/ص ۵۷۸)

البتہ شوہر اگر اس کے ساتھ جماع نہیں کر سکتا اور اس کو دوسری بیوی کی ضرورت بھی ہو تو وہ دوسری شادی کر سکتا ہے اور اگر شوہر کو دونوں بیویوں کا نان نفقہ دینا مشکل ہو یعنی نہیں دے سکتا تو شوہر کو صبر کرنا چاہیئے اگر وہ صبر نہیں کر سکتا تو مریضہ کو طلاق بھی دے سکتا ہے اگر چہ یہ کراہت سے خالی نہیں ہے۔

جواب (۲):- مریضہ کو اگر اپریشن کی ضرورت ہے تو شوہر کی اجازت سے آپریشن کرا سکتی ہے مگر شوہر اگر علاج و تداوی کرانے میں راضی نہ ہو اور اس سے عورت کی ہلاکت کا خوف ہو تو عورت شوہر کی اجازت کے بغیر بھی علاج یعنی اپریشن کرا سکتی ہے۔

کماذکره صاحب فتح الملهم عن القرطبی. یدل أنه لاینبغی للمرأة ان تداوی

الا باذن الزوج لان ذلک قد یکون مانعًا لغرض منها وإذا کانت لاتتقرب بالتطوعات الاباذنه کان غیر التقربات أولی بالاذن تدعوا ضرورة خوف موت اوغیره فلا یفتقر لاذنه لان قد یتعین ویلتحق بالواجبات . (ج۴ص۳۳۹)

جواب(۳):-عورت بدون اجازتِ شوہر اگر علاج کراتی ہے تو اس کا خرچہ شوہر کے ذمہ لازم نہیں اور شوہر خود اگر عورت کا علاج کراتا ہے یا علاج کی اجازت دیتا ہے تو شوہر کو خرچہ دینا چاہئے۔چنانچہ فتاویٰ شامی میں ہے:

(قوله کمالایلزمه مداوتها) ای إتیانه لها بدواءِ المرض ولاأجرة الطبیب والفصد والحجامة هندیة عن السراج والظاهر أن منها ما تستعمله النفساء بما یزیل الکلف ونحوه وامّا أجرة القابلة الخ (۵/۵۷۵)

یادرہے کہ ایک ہے شرعی فیصلہ اور ایک ہے مروت،اور شرافت کا مسئلہ شرعًا اگر چہ شوہر کے ذمہ عورت کے علاج کا خرچہ واجب نہیں،مگر اس کو اگر علاج کی ضرورت ہے اور شوہر مالدار ہے اور اس کو اس کا احساس ہے تو مروت اور شرافت کا لحاظ کر کے علاج کا خرچہ دینا شوہر پر واجب ہے کیونکہ بیوی کے سوانہ شوہر کو سکون ملتا ہے نہ راحت، اسیطرح اولاد کو،تو گویا کہ بیوی شوہر کے جسم کے ایک جز کی طرح ہے جس کا خیال رکھنا شوہر پر ضروری ہے۔

فقط واللّٰہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفااللہ عنہ
۱۷؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفر
معاون مفتی دارالافتاء
۱۷؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۶ھ

(۲۰۵)سوال:-علاج اور توکّل کے متعلق چند سولات کے جوابات مطلوب ہیں

(۱) علاج اور تداوی کرنا شرعًا ضروری ہے یا مستحب؟ اسیطرح بدون علاج وتداوی کے توکّل کرنا بہتر ہے یا تداوی اور علاج کر کے توکل کرنا بہتر ہے؟

(۲) علاج وتداوی توکل کے منافی ہے یا نہیں؟

(۳) دوا تقدیری فیصلہ کو تبدیل کرسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب بعون اللّٰہ تعالیٰ وتوفیقہ

جواب: (۱) علاج وتداوی کرنے اور نہ کرنے کا مسئلہ مریض اور مریضہ کی حالت پر موقوف ہے، فلہٰذا اس کو اگر علاج سے شفایاب ہونا یقین یا ظنِ غالب نہیں ہے بلکہ تردّد ہے جبکہ علاج کرنے میں خلافِ شرع امور کا ارتکاب بھی کرنا پڑتا ہے تو ایسی صورت میں اس کو مجبور نہیں کیا جائیگا بلکہ اس کو اپنی صواب دید پر چھوڑ دیا جاوے اور جو مریض یا مریضہ علاج پر ہمت وشفا کا ظنِ غالب رکھتے ہیں ان کیلئے علاج کرنا افضل ہے، ضروری پھر بھی نہیں ہے چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں فرماتے ہیں:

أعلم بأن الأسباب المزيل للضرر تنقسم إلى مقطوع به كالماء المزيل لضرر العطش والخبز المزيل لضرر الجوع وإلى مظنون كالفصد والحجامة وشرب المسهل وسائر ابواب الطب أعنى معالجة البرودة بالحرارة ومعالجة الحرار بالبرودة وهى الأسباب الظاهرة فى الطب والى موهوم كالكى والرقية امّا المقطوع به فليس تركه من التوكل بل تركه حرام عند خوف الموت وامّا الموهوم فشرط التوكل تركه إذبه وصف رسول اللّٰه صلى اللّٰه المتوكلين وامّا الدرجة المتوسطة وهى المظنونة كالمداوة بالأسباب الظاهرة عندالأطباء فعله ليس مناقصا للتوكل بخلاف الموهوم وتركه ليس محظورًا بخلاف لامقطوع به بل قد يكون افضل من فعله في بعض الأحوال وفى حق بعض الاشخاص فهوعلى درجة بين الدرجين كذا فى الفصول العمادية فى الفصل للرابع والثلاثين.

(هنديه: ج۵/ص۳۵۵)

ترجمہ: مذکورہ مسئلہ میں عالمگیری نے یہ قاعدہ بیان کیا ہے کہ کسی نقصان وضرر اور تکلیف کو دور کرنے والے اسباب وذرائع تین طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ کہ جن کا مؤثر ہونا یقینی ہوتا ہے، جیسے کہ پانی پیاس کو اور کھانا بھوک کو دور کرتا ہے، دوسرے وہ اسباب جو کہ ظنی ہوتے ہیں جیسے فصد کھلوانا پچھنے لگوانا مسہل دوا لینا اور طب کے دوسرے قواعد وضوابط کہ مثلاً گرمی سے پیدا ہونے والے امراض میں ٹھنڈی دواؤں کا استعمال کرنا اور ٹھنڈ سے پیدا ہونے والے امراض میں گرم دواؤں کے ذریعہ علاج کرنا، اور یہ چیزیں طبی نقطۂ نظر سے ظاہری اسباب کا درجہ رکھتی ہیں اور تیسرے وہ اسباب کہ جو علاج کے لئے فائدہ مند ہوتے ہے لیکن وہم کے

درجہ میں ہیں جیسے جسم کو داغنا، دعاؤں کے ذریعہ جھاڑ پھونک کرانا اور تعویذ گنڈا وغیرہ ان میں جو اسباب و ذرائع یقینی فائدے کی حیثیت سے کام کرتے ہیں ان کو ترک کرنا نہ صرف یہ کہ توکل ہے بلکہ اس صورت میں شرعی نقطۂ نظر سے ان کا ترک کرنا گناہ اور حرام ہے جبکہ ان کو ترک کرنے کی وجہ سے موت کے واقع ہو جانے کا خوف ہو، اس کے برخلاف جہاں تک ان اسباب و ذرائع کا تعلق ہے جو موہوم کی حیثیت رکھتے ہیں ان کو ترک کرنا جائز ہے توکل کی نیت سے ثواب ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے اسباب و ذرائع کو ترک کرنے والوں کو متوکلین کے زمرہ میں شمار فرمایا ہے رہے وہ اسباب و ذرائع جو ظنی ہیں اور جو اطباء و حکماء کے نزدیک ظاہری اسباب کا درجہ رکھتے ہیں تو ان کو اختیار کرنا یعنی طبی اصول و قواعد کے تحت علاج کرنا توکّل کے منافی نہیں ہے اس طرح ظنی اسباب کو اختیار کرنا موہوم اسباب کی طرح توکّل کے خلاف نہیں ہے اور ان کو ترک کرنا یقینی اسباب کو ترک کرنے کی طرح ممنوع نہیں ہے بلکہ بعض احوال میں اور بعض اشخاص کے حق میں ان کو ترک کرنا افضل ہو جاتا ہے پس یہ ظنی اسباب گویا دو درجوں کے درمیان ایک معتدل درجہ ہے، چاہیں ان کو اختیار کریں چاہیں نہ کریں گناہ نہیں۔

جواب (۲):-علاج و تداوی توکّل کے منافی نہیں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ''یاعباد الله تَدَاوَوْا '' اے اللہ کے بندو! تم لوگ بیماری کیلئے دوا استعمال کرو اس سے آپ نے گویا اس طرف اشارہ کیا ہے کہ علاج کرنا اور بیماری کو دور کرنے کے لئے ذرائع اختیار کرنا عبودیت و توکّل کے منافی نہیں ہے، عبودیت و توکل کے منافی تب ہوگا جبکہ کوئی یہ سمجھنے لگے کہ دوا کے اثر سے شفاء ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ نے شفاء دی اس کا اقرار نہ کرے اور اگر اللہ تعالیٰ کے مؤثر ہونے کا انکار کرے پھر تو شرک اور کفر آئے گا کیونکہ حقیقی شفاء دینے والا تو وہی ہے لیکن اگر دل میں یہ یقین ہے کہ شفاء اور صحت وغیرہ نعمتیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں دوا وغیرہ اسباب ہیں یعنی اللہ چاہے گا تو ان سے شفا دے گا نہ چاہے گا تو شفاء نہ ہوگی تو اس طرح دوا کا استعمال کرنا عبودیت اور توکل کے منافی نہیں ہے۔

چنانچہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

''قال نعم'' يعني تعتبر الطب أو نتوكّل على الله و نترك التداوي فلا خفاء أنه لايلائمه الجواب بقوله نعم ايضًا جعل التوكل من قسم ترك التداوي غير

صحیح فی المعنی "یاعبداللّٰہ" إشارۃ إلی أن التداوی لاینافی العبودیۃ ولایدافع التوکل علی صاحب الربوبیۃ ولذاقال فی الحدیث " اعقل توکّل" تداووا تاکیداً لما فھم من قولہ نعم والمعنی تداووا لا تعتمدوا فی الشفاء علی التداوی بل کونوا عباداللّٰہ متوکلین ومفوضین الامور الیہ.

(مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ ج۸ص۳۰۷)

البتہ جولوگ کامل توکل پر قائم رہنا چاہتے ہیں تازندگی وہ علاج ومعالجہ میں مبتلا نہیں ہوئے، نہ جھاڑ پھونک کیا، توان کے لئے ترکِ علاج کے ساتھ توکل افضل ہے جبکہ تداوی بھی جائز ہے۔

جواب(۳):- درحقیقت دوا تقدیری فیصلہ کو تبدیل نہیں کرسکتی بلکہ دوا صرف اللہ تعالیٰ کے حکم سے مرض مٹاتی ہے، اس وجہ سے ایک ہی دوا اور ایک ہی مرض میں مبتلا دو آدمیوں میں سے ایک کو شفا ہوتی ہے دوسرے کو نہیں۔

چنانہ شارح بخاری ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ان ذلک لاینافی التوکّل علی من اعتقد أنھا بإذن اللّٰہ وبتقدیرہ وإنھا تنجع بذواتھا بل بما؟قدرہ اللّٰہ تعالیٰ فیھا وان الدوا قد ینقلب داء إذا قدر اللّٰہ ذلک الخ: (فتح الباری شرح البخاری: ج۱۰ ص ۱۳۵)

فقط اللّٰہ تعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفااللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۱۷/جمادی الاخریٰ ۱۴۲۶ھ	۱۷/جمادی الاخریٰ ۱۴۲۶ھ

مرد ڈاکٹر کیلئے عورت کا اور ڈاکٹر عورت کیلئے مرد کا علاج کرنا

(۲۰۶)سوال:- ہم میاں بیوی دونوں ڈاکٹر ہیں، حکومت کے ہسپتال میں ہم نوکری کرتے ہیں روزانہ ہمیں آٹھ گھنٹے ڈیوٹی کرنی ہوتی ہے، اس دوران ہم کو مرد عورت دونوں کا علاج کرنا پڑتا ہے، علاج کی غرض سے عورت سے بات چیت کرنی ہوتی ہے کبھی کبھاران کے اعضاء وجوارح وغیرہ کو دیکھنے یا مس کرنے کی ضرورت پڑتی ہے مثلا بلیڈ پریشر ناپنے یا موضع مرض کو دیکھنے میں حتی کہ

مستور حصّوں کو بھی دیکھنے اور مس کرنے کی ضرورت پڑتی ہے جبکہ بدونِ دیکھنے اور پکڑنے آپریشن کرنا مشکل ہوتا ہے میری بیوی کی حالت بھی ویسی ہے اب ہمیں چند باتوں کی معلومات حاصل کرنا آپ سے ضروری معلوم ہوا ہے۔

(۱) صورت مذکورہ میں ہمارے لئے ہسپتالوں میں نوکری کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟ خصوصًا میری بیوی کا حال کیا ہوگا؟ بسا اوقات عورتوں کے علاج میں مجھے شہوت آتی ہے اس وقت مجھے کیا کرنا چاہیے؟ واضح رہے کہ ہم اگر حکومت کی نوکری چھوڑ دیں تو باہر میں اپنی مرضی کے مطابق علاج کر سکتے ہیں یعنی میں صرف مردوں کا اور میری بیوی صرف عورتوں کا علاج کر سکتے ہیں، لیکن سرکاری ہسپتالوں میں یہ بات ممکن نہیں۔

(۲) میں نے بخاری شریف بنگلہ ترجمہ میں ایک باب "هل يداوي الرجل المرأة والمرأة الرجل" دیکھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد ڈاکٹر عورت کا علاج اور عورت ڈاکٹر مرد کا علاج کر سکتی ہے۔

(۳) ہمارے لئے اوقات خارجہ میں مریضوں سے فیس لینے کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب باسمہ تعالیٰ وہو الموفق لصواب

جواب:-(۱) واضح رہے کہ سرکاری ہسپتالوں میں مردوں اور عورتوں کا مخلوط علاج ہوتا ہے جس میں پردہ کی خلاف ورزی ہوتی ہے لہٰذا مخلوط علاج آپ لوگوں کو نہیں کرنا چاہیے بلکہ آپ کو چاہئے کہ صرف مردوں کا علاج کریں اور آپ کی بیوی کو چاہئے کہ وہ صرف عورتوں کا علاج کرے اس سے پردہ کی خلاف ورزی نہ ہوگی اور علاج بھی صحیح ہوگا، سہولت بھی سب مریضوں کو حاصل رہے گی، ہاں کبھی کہیں مشکل ہو تو مجبوری کی بات ہے پھر مرد کا عورت کو دیکھنا اور عورت کا مرد کو دیکھنا جائز ہوگا۔

چنانچہ درمختار میں ہے:

(شرائها ومداوتها ينظر الطبيب (إلى موضع مرضها بقدر الضرورة) إذ الضرورات تتقدر بقدرها وكذا نظر قابلة وختان وينبغي ان يعلم امرأة تداويها لان نظر الجنس إلى الجنس أخف. (در مختار مع شامية ج٦ ص ٣٧٠)

جواب (۲):- امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے "باب هل يداوي الرجل الخ" سے عورتوں کی ڈاکٹری کے جواز کا ثبوت نہیں ملتا، کیونکہ ان جگہوں میں مردوں کے کم ہونے کی وجہ سے بعض

عورتوں کو دوا اور پانی وغیرہ پلانے کے لئے جانے کی اجازت دی گئی تھی، وہ وقتی حالات تھے پھر وہ پردہ کی آیات اُترنے سے پہلے کے واقعات ہیں۔

چنانچہ شارح بخاری ابن حجر شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

انما لم يجزم بالحكم لاحتمال أن يكون ذلك قبل الحجاب أو كانت المرأة تصنع ذلك بمن يكون زوجًا لها أو محرمًا وأمّا المسئلة فتجوز مداوة الأجانب عند الضرورة وتتقدر بقدرها فيما يتعلق بالنظر والحبس باليد وغير ذلك. (فتح الباری ج۱۰/ص۱۳۶)

یعنی بعض مواقع پر عورتیں مردوں کے علاج وتداوی کے لئے گئیں تھیں مگر یہ واقعہ قبل الحجاب کا ہے، یا تو ہر عورت اپنے اپنے زوج یا محرم کا علاج کرتی تھی یا شدید ضرورت یعنی اس وقت جنگ کے مریضوں کے علاج وتداوی کے لئے اور کوئی مرد نہیں تھا، پھر عورتوں نے مردوں کا علاج کیا ہے فلہٰذا اس واقعہ سے جواز پر دلیل پیش کرنا جائز نہیں ہے۔

جواب (۳):۔ مریضوں سے ڈاکٹروں کا فیس لینا جائز ہے، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

أن النبی صلی الله علیه سلم احتجم فأعطی الحجّاج أجره واستعط متفق علیه (مشکوٰۃ شریف: ۱/۲۵۸)

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک مرتبہ) بھری ہوئی سینگی کھوائی اور سینگی کھینچنے والے کو اس کی اجرت عطا فرمائی نیز آپ ﷺ نے اپنی ناک میں دوا ڈالی۔

مگر اس میں دو باتوں کی رعایت کرنا ضروری ہے ایک یہ کہ خدمتِ انسانی کی نیت ہو اور کم سے کم فیس لینے کا دھیان ہو ان دونوں صورتوں میں مریضوں کو زیادہ فائدہ پہنچے گا اور ڈاکٹروں کو مفت میں ثواب بھی ملتا رہے گا مگر زیادہ فیس لینے میں مال کمانے کی حرص بڑھے گی خدمت خلق مقصد نہ رہے گا بخل میں اضافہ ہوگا انسانی ہمدردی کی صفت ختم ہوجائے گی قساوتِ قلبی پیدا ہوگی انسانیت کی جگہ حیوانیت آجائے گی۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ:
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۱۷/ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۶ھ	۱۷/ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۶ھ

جواہر الفتاویٰ

حضرت مولانا مفتی محمد عبد السلام چاٹگامی دامت برکاتہم العالیہ

اسلامی کتب خانہ
علامہ بنوری ٹاؤن کراچی